قاضی اطہر نمبر

ماہنامہ

ضیاء الاسلام

سرپرست

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہ

مدیر ضیاء الحق خیرآبادی (فاضل دیوبند)

مرکز اشاعت مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور اعظم گڑھ (یوپی)

قاضی اطہر مبارکپوریؒ نمبر

ماہنامہ

ضیاء الاسلام

شیخوپور

جلد نمبر: ۳	اگست تا دسمبر ۲۰۰۳ء (جمادی الاخریٰ تا شوال ۱۴۲۴ھ)	شمارہ نمبر: ۸ تا ۱۲

سرپرست: حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہ

مدیر: مولانا ضیاء الحق خیرآبادی Mob:9235327576

سالانہ زرتعاون

☆ اندرون ملک ۱۲۵/روپئے

☆ بیرون ممالک: ۲۲/ڈالر

☆ فی پرچہ: ۱۲/روپئے

ترسیلِ زر کا پتہ

منیجر ماہنامہ ضیاء الاسلام

مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور

ضلع اعظم گڈھ (یوپی)

PIN:276121

S.T.D.Code:(05466) Phone:225249

اس خصوصی نمبر کی قیمت: 200 روپئے

مرکز اشاعت: مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور

ضلع اعظم گڈھ (یوپی) PIN:276121

Email: zeyaulhaquekbd@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کچھ اس ایڈیشن کے بارے میں

آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے قاضی اطہر مبارکپوری نمبر شائع ہوا، اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، معاصر رسائل ومجلّات نے اس پر وقیع تبصرے شائع کئے۔ خصوصاً معروف صاحب قلم انشا پرداز وادیب، قاضی صاحب کے دیرینہ رفیق مولانا اسیر ادروی صاحب نے، ان کے تبصرے کو اس ''ای ایڈیشن'' میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا محسن عثمانی ندوی نے بھی بہت وقیع تبصرہ کیا جو ان کے تبصروں کے مجموعہ ''کتابوں کے درمیان'' (مطبوعہ خدا بخش لائبریری پٹنہ) میں شائع ہو چکا ہے۔ ماہر شبلیات ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا تبصرہ ''کتابیں'' جلد دوم میں شائع ہو چکا ہے۔ سب نے اس علمی خدمت کو بہت سراہا، خصوصاً قاضی صاحب کی غیر مطبوعہ خود نوشت ''کاروانِ حیات'' کی دریافت اور اس کی اشاعت پر سب نے مسرت کا اظہار کیا اور اس تحریر کو ''دستاویزی حیثیت'' کی حامل قرار دیا۔

جس وقت یہ نمبر شائع ہوا، اس وقت یہ بات تصور سے باہر تھی کبھی ان کتابوں کی پی ڈی ایف فائل بھی بنے گی اور اسے کمپیوٹر اور موبائل پر پڑھا جا سکے گا۔ گزشتہ چند سالوں میں ذرائع ابلاغ نے جو حیرت انگیز ترقی کی اس کے نتیجہ میں یہ تمام چیزیں واقعہ بن کر سامنے آچکی ہیں، بہت سی کتابیں جن کا صرف نام سنتے تھے اور اسے دیکھنے کی بڑی تمنائیں اور آرزوئیں تھیں آج آرام سے ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھ لیتے ہیں۔ میرے ایک کرم فرما بھائی شوکت علی ہیں، جنھوں نے ایک ویب سائٹ بنا رکھی ہیں ''islamic Books City'' ان سے جب رابطہ ہوا تو انھوں نے فرمائش کی کہ استاذی حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی کی سبھی کتابوں کی پی ڈی ایف فائل ان کو بھیجوں وہ اسے مذکورہ سائٹ پر ڈال دیں گے، میں نے حضرت الاستاذؒ کی سبھی کتابیں اور اپنا سہ ماہی رسالہ ''مجلّہ رشد وہدایت'' بھی بھیج دیا، جس کو انھوں نے ویب سائٹ پر ڈال دیا۔ پھر انھوں نے قاضی صاحبؒ کی چند کتابوں کے بارے میں دریافت کیا، جو آسانی سے دستیاب ہو گئیں ان کو بھیج دیا۔

انھوں نے ماہنامہ ضیاء الاسلام کی اِس خصوصی اشاعت کے بارے میں سوال کیا، اس کو بھیجنے میں کچھ دقت تھی، جس کو دور کئے بغیر بھیجنا مناسب نہ تھا۔ اس کے کئی مضامین کمپوز نہ تھے، اس کی اسکیننگ میں فائل بڑی ہو جاتی، اور کتابت کی رنگارنگی بھی باقی رہتی، اس لئے ان مضامین کی کمپوزنگ ضروری تھی، میں اپنے فاضل دوست مولانا نوشاد احمد معروفی کا ممنون ہوں کہ ان کی نگاہ توجہ سے کمپوزنگ کا مرحلہ بہت آسان ہو گیا، میرا بیٹا محمود ضیاء سلّمہٗ (جو ابھی کمپوزنگ سیکھ رہا ہے) اس نے بھی محض اپنی دلچسپی کی بنا پر کئی صفحات کمپوز کر کے میرے لئے سہولت پیدا کی۔ بارك فی حیاته وعلمه وعمله

اس ایڈیشن کی تیاری کے دوران ایک روز اپنے کرم فرما بزرگ ماہر شبلیات ڈاکٹر محمد الیاس صاحب اعظمی سے فون پر گفتگو کے دوران میں نے اس کا ذکر کیا، انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر نعیم صدیقی کا ایک بہت اچھا مضمون قاضی صاحب پر ابھی الرشاد میں آیا ہے، میں نے کہا کہ آپ کا بھی تو ایک مضمون قاضی صاحب پر ہے، انھوں نے کہا کہ جی ہے تو، میں نے کہا کہ اگر ان دونوں مضمون کی ان پیج فائل مہیا کرا دیں تو میں ان کو بھی اس ایڈیشن میں شامل کر دوں، انھوں نے دوسرے دن ہی ان پیج فائل بھیج دی۔ اس طرح یہ دونوں مضمون (''مورخ اسلام قاضی اطہر مبارک پوری.....'' اور ''وہ یاد آئے بہت ....'') اس ایڈیشن کی زینت بن گئے۔ ان کے علاوہ اخیر میں اس نمبر پر مولانا اسیر ادروی صاحب کا تبصرہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ باقی سب کچھ ویسے ہی ہے جیسے مطبوعہ ایڈیشن میں تھا۔ مطبوعہ ایڈیشن میں مَیں نے ماہنامہ ضیاء الاسلام کی چار سالہ فہرست مضامین کو شامل کر دیا تھا، مقصد صرف یہ تھا کہ گزشتہ شماروں کے مضامین کی تلاش میں سہولت رہے گی، اس کو ویسے ہی باقی رکھا ہے، جی چاہ رہا تھا کہ بعد کے سبھی شماروں کی فہرست بھی کمپوز کر کے شامل کر دوں، لیکن فرصت نہ ملنے کی وجہ سے یہ کام رہ گیا۔

باری تعالیٰ مطبوعہ ایڈیشن کی طرح اس کو بھی قبول عام سے نوازیں۔

ضیاء الحق خیرآبادی
مدیر مجلّہ ''رشد وہدایت'' سہ ماہی
واستاذ دار العلوم تحفیظ القرآن، سکٹھی، مبارکپور، اعظم گڈھ یوپی
یکم رصفر ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۲ر اکتوبر ۲۰۱۷ء یکشنبہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

☆☆☆☆☆

اداریہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آغاز سخن

از:۔سرپرست

قاضی اطہر مبارکپوری علیہ الرحمہ

قاضی اطہر مبارکپوری؟ آنے والی نسل کو جاننا چاہئے کہ قاضی اطہر مبارکپوری کون تھے؟ اور کیا تھے؟ وہ سراپا جہد و عمل تھے، وہ ایک پیکر صبر واستقامت تھے، حالات نے ان کی مخالفت کی، مگر ان کی ہمت مردانہ اور توفیق الٰہی نے ہر مخالفت کو موافقت پر مجبور کردیا۔ ان کا خمیر علم و تحقیق سے اٹھا تھا، اور تازندگی وہ اس میں تازگی اور پختگی پیدا کرتے رہے، وہ طالب علم تھے، اور جب وہ علماء کی صف اول میں پہونچ گئے تھے جب بھی وہ طالب علم ہی تھے، علم کے سمندر میں وہ گھستے رہے، ایک سے بڑھ کر ایک وہ علم و تحقیق کے موتی نکالتے اور طالب علموں کے دامن میں ڈالتے رہے، مگر کہیں رکے نہیں، ہر قدم وہ آگے بڑھتے رہے، علم کی آغوش کشادہ ہوتی رہی، اور وہ علم وفن کی جلوہ طرازیوں میں گم ہوتے رہے، زندگی کی آخری سانس تک وہ طالب علم رہے۔

وہ دیار پورب کے لئے مایۂ افتخار تھے، نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے علماء کا انھوں نے سر اونچا کیا، کتنے لوگوں کو دھوکہ ہوا کہ وہ متقدمین میں کی کوئی قدآور شخصیت ہیں۔ حالانکہ وہ ہمارے ہی درمیان رہے، گھل مل کر رہے، بغیر کروفر کے رہے، ہر طبقہ کے لوگوں نے سمجھا کہ وہ ہمیں میں ہیں، اصحاب تحقیق میں پہونچے، تو انھیں پیشوا مانا گیا۔ اہل تدریس میں گئے، تو بہترین مدرس سمجھے گئے، شعروادب کی وادی میں گئے تو اسی دنیا کے محسوس ہوئے، تالیف وتصنیف کے میدان میں قدم رکھا، تو معلوم ہوا کہ ع: عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

تقریریں بھی خوب کیں! گو کہ ان کی تقریریں سادہ ہوتیں، مگر معلومات سے لبریز ہوتیں، طالب علموں میں ہوتے، تو طالب علم معلوم ہوتے، حدتو یہ ہے کہ عوام میں ہوتے اوران سے گفتگو کرتے، تو ہر ایک اپنے کو ان کے قریب پاتا۔

ولیس علی اللہ بمستنکر　　　أن یجمع العالم فی واحد

(اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ وہ شخص واحد میں ایک دنیا کی دنیا سمیٹ کرر کھ دے)

قاضی صاحب کی شخصیت کچھ ایسی ہی نمونۂ قدرت الٰہی تھی۔

۱۴؍جولائی ۱۹۹۶ء کو ان کا انتقال ہوا۔ علم وتحقیق کی دنیا میں ایک خلا پیدا ہوا، حق یہ تھا کہ اس خلا کو ان کی یادوں سے، ان کے کارناموں کے تعارف وتبصرے سے، ان کے احوال زندگی کی تحریر وتصنیف سے کسی قدر پر کیا جاتا۔ تاکہ اصحاب توفیق انھیں دیکھ دیکھ کر اپنی راہیں درست کرتے، جہد وعمل کا حوصلہ پاتے، صبر واستقامت کی عزیمت سے سرفراز ہوتے، اگلوں کے احوال سناتے رہنا چاہئے تاکہ پچھلے راہ میں تھک کر بیٹھ نہ رہیں۔

قاضی صاحب کے ہمعصر، ان کے رفیق درس، ان کے مخلص دوست مولانا نظام الدین اسیرؔ ادروی مدظلہٗ نے پہل کی، انھوں نے ترجمان الاسلام بنارس کا خصوصی نمبر قاضی صاحب کی یادگار میں شائع کیا۔ قاضی صاحب سے ایک ہلکی سی نسبت رکھنے والا یہ خاکسار بھی ہے، تلمذ کی نسبت! ''ہلکی سی'' اس لئے کہ وہ گنتی کے چند ایام تھے، جب اس بے مایہ طالب علم نے ان کے سامنے مقامات حریری کے چند اوراق کھولے تھے۔ ان کی عمر کے آخری چند سالوں میں مولانا عبد الرّب صاحب اعظمی نے ان کی سرپرستی اور نگرانی میں ماہنامہ انوار العلوم جہاناگنج کا اجراء کیا۔ ان کے وصال کے بعد ارادہ کیا گیا کہ ان کی یاد میں ماہنامہ انوار العلوم کا خاص نمبر اہتمام کے ساتھ شائع کیا جائے۔ چنانچہ اس کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ کئی مضامین اور مقالے مہیا ہو گئے، ایک اچھے کاتب سے بہت خوبصورت کتابت بھی ایک حد تک کروائی گئی، مگر وہ بھی مرحوم ہو گیا۔ پھر اس کی نشأۃ ثانیہ مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور میں ضیاء الاسلام کے نام سے ہوئی، شروع ہی سے قصد تھا کہ یہ نو دمیدہ پودا جب کچھ توانائی پالے گا، تو قاضی صاحب پر خاص نمبر شائع کیا جائیگا مگر اردو رسالوں بالخصوص دینی جریدوں کا معاملہ خاصا صبر آزما اور ہمت شکن ہوتا ہے، انتظار ہی

انتظار میں وقت گزرتا گیا، اور مالی اعتبار سے اس کی پوزیشن بجائے مضبوط ہونے کے اور کمزور ہوتی رہی، اندیشہ ہورہا تھا کہ یہ آرزو، آرزو ہی رہ جائے گی، اور دل ہی دل میں دم توڑ دے گی۔ اور آخر میں کہنا پڑے گا کہ ع: اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس اندیشہ نے دلوں کو گرمایا۔ سوچا گیا کہ ہرچہ بادا باد، ارادوں کی کشتی کو دریائے عمل میں ڈال ہی دیا جائے۔ اللہ کی مدد ہوگی، تو ساحل نصیب ہو ہی جائے گا۔ پھر اللہ نے مدد فرمائی، احباب ادھر متوجہ ہوئے، اور کام چل پڑا، کتابت شدہ جو حصہ تھا، وہ تو تھا ہی، کچھ اور مضامین حضرات اہل علم کی طرف سے دستیاب ہوئے۔ بعض اہم مضامین ترجمان الاسلام بنارس کے خصوصی نمبر سے لئے گئے اور قاضی صاحب کا یہ تذکرہ مرتب ہوگیا۔

اس خاص نمبر میں خاص، بہت ہی خاص چیز قاضی صاحب کی ناتمام خودنوشت آپ بیتی ہے، اس کا ایک حصہ قاضی صاحب نے ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' کے عنوان سے شائع کردیا تھا، یہ حصہ بہت مقبول ہوا۔ علماء نے بھی، طلبہ نے بھی اسے خوب پڑھا، اور خوب سبق لیا، اس کا دوسرا حصہ کاروان حیات کے نام سے قاضی صاحب لکھ رہے تھے، مگر اسے تمام کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ کاروان حیات کا سفر ہی تمام ہوگیا، لیکن جتنا ہے، وہ خود بہت ہے، اسے شائع کرنے کی سعادت اس خاص نمبر کو حاصل ہورہی ہے، ساری خودنوشت داستان حیات یکجا آجائے، اس واسطے اس میں ''کاروان حیات'' کے دور اول کا مطبوعہ حصہ ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' کو بھی شامل اشاعت کردیا گیا ہے۔

باقی مضامین کے تعارف کی حاجت نہیں۔ قارئین کے ہاتھوں میں ہیں۔ ہم نے اپنی بساط بھر کوشش کی ہے کہ قاضی صاحب کی زندگی کا ہر گوشہ نگاہوں میں آجائے، اللہ کرے کسی حد تک ہم اس میں کامیاب ہوئے ہوں۔

اس خاص نمبر کی تیاری اور اس کی ترتیب وتہذیب میں ہم اپنے ان تمام احباب اور معاونین کے شکرگزار ہیں جن کا ہمیں تعاون حاصل رہا ہے، مولانا عبدالرّب صاحب اعظمی نے سارے مضامین عطا فرمادئے، جو انھوں نے ماہنامہ انوار العلوم جھانا گنج کے لئے کتابت کرا رکھے تھے، قاضی صاحب کے صاحبزادۂ محترم قاضی مولوی ظفر مسعود صاحب نے اس نمبر کے

ساتھ خاص دلچسپی لی، تمام ضروری مضامین اور مکاتیب انھوں نے مہیا کئے، ان سے استفادہ کا موقع دیا، اس سلسلے میں وہ مبارکپور سے بار بار شیخوپور آئے، ان کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی سے اس راہ کی کتنی مشکلیں سر ہوئیں۔ ان کے چھوٹے بھائی قاضی سلمان مبشر صاحب نے بھی ہر قدم پر ہمت افزائی کی۔ **فجزاهم الله تعالیٰ احسن الجزاء**

قاضی صاحب کے تلمیذ خاص مولانا بدرالدین اجمل صاحب رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند وسرپرست شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند، مولانا قاری محمد ایوب صاحب مہتمم مدرسہ مفتاح العلوم، بھیونڈی، اور قاضی صاحب کے قدیم اور خصوصی شاگرد مولانا شہاب الدین صاحب بھیونڈی، کے ہم بھی بطور خاص شکر گزار ہیں کہ ان کے خصوصی تعاون اور دلچسپی کی وجہ سے ہماری ہمتوں میں توانائی آئی۔ اور کام مسلسل آگے بڑھتا رہا، اللہ تعالیٰ ان سب حضرات پر اپنا خاص فضل وکرم فرمائیں، کلکتہ کے مجیب الرحمٰن بھائی خاص شکریے کے مستحق ہیں کہ طباعت کا مرحلہ ان کی مخلصانہ کوششوں اور مدد سے بہت آسان ہوگیا، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائیں۔

جیسا بن پڑا، قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کی زندگی اور ان کے کارناموں کا ایک نا تمام مرقع تیار ہوگیا ہے، اسے پڑھئے، اور مدرسہ شیخ الاسلام کے لئے، ادارۂ ضیاء الاسلام کے لئے، اس کے کارکنوں کے لئے، اس کے معاونین کے لئے، دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ کرم کا معاملہ فرمائیں، یہی دعا ہماری طرف سے تمام قارئین کے لئے ہے،

ایں از من از جملہ جہان آمین باد

❖❖❖❖❖❖❖

"ماہنامہ ضیاء الاسلام" کی توسیعِ اشاعت میں حصہ لیکر عنداللہ ماجور ہوں، اور اگر آپ کے ذمہ رسالہ کی رقم باقی ہو تو اسے اول فرصت میں ادا کر کے اپنے فریضے سے سبکدوش ہوں۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء

"ادارۂ ضیاء الاسلام"

سوانح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسو لہٖ الکریم

خود اعتمادی اور خودسازی کی یہ طویل داستان ان عزیز طلبہ کی تشجیع وتشویق اور ہمت افزائی کے لئے لکھی گئی ہے، جو بہترین ذہن و دماغ لے کر دارالعلوموں اور جامعات کی لق و دق اور شاندار عمارتوں میں جاتے ہیں تا کہ وہاں کے بہترین تعلیمی وتربیتی نظام کے ماتحت لائق و فائق اساتذہ کی توجہ سے علم حاصل کریں، مگر عام طور پر ان کو اپنے مقصد میں ناکام ہونے کے ساتھ اپنی نالائقی اور بدنامی کی سند ملتی ہے، کیونکہ ان مدرسوں کے ذمہ داروں کی وجہ سے تعلیم وتربیت کا معیار حد درجہ ناقص بلکہ علم کش ہوتا ہے اور وہ لوگ سارا الزام طلبہ کے سر رکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور اگر کچھ طلبہ اپنے طور پر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔

ایسے طالب علموں کو ہم جیسے چھوٹے مدرسوں کے طلبہ سے سبق لے کر اپنے بلند مقاصد میں کامیابی کی جدوجہد کرنی چاہیئے، میں نے اپنی طالب علمی کی یہ کہانی خودستائی اور خودنمائی کے لئے نہیں لکھی ہے۔ عزیز طلبہ اس تحریر کو اس نقطۂ نظر سے نہ پڑھیں بلکہ اس کو پڑھ کر آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کریں۔

اس سے پہلے میں نے ''تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، اس کا مقصد بھی عزیز طلبہ کی تشجیع وتشویق ہے۔ اس سلسلہ کی یہ دوسری کتاب ہے، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانیؒ کی کتاب ''علمائے سلف'' بہت خوب اور بہت مفید ہے، یہ میری محسن کتابوں میں ہے، اسکا مطالعہ بھی ضرور کرنا چاہیئے۔

قاضی اطہر مبارکپوری

یکم ربیع الاول ۱۴۰۷ھ ۵/نومبر ۱۹۸۶ء

حضرت مولانا قاضی اطہر صاحبؒ کی خودنواشت سوانح کے دو حصے ہیں، ایک تو یہی ''قاعدۂ بغدادی سے صحیح بخاری تک''، جس میں قاضی صاحب نے اپنی طالب علمی کی سبق آموز داستان مختصراً تحریر فرمادی ہے، یہ حصہ مطبوعہ ہے۔ اسے قاری ابوالحسن صاحب نے اپنے مکتبہ صوت القرآن دیو بند سے شائع کیا ہے۔
دوسرا حصہ وہ ہے جو قاضی صاحب کے وصال کے بعد ان کے مسودات کے ذخیرہ میں ملا، اس میں قاضی صاحب کے قلم لکھے ہوئے فراغت کے بعد کے مفصل حالات ہیں، یہ تحریر اگر چہ مکمل نہیں ہے، لیکن جتنی ہے وہ خود بہت معلومات افزاء اور کارآمد ہے، ہم اسے خاص نمبر کا خاص تحفہ سمجھ کر قارئین کی خدمت میں نذر کرتے ہیں، اسی کے ساتھ مطبوعہ سوانح کو بھی ملحق کر دیا گیا تا کہ مکمل سوانح یکجا طور پر سامنے آجائے۔

خاندانی سلسلہ اور پیدائش

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین محمد و آلہ واصحابہ اجمعین۔

میری پیدائش ۴؍رجب ۱۳۳۴ھ مطابق ۷؍مئی ۱۹۱۶ء میں صبح پانچ بجے ہوئی، جائے پیدائش مبارک پور کے محلّہ پورہ صوفی اور محلّہ حیدر آباد کے نقطۂ اتصال پر موجودہ مسکونہ مکان کے شمال میں سڑک کے بعد چوتھا مکان ہے، بعد میں ہم لوگ اس سے پہلے تیسرے مکان میں آگئے، جس میں میرے بچپن، جوانی اور طالب علمی کا پورا دور گذرا، باہر والا کمرہ میرے لئے مخصوص تھا میں اپنے والدین کی پہلی اولاد تھا نانا مرحوم مولانا احمد حسین صاحب رسول پوری متوفی ۲۶؍رجب ۱۳۵۹ھ نے میرا نام عبدالحفیظ رکھا، بعد میں قاضی اطہر مبارک پوری کے نام سے مشہور ہوا، والد مرحوم کا نام شیخ حاجی محمد حسن بن شیخ حاجی لعل محمد بن شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضا بن شیخ امام بخش بن شیخ علی متوفی ۱۱؍ربیع الاول ۱۳۹۸ھ ہے اور والدہ مرحومہ کا نام حمیدہ بنت مولانا احمد حسین بن شیخ عبدالرحیم بن شیخ جمال الدین متوفیہ ۲۲؍ذی قعدہ ۱۳۵۲ھ ہے، رحمہم اللہ اجمعین، دادا یہال اور نانہال کے بزرگوں کے حالات ''مآثر و معارف'' اور ''تذکرہ علمائے مبارکپور'' میں درج ہیں۔
اس زمانہ میں نانا مرحوم ڈھاکہ میں مدرس تھے اور وہاں کے مشہور و معمر بزرگ حضرت شاہ

عبداللہ صاحبؒ ساکن رمنہ نے ان کو میری اور میرے ماموں عبدالباری مرحوم کی ولادت کی خوشخبری دی تھی اور ہم دونوں کے حق میں دعائے خیر بھی کی تھی۔

میرے جداعلیٰ سلطان نصیر الدین ہمایوں کے دور سلطنت میں کڑا مانک پور سے حضرت راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد بن راجی سید نور بن راجہ سید حامد چشتی مانک پوریؒ متوفی ۲؍شوال ۹۶۵ھ بانئ مبارک پور کے ہمراہ اپنا حسب ونسب چھوڑ کر یہاں آئے، اوراسی زمانہ میں نیابت قضاء کا عہدہ ہمارے خاندان میں چلا آرہا ہے، جس کی خو، بواب بھی خاندان کے ہر چھوٹے بڑے فرد میں پائی جاتی ہے، اور غیرت وحمیت، عزت نفس، صاف گوئی اور خودداری کا لحاظ و پاس بہت زیادہ ہے، انتہائی بچپن کے چند ایسے واقعات مجھ کو اب تک یاد ہیں جن سے میری غیرت وحمیت کو ٹھیس لگی تھی اور آگے چل کر ان سے خودداری کو مدد ملی۔

ہمارا خاندان بہت بڑا تھا، والد مرحوم چار بھائی تھے (عبداللہ، اسداللہ، محمد حسین اور محمد حسن) والد مرحوم ان میں سب سے چھوٹے تھے اور میں ان کی پہلی اولاد تھا، اس لئے خاندان کے تمام چھوٹے بڑے مجھ سے زیادہ محبت کرتے تھے۔

میں خاندان اور محلّہ کے لڑکوں کے ساتھ میں ہر قسم کے کھیل کود، صید وشکار، سیر وتفریح اور طفلی شرارتوں میں شریک رہ کران کو غلط حرکتوں سے منع کرتا تھا، اس لئے وہ سب مجھے ’’مولوی‘‘ کہتے تھے حتی کہ اسی زمانہ میں محلّہ کے دوسرے لڑکے اور بڑے لوگ بھی مجھ کو اسی خطاب سے یاد کرنے لگے، کھیل کود کے سامان بنانے میں زیادہ دلچسپی رہتی تھی، چڑیے اور مچھلی کے شکار سے خاص شغف تھا اور خاندانی بھائیوں کے ساتھ قصبہ کے باہر باغوں، کھیتوں، دیہاتوں اور ندی نالوں کا چکر کاٹتا تھا، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم تک یہی حال رہا اور کھیل کود میں زیادہ وقت گذرتا تھا، خاندانی ماحول غیر علمی تھا، چار بھائیوں میں دونوں چھوٹے بھائی معمولی لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور دینی زندگی بسر کرتے تھے، میں بچپن میں بہت سیدھا سادا تھا، آشوب چشم کی وجہ سے نگاہ بھی کمزور ہوگئی تھی، والدہ مرحومہ کو خاص طور سے میرے بارے میں بہت فکر رہا کرتی تھی کہ یہ بڑا ہو کر متاہل زندگی کیسے بسر کرے گا، اس کا ذکر دوسروں سے بھی کیا کرتی تھیں، میری نانی مرحومہ رحیمہ بنت حافظ شاہ نظام الدین سریانویؒ متوفیہ ۲۶؍رمضان ۱۳۷۸ھ بڑی نیک اور

عابدہ زاہدہ تھیں، میں نے ان کا دودھ پیا ہے وہ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتی تھیں، اکثر صبح کو رسولپور منگوالیا کرتی تھیں اور شام کو مبارک پور واپس کرا دیا کرتی تھیں یہ خدمت ان کے یہاں پڑھنے والے بعض لڑکے انجام دیتے تھے۔

میرا حافظہ بچپن میں بہت قوی تھا، چھ ماہ اور سال بھر کی عمر کے کئی واقعات اب تک یاد ہیں۔ والدہ مرحومہ مجھے گود میں لے کر صبح کو قرآن شریف کی تلاوت کیا کرتی تھیں اور میں سنتا تھا، نیز محلّہ کے لڑکے لڑکیوں کو پڑھاتی تھیں، اس وجہ سے بچپن سے مجھ کو دینی اور مذہبی معلومات سے دلچسپی ہوگئی تھی، اور انبیاء علیہم السلام، رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور بزرگان دین رحمہم اللہ کے حالات سے فی الجملہ واقفیت بھی ہوگئی تھی، اور والدہ مرحومہ کی کتابیں الٹتا پلٹتا تھا، اس طرح ان کی گود میرا پہلا مدرسہ تھی، نو دس سال کی عمر سے نماز کی پابندی ہوگئی تھی۔ الغرض والدہ مرحومہ اور نانی مرحومہ دونوں کی پرورش اور تربیت میں میرا بچپن گذرا ہے جن کا ذہن ومزاج اور ماحول سراسر دینی علمی، خدا پرستی اور خدا ترسی کا تھا، جب کہ خاندان اور محلّہ کا ماحول اس سے جداگانہ تھا میں نے ان ہی متضاد حالات میں آنکھ کھولی اور ان سے میرا بچپن متاثر ہوا، میرے مزاج کی نرمی اور گرمی ان متضاد تاثرات کا نتیجہ ہے جس کا ظہور اب بھی کبھی کبھی ہوتا رہتا ہے۔

باقاعدہ تعلیم کی ابتداء:۔ ویسے تو میں گھر پر ہی کچھ نہ کچھ پڑھنے لگا تھا مگر باقاعدہ تعلیم کے لئے محلّہ کے گھریلو مکتب میں بھیجا گیا، اس زمانہ میں عام طور سے قاعدہ بغدادی، قرآن شریف اور اردو کی ابتدائی تعلیم اور تربیت خانگی مکاتب میں ہوا کرتی تھی، گھر پر والدہ مرحومہ اور والد مرحوم سے پڑھا کرتا تھا، اس کے بعد مدرسہ احیاء العلوم میں داخل کیا گیا، اس وقت تیسرا پارہ پڑھ رہا تھا، حافظ علی حسن صاحب مرحوم سے قرآن شریف پڑھ کر ختم کیا جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، مدرسہ جانے سے پہلے ہی اردو پڑھنے کی شدبد پیدا ہوگئی تھی، قرآن شریف ختم کرنے کے بعد اردو کی تعلیم منشی عبدالوحید صاحب لاہر پوری مرحوم سے حاصل کی جنھوں نے مبارک پور میں آباد ہوکر پوری زندگی مدرسہ احیاء العلوم میں مدرسی کی، ریاضی کی تعلیم منشی اخلاق احمد صاحب متوفی ۱۸/ ذی قعدہ ۱۴۰۴ھ سے مدرسہ میں حاصل کی۔

اس زمانہ میں مجھے رنگین کاغذات، نقشہ جات، مختلف قسم کے پیسے اور سکے جمع کرنے کا

شوق ہوا، ماچس کی ڈبیاں بھی جمع کرتا تھا، گھر کے صحن میں مختلف قسم کے پودے اور پھول بویا کرتا تھا، دوسرے کھیلوں کے ساتھ کبوتر بازی کا شوق ہوا تو کئی سال تک یہ مشغلہ جاری رہا جس کی وجہ سے مدرسہ میں ناغہ ہوتا تھا، ایک مرتبہ الدمرحوم نے خوب خوب مارا، اور گھسیٹتے ہوئے مدرسہ لے گئے، اس کے بعد بالکل سیدھا ہوگیا اور باقاعدہ مدرسہ جانے لگا، اسی زمانہ میں اردو کی کتابیں جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور ادھر ادھر سے کتابیں تلاش کرنے لگا ١٣٤٦ھ میں نانا مرحوم کی کتاب ''سبیل الآخرت'' پہلی بار چھپ کر آئی جس کے پڑھنے اور سننے سے والدہ مرحومہ کی طرح مجھ پر بھی موت، قبر اور قیامت کا خوف طاری ہوگیا جس کا اثر اب بھی باقی ہے۔

فارسی کی تعلیم مولانا نعمت اللہ صاحب مبارکپوریؒ متوفی ٢٨/ ربیع الثانی ١٣٦٢ھ سے حاصل کی، اردو عربی کی خوش نویسی بھی ان ہی سے سیکھی، الغرض تقریباً پندرہ سال کی عمر تک کھیل کود کر اردو فارسی کی تعلیم مکمل کی، اس کے بعد عربی تعلیم کا دور آیا۔

صفر ١٣٥٠ھ تا شعبان ١٣٥٩ھ تقریباً دس سال میری عربی تعلیم کا زمانہ ہے جس وقت عربی شروع کی میری عمر چودہ، پندرہ سال کی تھی، جو عنفوان شباب کا زمانہ ہوتا ہے اور اس میں بچپن کی تمام بالقوۃ صلاحیتیں بالفعل ہوجاتی ہیں، اگر اس زمانہ میں ماحول سازگار ہو تو انسان سب کچھ ہوسکتا ہے، ورنہ محرومی ہوتی ہے، مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی استعداد و صلاحیت، احوال وظروف کی ناسازگاری کے باوجود اپنا کام کرتی ہے، میں اپنے کو اسی طبقہ کے خوش نصیبوں میں شمار کرتا ہوں۔

اردو فارسی کی تعلیم تک شہنشاہیت کا دور تھا، والدہ مرحومہ کا ذہن ومزاج خالص دینی وعلمی تھا، گھر میں کفایت شعاری اور سادگی کی وجہ سے بڑی خیر وبرکت کا دور تھا کاروبار بھی اچھا خاصا تھا ١٣٥٢ھ میں جب کہ میں کافیہ وغیرہ پڑھ رہا تھا، والدہ مرحومہ کا انتقال ہوگیا جس کے صدمہ سے میری اٹھتی جوانی خاک میں ملنے لگی، سالوں غم واندوہ کی وادی میں بھٹکتا رہا، معلوم ہوتا تھا کہ والدہ مرحومہ کی یاد میں اپنے کو بھول جاؤں گا، والد مرحوم بہ سلسلہ معاش ومعیشت باہر آنے جانے لگے، تین بھائی اور ایک بہن میں سب سے بڑا میں تھا، تعلیم کے لئے باہر نکلنا مشکل تھا، نیز بعض دوسرے خانگی معاملات پریشان کن تھے، حتیٰ کہ تعلیم بند کردینے کی بات ہونے لگی، مگر میں نے

گھر کے کام کاج کے ساتھ بڑے صبر واستقامت اور شوق ومحنت سے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا، اور مدرسہ احیاء العلوم میں پوری تعلیم حاصل کی، صرف آخری سال دورۂ حدیث کے لئے جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد گیا، درمیان میں ۱۳۴۵ھ میں جامعہ قاسمیہ ''گیا'' گیا تھا، مگر دو ماہ کے بعد واپس چلا آیا تھا۔

میرا تعلیمی ماحول: میری تعلیم کا پورا زمانہ مبارکپور میں گذرا ہے، اس زمانہ میں قصبہ اور سواد قصبہ میں متبحر علماء ومدرسین اور مصنفین موجود تھے اور تقریباً سب ہی حضرات دوسرے مقامات میں علمی و دینی خدمت انجام دیتے تھے، ان میں سے کسی سے نہ استفادہ کی عمر تھی اور نہ موقع تھا۔ البتہ بعد میں ان کے کاموں اور کارناموں کو دیکھ سن کر علمی حوصلہ پیدا ہوا، اور ان سے رہنمائی ملی۔

ان میں مولانا عبدالعلیم صاحب رسول پوریؒ (نانا مرحومؒ کے بڑے بھائی) متوفی ۱۳۴۱ھ صدر المدرسین مدرسہ چشمۂ غازی پور کو دیکھا ہے ان کی صورت ذہن میں باقی ہے، اپنے وقت کے جید عالم، مفتی، مدرس، طبیب اور مصنف تھے۔

مولانا عبدالسلام صاحب مبارکپوریؒ متوفی ۱۳۴۲ھ مصنف سیرۃ البخاری، مدرس دارالحدیث رحمانیہ دہلی کی خدمت میں ایک مرتبہ والد مرحوم کے ساتھ نبض دکھانے گیا تھا۔

شمس العلماء مولانا ظر حسن صاحب فاروقی مبارکپوریؒ متوفی ۱۳۴۷ھ ڈھاکہ میں مدرس تھے اور نانا مرحوم کے خاص دوستوں میں تھے، ان کی زیارت نصیب نہ ہوسکی۔

مولانا عبدالحق صاحب املویؒ متوفی ھ مترجم تلبیس ابلیس مستقل طور سے مدرسہ میاں صاحب دہلی میں رہتے تھے اور وہیں فوت ہوئے، ان کی زیارت بھی نصیب نہ ہوسکی۔

مولانا محمد احمد صاحب لُہراویؒ متوفی ۱۵/شوال ۱۳۶۸ھ اس زمانہ میں علماء کی ایک جماعت لے کر ''تحفۃ الاحوذی'' کی تبییض کرنے میں لگے رہتے تھے، ان کی خدمت میں بہ سلسلہ علاج آتا جاتا تھا، کبھی کبھی یوں ہی چلا جاتا تھا، ایک مرتبہ مولانا نے پوچھا کون کون کتابیں پڑھتے ہو، میں نے کتابوں کا نام بتایا تو فرمایا منطق میں بہت پیچھے ہو، اس میں محنت کرو، ان کی علمی مشغولیت اور تصنیفی انہماک دیکھ کر لکھنے پڑھنے کا حوصلہ ملا۔ ان کی زبان سے پہلی بار عربی کا مقولہ سنا تھا، **من ساویٰ یوماہ فھو فی الخسران** ''یعنی جس انسان کے دونوں دن برابر ہوں وہ

نقصان میں ہے، ہر اگلا دن پچھلے سے بڑھا ہونا چاہئے، یہ جملہ آج تک کام دے رہا ہے۔

مولانا محمد شریف صاحب مصطفی آبادیؒ متوفی ۲/ ذوالحجہ ۱۳۷۲ھ مصنف ''الافاضۃ القدسیۃ فی المباحث الحکمیۃ''، ''نسیم الکلام فی تائید شریعۃ خیر الانام'' وغیرہ منطق، فلسفہ اور علم کلام کے بے مثال عالم و فاضل تھے۔ استاذ الاستاذ بھی تھے، اس زمانہ میں اکثر وطن ہی میں رہتے تھے، نانا مرحوم کے مخلص احباب میں تھے، ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا وہ کبھی کبھی ہمارے گھر بھی آیا کرتے تھے۔ ان کی مجلس خالص علمی ہوتی تھی۔

میرے نانا مولانا احمد حسین صاحب رسولپوریؒ متوفی ۲۶/ رجب ۱۳۵۹ھ متبحر عالم، مدرس ومصنف اور طبیب حاذق، عربی کے ادیب اور صاحب دیوان شاعر تھے، ڈھاکہ میں پڑھاتے تھے، تعطیلات میں گھر آتے تو رات دن کتب بینی، تصنیف و تالیف اور دوا سازی اور کام کاج میں مصروف رہتے، آخر میں چند سال گھر ہی پر رہے، اس زمانے میں مجھے ان کے علمی مشاغل کے دیکھنے کا زیادہ موقع ملا، اور میرے ذوق کو بہت کچھ روشنی ملی، جو میرے گھر ہی کی چیز تھی، ان کے وصال کے وقت میں مرادآباد میں آخری تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

میرے ماموں مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ متوفی ۱۱/ صفر ۱۳۸۷ھ نہایت ذہین وطباع اور جامع العلوم عالم تھے۔ ان کی ذات سے مجھے بے حد فائدہ پہونچا اور انہوں نے میرے علمی ذوق کو بڑی جلا بخشی، میرا علمی سرمایہ ننہال کی دین ہے اور وہیں سے میں نے یہ دولت پائی ہے۔

مولانا حکیم محمد صابر صاحب متوفی ۸/ رجب ۱۳۹۹ھ کے خاندان اور میرے ننہال کے درمیان علمی رشتہ بہت پہلے سے تھا، میں ابتدائے طالب علمی ہی سے ان کے یہاں آتا جاتا تھا، انہوں نے مجھے ''وفیات الاعیان لابن خلکان'' کے مطالعہ کا مشورہ دیا، اور اس کی اہمیت وافادیت سے واقف کیا اور اس کتاب سے میں نے خوب خوب استفادہ کیا، اسی زمانہ میں ان کے یہاں سے کئی کتابیں لا کر پڑھیں جس سے عربی شعر وادب کی مزاج شناسی کا ذوق پیدا ہوا۔

ملا رحمت علی اسمٰعیل مبارکپوریؒ متوفی ۱۹۴۴ء بوہرہ فرقہ کے بڑے عالم و فاضل تھے، زندگی کا بیشتر حصہ بمبئی میں گذارا تھا، ملا سیف الدین طاہر سے اختلافات و بغاوت کے بعد ایک جماعت لیکر ان سے مقدمہ بازی کی جو ۱۹۱۷ء غلہ کیس کے نام سے مشہور ہے، ناکامی کے بعد

مبارک پور بازار میں بساطے کی دوکان کرلی تھی۔عربی کے زبردست ادیب وشاعر اور کئی مذہبی کتابوں کے مصنف تھے،مصر،شام،ایران،حجاز وغیرہ کا متعدد بار سفر کر چکے تھے،میں ان کی دکان پر بیٹھا کرتا تھا،ان کی باتیں علمی اور مذہبی ہوتی تھیں،وہ مجھے اپنی مذہبی قلمی کتابیں مطالعہ کے لئے دیا کرتے تھے،میں نے اسی زمانہ میں مشہور فلسفی شاعر ابوالعلاء معری کے''رسالۃ الغفران'' کا مطالعہ ان ہی سے لے کر کیا تھا،انہوں نے مجھے جامع ازہر میں داخل کرانے کا وعدہ کیا تھا،مگر وہ خود قاہرہ جا سکے،نہ مجھے جامع ازہر میں داخل کرا سکے،ان کی صحبت سے عربی ادب میں رہنمائی ملی اور بوہرہ فرقہ کی باطنی تعلیمات کا علم ہوا۔

اس زمانہ میں دارالمصنفین اعظم گڈھ میں کئی مشہور اہل علم تصنیف وتالیف اور تحقیقی کاموں میں مشغول تھے،مولانا مسعود علی صاحب کی وجہ سے دارالمصنفین ضلع کی سیاسیات کا مرکز بھی تھا، میں کبھی کبھی ساتھیوں کے ہمراہ وہاں جاتا تھا،مولانا سید سلیمان ندویؒ ادھر ادھر آتے جاتے ہم لوگوں کو دیکھ کر رک جاتے اور خیریت دریافت کرتے،بعض اوقات وہ خود بھی مدرسہ احیاء العلوم میں آیا کرتے تھے،مگر ان سے یا دارالمصنفین کے کسی عالم سے استفادہ نہیں ہوسکا،ویسے بھی دارالمصنفین دوسروں کے حق میں شجر ممنوعہ ہے۔البتہ وہاں کی تصنیفات اور رسالہ''معارف'' سے بہت فائدہ ہوا اور ان سے میرے تصنیفی ذوق کو مدد ملی۔

مدرسہ کا ماحول اور اساتذہ:۔ یہ تھا میرا محدود علمی ماحول جس میں میں نے طالب علمی کے دس سال گزار کر وطن کے علماء ومدرسین سے تعلیم حاصل کی،اور خانگی ومعاشی الجھن کی وجہ سے باہر نہ جا سکا۔اس زمانہ میں مبارک پور شیعہ،سنی اور دیوبندی،بریلوی جھگڑے کا اکھاڑا بنا ہوا تھا،ہر فرقہ کے پہلوان لنگوٹ کس کر میدان میں زور آزمائی کررہے تھے اور یہاں کے عوام اپنے اپنے علماء کو باہر سے بلا کر اپنے مخالف کو کافر وبددین بنا رہے تھے،مہینوں مہینوں جانبین سے سوال وجواب کی تقریریں ہوتی تھیں،مناظرے اور مباحثے ہوتے تھے،پھر مار پیٹ اور مقدمہ بازی کی نوبت آتی تھی،عوام وخواص اس میں وقت،صلاحیت اور دولت خرچ کرنے کو عین دین اور کار ثواب سمجھتے تھے،گروہی عصبیت اور جماعتی جانبداری کی وجہ سے انفرادی اور شخصی باتیں پارٹی کا مسئلہ بن جاتی تھیں،دیوبندی جماعت کی سرگرمیوں کا مرکز مدرسہ احیاء العلوم تھا،اس کے علاوہ آئے دن

جمعیۃ العلماء اور کانگریس کے جلسے، تحریکیں اور دوسری ملکی و سیاسی اور مذہبی سرگرمیاں اور ہنگامی حالات، جذباتی اور ہیجانی کیفیت پیدا کرتے تھے اور ہم طلبہ ان سب میں شریک رہا کرتے تھے۔ اس خلفشار و انتشار کے دور میں تعلیم و تعلم کا کام بظاہر بہت مشکل معلوم ہوتا تھا اور پڑھنے پڑھانے کے لئے جن پرسکون اور اطمینان بخش حالات کی ضرورت ہوتی ہے وہ مفقود تھے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ یہی دور مدرسہ احیاء العلوم کا زرّیں عہد ہے۔ مدرسہ میں اس سے پہلے نہ ایسی رونق و برکت تھی اور نہ بعد میں آئی، یہاں کی تعلیم و تربیت کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا، اس دور کا ہر طالب علم آگے بڑھنے کی کوشش کرکے اپنے آپ کو کچھ نہ کچھ بنانا چاہتا تھا۔ یہ سب قصبہ کے ان اساتذہ کے خلوص و ایثار کا فیض تھا جو دس بارہ روپئے سے بیس روپئے تک کے قلیل مشاہرہ پر صبر و قناعت کرکے اور حساب کم و بیش سے یکسو ہو کر رات دن پڑھنے پڑھانے میں مصروف رہا کرتے تھے۔ ایک دن میں دس دس بارہ بارہ اسباق پڑھاتے تھے، مدرسہ کے خارج اوقات میں طلبہ کو اپنے گھروں پر بلا کر عمدہ تعلیم اور بہترین تربیت دیتے تھے، خود محنت کرکے طلبہ سے محنت کراتے تھے، وہ حریص تھے کہ ان کے شاگردوں کو علم آجائے، استادی شاگردی کے تعلقات بالکل عزیزانہ نوعیت کے تھے۔

مدرسہ احیاء العلوم کے عربی اساتذہ میں مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب مبارکپوریؒ متوفی ۲۲ محرم ۱۴۰۴ھ میرے سب سے پہلے استاذ ہیں اکثر و بیشتر کتابیں انہیں سے پڑھی ہیں، ان کی سادگی، نیک نفسی، خلوص اور شفقت سے مجھے بہت فیض پہونچا ہے، منطق و فلسفہ کی زیادہ تعلیم مولانا شکر اللہ صاحب مبارکپوریؒ متوفی ۵ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ سے حاصل کی، میں ان کا آخری شاگرد ہوں جسے نہایت ذوق و شوق سے پڑھایا، میری ہمت افزائی اور ذہنی تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ مولانا بشیر احمد صاحب مبارکپوریؒ متوفی ۳ شوال ۱۴۰۴ھ سے منطق کی بعض کتابیں پڑھی ہیں، مولانا محمد عمر صاحب مظاہری مبارکپوری سے تفسیر جلالین وغیرہ پڑھی ہے۔ ماموں مولانا محمد یحیٰی صاحب رسولپوریؒ متوفی ۱۱ صفر ۱۳۸۷ھ سے عروض و قوافی اور ہیئت کے بعض اسباق پڑھے ہیں، میری تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہے، میرے مطالعہ کے لئے عربی کی نادر نادر کتابیں مہیا کرتے تھے، ان کے علاوہ میرے اساتذہ کرام میں کوئی ادیب، شاعر، مصنف

اور مضمون نگار نہیں تھا، مگر میں ان ہی سے تعلیم حاصل کر کے سب کچھ ہوا، یہ ان کے خلوص اور میری ذاتی کوشش کا نتیجہ ہے۔ جامعہ قاسمیہ مراد آباد کے اساتذہ وشیوخ میں مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ متوفی ۱۳۹۲ھ سے صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ اور سنن ابی داؤد، اور مولانا سید محمد میاں صاحب متوفی ۱۶ر شوال ۱۳۹۵ھ سے سنن ترمذی اور مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلیؒ متوفی ۱۳۹۵ھ سے صحیح مسلم پڑھی، درمیان میں ایک مرتبہ دو ماہ تک جامعہ قاسمیہ میں رہ کر مولانا سید محمد میاں صاحب سے دیوان حماسہ کا پہلا باب اور مقامات زمخشری پڑھی، مولانا عربی زبان کے ادیب، اردو کے مصنف اور خالص دینی وعلمی زماج کے آدمی تھے، ان کے خلوص ومحبت اور ہمت افزائی سے مجھے بہت فیض پہونچا ہے۔

اسی زمانہ میں مدرسہ احیاء العلوم میں طلبہ کی فکری وذہنی تربیت اور وسعت معلومات کے لئے جمعیۃ الطلبہ کا قیام ہوا، اس کے لئے عظیم الشان کتب خانہ قائم ہوا جس میں ہر علم وفن خصوصاً تاریخ وادب کی ہزاروں مستند ومعتبر کتابیں جمع کی گئیں اور بہت سے علمی ادبی، مذہبی اور سیاسی اخبار ورسائل جاری کرائے گئے جن سے طلبہ استفادہ کرتے تھے، اس دور کی تقریباً ہر کتاب میری پڑھی ہوئی ہے ہر جمعرات کو طلبہ سے تقریر کرائی جاتی تھی، جمعیۃ الطلبہ کی طرف سے "الاحیاء" نام کا قلمی رسالہ جاری کیا گیا جس کی ادارت میرے ذمہ تھی۔ مدرسہ کے ناظم اور روح رواں مولانا شکر اللہ صاحب اپنے عزیز طلبہ کی تعلیم وتربیت پر کڑی نظر رکھتے تھے، ان کے اندر عزت نفس، خود اعتمادی، بلندئ کردار ورٹھوس علمی استعداد کا جوہر دیکھنا چاہتے تھے وہ اپنے طلبہ کو علم کے ہر میدان میں آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔

میرے محدود وسائل اور مخصوص حالات قرب وجوار کے بڑے مدرسوں میں جانے کے حق میں بالکل نہیں تھے، بڑی مشکل سے ایک سال باہر رہنا نصیب ہوا اس کے باوجود حوصلہ کی بلندی اور تحصیل علم کی دھن کا یہ حال تھا کہ جامع ازہر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سودا ہر وقت سر میں سمایا رہتا تھا بلکہ بعد میں بھی یہ آرزو باقی رہی مگر میں نے اپنے ذوق وشوق کی بدولت ناکامی کو کامیابی سے یوں بدل دیا کہ اپنے گھر اور مدرسہ کو جامع ازہر، جامع زیتون، جامع قرطبہ، مدرسہ نظامیہ مدرسہ مستنصریہ بنالیا، اور وطن میں ہی رہ کر خدا کے فضل وکرم، اساتذہ کی شفقت ومحبت اور

اپنی محنت وعزیمت سے بہت کچھ حاصل کیا، اس دور میں مجھ پر عجیب سرمستی اور شوریدگی چھائی رہتی تھی، ہر وقت بغداد و بخارا، اندلس وغرناطہ، اور عالم اسلام کی قدیم مشہور درسگاہیں اور ان کے اساتذہ وتلامذہ کے مناظر سامنے رہتے تھے اور میں ان کے حسنات و برکات سے مستفیض ہوتا رہتا تھا۔

طالب علم میں محنت اور کوشش کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ اور ذوق وشوق ہو تو چھوٹی جگہ رہ کر بڑا ہو سکتا ہے، اور اگر یہ باتیں نہ ہوں تو بڑی جگہ رہ کر چھوٹا ہی رہے گا، مجھے کسی بڑے علمی وتحقیقی اور تربیتی ادارہ کی ہوا تک نہیں لگی نہ کسی بڑی شخصیت کی رہنمائی حاصل ہو سکی ساتھ ہی میرے ذاتی اور خانگی حالات بھی سازگار نہیں تھے، اس کے باوجود میں مطمئن اور خوش ہوں کہ اپنے ذوق وشوق، محنت وحوصلہ اور خودسازی کے بل پر وہ سب کچھ حاصل کیا جو بڑے اداروں اور بڑی شخصیتوں کی سرپرستی میں رہ کر حاصل کیا جاتا ہے، ہو سکتا ہے جیسا کہ ہوتا بھی ہے کہ مجھے کسی بڑی شخصیت یا ادارہ کے سایہ میں جگہ ملتی تو میرا علمی پودا قوت نمو سے محروم ہو جاتا اور کھلی آب وہوا میں اسے آزادانہ پھلنے پھولنے اور بارور ہونے کا موقع میسر نہ آتا۔

اس میں شک نہیں کہ درس نظامیہ میں بہت کچھ کتر بیونت کے باوجود اب بھی وہ بہت مفید اور کارآمد ہے، کئی مدارس نے اپنے یہاں نئے نصاب جاری کئے مگر نتیجہ کے طور پر ان سے ایسے علماء پیدا نہیں ہوئے جو درس نظامہ کے فضلاء کی صف میں بیٹھ کر ٹھوس تعلیمی وتصنیفی خدمات انجام دے سکیں اور دینی علوم وفنون میں مستند فکر اور معتبر نظر رکھتے ہوں، حالات اور تقاضے کے مطابق نصاب میں تغیر وتبدل ہونا چاہئے، مگر طلبہ میں پختہ علمی استعداد وصلاحیت اور اعتقاد وعمل میں صلابت کا خیال مقدم ہونا چاہیئے، کیونکہ دینی مدارس کے وجود کا مقصد یہی ہے، اسی نام سے وہ جاری ہیں، اور یہی ان کا اصل کام ہے، میں نے مجموعی طور سے اسی درس نظامیہ کو پڑھا ہے اور مجھے جو کچھ ملا ہے اسی سے ملا ہے۔

قوت مطالعہ کی برکت:۔ ابتداء میں عربی تعلیم مجھے سخت اور مشکل معلوم ہوتی تھی، مدرسہ سے اکثر غائب رہا کرتا تھا اس میں اپنی کچھ بے پرواہی اور سمجھ کا قصور اور کچھ طریقہ تعلیم کا قصور تھا۔ نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ کئی ماہ تک مدرسہ نہیں کیا، حالانکہ بچپن ہی سے عربی زبان سے

یوں مناسبت پیدا ہوگئی تھی کہ روزانہ صبح کو مترجم قرآن شریف کی تلاوت کرتا تھا اور ترجمہ کی روشنی میں عربی کے اردو معنیٰ پر غور کرتا تھا، میزان، منشعب، علم الصیغہ اور نحو میر پڑھنے کے بعد جمعہ کا خطبہ سمجھنے لگا تھا، نحوی اور صرفی قواعد کی خوب مشق کی، بعد میں کبھی کبھی علم الصیغہ اور نحو میر پڑھ لیا کرتا تھا، نیز فصول اکبری کی خاصیت ابواب خوب یاد کر لی تھی۔ ان کتابوں کے قواعد و مسائل آج بھی تقریباً اسی یاد ہیں اور کام آتے ہیں، بعد میں جب مقامات حریری بحاشیہ مولانا محمد ادریس صاحبؒ کے دس مقامات ان کے پورے حقوق کے ساتھ پڑھے تو عربی زبان و ادب کا صحیح ذوق پیدا ہوا، اس کے متعلقات و مبادی، مثلاً لغت، اشتقاق، ابواب، صلات، نحو، صرف، خاصیات وغیرہ کے بارے میں نظر پیدا ہوئی جس سے درسی اور غیر درسی کتابیں سمجھ میں آنے لگیں اور خود اعتمادی نے ہمت و حوصلہ کو قوت دی۔ ہمارے اساتذہ بغیر مطالعہ کے سبق نہیں پڑھاتے تھے، طلبہ کے لئے ضروری تھا کہ کل کے سبق کا مطالعہ رات میں کر کے خود معانی و مطالب حل کرنے کی کوشش کریں وہ خود بھی رات کو مطالعہ کرتے تھے، چنانچہ رات میں تمام درسی کتابوں کا مطالعہ جو عموماً چار ہوا کرتی تھیں، جم کر کیا کرتا تھا، جہاں کام نہیں چلتا تھا استاذ پر چھوڑ دیتا تھا، اس طرح جب قوت مطالعہ پیدا ہوگئی تو یوں آنکھ کھل گئی کہ ایک ہی سال میں منیۃ المصلی، نور الایضاح، قدوری، کنز الدقائق اور شرح وقایہ پڑھ لی، شرح وقایہ کا سبق ایک ایک دن میں چھ چھ صفحات تک پڑھ لیتا تھا، ان ہی ایام میں تاریخ الخلفاء شروع کی مگر چند اسباق پڑھ کر چھوڑ دی کیوں کہ وہ کتاب درس کی نہیں بلکہ مطالعہ کی تھی، ایسا بھی ہوتا تھا میں کتاب کی عبارت پڑھ کر کہہ دیتا کہ میں سمجھ گیا اور استاذ آگے پڑھانے لگتے تھے، یہ سب قوت مطالعہ کی برکت تھی جو نحوی و صرفی قواعد کے حفظ و اجراء اور عربی ادب میں محنت کے نتیجہ میں پیدا ہوگئی تھی،۔ جس کے لئے میں نے ابتداء میں خوب محنت کی تھی، اس کے باوجود میں نے اپنے اساتذہ کے بارے میں کبھی گستاخانہ رائے قائم نہیں کی، اور نہ ان کے علم پر حرف گیری، اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو اسی زمانہ میں اس کی سزا مل جاتی اور ان کے طفیل مجھے یہ علمی فیض نہ پہونچتا۔

نیز زمانہ طالب علمی میں مدرسہ میں دو ایک درسی کتاب پڑھاتا تھا، اور طلبہ نہایت ذوق وشوق سے پڑھتے تھے جن میں کئی ہمعصر تھے، بعض اوقات میں پڑھانا نہیں چاہتا تھا تو مجھے

زبردستی پڑھانے پر مجبور کرتے تھے اس میں بعض مرتبہ مار پیٹ کی نوبت آجاتی تھی اس طرح طالب علمی کے ساتھ مدرسی کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، جس سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ عربی کی کوئی غیر درسی کتاب ہر وقت لئے رہتا تھا سبق اور تکرار کے بعد اس کے مطالعہ میں لگ جاتا تھا، ہمارے مدارس عربیہ کا یہ تغیر کتنا عجیب اور علمی انحطاط کی یہ روکتنی اندوہناک ہے کہ اب سے چالیس پینتالیس سال پہلے ہم جیسے طالب علم اپنے شفیق اساتذہ کی نگاہ میں نالائق اور بداستعداد تھے، وہ کہتے تھے کہ تم لوگوں کو کچھ نہیں آتا، اہل علم کی مجلس میں بیٹھنے کے لائق نہیں ہو، مدرسہ میں آکر وقت اور عمر ضائع کرتے ہو، اور ہم ان سے بعض اوقات طالب علمانہ انداز میں دبی زبان سے کہہ دیا کرتے تھے کہ آپ ہمارے بعد ہم کو یاد کریں گے، چنانچہ بالکل یہی ہو رہا ہے۔ قوت مطالعہ پیدا ہو جانے کی وجہ سے پڑھنے میں بڑا انشراح وانبساط پیدا ہو گیا اور غیر درسی کتابوں کے مطالعہ کا شوق جنون ودیوانگی کی حد تک بڑھ گیا، درسی کتابوں میں بس اتنی محنت کرتا تھا کہ امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہو جاؤں، ممتاز یا اول آنے کی کوشش کبھی نہیں کی، مگر اکثر اول ہی آیا، بعض مرتبہ ممتاز بھی رہا، اس کے مقابلہ میں غیر درسی کتابوں سے شغف بہت رکھتا تھا، چلتے پھرتے کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں ضرور رہا کرتی تھی، حتیٰ کہ کھانا کھاتے وقت بھی کتاب دیکھتا تھا، راتوں کو درسی کتابوں کے مطالعہ کے بعد غیر درسی کتابوں کا مطالعہ کئی کئی گھنٹے تک کیا کرتا تھا، گرمی کی رات میں لالٹین کے سامنے کتاب لئے پڑا رہتا تھا۔ بسا اوقات زبردستی اٹھایا جاتا تھا حالانکہ بچپن سے نگاہ کمزور تھی، عربی شروع کرنے کے بعد عینک کا استعمال شروع کر دیا تھا بعض اساتذہ از راہ شفقت کہتے تھے کہ اس قدر زیادہ نہ پڑھو ورنہ اندھے ہو جاؤ گے تو میں عرض کرتا کہ اگر ایسا ہو تو خود ہی یہ کام بند ہو جائے گا، کثرت مطالعہ اور کتب بینی سے بعض اوقات آنکھ میں سوزش پیدا ہو جاتی تھی، دانے نکل آتے تھے اور چکر آنے لگتا تھا جس کی وجہ سے دیر تک آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا،

میں فقہ کے درس میں اکثر امام شافعیؒ کی حمایت کرتا تھا، اور استاذ مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے اکثر سوچتا تھا کہ متاخرین ائمہ احناف خصوصاً علماء ماوراء النہر کی کتابیں کیوں نہیں پڑھائی جاتی ہیں۔ قدماء کی امہات کتب کہاں ملیں گی جن میں فقہ حنفی کی صاف ستھری روح

موجود ہے اور فروعات کا استخراج احادیث وآثار سے کیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ بعد میں احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد سے شائع ہونے والی ائمہ احناف کی نادر ونایاب کتابوں سے بے حد شغف رہا، ان سب کو جمع کیا اور دل کھول کران پر تبصرہ وتعارف لکھا۔ مولانا ابوالوفاء افغانیؒ متوفی ١٣/رجب ١٣٩٥ھ صدر لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد متصلب حنفی تھے جنھوں نے یہ کتابیں تلاش کر کے اپنے تعلیق وتحشیہ کے ساتھ شائع کیں، بعد میں انہوں نے ایک مرتبہ میرے سامنے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ علماء ماوراء النہر کی ان کتابوں کو جلادوں ان ہی کے رواج کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ، امام ابویوسف اور دیگر ائمہ احناف رحمہم اللہ کی کتابیں ناپید اور ضائع ہوگئیں اور لوگوں نے ان سے صرف نظر کر کے متاخرین کی کتابوں کو فقہ حنفی کا ماخذ ومدار بنالیا۔ احیاء المعارف النعمانیہ کی کتابوں اور حجۃ اللہ البالغہ کے مطالعہ سے مجھے فقہی مسائل کو احادیث وآثار کی روشنی میں سمجھنے کا ذوق پیدا ہوا۔

اسی طرح اکثر خیال آتا تھا کہ قرآن وحدیث جو دین کی بنیاد ہیں ان کو درس نظامیہ میں تیسرا درجہ دیا گیا ہے اور ان کو دوراور عبور کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ اس خیال کی بناء پر اسی زمانہ میں مشکوٰۃ، تفسیر جلالین اور تفسیر ابن کثیر خرید کر پڑھتا تھا، ساتھ ہی مؤطا امام مالک اور مؤطا امام محمد کا مطالعہ کرتا تھا۔

ذہن ساز کتابیں جن کا میں نے مطالعہ کیا:۔ ابتداء مسدس حالی اور علمائے سلف پھر فہرست ابن ندیم اور وفیات الاعیان سے اسلاف کے علمی کارناموں سے واقفیت ہوئی اور ان کے احوال وسوانح سے ان کی تقلید وتتبع کا شوق پیدا ہوا، اسی زمانہ میں ماموں مرحوم مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ فراغت کے بعد دارالمبلغین لکھنؤ گئے جو نیا نیا قائم ہوا تھا، وہ میرے لئے مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ کی کتابیں روانہ کرتے یا لاتے تھے، اور میں ان کو نہایت ذوق وشوق سے پڑھتا تھا، نیز ردشیعہ کے سلسلہ کی دوسری کتابیں ان ہی سے حاصل ہوئیں۔ اور میرے پاس ان کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا، اس کے بعد وہ مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں مدرس ہوئے تو وہاں کے کتب خانہ سے میرے لئے کتابیں لاتے تھے اور پھر واپس لے جاتے تھے، ان کے ذریعہ جن کتابوں کے مطالعہ سے مستفیض ہوا ان میں سے یہ چند نام یاد رہ گئے ہیں:

الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ابن عبدالبر، دلائل النبوۃ اصفہانی ،سبحۃ المرجان فی آثار الہندوستان غلام علی آزاد بلگرامی ، آکام المرجان فی احکام الجان ابوبکر شبلی بغدادی ، حیاۃ الحیوان دمیری ، الصواعق المحرقۃ ابن حجر مکی ، العمدہ فی الشعر ونقدہ ابن رشیق قیروانی ، المحاسن والاضداد جاحظ ،الشعر والشعراء ابن قتیبہ ،المیزان الکبریٰ شعرانی وغیرہ۔

مولانا حکیم صابر خاں صاحبؒ کے یہاں سے یہ کتابیں لاکر پڑھیں ، فقہ اللغہ ثعالبی ، امثال العرب ضبی ،نقد الشعر ابن قدامہ، کتاب الصناعتین عسکری۔

مدرسہ احیاء العلوم کے کتب خانہ سے یہ کتابیں پڑھیں ، سیرت ابن ہشام ، وفاء الوفاء للسمہودی ، المستطرف ، دیوان فرزدق ، نیز مختلف طریقوں سے ان کتابوں کے مطالعہ سے فائدہ اٹھایا ، وفیات الاعیان ابن خلکان ، کتاب الملل والنحل شہرستانی ، العقد الفرید ابن عبدربہ ، رسالۃ الغفران ابوالعلاء معری ،تہذیب التہذیب ،توالی التاسیس وغیرہ۔

یہ ان کتابوں کے علاوہ ہیں جن کو میں خریدتا تھا اور رات دن ان کے مطالعہ میں مشغول رہتا تھا ، ان کی فہرست آگے آرہی ہے ۔اسی طرح جمعیۃ الطلبہ کی لائبریری کی تقریباً تمام کتابیں کلی یا جزوی طور پر میرے مطالعہ میں رہ چکی ہیں اور میں نے ان سے استفادہ کیا ہے ۔جس دن کوئی نئی کتاب ہاتھ آجاتی ، سب کچھ چھوڑ کر اسی کے مطالعہ میں غرق رہتا تھا ، ان کتابوں کے پڑھنے کے ساتھ ان کے منتخبات جمع کرتا ، مضامین لکھتا تھا ، حالانکہ اس وقت تک ان کتابوں کو پوری طرح سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی بلکہ بہت سی کتابیں میری استعداد سے کہیں زیادہ بلند تھیں اور ان کو بہت کم سمجھ سکتا تھا جو کچھ اور جتنا سمجھ لیتا تھا اس سے میرے علمی حوصلہ میں بڑی توانائی آجاتی تھی ،اور مزید مطالعہ کا شوق پیدا ہوتا تھا۔

اس زمانہ میں ہر منگل کو بازار میں عیسائی مشنری سے تقریری اور تحریری مباحثہ کرتا تھا اور اس سلسلہ میں تورات ،انجیل اور ردنصاریٰ کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا۔

کثرت مطالعہ اور کتب بینی کی وجہ سے میری معلومات میں بہت اضافہ ہوا اس لئے تقریر وخطابت میں بھی مدرسہ کے طلبہ میں نمایاں حیثیت حاصل تھی ،اور قصبہ کے اندر باہر جلسوں میں اساتذہ سے پہلے تقریر کرتا تھا۔

ابتداء ہی سے شعروشاعری کا ذوق پیدا ہوا تو اپنے طور پر اچھی خاصی شاعری کرنے لگا اور میرے اشعار مذہبی، سیاسی اور علمی جلسوں میں پڑھے جانے لگے بلکہ چھپنے لگے، اسی کے ساتھ مضمون نگاری بھی اپنے طور پر کرنے لگا اور میرے مضامین اخباروں اور رسالوں میں چھپنے لگے۔

الغرض میں نے کثرت مطالعہ، علمی استعداد، مضمون نگاری، تصنیفی ذوق، شعروشاعری، بحث و مناظرہ، تقریر و خطابت میں شہرت کی حد تک کامیابی حاصل کرلی۔صلاحیتوں کے دروازے کھل گئے، جولانیٔ طبع اور علمی انبساط ونشاط ہر میدان میں رواں دواں معلوم ہونے لگا اور خوداعتمادی کے ساتھ منزل مقصود تک پہونچا۔میرے اساتذہ ان باتوں کی وجہ سے بہت خوش رہا کرتے تھے اور میری ہمت افزائی فرماتے تھے۔واقعہ یہ ہے کہ میری یہ تمام صلاحیتیں ان ہی کے خلوص ومحبت اور مربیانہ تعلیم وتربیت کا نتیجہ تھیں، وہ خود محنت کرکے اپنے شاگردوں سے محنت لیتے تھے، اور حساب کم وبیش سے یکسو ہوکر اس حرص میں گھلے جاتے تھے کہ ان کے شاگردوں کو علم آجائے۔

مطبوعات کی خریداری اور مخطوطات کی فراہمی:۔اردو کی تعلیم کے زمانہ ہی سے مجھے کتابیں جمع کرنے کا شوق پیدا ہوگیا تھا، ساتھیوں سے کتابیں مانگتا اور خود بھی خریدتا تھا، مقامات مقدسہ کے نقشے، مختلف قسم کے نقشے جو اس چھوٹے سے قصبہ میں کہیں سے مل گئے جمع کیا اور ان سب کو لکڑی کی ایک چھوٹی سی صندوق میں جسے والدہ مرحومہ رسول پور سے لائی تھیں بحفاظت رکھتا تھا، اور ہر دوسرے تیسرے دن ان کو نئی ترتیب اور قرینے سے سجاتا تھا، یہ میرا پہلا کتب خانہ یا اسلامی عجائب خانہ تھا۔عربی شروع کرنے کے بعد کتابی ذوق میں اضافہ ہوا، درسی کتابیں نانا مرحوم کے کتب خانہ سے لاتا تھا جسے دیکھ کر مجھے کتابیں جمع کرنے کا شوق ہوا تھا اور میزان ومنشعب، علم الصیغہ، کافیہ، مرقاۃ، کفایۃ المحتفظ، کنزالدقائق، دیوان متنبّی، مقامات حریری، وغیرہ خریدی اور اردو کتابوں میں تواریخ حبیب الہٰ، الکلام المبین، حدائق البیان، الفاروق وغیرہ منگائیں، رسالہ ''مولوی'' دہلی سے ایک روپیہ سالانہ چندہ میں مستقل طور سے آتا تھا اس کی جلدیں بناکر رکھتا تھا۔

جب عربی زبان میں کچھ استعداد پیدا ہوئی اور عربی کی غیر درسی کتابوں کے مطالعہ کا شوق

ہوا تو ادھر ادھر سے کتابیں تلاش کر کے پڑھنے لگا، اسی زمانہ میں ماموں مرحوم مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ نے میرے پتہ پر اپنے لئے عبدالصمد واولادہ تجار الکتب سید واڑہ سورت سے مصری کتابوں کی فہرست اور کتب خانہ رشیدیہ دہلی کی فہرست منگائی اس کے بعد میں نے بھی اپنے لئے ان دونوں فہرستوں کو منگایا، کچھ دنوں کے بعد ابنائے مولوی محمد بن غلام رسول السورتی، تجار الکتب بمبئی اور المکتبۃ العربیۃ الکبریٰ بمبئی کی فہرستیں بھی منگالیں۔ کتب خانہ رشیدیہ کے علاوہ سب فہرستیں عربی زبان میں مصر کی چھپی ہوئی تھیں۔ ان میں سے بعض میرے کتب خانہ میں اب بھی محفوظ ہیں، ان میں فن وار کتابوں کے نام، مصنف کے نام، مصنف کے نام ونسب، سنہ وفات، کتابوں کے اجزاء اور قیمت کی تفصیل ہوتی تھی، بعض کتابوں کا تفصیلی تعارف بھی ہوتا تھا، اس طور سے یہ فہرستیں بجائے خود عربی مطبوعات اور ان کے مصنفین کا دائرۃ المعارف معلوم ہوتی تھیں، ان فہرستوں سے مجھے علمائے اسلاف کے تصنیفی کارناموں اور مصر وشام وغیرہ کی مطبوعات کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل ہوئیں اور میرے علمی ذوق کو رہنمائی ملی، ان کو بار بار پڑھتا اور دیکھتا تھا، پھر اپنے ذوق اور وسعت کے مطابق منتخب کرتا تھا، جی چاہتا تھا کہ کل کتابیں خرید لوں مگر سوال پیسے کا تھا، گھر کی اقتصادی حالت کتابیں خریدنے کی بالکل اجازت نہیں دیتی تھی اس لئے میں نے جلد سازی شروع کر دی۔ اور اس کا جملہ سامان مہیا کر کے ہر قسم کی جلدیں بنانے لگا، سامان اعظم گڑھ سے لاتا تھا، صبح کو کچے راستے سے پیدل جاتا اور ظہر تک سامان خرید کر آجاتا، آتے جاتے بارہ میل کی مسافت چند گھنٹوں میں طے ہو جاتی تھی، جلد سازی کی آمدنی کتابوں کی خریداری کے لئے محفوظ رکھتا تھا۔ دوسری ترکیب یہ نکالی کہ کتب خانہ رشیدیہ سے تاجرانہ نرخ پر کتابیں منگانے لگا، عام کتابوں پر روپیہ میں چار آنے، مصری کتابوں پر دو آنے اور قرآن شریف اور پاروں پر زیادہ کمیشن ملتا تھا۔ مدرسہ کے طلبہ اور قصبہ کے لوگوں کی فرمائش پر قرآن شریف اور کتابیں منگا کر فہرست کے دام پر دیا کرتا تھا محصول وغیرہ کے بعد کمیشن کی جو رقم بچ جاتی اسے بحفاظت رکھ دیتا اور جب کتابیں منگاتا تو کتاب کی قیمت اور اپنی رقم کا اندازہ کر کے اپنے ذوق کی کوئی کتاب منگا لیتا تھا، ہر مہینہ میں دو تین پارسل ڈاک یا ریل سے آتے تھے جن میں میری بھی کوئی کتاب ہوتی تھی، ایسا بھی ہوتا تھا کہ مطلوبہ کتاب کی رقم جمع نہ ہونے کی وجہ سے کئی کئی

مہینہ تک میری کوئی کتاب نہیں آتی تھی۔اس طرح طالب علمی کے دس سالہ دور میں عربی کی نادرو نایاب امہات الکتب اور مصروشام اور بیروت وغیرہ کی مطبوعات کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا تھا، ان کتابوں کے بارے میں انتظار اور بے تابی کا یہ حال تھا کہ جس دن کتاب آنے والی ہوتی رات ہی کو خواب میں معلوم ہوتا تھا اور ڈاک خانہ یا اسٹیشن جا کر خود پارسل چھڑا کر لاتا تھا۔ یہ دن میرے لئے روز عید ہوتا تھا، کئی دنوں تک ہر وقت کتاب ہاتھ میں لئے پڑھتا اور الٹتا پلٹتا رہتا تھا اور دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرتا تھا۔اس دور کی ہر کتاب پر نماز پڑھی ہے، بلکہ یہ سلسلہ بہت بعد تک جاری رہا۔ پھر اولین فرصت میں اپنے ذوق کے مطابق اس کی جلد بناتا، بعض اوقات جلد ناپسند ہوتی تو دوبارہ جلد بندی کرتا تھا۔اس دور کی تمام کتابوں کی جلد سازی میرے ہاتھ کی ہے۔ مصنف کا حال تلاش کر کے لکھتا اور کتاب کے اوپر کاغذ کا غلاف چڑھاتا، آج بھی میری تقریباً تمام کتابوں پر کاغذی غلاف چڑھا ہوا ہے۔ نیز ہر کتاب پر اس کی قیمت اور تاریخ خرید لکھتا۔

ذیل میں اس زمانہ کی غیر درسی عربی کی کتابوں کی فہرست مع قیمت و تاریخ کے درج ہے۔اس سے اندازہ ہوگا کہ کس طرح سال بہ سال علمی ترقی اور ذہنی تبدیلی ہوتی رہی اور اس زمانہ میں ان کتابوں کی قیمت کیا تھی۔اور اب کیا ہوگئی ہے۔

(۱) مختار الصحاح رازیؒ قیمت ایک روپیہ، شعبان ۱۳۵۳ھ میں آئی، یہ میرے کتب خانہ کی مصری مطبوعات میں پہلی کتاب ہے، مولانا شکر اللہ صاحب مدرسہ کیلئے میزان الاعتدال، تذکرۃ الموضوعات اور المستطرف وغیرہ ابناء مولوی محمد بن غلام رسول السورتی بمبئی سے منگوار ہے تھے ان ہی کے ساتھ یہ کتاب بھی آئی تھی، بعد میں کئی طالب علموں نے میرے ذریعہ سے اس کو خریدا۔

(۲) ادب الکاتب ابن قتیبہؒ قیمت دو روپیہ (۳) کتاب الاضداد فی اللغۃ ابن بشار انباریؒ، قیمت ایک روپیہ، یہ کتابیں ایک ساتھ رمضان ۱۳۵۳ھ میں عبدالصمد واولادہ تجار الکتب سورت سے آئیں۔

(۴) کتاب المعارف ابن قتیبہؒ قیمت ڈیڑھ روپیہ، رجب ۱۳۵۴ھ میں آئی۔ (۵) دیوان نابغہ ذبیانی، قیمت دس آنے۔ (۶) دیوان زہیر بن ابی سلمی مع شرح اعلم شنتری قیمت پانچ آنے (۷) العلم الخفاق فی علم الاشتقاق، نواب صدیق حسن خاںؒ قیمت چھ آنے، (۸، ۹) دیوان

الخنساء مع دیوان حاتم الطائی قیمت غالباً آٹھ آنے، یہ چاروں کتاب ایک ساتھ شوال ۱۳۵۴ھ میں الکمتبۃ العربیۃ الکبریٰ بمبئی سے آئی تھیں۔

(۱۰) مقدمہ ابن خلدون، قیمت ایک روپیہ چار آنے، ۱۳۵۴ھ کے سالانہ امتحان میں مقامات حریری میں اول آنے پر مولانا مفتی محمد یٰسین صاحبؒ نے ایک روپیہ انعام دیا تھا، چار آنے خود لگا کر یہ کتاب منگائی۔

(۱۱) دلائل الاعجاز عبدالقاہر جرجانیؒ قیمت غالباً دو روپیہ۔ (۱۲) العمدہ فی الشعر ونقدہ ابن رشیق قیروانی دو جلدوں میں، قیمت دو روپیہ، یہ دونوں کتب خانہ رشیدیہ دہلی سے صفر ۱۳۵۵ھ میں آئیں۔ (۱۳) الاخبار الطّوال ابوحنیفہ دینوری، قیمت ڈیڑھ روپے، (۱۴) طبقات الامم ابن صاعد اندلسیؒ قیمت ایک روپیہ پانچ آنے، یہ دونوں کتابیں المکتبۃ العربیۃ الکبریٰ بمبئی سے ۱۶/ ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ میں آئیں۔ (۱۵) الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ، ابن حجر عسقلانیؒ آٹھ جلدوں میں قیمت دس روپے کتب خانہ رشیدیہ دہلی سے رمضان ۱۳۵۵ھ میں آئی، اصل قیمت بارہ روپیہ تھی، فی روپیہ دو آنے کمیشن کے بعد ساڑھے دس روپے ہوئی تھی مگر آٹھویں جلد کے آخری سادہ صفحات کا کونا غائب تھا اس لئے آٹھ آنے کی مزید کمی ہوگئی تھی۔ آٹھوں جلدوں کی الگ الگ جلد بندی کی تھی پھر توڑ کر دو جلدوں کی ایک جلد بنائی (۱۶) فتوح البلدان ابوالحسن بلاذریؒ قیمت ایک روپیہ چودہ آنے شوال ۱۳۵۵ھ میں آئی تھی۔ (۱۷) کتاب الفہرست ابن ندیمؒ قیمت تین روپیہ، ۲۶/ رجب ۱۳۵۶ھ کو ایک دوست کے ذریعہ ابناء مولوی محمد بن غلام رسول السورتی بمبئی سے منگائی (۱۸) شرح نخبۃ الفکر ابن حجر عسقلانیؒ قیمت ساڑھے تین آنے (۱۹) زاد المعاف فی ہدی خیر العباد ابن قیم: چار جلدوں میں قیمت چار روپیہ (۲۰) دیوان الحماسہ ابوتمام طائی مع مختصر شرح تبریزی دو جلدوں میں قیمت دو روپیہ، یہ تینوں کتابیں کتب خانہ رشیدیہ دہلی سے رجب ۱۳۵۶ھ میں آئیں۔ (۲۱) الکامل فی اللغۃ والادب مبرد دو جلدوں میں قیمت ساڑھے تین روپیہ، (۲۲) فقہ اللغۃ مع سر العربیۃ ثعالبی، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے، یہ دونوں کتابیں رمضان ۱۳۵۶ھ میں کتب خانہ رشیدیہ دہلی سے آئیں۔ (۲۳) مشکوٰۃ المصابیح (اصح المطابع دہلی) قیمت دو روپیہ نو آنے ۱۷/ شوال ۱۳۵۶ھ میں آئی، (۲۴) دیوان مجنوں قیمت تین آنے، ذوالحجہ ۱۳۵۶ئھ میں

آئی۔ (۲۵) تفسیر ابن کثیر چار جلدوں میں قیمت دس روپیہ،۱۲؍ربیع الاول ۱۳۵۷ھ میں آئی، (۲۶) صحیح البخاری مع حاشیہ السندی دو جلدوں میں قیمت ایک روپیہ چودہ آنے، ۱۵؍رجب ۱۳۵۷ھ میں آئی بعد میں کئی طلبہ نے میرے ذریعہ سے منگائی (۲۷) احیاء العلوم غزالیؒ چار جلدوں میں حاشیہ پر کتاب المغنی عن الاسفار فی تخریج مافی الاحیاء من الاخبار عراقی، کتاب تعریف الاحیاء بفضائل الاحیاء عبدالقادر علوی کتاب الاملاء عن اشکالات الاحیاء غزالیؒ اور عوارف المعارف سہروردیؒ قیمت چار روپیہ ۱۶؍شوال ۱۳۵۷ھ میں آئی (۲۸) تذکرۃ الحفاظ ذہبیؒ چار جلدوں میں قیمت ساڑھے دس روپیہ،۴ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ کو آئی (۲۹) کتاب الخراج امام قاضی ابو یوسف قیمت ڈھائی روپیہ،۲۴ ربیع الآخر ۱۳۵۸ھ کو آئی (۳۰) تفسیر جلالین مع اسباب النزول دو جلدوں میں قیمت ایک روپیہ، (۳۱) الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہؒ قیمت ڈیڑھ روپیہ ان دونوں کتابوں کی تاریخ خریداری نہیں لکھی تھی، یہ سب کتابیں کتب خانہ رشیدیہ دہلی سے آئیں (۲) سنن ابن ماجہ (۳۳) سنن نسائی (۳۴) سنن ترمذی، یہ تینوں کتابیں پرانی تھیں، سستے دام پر ۱۳۶۹ھ میں ایک طالب علم سے مراد آباد میں خریدیں، یہ سب ۳۴ کتابیں ۵۸ جلدوں میں ہیں، جن کی مجموعی قیمت اس زمانہ میں ساٹھ ستر روپیہ کے درمیان تھی جو آج کل کئی ہزار کے برابر ہے۔ یہ کتابیں نہایت عسرت اور تنگدستی کی حالت میں کوڑی کوڑی جمع کر کے خریدیں۔

اردو کی تعلیم ہی کے زمانے میں مجھے نادر سکہ جات اور دوسری پرانی چیزوں کو جمع کرنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا، اس زمانہ میں قلمی اور نادر کتابوں کی تلاش وجستجو بھی رہا کرتی تھی، خاندان میں بڑے بوڑھوں سے سنتا تھا کہ ہمارے یہاں قلمی کتابیں بہت زیادہ تھیں۔ دو بورے کتابیں ایک نویں میں ڈال دی گئیں، پردادا شیخ محمد رجب کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف بہت بعد تک محفوظ تھا، مگر میری پیدائش اور ہوش سنبھالنے سے پہلے وہ بھی ضائع ہو گیا، البتہ ایک قدیم مطبوعہ مجموعہ خطب ملا ہے، جس کے آخر میں ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا جمعہ کا خطبہ ثانیہ اور عیدین کا خطبہ موجود ہے جس کے آخر میں ۱۲۹۷ھ درج ہے، عربی رسم الخط میں نہایت پاکیزہ اور خوشخط لکھا ہے، میرے پاس اب بھی محفوظ ہے۔ خاندان میں نیابت قضاء کے آخری دور کی چند سندیں تھیں جن کی پشت پر میں نے کاغذ چسپاں کر کے ان کو محفوظ کر لیا تھا، وہ بھی خاندان کے ناقدروں کے ہاتھوں ضائع

ہوگئیں، البتہ میں نے اسی زمانہ میں ان سب کو نقل کرلیا تھا اور اپنی کتاب ''مآثر و معارف'' میں چھاپ دیا ہے۔ صرف ایک سند محفوظ ہے۔ اسی زمانہ میں کہیں سے قصہ شاہ جمجمہ اور اللہ خدائی کے قلمی نسخے مل گئے تھے جواب تک محفوظ ہیں۔

محلّہ کے ایک بزرگ حاجی ولی اللہ تاجر کتب بازار ایک دن قدم رسول کے چبوترہ پر اپنی دکان لگاتے تھے میں شام کو ان کی دکان پر جاتا اور کتابیں پڑھتا تھا، انہوں نے میرے شوق کو دیکھ کر ''تفسیر مرتضوی'' کا ایک نہایت نادر و نایاب قلمی نسخہ دیا، یہ شیخ غلام مرتضیٰ بن شیخ تیمور حنفی الہ آبادی متخلص بہ جنوب کی چند سورتوں کی منظوم تفسیر ہے جو ۱۱۹۸ھ میں لکھی گئی ہے۔ اردو زبان میں غالباً پہلی تفسیر ہے جو منظوم ہے، شاید ایک آدھ نسخہ ہندوستان میں اور ہے، میں نے اس کے آخر میں یہ یادداشت لکھی ہے ''ایں نسخہ قدیمہ متبرکہ در مبارک پور یکے از تاجران کتب کہ پیر کہن سال بود، نامش حاجی ولی اللہ بود و در دیار عرب یک زمانہ فروکش ماندہ بود مرا بطور ہدیہ در ۱۳۵۴ھ عنایت فرمود، و بعد چند سال انتقال کرد، نزد من ایک اول منظوم تفسیر است کہ بزبان اردو مسلسل گفتہ شد۔ واللہ اعلم بالصواب۔ **وانا العبد الافقر القاضی عبدالحفیظ اطہرؔ مبارکپوری، غفرلہ و لمتعلقہ اجمعین۔**

قصبہ کے ایک دوسرے تاجر کتب سے ایک چھوٹی سی نہایت ہی حسین و جمیل قلمی کتاب چھ آنے میں خریدی، جس میں اسماء شہداء بدر اور اسماء شہداء احد بیحد خوشنما اور جاذب نظر عربی خط میں لکھے ہوئے ہیں۔ جدول اور بین السطور مطلا ہے، اس کے ایک کونے پر میں نے یہ یادداشت درج کی ہے۔ **ملکت ھذاالکتاب المبارک بالبیع الشرعی یوم الخمیس ۲۹/ شوال ۱۳۵۷ھ وانا القاضی ابوالمعالی عبدالحفیظ المبارکفوری،** بخواب اندر متعلق ایں نسخہ مبارکہ مرا بشارت شدہ بود۔

جو کتابیں میرے ذوق کی ہوتیں اور ان کے حصول کی کوئی صورت نہ ہوتی ان کو نقل کرلیتا تھا، اس کے لئے بڑا اہتمام کرتا تھا، موٹے کاغذ پر دھاگے سے مسطر بناتا اچھے اچھے قلم مہیا کرتا اور پکی روشنائی تیار کرتا تھا، ہر کتاب کے آخر میں ترقیمہ میں دن، وقت تاریخ اور سنہ لکھتا تھا۔ میرے کتب خانہ میں میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی مندرجہ ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں:

(۱) کتاب النکت فی اعجاز القرآن ابوالحسن علی بن عیسیٰ رمانی متوفی ۳۸۴ھ یہ کتاب ۳۲ صفحات کی ہے، تاریخ کتابت ۱۲؍صفر ۱۳۵۴ھ ہے۔ میں نے اس کے شروع میں مقدمہ اور آخر میں مصنف کے حالات عربی زبان میں لکھے ہیں۔

(۲) کتاب الالفاظ المترادفہ، ابوالحسن علی بن عیسیٰ رمانی، ۱۶ صفحات تاریخ کتابت ۱۴؍جمادی الثانیہ ۱۳۵۴ھ، میں نے اس کے شروع میں عربی میں مقدمہ لکھا ہے جس میں مختلف کتابوں سے مترادف کی تعریف اور اس کے اسباب وغیرہ لکھے ہیں۔

(۳) دیوان امرؤالقیس، مطبوعہ شرح دیوان امرؤالقیس سے اسکے اشعار نقل کر کے آخر میں مختار الصحاح اور دوسری کتابوں سے زیادات نقل کئے ۳۳؍صفحات میں ہے، میں نے ابتداء میں پانچ صفحات میں امرأالقیس کے حالات لکھے ہیں۔ تاریخ کتابت رمضان ۱۳۵۴ھ ہے۔

(۴) مختصر الجرجانی فی اصول الحدیث علامہ میر سید شریف علی بن محمد بن علی جرجانی کا مختصر سا رسالہ ۱۶؍صفحات میں ہے، تاریخ کتابت بوقت عصر دوشنبہ ۱۰؍صفر ۱۳۵۵ھ

(۵) دیوان الفرزدق، بیروت کے مطبوعہ دیوان سے نقل کیا، میں نے ابتداء میں عربی میں فرزدق کا حال لکھا ہے اس کے بعد ۱۱۴ صفحات ہیں، تاریخ کتابت وقت ضحیٰ یوم جمعہ ۱۶؍جمادی الثانیہ ۱۳۵۵ھ

(۶) انباء الاذکیاء فی حیات الانبیاء امام سیوطی کے مطبوعہ رسالہ سے نقل کیا، صفحات ۱۴ تاریخ کتابت ۷؍ربیع الاول ۱۳۵۸ھ

(۷) کتاب الدرات، اصمعی کی مختصر سی کتاب ہے، بیروت میں چند رسائل کے ساتھ چھپی تھی، آخر میں ۸۳ دارات کے نام ہیں، اس کے بعد حریری کے دو رسالہ سینیہ اور شینیہ ہیں، صفحات ۱۲ تاریخ کتابت ۲۰؍صفر ۱۳۵۵ھ

(۸) عروض وقوافی بیروت میں چھپا ہوا ایک رسالہ نقل کر کے ماموں مرحوم مولانا محمد یحییٰ صاحب سے تین مجلس میں پڑھا۔

(۹) الاستیعاب سے سیرت نبوی کا پورا حصہ کتابی شکل میں نقل کیا۔

(۱۰) فقہ اللغہ کی پہلی فصل اور دوسری کتابوں سے لغوی وادبی فوائد، عربی ادب کی تاریخ

منتخب اشعار والغاز، علماء اسلام کے قصص واحوال وغیرہ ایک کتاب نماز چھوٹی سی تقطیع کی بیاض میں مع کئے جواب تک موجود ہے۔ عربی کتابوں سے اخذ واقتباس اور جمع وترتیب کا سلسلہ پورے دور طالب علمی میں جاری رہا اور بلا مبالغہ کئی سو صفحات سیاہ کئے۔

الغرض طالب علمی کے دور میں مطبوعات ومخطوطات کا ایک نہایت وقیع اور قابل قدر کتب خانہ جمع ہوگیا تھا جس میں مغز ہی مغز تھا چھلکے کا نام نہیں تھا۔ میں رات دن ان کتابوں میں گم رہتا تھا۔ ان کو ایک الماری میں نہایت قرینہ سے سجاتا، کیا مجال کی الماری میں کوئی آگے پیچھے یا نیچے اوپر پڑی رہے۔ جلد سازی کے وقت اہتمام کے ساتھ ابتداء میں سادے اوراق لگاتا جن پر کتاب کے مناسب فوائد ومضامین دوسری کتابوں سے نقل کرتا، کتاب کو داغ دھبہ سے بچاتا رکھنے اٹھانے میں احتیاط سے کام لیتا، میرے ساتھیوں اور دوستوں کو ان ''بیکار'' کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس لئے میری ان ''قیمتی'' کتابوں کے بارے میں کسی سے بخل اور کنجوسی نہیں کرنی پڑتی تھی۔ اور نہ ہی کتابوں کے ضائع ہونے کا ڈر تھا، کتابوں کے ذوق وشوق کی وجہ سے بعد میں میرے پاس امہات کتب کا ایک عظیم الشان ذاتی کتب خانہ بن گیا، جس میں عربی زبان کی نادر ونایاب مطبوعات ومخطوطات کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ اب اس کے رکھنے کی جگہ نہیں مل رہی ہے۔

مضمون نگاری اور تصنیف وتالیف:۔ نانا مرحوم مولانا احمد حسین صاحب کا ذاتی کتب خانہ بہت بڑا تھا جس میں ہر قسم کی عربی، فارسی، اردو مطبوعات ومخطوطات تین بڑی الماریوں میں نہایت قرینہ سے رہتی تھیں، چھٹیوں میں نانا مرحوم ڈھاکہ سے آتے تو رات دن کتب بینی، تصنیف وتالیف اور دواسازی میں مصروف رہا کرتے تھے، چٹائی پر کتابیں پڑی رہتی تھیں جن سے اخذ واقتباس فرمایا کرتے تھے، میں ان کے علمی انہماک کو دیکھتا تھا مگر قریب جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ جب کہیں چلے جاتے تو ان کے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھتا اور پھر اسی طرح رکھ دیتا، بعض اوقات ان کو پتہ چل جاتا، اور پوچھتے کہ یہاں کون آیا تھا، اور میرا نام سن کر خاموش ہوجاتے تھے۔

نانا بہ سلسلۂ مدرسی باہر رہتے تھے اور ماموں بہ سلسلہ تعلیم باہر رہتے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں رسول پور جاتا تو کتب خانہ میں بیٹھ کر کتابیں نکالتا اور پھر اسی طرح رکھ دیتا، اکثر

کتابوں پر نانا کے تعلیقات اور حواشی ہوتے تھے۔ بعض کتابوں کی ابتداء میں کئی کئی صفحات ان کے ہاتھ کے لکھے رہتے تھے اور میں ان کو بہت غور سے دیکھتا تھا، حالانکہ ان کو سمجھنے کی صلاحیت بالکل نہیں تھی، مگر یہیں سے مجھ کو اخذ و اقتباس کا ذوق پیدا ہوا اور اردو کی تعلیم ہی کے زمانے میں اپنی استعداد کے مطابق ان کے کاموں کی نقل کرنے لگا، عربی درجہ میں جانے کے بعد ہی جب کتب بینی اور مطالعہ کا شوق بڑھا تو یہی روشنی کام آئی اور اسی دور میں مضمون نگاری اور تالیف کی طرف رجحان زیادہ ہوا۔

مدرسہ احیاء العلوم کے مدرسین واراکین کو تصنیف وتالیف کا ذوق بالکل نہیں تھا، ایک مرتبہ بزم احباب احمد آباد نے ائمہ اربعہ کے سوانح پر مدرسہ کے طلبہ سے مضمون طلب کیا تو بڑی مشکل سے بعض اساتذہ نے اس کو ترتیب دیا۔ اس کے بعد احساس ہوا کہ طلبہ میں تحریر کا ذوق پیدا کرنا چاہئے اور اس کے لئے جمعیۃ الطلبہ کا قیام ہوا، مختلف علوم وفنون خصوصاً تاریخ وادب کی مستند کتابیں خریدی گئیں، علمی، ادبی، اور مذہبی اخبارات ورسائل منگائے گئے اور الاحیاء کے نام سے ماہوار قلمی رسالہ جاری کیا گیا جو چند نمبروں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ان کتب ورسائل سے میں نے بہت زیادہ استفادہ کیا، خصوصاً دار المصنفین، ندوۃ المصنفین، جامعہ ملیہ اور دار التراجم کی کتابوں اور معارف، برہان، جامعہ وغیرہ رسائل سے مجھے بہت رہنمائی ملی۔ ان کتابوں میں عام طور سے حوالے ہوتے تھے۔ ان کو دیکھ کر عربی کے اصل ماخذوں سے براہ راست استفادہ کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ اس زمانہ میں تاریخ وطبقات کی متعدد کتابیں اسی داعیہ پر خریدیں۔

جب لکھنے پڑھنے کی کچھ شد بد ہوگئی تو والدہ مرحومہ کی کتابوں سے خلفاء اربعہ اور ائمہ اربعہ کے مختصر حالات اس وقت کے ذوق کے مطابق ایک چھوٹی سی کاپی میں جمع کئے، اس کو تار سے سیا اوپر دبیز سرخ کاغذ کا ٹائٹل لگایا، یہ میرے تصنیفی اور تالیف ذوق کا نقش اولیں تھا۔ اردو کے دوسرے یا تیسرے درجہ میں گیا تو مشکل الفاظ کے معنی لکھنے کے لئے ایک چھوٹی سی مجلد کاپی بنائی۔ نیز اسی زمانہ میں ایک بہت چھوٹی سی کاپی میں نعتیہ اشعار جمع کئے، اس کی خوبصورت جلد بنائی، بچپن میں کتاب بنانے کا یہی ذوق آگے چل کر کتاب لکھنے کا سبب بنا۔

عربی شروع کی تو شاعری کے ساتھ مضمون نگاری کا شوق ابھرا، اور اخباروں اور رسالوں

میں چھپنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ سب سے پہلے میرا نام ایک پہیلی کے سلسلہ میں جامعہ ملیہ دہلی کے رسالہ ''پیام تعلیم'' میں چھپا تو مولانا شکر اللہ صاحب نے بلا کر مجھے داد دی۔ اس کے بعد اخبار الجمعیۃ دہلی میں واردھا کی خطرناک تعلیمی اسکیم کے عنوان سے ایک مختصر سا مضمون چھپا، پھر ۱۳۵۳ھ میں رسالہ ''مومن'' بدایوں میں ایک صفحہ کا مضمون مساوات کے عنوان سے شائع ہوا، کہنا چاہئے کہ میرا سب سے پہلا مضمون یہی ہے جو اس زمانہ میں شائع ہوا، پھر اسی رسالہ میں دوسرا مضمون ''رہا دین باقی نہ اسلام باقی'' کے عنوان سے دو صفحے کا چھپا، اسی زمانہ میں ہفتہ وار العدل گوجرانوالہ پنجاب میں ایک مضمون بلا کشان اسلام کے عنوان سے شائع ہوا۔ اڈیٹر نے اس کو مقالہ افتتاحیہ کی جگہ چھاپا تھا، ان مضامین کی اشاعت کے بعد مضمون نگاری کا سودا سر میں یوں سمایا کہ اس کے لئے باقاعدہ انتظام واہتمام کیا، بازار سے ایک میز ایک روپیہ دو آنہ کی اور ایک اسٹول چھ آنے کا خریدا، ایک خوبصورت بڑا سا قلمدان بنوایا، اس پر سیاہ پالش کر کے پشت پر سفید حرفوں میں بخط عربی ''**علم بالقلم**'' لکھا، سرخ اور سیاہ روشنائی بنائی، قسم قسم کے قلم خریدے، اور اسی میز پر کاغذات اور قلمدان وغیرہ نہایت سلیقہ سے رکھ کر کتب بینی، مضمون نویسی اور شاعری کا مشغلہ جاری رکھتا تھا، مضمون نویسی کے بارے میں صرف میرا ذوق رہنما ہوا اور خود اعتمادی نے ہمت افزائی کی، معلومات کی فراہمی اور اسلوب نگارش وغیرہ میں کسی کی رہنمائی حاصل نہ ہوسکی، اس لئے ایک مضمون کئی کئی بار لکھتا اور پھاڑ کر پھینک دیتا، اور کافی محنت کے بعد میرے ذوق کے مطابق ہوتا، ساتھ ہی خیال ہوتا کہ یہ مضمون قابل اشاعت ہوا یا نہیں، مگر جب کسی حکّ واضافہ اور بلا تغیر وتبدل کے چھپ جاتا تو حوصلہ میں نئی جان آجاتی، اور فوراً دوسرا مضمون تیار کرنے میں لگ جاتا۔

اسی دوران ۱۳۵۷ھ میں مولانا سید محمد میاں مرحوم مدرسہ شاہی مرادآباد سے جمعیۃ الطلبہ کے سالانہ جلسہ کی صدارت کیلئے تشریف لائے، مولانا نے اس زمانہ میں شاہی مدرسہ مرادآباد سے رسالہ ''قائد'' جاری کیا تھا۔ میرے دوست مولوی عثمان صاحب نے مولانا کو میرے کچھ اشعار سنائے تو مولانا نے از راہ شفقت ان کو شائع کردیا، اور مضمون لکھنے کی تاکید فرمائی اس کے بعد مولانا مرحوم مستقل طور سے قائد میں میرے مضامین اور اشعار چھاپنے لگے اور میں اس کے

مستقل مضمون نگاروں میں شامل ہوگیا، بس کیا تھا؟ اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں، میری دلی مراد برآئی اور مضمون نگاری کی دھن سوار ہوگئی، یکے بعد دیگرے مضامین تیار کرتا، کتابیں فراہم کرتا، مضمون میں کاٹ چھانٹ کرتا، عبارت درست کرتا اور مضمون لکھ کر پہلی فرصت میں روانہ کردیتا تھا۔ مولانا مرحوم کی نگاہ شفقت میں یہ مضامین بہت بلند پایہ ہوتے۔ اپنے خطوط میں خوب خوب ہمت افزائی فرماتے، ایک مرتبہ مجھ کو ''مولانا قاضی عبدالحفیظ صاحب اطہر مبارک پوری فاضل دیوبند'' کے خطاب سے نواز کر لکھا کہ آپ کے مضامین اعلیٰ درجہ کے اور معیاری ہوتے ہیں، زیادہ تعریف اس لئے نہیں کی جاتی ہے کہ کہیں آپ رسالہ قائد کو ان کے لئے نااہل نہ سمجھنے لگیں۔ میں نے نہایت ادب واحترام سے جواب دیا کہ طالب علم ہوں، ھدایہ وغیرہ پڑھتا ہوں۔ بعد میں جامعہ قاسمیہ میں جاکر مولانا مرحوم سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ جب تک رسالہ قائد جاری رہا، میرے مضامین اس میں شائع ہوتے رہے۔ ایک مرتبہ میں نے مولانا مرحوم سے کتاب الخراج امام ابو یوسف کے مطالعہ کی خواہش ظاہر کی تو مولانا نے بڑی محبت وشفقت کا اظہار فرماتے ہوئے کتاب عطا فرمائی، میں نے اس کے اوپر عمدہ کاغذ لگا کر کتاب اور مصنف کا نام خوشخط اور جلی حروف میں لکھا، جب کتاب واپس کی تو مولانا نے ہاتھ میں لیتے ہیں فرمایا کہ میں نے سمجھا کہ آپ نے یہ کتاب لکھی ہے، میں نے عرض کیا کہ حضرت! دعا فرمائیں۔ اور جب میری کتاب رجال السند والہند چھپی اور میں نے مولانا مرحوم کی خدمت میں بھیجی تو طالب علمی کے اس واقعے کی طرف اشارہ کرکے لکھا کہ یہ آپ کی دعا اور توجہ کی برکت ہے کہ میں اس لائق ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم اس سلسلے میں میرے اولین محسن اور مربی ہیں اگر ان کی توجہ نہ ہوتی اور رسالہ قائد میں مضامین شائع نہ ہوتے تو شاید میں تصنیف وتالیف کے لائق نہ ہوتا اور میری جولانیٔ طبع نامساعد حالات کی نذر ہوگئی ہوتی۔

مضامین واشعار کے شائع ہونے کے بعد شاعری اور مضمون نگاری کے ساتھ تصنیف و تالیف اور تلاش وتحقیق کا ذوق جرأت وہمت دکھانے لگا، چنانچہ میں نے زمانۂ طالب علمی میں پانچ کتابیں لکھیں، دو عربی میں اور تین اردو میں۔

(۱) سب سے پہلے شوال ۱۳۵۵ھ میں حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ کے مشہور اور

متبرک قصیدہ بانت سعاد کی شرح عربی میں لکھی اوراس کا نام **خیر الزاد فی شرح بانت سعاد** رکھا جو بڑے سائز کے بیس صفحات میں ہے ،۔ابتداء میں تین صفحے کا عربی میں مقدمہ ہے جس میں حضرت کعب بن زہیرؓ کے حالات ،قصیدہ کا واقعہ اوراس کے اشعار کی تقطیع وغیرہ ہے، یہ کتاب اب تک میرے پاس ہےاور میں اس کو اپنی تصنیفی کوشش کا نقش اولیں سمجھتا ہوں۔

(۲) وفیات الاعیان ، تذکرۃ الحفاظ ،فہرست ابن ندیم سے علماء سلف اور ائمہ علم وفن کے واقعات مختلف عنوانات پر جمع کر کے عربی میں ایک کتاب ’’**مرآۃ العلم**‘‘ کے نام سے مرتب کی جو متوسط سائز کے ۵۴ صفحات کی ہے۔آخر کے ۶ صفحات میں علم وعلماء سے متعلق اشعار ہیں، یہ کتاب بھی میرے پاس موجود ہے۔

(۳) ائمہ اربعہ کے عنوان سے میں رسالہ’’ قائد‘‘ میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا اور وفیات الاعیان ، تذکرۃ الحفاظ ،تہذیب التہذیب ،فہرست ابن ندیم وغیرہ سے اسی وقت کے معیار کے مطابق تحقیقی کام کی ابتداء کی ۔اس سلسلے میں سب سے پہلے تہذیب التہذیب جلد دہم مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری مرحوم کے کتب خانہ سے لے کر اس سے استفادہ کیا۔ یہ سلسلہ امام مالکؒ پر بعض وجوہ سے ختم ہوگیا، کچھ دنوں کے بعد اس کو کتابی شکل میں مرتب کیا جس میں ائمہ اربعہ کے مختصر حالات تھے، قیام لاہور کے زمانہ میں مرکز تنظیم اہل سنت نے شائع کرنے کیلئے کتابت کرائی ،اسی دوران ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا، میں وطن میں تھا کاپی تصحیح کے لئے آئی۔ میں نے تصحیح کر کے روانہ کر دی اس کے بعد پتہ نہ چلا ،اس کا مثنیٰ میرے پاس تھا۔۱۳۶۸ھ میں بمبئی گیا تو سلطان کمپنی بھنڈی بازار نے شائع کرنے کا وعدہ کیا، میں نے دوسرا مسودہ دے دیا ،مگر چند دنوں کے بعد اس کا مالک مشرقی پاکستان چلا گیا اور آج تک اس کا پتہ نہ چلا۔تقریباً سوا سو صفحات کی مختصر ہونے کے باجود بہت جامع تھی۔

(۴) الاستیعاب ،الاصابہ اور اسد الغابہ وغیرہ سے حضرات صحابیات رضی اللہ عنہن کے دل آویز اور سبق آموز واقعات الگ عنوان سے جمع کئے اور’’ الصالحات‘‘ کے نام سے کتاب مرتب کی ،اور قیام لاہور کے زمانہ میں ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور کو چھاپنے کے لئے دی اس کا کتاب کا بھی پتہ نہ چلا اور نہ ہی میرے پاس اس کا مسودہ ہے۔

(۵) ان ہی ایام میں اصحاب صفہ کے نام سے ایک منظوم کتاب لکھی جس میں تقریباً سوا دوسو اشعار تھے، انداز نہایت والہانہ اور عقیدت مندانہ تھا اس میں حضرات اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کیا سماء واحوال شاہنامہ اسلام کے طرز پر جمع کئے تھے، مولانا سید فخر الدین احمد صاحب نے اسے دیکھ کر بہت پسند فرمایا اور دو ایک جگہ اصلاح دی تھی اور مولانا سید محمد میاں صاحب نے اسے مزید تصحیح کے لئے مولانا اعزاز علی صاحب کے پاس بھیج دیا، اور ان سے اصلاح کے بعد آ گئی۔ وطن واپس آیا تو تو اسی سال (۱۳۵۹ھ) شباب کمپنی بمبئی (ابناء مولوی محمد بن غلام رسول السورتی) کے لئے بعض کتابوں کا ترجمہ کیا اور رسالہ "اصحاب صفہ" اسی کمپنی کو دیا، مگر اس کی بھی اشاعت نہ ہوسکی، میرے پاس کی نقل بھی نہیں ہے، اسکا مجھے بے حد افسوس ہے خاصے کی چیز تھی۔

مضمون نگاری، شاعری کے ابتدائی نمونے:۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں قلم پکڑنے اور کچھ نہ کچھ لکھنے کا شعور اردو تعلیم کے زمانہ ہی سے پیدا ہو گیا تھا، عربی شروع کی تو اس کا شوق زیادہ ہو گیا اسی زمانہ میں رسالہ "مومن" بدایوں کے اڈیٹر مولوی محمود الحسن صاحب توسیع اشاعت کے لئے مبارک پور آئے، میں ان سے ملتا رہا، انہوں نے میرے شوق کو دیکھ کر کہا کہ تم مضمون لکھو میں شائع کروں گا، ان کی شہ پا کر میں نے دو مضمون جلدی میں لکھ کر ان کو بھیج دیئے۔ ایک کا عنوان "مساوات" تھا جو ۱۳۵۳ھ دسمبر ۱۹۳۴ء کے رسالہ مومن میں چھپا، یہ "جناب مولوی عبدالحفیظ صاحب اعظمی متعلم مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور" کا پہلا مضمون تھا، ملاحظہ ہو:

> بنی نوع انسان میں مساوات و یکسانیت کا حد اعتدال پر قائم رکھنا اتنا ضروری اور لازمی امر ہے کہ جس کے بغیر نہ کسی سلطنت کا نظام اچھی طرح قائم رہ سکتا ہے اور نہ دنیا کی کوئی جماعت فروغ پاسکتی ہے، جو مذہب یا قانون مساوات و یکسانیت سے خالی ہے سمجھ لو کہ وہ بالکل ناقص ہے، اسی طرح جو جماعت یا سوسائٹی اپنے افراد میں مساوات و یکسانیت بدرجہ اتم قائم و برقرار نہ رکھ سکتی ہو یقین کر لو کہ وہ آج نہیں تو کل دنیا سے فنا ہو جائے گی۔ اس طرح ہر نظام اور ہر سوسائٹی کی روح رواں حقیقت میں مساوات اور صرف مساوات ہے، آج کل دنیا کی کوئی قوم اور مذہب ایسا نہیں جو مساوات کا دعویدار نہ بنتا ہو۔ لیکن جب ایک انصاف پسند

انسان صحیح طریقے پر اس کی جانچ کرنے بیٹھتا ہے تو اسلام کے سوا دنیا کا کوئی مذہب اس امتحان میں پورا نہیں اترتا۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اسلام نے اس دور میں دنیا کے اندر مساوات کی بنیاد ڈالی جب کہ سارے عالم پر خود نمائی اور خود پسندی کا بھوت سوار تھا۔ کہا جاتا ہے اسلام دنیا سے بت پرستی مٹانے آیا تھا بیشک اس نے ظاہری بتوں کی پرستش کو بھی دنیا سے مٹایا اور غرور و پندار کے بتوں کو بھی سارے جہاں سے نیست و نابود کیا، عرب جہاں پتھر کے خود تراشیدہ بتوں کی پرستش میں مبتلا تھا وہاں اس میں خود ساختہ خاندانی بت اور نسلی شرافت کی دیویاں بھی بکثرت پوجی جاتی تھیں۔ اور اکثر غریب اور کمزور جماعتوں کے حقوق نہایت بے دردی کے ساتھ پامال کر دیئے جاتے تھے۔ اسلام نے آکر اہل عرب سے اس لعنت کو دور کیا، غریبوں کو نوازا اور غلاموں کی دلجوئی کی، جس کی برکت سے اہل عرب میں ایک اجتماعی طاقت پیدا ہوئی اور پھر دیکھتے دیکھتے آن واحد میں سارے جہان پر چھا گئے اور تھوڑی ہی مدت میں اسلام ایک عالمگیر مذہب بن گیا۔ فروغ اسلام کے متعلق یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن آپ ذرا غور سے کام لیں تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ مسلمانوں کے اس قابل رشک فروغ میں صرف ایک باہمی مساوات و یکسانیت کا راز پنہاں تھا جس کو اسلام نے کبھی اور کسی حالت میں نظر انداز کر دینا روا نہ سمجھا اور اب تک بھی تمام اسلامی کتابیں اس یکسانیت و مساوات کی پاک تعلیم سے بھری ہوئی نظر آتی ہیں اور قانون اسلام کی ساری دفعات و احکامات میں اس وقت تک پوری پوری مساوات و یکسانیت موجود ہے۔ چنانچہ آپ کو ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ملے گا جس میں پوری پوری مساوات نہ پائی جاتی ہو۔

اردو تعلیم ہی کے زمانے سے شعر و شاعری کا ذوق ابھرنے لگا تھا، اس وقت میری عمر تیرہ چودہ سال کی تھی، مضمون نگاری کی طرح شعر و شاعری میں بھی کسی سے اصلاح یا مشورہ کی باری نہیں آئی اور اپنے ذوق ہی کو رہنما پایا، خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھا تو اس میں بھی بہت زیادہ

انہماک ہوگیا، درسی کتابوں کے ساتھ غیر درسی کتابوں کا مطالعہ، مضمون اور شعروشاعری یہ تمام مشاغل بیک وقت جاری تھے، گھر کے روزمرہ کے کام کاج مزید برآں تھے۔آئے دن جلسوں کے لئے ملی، قومی، سیاسی اور مذہبی نظمیں کہنے لگا۔ان ہی ایام میں جامع مسجد کی تعمیر کا اجتماعی انداز میں چندہ ہونے لگا اور لوگوں میں بے انتہا جوش تھا۔اس کے لئے ایک ایک دن میں چار چار پانچ پانچ نظمیں کہتا تھا اس وقت میری شاعری جنون کی حد تک پہونچ گئی، اشعار ابلتے تھے۔بعض اوقات چاروں طرف سے مجمع مجھے گھیر کر کہتا کہ ابھی ایک نظم کہو فلاں صاحب کے یہاں چندہ میں پڑھنی ہے اور میں اسی حالت میں اشعار کہتا جو فوراً پڑھے جاتے تھے اور روپیہ برسنے لگتا تھا۔مولانا شکر اللہ صاحبؒ بھرے مجمع میں خوب خوب تشجیع فرماتے تھے۔ایک مرتبہ مجھے ایک حکیم صاحب کی دوکان پر بھیجا انہوں نے مجھے کوئی مقوی دماغ معجون دیا، میں اس کو مولانا کے پاس لایا تو کہا کہ تم اس کو صبح وشام استعمال کرو اس سے دماغی قوت بڑھے گی، میں نے عرض کیا مجھے کسی قسم کی دماغی کمزوری نہیں محسوس ہورہی ہے یہ کہہ کر فوراً واپس کردیا۔اسی زمانہ میں میری بعض غزلیں اور نظمیں چھپی تھیں۔رسالہ الفرقان بریلی جمادی الثانیہ ۱۳۵۷ھ میں ''مسلم کی دعا'' کے عنوان سے میری پہلی نظم شائع ہوئی تھی۔

جامع مسجد کے چندہ کے سلسلہ میں بہت سی نظمیں کہی تھیں، ان سب کو''اذان کعبہ'' کے نام سے جمع کرلیا ہے۔ایک نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

نظر جب جب اٹھائی جا رہی ہے
جھلک کعبہ کی پائی جا رہی ہے

نظر میں نور پیدا ہو رہا ہے — یہ دل شاد تمنا ہو رہا ہے
زمیں پر عام چرچا ہو رہا ہے — فلک پر شور برپا ہو رہا ہے
کوئی مسجد بنائی جا رہی ہے

بناؤ جامع مسجد بناؤ — بڑھاؤ دین کی شوکت بڑھاؤ
کماؤ دولت عقبٰی کماؤ — بلاؤ روح حاتم کو بلاؤ
یہاں ہمت دکھائی جا رہی ہے

مسلماں! سن ذرا گوش صفا سے　　مسلماں ! کام لے جود وسخا سے
مسلماں! جوڑ رشتہ مصطفیٰ سے　　مسلماں! تیری مذہب سے خدا سے
محبت آزمائی جا رہی ہے

تعالی اللہ یہ پر نور مسجد　　حقیقت میں ہے رشک حور مسجد
ہے نگہ خاص کی منظور مسجد　　سدا اطہرؔ! رہے معمور مسجد
بہت بہتر بنائی جا رہی ہے

ابن رشیق نے کتاب العمدہ میں ’’باب من رفعه الشعر ومن وضعه ‘‘ کے تحت کئی ایسے شعراء کا حال لکھا ہے جو اپنی شاعری کی وجہ سے ابھرے اور کئی شعراء گمنام ہو گئے، میری خودرو شاعری نے مجھے آگے بڑھانے میں بہت مدد کی، لاہور کے اخبار ’’زمزم‘‘ اور اخبار ’’مسلمان‘‘ (بعد میں کوثر) میں میرے اشعار کثرت سے چھپتے تھے جس سے میں بحیثیت شاعر مشہور و متعارف ہوا، اور یہی تعارف مرکز اہل سنت امرتسر اور اخبار زمزم لاہور جانے کا سبب بنا اور یہی بمبئی جانے کا سبب بنا، اس طرح میری شاعری نے مجھے بہت فائدہ دیا مگر اب اس سے میرا تعلق نہیں رہا۔ معلوم نہیں میں نے اس سے بے وفائی کی یا اس نے مجھے اچھی راہ پر لگا کر خود کنارہ کشی کر لی۔

زمانہ طالب علمی میں شعرو شاعری عموماً مفید ثابت نہیں ہوتی ہے لیکن اگر سلیقہ اور اعتدال سے ہو تو بہت خوب اور مفید ہے اس سے ذہنی اور فکری جلا پیدا ہوتی ہے۔

میں نے دیسی یعنی قدیم طریقہ تعلیم کے ایک مدرسہ میں چار قصباتی اساتذہ سے عربی کی تعلیم حاصل کی جس میں ادب اور عربیت بھی شامل ہے۔ عام طور سے ایسے مدارس میں عربی شعرو وادب کی قدیم کتابیں قدیم طرز پر پڑھائی جاتی ہیں کیونکہ کتاب وسنت کی زبان یہی قدیم عربی ہے اور مدرسوں کا مقصد کتاب وسنت کی تعلیم براہ راست عربی زبان میں ہے اسی طرز تعلیم سے ہندوستان میں عربی کے عظیم مصنف پیدا ہوئے ہیں اور ان کی تصانیف حواشی اور شروح زبان و ادب کے اعتبار سے معیاری تسلیم کی جاتی ہیں۔

میرا عربی کا ذوق مقامات حریری، دیوان حماسہ، دیوان متنبّی، سبعہ معلقہ کے درس اور لغت وادب کی کتابوں کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ ۱۳۵۵ھ میں قصیدہ بانت سعاد کی عربی شرح لکھی تو اس کا

مقدمہ کچھ اس طرح لکھا:

الحمد لله الذی اسبغ علینا من النعم و جعل فی لسان العرب من اللطائف والحکم والصلاة والسلام علی حبیبہٖ نبینا المکرم المبعوث الی کافة الامم و علیٰ آلہ و اصحابه الذین هم مصابیح الظلم ، صلی الله علیه و آلہٖ و صحبہٖ وسلم . أما بعدً فیقول العبد الاحقر القاضی عبدالحفیظ محمد اطهر مبارکفوری انی اردت ان اشرح قصیدة بانت سعاد الذی طارت شهرته فی اطراف العالم والابعاد لکعب بن زهیر بن ابی سلمیٰ رضی الله عنه و وفقنی الله فی منتصف شوال المکرم سنة خمس وخمسین و ثلثمائة بعد الالف فشرحته کیف ما قدرت طاویا کشح القیل والقال لئلا یوجب الملال والاختصار لئلا یکون سبباً للکلال و سمیته خیر الزاد فی شرح بانت سعاد'' و هذا اول جولان یراعی فی میدان القرطاس وانا غمر جاهل من مثل هذاالشان فانه ما اغبر مذ نیطت عن التمائم و نیطت بی العمائم الا برهة من الزمان وانا معترف بعجز و التمس من
السادة الکرام ، ان یصفحوا عن زلاتی واعرضوا من ان یاخذونی عرضة للملامة والمسئول من الله تعالیٰ ان یجعله خالصاً لوجهه الکریم و منه التوفیق والعصمة ومنه الاستعانة فی کل امر .

طبعی رجحانات:۔ طالب علمی کا تقریباً پورا دور عسرت اور تنگی میں گذرا، کھانے پینے اور پہننے میں کفایت شعاری اور سادگی ہی رہی اس وقت آج کل کی طرح معاش ومعیشت کی فراوانی وفراخی نہیں تھی ۔ عام طور سے لوگ روکھی پھیکی زندگی کے عادی تھے، اس لئے تنگ دستی اور غربت کا احساس نہیں تھا بلکہ سب لوگ اسی زندگی پر راضی وخوش رہا کرتے تھے۔ اس میں بڑی خیر و برکت تھی ۔ میں بھی ہر معاملہ میں اپنے ذوق وشوق کے مطابق سامان مہیا کرلیا کرتا تھا اور کبھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوا۔

سفید گزی گاڑھے کا کرتا پائجامہ عام لباس تھا، شیروانی بہت کم پہنتا تھا اور پرصدری ہوا

کرتی تھی، ٹوپی کشتی نما اچھے کپڑے کی ہوتی تھی جوتا اس زمانہ کے لحاظ سے قیمتی ہوتا تھا، عطر کی شیشی ہمیشہ جیب میں رکھتا تھا، کپڑے خود ہی دھولیا کرتا تھا، یہی وضع قطع آج بھی باقی ہے، مگر اب احساس ہوتا ہے کہ اتنی سادگی بھی اچھی نہیں ہے بلکہ بعض اوقات مضر، موہم بخل اور باعث تحقیر ہو جاتی ہے۔

مدرسہ کے طلبہ جو اکثر قصبہ اور اطراف کی بستیوں کے ہوا کرتے تھے عصر کے بعد عیدگاہ پر جمع ہوتے تھے، یہ بہت پر فضا جگہ ہے، شمال میں سامنے سمودی کا وسیع وعریض تالاب، عیدگاہ کے پیچھے کچے صحن میں نیم کے درختوں کی قطار، جنوب میں تا حد نظر میدان، اور آس پاس سرسبزی و شادابی عجیب جاذب نظر اور دلکش منظر پیدا کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حافظ شیرازی کا ''کنار آب رکنا باد، وگل گشت مصلیٰ''، یہیں پر آ گیا ہے۔ اسی زمانہ میں ''برسات کی چاندنی رات'' کے عنوان سے میں نے ایک نظم کہی تھی جس میں یہ شعر بھی تھا۔

دور کچھ یاں سے سمودی کے کنارے آم پر
اک پپیہا دے رہا تھا جاں پیا کے نام پر

میں بڑے اہتمام اور نہایت ذوق وشوق سے یہاں کی تفریح میں شریک رہا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں یہی تفریح تھی۔

عشاء کے بعد درسی کتابوں کے مطالعہ میں لگ جاتا تھا جو عام طور سے تین چار ہوتی تھیں اور کل دن کے اسباق کو رات میں حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے بعد غیر درسی کتابوں کے مطالعہ، مضمون نگاری، اور شاعری میں لگ جاتا تھا۔ اس سے فراغت کے بعد چار پائی پر جاتا تو تو کوئی غیر درسی کتاب ہاتھ میں ہوتی تھی یا شعر وشاعری کا مشغلہ رہتا تھا۔

علمی وتعلیمی نشاط کے ساتھ بلند حوصلگی، عالی ہمتی اور خودسازی کا احساس ہر معاملہ میں نقطۂ عروج پر رہتا تھا۔ بڑوں اور بزرگوں کا واجبی احترام مدنظر رہتا تھا مگر بیجا عقیدت نہیں تھی، بعض اوقات قصبہ کے بڑوں کے یہاں طلبہ ومدرسین کی دعوت ہوا کرتی تھی، میں کسی بہانے سے بچ کر ان کے لقمۂ تر کے مقابلہ میں اپنی نان جویں میں زیادہ لذت پاتا تھا۔

مراد آباد گیا تو ابتداء میں ایک گھر سے کھانا لانا پڑتا تھا۔ ایک آدھ ہفتہ ضمیر پر جبر کر کے

چھپتے چھپاتے یہ کام کیا، پھر ڈھائی روپیہ ماہوار مدرسہ سے وظیفہ لے کر اس سے نجات حاصل کر لی اور ایک معمولی ہوٹل میں چھ پیسہ فی وقت کے حساب سے کھانا کھانے لگا، قیام مرادآباد کی مدت میں پچاس ساٹھ روپیہ گھر کے خرچ ہوئے۔ میری پوری تعلیم پر بہت ہی کم خرچہ ہوا ہے۔

آگے چل کر کفایت شعاری، سادگی، خودشناسی اور کم آمیزی نے بہت فائدہ دیا، اسی کی برکت ہے کہ بمبئی جیسے شہر میں مدت دراز تک رہنے کے باوجود میں بمبئی والا بالکل نہیں بن سکا، بڑی بڑی عقیدت مندانہ پیش کش کو شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا، تملق، چاپلوسی اور خوشامد سے نفرت رہی اور مدرسہ کی فضا میں جو ذہن و مزاج بنا تھا وہ اس شہر کی رنگینی اور دولت کی نذر نہ ہو سکا، اور الحمدللہ کہ میں نے اس شہر کے ایک معمولی کمرہ میں بیٹھ کر وہ کام کیا جو بڑی بڑی تنخواہوں پر علمی اور تصنیفی وتالیفی اداروں میں کیا جاتا ہے اور اس سے دولت کمائی جاتی ہے۔

میں نے اپنی کسی کتاب پر نہ کسی قسم کا معاوضہ لیا، نہ رائلٹی کی بات کی، اور نہ اس کے لئے کوئی تحریر لکھی، بلکہ علم کی خدمت واشاعت کے جذبہ سے لکھی اور اسی جذبہ سے ناشروں کو ان کی طباعت واشاعت کی اجازت دی۔

قیام مرادآباد کے دوران پہلی مرتبہ دہلی گیا تو ندوۃ المصنفین میں جانا ہوا اور اس کے ناظم مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مرحوم سے ملاقات ہوئی، میرے دوست مولانا محمد عثمان صاحب ساتھ تھے، اس بار بھی انہوں نے مبالغہ آمیز انداز میں میرا تعارف کرایا، مفتی صاحب نے اس وقت مجھ سے فرمایا کہ ''برہان'' کے لئے مضامین لکھا کریں، معاً خیال ہوا کہ ندوۃ المصنفین اور اس کے ترجمان ''برہان'' کے معیار پر مضامین کہاں پورے اتر سکتے ہیں؟ مگر اللہ کی شان کہ بعد میں اس ادارہ سے مفتی صاحب مرحوم نے میری آٹھ کتابیں اعلیٰ معیار پر شائع کیں اور اب رسالہ برہان کے اعزازی ادارت کی باری آ گئی ہے۔

ایام طالب علمی میں حدیدی حروف کی مصری کتابوں سے بیحد شغف تھا، خوب خریدتا تھا اور خوب پڑھتا تھا، سوچتا تھا کہ کیا کبھی میری بھی کوئی کتاب اس طرح چھپ سکتی ہے؟ پھر خیال ہوتا تھا کہ مجھ جیسے بے سہارا اور بے نوا کے لئے یہ خیال خام اضغاث احلام ہے، مگر یہ تمنا بھی پوری ہوئی اور اب تک میری تین کتابیں بمبئی میں اور تین کتابیں قاہرہ میں ان ہی حروف میں چھپ

چکی ہیں اور اردو کی دو کتابوں کے عربی ترجمے قاہرہ اور ریاض سے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔

بچپن میں سنن ونوافل کا بہت اہتمام کرتا تھا، اکثر خواب سچے ہوا کرتے تھے، لوگوں کی صورت دیکھ کر نام بتانے کا شوق تھا اور نوے فیصدی صحیح ہوتا تھا۔ دعا تعویذ سے شغل کبھی نہیں رکھا، مگر اسی زمانہ میں اعمال قرآنی، تعویذ سلیمانی، نقش سلیمانی، حرز سلیمانی وغیرہ خرید کر پڑھتا تھا، قوت خیالیہ کے کرشمے دکھائی دیتے تھے، اگر اسی راہ پر لگ جاتا تو زہد وتصوف کا رنگ غالب ہوتا، یہی وجہ ہے کہ احسان وتصوف کا ذوق فکری حد تک اب بھی ہے گو عملی طور سے اس سے دور ہوں، حقیقی تصوف اور صوفیہ سے عقیدت ومحبت ہے اور بزرگان دین اور مشائخ عظام کے تذکرے میں بڑا لطف وسکون پاتا ہوں۔

شعر وشاعری کا ذوق ابھرا تو اتنا غلو ہوا کہ خواب میں اشعار کہنے لگا، اگر یہ صورت باقی رہتی تو اچھا خاصا شاعر بن گیا ہوتا۔ تعلیم وتدریس کا سلسلہ زمانۂ طالب علمی سے جاری تھا اور اسی میں زندگی بسر کرنے کا ارادہ تھا، مدرسوں کی فضا صاف ہوتو یہ زندگی بڑی پرسکون اور خیر وبرکت کی ہے، اگر مدرسہ والے مجھے قبول کر لیتے تو میں بہترین مدرس ہو گیا ہوتا، اس کے باوجود ہر حال میں کسی نہ کسی طرح یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ان سب رجحانات پر علمی وتحقیقی ذوق یوں غالب رہا کہ ابتدائی چند سالہ مدرسی کے بعد تقریباً پورا دور صحافت اور اخبار نویسی جیسی سطحی مشغولیت میں گذرا مگر میں نے صحافی اور اخبار نویس بننا گوارا نہیں کیا بلکہ اس کو صرف ذریعہ معاش بنا کر اور اپنے کو علم وتحقیق اور تصنیف وتالیف میں مشغول رکھ کر ''خود کوزہ وخود کوزہ گر وخود گل کوزہ'' کے مانند کام کیا۔

☆☆☆☆☆

کاروانِ حیات (غیر مطبوعہ خودنوشت سوانح)

از فراغت تعلیم تا قیامِ بمبئی

مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوریؒ

فراغت کے بعد ملازمت کی تلاش شروع ہوئی، مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو دہلی لکھا کہ آپ قرآن کی تعلیم و تفہیم کا ادارہ جاری کرنے والے ہیں، میں بھی اس میں داخلہ کا امیدوار ہوں، مولانا نے جواب دیا کہ قوم کی بے توجہی سے اب تک اس کا انتظام نہیں ہو سکا ہے، اگر ادارہ جاری ہوا تو آپ کا خیال رکھا جائے گا، بات آئی گئی ہوئی، مولانا شکر اللہ صاحب کے مشورہ سے مولانا محمد منظور نعمانی کو لکھا کہ ''دفتر الفرقان'' میں جگہ ہو تو مجھے رکھ لیں، انھوں نے ٹیلیگرام کے ذریعہ لکھنؤ بلایا، اور جب گیا تو کہا کہ ندوۃ العلماء میں ہر جمعرات کو اجتماع ہوتا ہے، آپ اس میں میری تقریر نوٹ کریں، بیس روپیہ ماہوار ملے گا، یہ سوچ کر کہ ''لکھنؤ میں رہیں گے پر کھائیں گے کیا''، مایوسی کے بعد دفتر جمعیۃ علماء صوبہ یوپی میں گیا اور کہا کہ جمعیۃ علماء میں نشر و اشاعت کا شعبہ ہے، اس میں گنجائش ہو تو مجھے موقع دیں۔ مولانا بشیر احمد بھٹہ صدر تھے، انھوں نے کہا کہ فی الحال یہ شعبہ جاری نہیں ہے، پھر انھوں نے جمعیۃ علماء اور میرے مفاد میں کہا کہ آپ جمعیۃ کے لئے سفارت قبول کرلیں، چندہ کی رقم سے آپ کی تنخواہ اور جمعیۃ علماء کی آمدنی دونوں کا کام چلے گا، اس پیشکش کو بھی قبول نہ کر سکا، لکھنؤ سے ناکام واپس آیا، البتہ نخاس سے ڈریپر کی کتاب ''معرکۂ سائنس و مذہب'' مترجمہ مولانا ظفر علی خاں غالباً تین روپیہ میں خریدی، مکتبہ الفرقان سے نزھة الخواطر جلد اول خریدی، یہ سفر میں نے دس روپیہ قرض لیکر کیا تھا، اس وقت ریل کا کرایہ دو روپیہ ۱۴ر آنے تھا، اس درمیان میں برما کے جیل افسر آئے، انکو ایک دینی عالم کی ضرورت تھی، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کے مشورہ سے طے پایا کہ میں برما جاؤں، ہر دو سال کے بعد

واپسی ہوگی۔ تنخواہ وغیرہ گورنمنٹ دے گی، میں نے ان کی ایک دن دعوت بھی کی تھی، مگر واپسی کے بعد وہاں سے کوئی خط نہیں آیا۔

جب ہر طرف سے مایوسی ہوئی تو مولانا شکر اللہ صاحبؒ نے مدرسہ کے چندہ کے لئے بستی بھیجا، اور میں وہاں کے ایک طالب علم محمد تقی مرحوم کے گاؤں گیا۔ واپسی پر مولانا نے کہا کہ مدرسہ احیاء العلوم میں تم ایک سال حسبۃً للہ پڑھاؤ تو تم کو استحقاق ہو جائے گا، اور عربی درجہ میں لے لئے جاؤ گے، مرتا کیا نہ کرتا، والد صاحب سے مشورہ کے بعد مجبوراً حسبۃً للہ مدرس بن گیا، شوال ۱۳۵۹ھ میں۔ ظاہر ہے کہ استحقاق کی خاطر حسبۃً للہ پڑھانا دوسرے امیدواروں کے حق میں مضر تھا، اس لئے حسبۃً للہ کا جملہ مذاق اور طعن و تشنیع کے طور پر استعمال ہونے لگا، کسی طرح سال پورا ہونے کے بعد شوال ۱۳۶۰ھ میں باتنخواہ مدرسی کی باری آئی، تو مولانا نے بارہ روپیہ میری تنخواہ تجویز کی، میں نے عاجزانہ جرأت کر کے انکار کر دیا، اور کہا کہ یہ جگہ ۱۵؍روپیہ کی ہے، چنانچہ یہی رہی، اور ان کے وصال سے پہلے یا بعد میں تین روپیہ کا اضافہ ہوا، اور اٹھارہ روپیہ تنخواہ ہو گئی۔

آج کی طرح اس زمانہ میں مدرسوں میں روپیوں کی فراوانی اور بہتات نہیں تھی، مہینہ ختم ہونے پر ناظم کو مدرسین کی تنخواہ کا انتظام کرنا پڑتا تھا، اور بعض اوقات بڑی مشکل پیش آتی تھی، مدرسہ احیاء العلوم میں سب سے اونچے مدرس کی تنخواہ بیس روپیہ تھی، اس حساب سے بارہ یا پندرہ روپیہ بالکل مناسب تھی، پھر مولانا مرحوم مدرسہ کے انتظامی امور میں بے حد محتاط تھے، کیا مجال تھی کہ ایک پیسہ بھی بے جا خرچ ہو، پائی پائی کا حساب رکھتے تھے، البتہ مدرسہ کے لئے زمین اور عمارت کے بارے میں دور اندیشی سے کام لے کر روپیہ خرچ کرنے میں فراخ دل تھے، ایک مرتبہ حضرت مولانا فخر الدین صاحب علیہ الرحمۃ جمعیۃ الطلبہ کے جلسہ کی صدارت کے لئے تشریف لائے تو اہتمام کی بلند و بالا شاندار عمارت دیکھ کر فرمایا کہ ”جب مدرسہ کی عمارت اتنی شاندار ہوگی تو مدرسین کی تنخواہ کم ہوگی ہی۔“ شوال ۱۳۵۹ھ سے محرم ۱۳۶۴ھ تک ساڑھے چار نسال تک احیاء العلوم میں مدرسی کی، اسی دوران مولانا شکر اللہ صاحب نے کئی ماہ کی بیماری کے بعد دوشنبہ ۵؍ربیع الاول ۱۳۶۱ھ کو وصال فرمایا، اس وقت جماعت اور مدرسہ میں انتشار کی کیفیت

پیدا ہوئی، جس میں شدت آتی گئی۔

میں نے احیاء العلوم کی مدرسی کے زمانہ میں یہ کتابیں پڑھائیں ہیں، علم الصیغہ، نور الایضاح، قدوری، شرح نقایہ کبریٰ، ہدیہ سعیدیہ، ملاحسن، مقامات حریری، سبعہ معلقہ، مقدمہ ابن خلدون، (علوم کے متعلق حصہ) اور دیگر متوسطات۔ ہدیہ سعیدیہ اور مقامات ہر سال میرے ذمہ ہوتی تھی۔ اور میں ان دونوں کے پڑھانے میں ممتاز تھا، کئی طلبہ مقامات کی کاپی لکھتے تھے، بعض کے پاس اب تک محفوظ ہے، طلبہ اور استاذ کی عمر میں دو چار سال کا فرق تھا، اس لئے سب میں ذہنی ہم آہنگی تھی پڑھنے والوں اور پڑھانے والے دونوں میں نشاط رہتا تھا، چھوٹے بڑے بھائی معلوم ہوتے تھے، ان میں کئی وہ طلبہ بھی تھے جن کو میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں بھی پڑھاتا تھا، اس زمانہ میں قصبہ کے اطراف وجوانب کے طلبہ زیادہ ہوتے تھے، احیاء العلوم مرکز کی حیثیت رکھتا تھا، اس لئے طلبہ اور اساتذہ میں بڑی ہم آہنگی اور مناسبت رہتی تھی، گویا عزیزانہ تعلقات ہوتے تھے، اس لئے پڑھنے پڑھانے میں بڑا نشاط تھا، اس کے ساتھ ادب احترام میں فرق نہیں آتا تھا۔

بعض اوقات اثنائے درس میں کسی جگہ رک جاتا تو فوراً مولانا مفتی یٰسین صاحبؒ کے پاس جاکر عبارت کا مطلب معلوم کرتا تھا، وہ کہتے تھے کہ درس سے پہلے آکر پوچھ لیا کرو اس سے طلبہ پر برا اثر پڑے گا۔ میں عرض کرتا کہ میری طرح وہ بھی علمی معاملہ میں فراغت کے بعد اپنے اساتذہ سے استفادہ میں جھجک نہیں محسوس کریں گے، میں نے یہ بات مفتی صاحب سے ہی سیکھی تھی، زمانۂ طالب علمی میں وہ ہم لوگوں کو پڑھاتے وقت کہیں اٹک جاتے تو فوراً لغت وغیرہ اٹھا کر دیکھتے تھے، اور ہم لوگوں سے بھی کہتے تھے کہ فلاں کتاب میں دیکھو کہ کیا لکھا ہے؟ جب ہمارے استاذ اثنائے درس ہمارے سامنے رک جاتے اور مشکل حل کرنے میں ہم سے بھی تعاون یا استفادہ کے خواہشمند تھے، تو ہم اپنے شاگردوں کے سامنے انکو سکھانے کیلئے ایسا کیوں نہ کریں۔

مدرسی کا یہ دور معاشی اور خانگی حالات کے اعتبار سے میرے لئے بڑا صبر آزما اور کٹھن گزرا ہے، مگر ذہنی اور فکری اعتبار سے بڑا پُر بہار رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس قدر پریشان خاطری بڑھتی جاتی ہے، اسی قدر ہمت وحوصلہ میں توانائی آتی جاتی ہے، میں کوئی فن اور ہنر نہیں جانتا تھا،

مدرسی کے علاوہ کیا کرسکتا تھا؟ پھر بچپن ہی سے پڑھنے پڑھانے کا شوق تھا، اور اسی میں مزاج بنا تھا ،اس لئے مدرسی میں خوب جی لگتا تھا، اور جم کر پڑھاتا تھا، اور آج بھی مدرسہ ہی کا مزاج ہے۔ اگر مولانا شکر اللہ صاحب اس طور سے میری دستگیری نہیں کرتے تو میں بہر حال مجبوراً کسی کام میں لگ جاتا اور سب کچھ کیا کرایا خاک میں مل جاتا، جیسا کہ اس موقع پر بہت سے اہل علم جوان ضائع ہوجاتے ہیں، مدرسوں میں ہنر سکھانے کا خیال وعمل غلط نہیں ہے، عام حالات میں مفید ہے، مگر فراغت کے بعد ہنر مند مولوی جب معاشی پریشانی میں مبتلا ہوگا تو علمی زندگی سے علٰیحدگی اختیار کرکے اسی میں لگ جائے گا، مجھے کوئی فن آتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا، اچھا ہوا کہ کوئی ہنر نہیں جانتا تھا، اور حالات کے خارزاروں سے گزرتا ہوا اپنے علمی دامن کو بچائے رکھا، مگر یہ ہر مولوی کے بس کی بات نہیں ہے۔

اسی زمانہ میں پروفیسر محمد حسن الاعظمی ازہری اپنے وطن مبارکپور آئے، اور انھوں نے یہاں **رابطة الادباء** کے نام سے ایک علمی انجمن قائم کی، اور طے پایا کہ اس انجمن کی طرف سے ایک ماہوار قلمی رسالہ عربی زبان میں نکالا جائے تاکہ طلبہ ومدرسین کو عربی زبان میں لکھنے کی مشق ہو۔ اس رسالہ کی ادارت میرے ذمہ تھی، چند نمبر نکل سکے جن میں اساتذہ کے مضامین عربی میں ہوتے تھے۔ اسی دوران میں نے اپنی کتاب ''مرآۃ العلم'' کو تالیفی شکل دی، جس کو زمانہ طالب علمی میں جمع کیا تھا، گویا طباعت کے لئے تیار ہوگئی، اس کے آخر میں لکھا: **كنت ألّفتُ هٰذا الكتٰبَ في زمن الطلب ثُمَّ بَيَّضْتُهٗ وسَمَّيْتُهٗ. ''مِرآة العلم''** ۱۳۶۳ھ میں اس کو مدرسہ سے شائع کرنے کا ارادہ تھا، اس کے پہلے صفحہ پر لکھا تھا: **تحت إدارةِ مجلس احياء العلوم الاسلاميه مباركفور اعظم گڈه (الهند)** اسی دوران ''جمال الدین افغانی کے رسالہ ''**الوحدة الاسلاميه**'' اور بعض دوسرے رسالوں کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا، شباب کمپنی بمبئی (ابنائے مولوی محمد بن غلام رسول السورتی تجار الکتب جالی محلہ بمبئی کی قائم کردہ) سے خط وکتابت کرکے اسی کے لئے یہ ترجمہ کیا تھا، جس کے معاوضہ میں دس روپیہ اور ایک کاپی، اور میرے نام وپتہ کی انگریزی میں ربڑ کی ایک مہر آئی تھی، میں نے معاوضہ کے سلسلہ میں انھیں پر فیصلہ چھوڑ دیا۔ جس پر انھوں نے خط میں یہ مصرعہ لکھا:

آپ نے الجھن میں الجھن ڈال دی

میں نے اس کے جواب میں لکھا

ہمنواہوں میں بھی تیرا عندلیب　میں نے کیا الجھن میں الجھن ڈال دی

اور جب بمبئی پہونچا تو یہ ہمارے مخلص مولوی عبدالعزیز نکلے، جو کتب خانہ کے مالک تھے، اسی زمانہ میں ان کو میں نے اپنی نظم ''اصحاب صفہ'' جو تقریباً ڈھائی سو اشعار پر مشتمل تھی، اس کو شائع کرنے کے لئے دیا مگر شائع نہ ہوسکی، اور نہ ہی مجھے مل سکی۔ اس دور میں تصنیفی و تالیفی ذوق کی تسکین نہ ہوسکی، نہ مضمون نگاری باقی رہ سکی، البتہ شعر و شاعری اپنے پورے عروج پر تھی، تنگ دستی اور پریشان خاطری میں فطری اور ذہنی پرواز میں کوتاہی نہیں آئی، بلکہ اس میں تیزی اور توانائی آگئی، (۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۴ء تک کا) یہ دور ہندوستانی سیاست میں بڑا ہنگامہ خیز گزرا ہے۔ دوسری جنگ عظیم جاری تھی، ہندوستان کی آزادی کا عمل تیز تر ہورہا تھا، پورا ملک فسادات اور سیاسی ہنگاموں کی رزم گاہ بنا ہوا تھا، اور یہ دور میری مدرسی کا ہے، جس میں ۱۵/اور ۱۸/روپئے میں گزر کرنا پڑا، گھریلو پریشانی الگ تھی، اس میں میری شاعری کا شباب تھا، غزلوں میں ذاتی رجحانات کی عکاسی ہوتی تھی، اور نظموں میں تحریک آزادی کا رنگ ہوتا تھا، ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۵ء تک میری غزلیں اور نظمیں سہ روزہ ''زمزم'' لاہور، اور سہ روزہ ''مسلمان'' اور بعد میں ''کوثر'' لاہور میں مستقل طور سے شائع ہوتی تھیں، کئی غزلیں اور نظمیں ''مدینہ'' بجنور میں بھی شائع ہوئیں، اور جیسا کہ معلوم ہوگا کہ میری شاعری نے مجھے امرتسر اور لاہور پہونچایا، گرانی و نایابی کا دور تھا، ذریعۂ آمدنی بالکل محدود تھا، طرح طرح کی الجھنیں تھیں، میں مدد کیا کرتا، اپنا اور بال بچوں کا خرچ پورا نہیں کرسکتا تھا، اس لئے مدرسہ احیاء العلوم میں مدرسی کے کچھ دنوں بعد مجھے وقتی طور پر اپنے خورد ونوش کا انتظام الگ کرنا پڑا، اور میں موجودہ مسکونہ مکان میں آگیا، جس میں اس وقت اندر اور باہر دو کمرے تھے، خالد کمال اور انور جمال دو بچے تھے، اور زوجین کل چار نفر تھے، انور جمال بچپن ہی سے ''خنازیر'' کا مریض تھا، اسی تنخواہ میں گزر بسر کرنا تھا، اور بچہ کا علاج بھی، اس دور میں ایسا بھی ہوا کہ آٹا گھول کر اور نمک کے ساتھ پکا کر وقت کاٹ لیا گیا، بسا اوقات سالن کی جگہ پیاز، لیموں، مرچ اور نمک کا کچومر استعمال کیا، دو پیسے ایک آنے کا گوشت بہت آسانی سے کام دیتا تھا،

اس زمانے میں آج کی طرح گرانی اور نایابی نہیں تھی، مگر اس دور کے لحاظ سے گرانی تھی، ایک روپیہ کا ڈیڑھ پونے دو سیر گیہوں، چاول ملتا تھا، مگر لوگوں کے پاس پیسہ نہیں تھا، اس لئے بڑی غربت تھی۔ اعظم گڈھ سے ۱۲؍آنے کی ایک انگیٹھی لایا، ایک آنے کا گڑ (بھیلی) صبح کو لاتا اور چائے بن جاتی تھی، اور رات کی بچی کچھی روٹی ناشتے میں کام آتی، بعض اوقات اس کا بھی انتظام نہیں ہوتا تھا، آج کے دور میں اس صورتحال کو غربت اور افلاس سے تعبیر کیا جائے گا۔ کیونکہ آج گرانی اور نایابی کے باوجود لوگ بہتر سے بہتر کھاتے ہیں، اور بہتر سے بہتر پہنتے ہیں، مگر اس زمانہ میں بڑے سکون کی زندگی تھی، اور جو کچھ ہوتا تھا امور خانہ داری کے تحت ہوتا تھا، اس زمانہ میں مختصر سی تنخواہ پانے والے مدرسین بہت خوشحال اور مطمئن مانے جاتے تھے اور لوگ ان پر رشک کرتے تھے، خود میرے یہاں اس زمانہ میں احباب واضیاف کی پُرتکلف (اس وقت کے لحاظ سے) دعوت ہوتی تھی، بچوں کی والدہ میرے علم کے بغیر انتظام کے طور پر بچا بچا کر رکھتی تھی، اور اسی مختصر سی آمدنی میں ہر کام چلتا تھا، اس دور میں اپنی غربت کا کبھی احساس تک نہ ہوا، اور نہ صحت وتندرستی پر کوئی اثر پڑا، بلکہ چار سے اچھا کھایا اور پہنا، روکھے کھانے میں جو لذت اس وقت ملتی تھی، آج اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے، یہی حال صحت وتندرستی کا تھا۔

واقعی معلموں اور مدرسوں کی تنخواہ میں بڑی برکت ہوتی ہے، وہ مختصر سی آمدنی میں خوش خوری اور خوش پوشی میں اس مقدار کی آمدنی والے عوام سے ممتاز ہوتے ہیں، صحت وتندرستی بھی اچھی رہتی ہے، کیونکہ اس میں مسلمانوں کی حلال روزی کی اجتماعی برکت شامل ہوتی ہے، مگر اب یہ بات باقی نہیں رہی۔ کیونکہ مدارس کی آمدنی میں حلال وحرام کی تمیز بہت کم رہ گئی ہے، اور آنکھ بند کر کے چندہ وصول کیا جاتا ہے، پہلے زمانہ میں لوگ اپنی حلال کمائی سے مدرسوں کی امداد کرتے تھے، جس کا فیض ظاہر ہوتا تھا، نیز رسول اللہ ﷺ نے دینی علم کے معلم ومبلغ کے حق میں دعا فرمائی ہے۔: **نَضَّرَ اللّٰہُ إمْرأً سمع مقالتی فوعاها ثم بلغها**، یہ دعا ہر قسم کی بشاشت وشادابی کے لئے ہے۔ اور اس برکت کا ظہور اہل علم کی قناعت اور میانہ روی سے ہوتا ہے، **أللّٰهم ارزقنی كفافاً وقنعنی بما رزقتنی** اور **الاقتصاد نصف المعيشة**.

اس وقت یکہ کا کرایہ اسٹیشن تک ۲؍آنہ اور ریل کا کرایہ مئو تک ۴؍آنہ تھا۔ میں دوستوں کی

ملاقات کے لئے اکثر مئو جاتا تھا، یہاں سے پیدل محمد آباد جاتا تھا، اس وقت پیدل چلنا عام رواج تھا، بچوں کے ننھیال کی خیریت وغیرہ معلوم کرکے ۲؍آنہ ریل کا کرایہ دے کر مئو چلا جاتا تھا اور واپسی پر محمد آباد اتر کر پیدل چلا آتا، اس لئے ۱۲؍آنے کے بجائے صرف ۴؍آنے میں کام چل جاتا تھا اور ۸؍آنے کی بچت ہو جاتی تھی، آمدنی کے مطابق خرچ کرنا اقتصاد ہے، جو نصف معیشت ہے، میں نے اس دور میں کسی سے قرض نہیں لیا، اور نہ ہی بعد میں یہ کام کیا، حالانکہ اس دور میں اور اس کے بعد کئی نازک وقت آئے۔

تقریباً پانچ سال تک احیاء العلوم میں تدریسی خدمت انجام دی، شروع ہی سے پڑھنے پڑھانے کا مزاج تھا، اور اسی میں رہنے کا ارادہ تھا۔ غالباً مولانا مرحوم کے انتقال کے بعد تنخواہ میں اضافہ ہوا، اور ۱۵؍روپیہ سے ۱۸؍روپیہ ہوگئی، خیال تھا کہ اگر ۲۵؍روپیہ تنخواہ ہو جائے گی تو تدریسی خدمت کرتا رہوں گا، مگر اس کی توقع نہیں تھی، تین روپیہ کے اضافہ ہی پر مدرسہ کے بعض اراکین طنز و مزاح سے غیرت کو ٹھیس پہونچاتے تھے، اسی درمیان مدرسہ اور مدرسین کے معاملات نازک صورت اختیار کر گئے، مدرسہ کی مجلس شوریٰ ہوئی، اور ۲؍بجے رات تک گفتگو ہوتی رہی، مدرسین بھی موجود تھے، اراکین کے ہتک آمیز رویہ پر میں نے رات ہی میں استعفاء دے دیا، استعفاء کی عبارت کچھ اس طرح تھی،:

''مدرسی اور معلّمی کے شریف دامن کو جب ''جہالت کے شرارے'' جلا دینا چاہتے ہوں تو ایسی حالت میں علٰیحدگی اختیار کر لینی چاہئے، فی الحال میری اس تحریر کو استعفاء سمجھا جائے، ویسے مدرسہ اپنا ہے۔ آئندہ حسب قدرت خدمت سے دریغ نہیں ہوگا۔''

ارکان کمیٹی نے کہا کہ ان کو بلا کر پوچھا جائے کہ ''جہالت کے شرارے'' کیوں لکھا، مگر بعض سمجھدار ارکان نے کہا کہ جب وہ علٰیحدہ ہو رہے ہیں تو آزادی سے مزید تند و تلخ باتیں کر سکتے ہیں، اور میرا استعفاء منظور ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

امرتسر کا سفر

غالباً ۲۴؍نومبر ۱۹۴۴ء کو پہونچا تھا

قیام مبارکپور کا زمانہ میری شاعری کے شباب کا زمانہ ہے، غزلیں اور نظمیں خوب کہتا تھا، تغزل میں اصغر گونڈوی مرحوم سے زیادہ متأثر تھا، ان کے دونوں دیوان ''نشاطِ روح'' اور ''سرودِ زندگی'' مطالعہ میں رہ چکے تھے، نظموں میں احسان دانش کا تتبع کیا، اسی کے ساتھ سیاسی نظمیں بھی کہتا تھا، میری غزلیں اور نظمیں لاہور کے سہ روزہ ''زمزم'' میں اور سہ روزہ ''مسلمان'' بعد میں ''کوثر'' میں زیادہ شائع ہوتی تھیں، کئی غزلیں اخبار ''مدینہ'' بجنور میں بھی چھپیں، اس وجہ سے ''زمزم'' اور ''مسلمان'' دونوں اخبار مستقل طور میرے نام آتے تھے۔ غزلیں ''مئے طہور'' کے عنوان سے چھپتی تھیں، ''زمزم'' میں مرکز تنظیم اہل سنت امرتسر کے مضامین پورے ایک صفحہ میں شائع ہوتے تھے، جن میں شیعوں اور قادیانیوں کا رد ہوتا تھا، اس تنظیم کے روح رواں مولانا سید نورالحسن بخاری دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے، ان کا وطن ملتان تھا، وہ میری غزلوں اور نظموں کو پڑھتے تھے، اور غائبانہ تعارف تھا، میں نے ان کو لکھا کہ ''مرکز تنظیم اہل سنت'' میں گنجائش ہوتو مجھے بلالیں، آپ کے علمی اور دینی کاموں میں تعاون کروں گا، انھوں نے بڑے انشراح سے لکھا کہ ''مرکز تنظیم میں تیس روپیہ ماہوار اگر منظور ہوتو آجایئے'' ایک حسبۃً للہ، پھر ۱۵؍روپیہ ماہوار، پھر ۱۸؍روپیہ ماہوار، اور ۳۰؍روپیہ کی اطلاع سے انشراح ہوا، اور امرتسر جانے کی تیاری کی، نومبر کا مہینہ تھا، پنجاب کی سردی مشہور ہے، اس وقت والد مرحوم بسلسلۂ تجارت الہ آباد میں تھے، میں یہاں سے الہ آباد گیا، وہاں جاڑے کے کپڑے بنوائے، اور اس طرح امرتسر روانہ ہوا، الہ آباد سے ایک ٹرین لکھنؤ آرہی تھی، جس ڈبہ میں گیا، اس میں سکھ فوجی تھے۔ اندر داخل نہیں ہونے دے رہے تھے، مگر جب معلوم ہوا کہ میں امرتسر جارہا ہوں تو بڑی خوشی سے جگہ دی، اور تاکید کی سگریٹ نہ پینا، لکھنؤ سے دہلی جانے والی گاڑی پر سوار ہوا تو اس میں ایک مسلمان تھا، جو رستہ بھر انجن سے گرم پانی لاکر ۵ چائے بناتا اور مجھ کو بھی پلاتا تھا، راستہ میں مرادآباد اتر گیا، ایک روز مدرسہ شاہی میں رہ کر دوسرے دن رات کو امرتسر کیلئے روانہ ہوا، طلبہ جن میں بعض مبارکپوری شاگرد تھے، اسٹیشن ساتھ آئے، اور غالباً بارہ بجے رات میں گاڑی امرتسر کے لئے روانہ ہوئی، اور دوسرے روز شام کو ۴؍بجے امرتسر اسٹیشن پر پہونچا، غالباً ۲۴؍نومبر ۱۹۴۴ء کی تاریخ تھی، ۲۷، ۲۸ سال کی عمر تھی، دس ماہ مرادآباد میں رہا، اسی درمیان ایک مرتبہ دہلی گیا تھا۔ اس سے زیادہ

اوراس سے آگے کبھی سفر نہیں کیا تھا،اور سفر بھی کیا تو پنجاب جیسے دور دراز مقام کا،اسٹیشن کے قلی پنجابی میں بات کرتے تھے،میں نے ایک قلی کے سر پر سامان (بکس،بستر) رکھا،اور شریف لاج ،کٹرہ مہان سنگھ چلنے کو کہا،غروب کے قریب جب منزل مقصود پر پہونچا تو معلوم ہوا کہ مولانا نورالحسن صاحب لاہور گئے ہیں کل آئیں گے،ایک صاحب نے ایک کمرہ کی طرف اشارہ کیا کہ اس میں سامان رکھو۔

بھوک کی شدت تھی،میں سامان رکھ کر باہر نکلا کہ کہیں ہوٹل ہوتو کچھ کھا پی لوں،مگر بالکل اجنبی تھا،راستہ بھول جانے کے ڈراور زبان نہ جاننے سے،قریب ہی ایک دوکان دیکھی،اندازہ ہوا کہ کھانا ملتا ہے،اوپر گیا،یہ انتہائی گندہ،عامی ہوٹل تھا،چٹائی کی درازوں میں کالی کالی مٹی جمی ہوئی تھی،اس پر بیٹھنا اور کھانا بڑی بدذوقی کا مظاہرہ تھا،مگر اجنبیت اور بھوک نے اس کو گوارا کیا، دو روٹی اور دال کی قیمت ۲؍آنے تھی،مالک نے کہا کہ یہاں دال کا پیسہ نہیں لیا جاتا دو روٹی دوآنے کی ہے۔وہاں سے نکل کر مٹی کا ایک چراغ خریدا اور اس میں تیل ڈالا،اور کمرے میں آکر بتی تلاش کی،اس طرح چراغ جلا کر مسافرت کی پہلی رات کا استقبال کیا،سفر کی تکان تھی،جلد ہی سوگیا،دوسرے دن شام کو مولانا نورالحسن صاحب لاہور سے تشریف لائے اور تپاک سے ملے، غیر حاضری کی معذرت کی،امرتسر کے مشہور تفریحی مقام یا پارک رام باغ لے گئے،اور میرے کھانے کا انتظام اپنے یہاں کیا،ان کے بال بچے بلڈنگ کے پہلے منزلہ پر رہتے تھے،اور وہیں سے کھانا ناشتہ آتا تھا۔

شریف لاج کٹرہ مہان سنگھ کے چاروں طرف کئی منزلہ بلڈنگیں تھیں،درمیان میں بہت بڑا صحن تھا،اندر داخلہ کا راستہ پورب،پچھم دونوں طرف بلڈنگیں تھیں اوپر چھت تھی،رات میں بجلی جلتی تھی،اس طرح یہ لمبا راستہ یا گلی اندھیرے میں گزرنا مشکل تھا،ایک بڑے صحن میں ایک طرف کچھ بھینسیں تھیں،جن کے نگراں کچھ پنجابی (پنڈو) لڑکے تھے،امرتسر پہلے احباب یہی دیہاتی لڑکے تھے،جو خالص پنجابی زبان بولتے تھے،بعد میں امرتسر کے غزنوی خاندان کے ایک صاحبزادے خالد میرے پاس آیا کرتے تھے،اوران سے اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی،ایک اور نوجوان جو اسی طرف لاج میں رہتا تھا،میرے پاس آیا کرتا تھا،بعض کھانے کی کچھ چیزیں بھی لاتا

تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے خلیفہ دوم مرزا بشیر الدین کا پوتا یا کوئی رشتہ دار ہے، مولانا مضامین لکھتے تھے، میں ان کی مدد کرتا تھا، اس زمانہ میں امرتسر سے لاہور کا کرایہ ۶؍آنہ تھا، درمیان میں تیس میل کا فاصلہ تھا، راستہ جلوا ٹاری، تاج پوری وغیرہ اسٹیشن پڑتے تھے، لاہور میرے خوابوں کی تعبیر تھا، یہیں کے اخباروں میں میرے اشعار شائع ہوتے تھے، مدرسہ میں یہاں کے ادبی رسائل ''نیرنگِ خیال'' ''ادبی دنیا'' اور ''ادبِ لطیف'' وغیرہ آتے تھے، دہلی لکھنؤ کے بعد لاہور اردو ادب کا مرکز تھا، شعراء و ادباء کا مجمع تھا، پہلی بار لاہور پہونچا تو اجنبیت اور پنجابی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے انارکلی بازار اور موہن روڈ پوچھتا ہوا پیدل ''زمزم'' کے دفتر میں پہونچا، جو پیسہ اخبار گلی کے پاس پہلے منزلہ پر تھا، کسی سے جان پہچان نہیں تھی، ہر چیز اور ہر شخص میں انسیت و اجنبیت کا ملا جلا احساس تھا، مگر دفتر میں تمام عملہ مغربی یوپی کا تھا، جس سے یک گونہ اطمینان ہوا، مولانا محمد عثمان فارقلیط مرحوم سے غائبانہ یوں واقفیت تھی کہ ان کا نام سب سے پہلے اخبار ''الجمعیۃ'' کے حلقہ ادارت میں دیکھا تھا، پھر اخبار ''مدینہ'' بجنور کی ادارت میں دیکھا اور اب وہ اخبار ''زمزم'' کے اڈیٹر تھے، منشی عبدالرحیم ساقی مینجنگ ڈائریکٹر تھے، کاتب اور ملازم بھی بجنور، گنگوہ وغیرہ کے تھے، میں نے اپنا نام ونشان نہیں بتایا، دسمبر کی ابتدائی کوئی رات تھی، رات کو دفتر بند ہونے لگا، تو منشی عبدالرحیم صاحب نے کہا کہ آپ مولانا نورالحسن صاحب کے آدمی ہیں، ان کا بستر وغیرہ دفتر میں ہے، آپ بھی یہیں سو جایئے، میں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں اجنبی آدمی ہوں، دفتر میں رات کو سونا مناسب نہیں ہے، میں رات کو دفتر میں چوری کر کے چلا جاؤں تو آپ کیا کر سکتے ہیں، بہتر ہے کہ دفتر بند کر کے باہر گیلری میں کرسی رکھوا دیں، اسی پر رات بسر کرلوں گا، اجنبی شخص پر پورا دفتر چھوڑنا کسی طرح مناسب نہیں ہے، میں اپنی بات پر اصرار کرتا رہا، اور وہ کہتے رہے کہ سخت سردی پڑ رہی ہے، رات باہر کرسی پر کیسے گزار سکتے ہیں، مولانا نورالحسن صاحب نے آپ کو بھیجا ہے، جب انھوں نے آپ پر اعتماد کیا ہے تو ہم بھی اعتماد کرتے ہیں، بہر حال منشی عبدالرحیم صاحب نے دفتر میرے حوالہ کر دیا۔ اور میں نے لاہور کی پہلی رات وہاں گزاری۔

اس کے بعد عام طور پر ہفتہ میں دو بار لاہور آتا جاتا رہا۔ اور اجنبیت ختم ہوتی رہی، مگر اب

بھی میں نے اپنا نام ونشان نہیں بتایا، اس درمیان میری بعض غزلیں بھی حسب سابق ''زمزم'' میں چھپتی رہیں۔ اور پیسہ اخبار، انارکلی بازار میں گھومتا پھرتا رہا، ابتداء میں ہوٹل وغیرہ کا پتہ نہیں چلتا تھا، کئی راتیں پھل وغیرہ کھا کر رہا، بعد میں پیسہ اخبار کے ایک ہوٹل میں کھانے لگا۔ ایک مرتبہ امرتسر سے لاہور جارہا تھا، میرے قریب ایک بوڑھا پنڈو (دیہاتی) بیٹھا تھا، اس نے مجھے مولوی صورت دیکھ کر حیاتِ مسیح کی بحث چھیڑ دی، وہ قادیانی تھا، اس نے مشہور حدیث ''لو کان موسیٰ حیاً ما وسعهٔ إلا اتباعي'' کے مقابلے میں ملاعلی قاری کے حوالے سے بتایا کہ ایک حدیث میں ''لو کان موسیٰ وعیسیٰ حیاً'' ہے، اس کا مطلب یہ تھا کہ اس حدیث سے وفات مسیح ثابت ہوتی ہے۔ باطل مذہب والے جاہلوں کو صرف پھنساتے ہی نہیں، بلکہ ان کو اپنا مبلغ بھی بناتے ہیں۔

ایک مرتبہ ''زمزم'' میں مضمون دے کر امرتسر آیا تو معلوم ہوا کہ اس میں کوئی اہم تبدیلی ضرور ہوئی ہے، اس لئے چار بجے رات کو جانا پڑا، شریف لاج والا راستہ دور تک یوں تھا کہ دونوں جانب بلڈنگیں تھیں، اور اوپر چھت تھی، راستے کی بجلی بجھی ہوئی تھی، اندھیرا گھپ تھا، میں اس میں آہستہ آہستہ جارہا تھا بیچ راستے میں ایک بیل بیٹھا تھا، میں اس پر گر پڑا اور بیل گھبرا کر بھاگنے لگا، نہ میں اس کو دیکھتا تھا، اور نہ وہ مجھ کو دیکھتا تھا، دونوں ایک دوسرے سے ڈرتے تھے، میں درمیان میں نہ ادھر جاسکتا تھا نہ ادھر جاسکتا تھا، کچھ دیر کھڑا رہا، پھر ڈرتے ڈرتے آگے بڑھتا رہا، حتیٰ کہ بخیر وعافیت یہ خطرناک منزل طے ہوگئی۔

ایک مرتبہ مولانا نورالحسن بخاری کوئی مضمون مجھ سے لکھوا رہے تھے، انھوں نے اپنے ملتانی لہجے میں ''عُجب وریاء'' کا جملہ استعمال کیا، میں اس کو بالکل نہیں سمجھ سکا، اور جوں کا توں ''اُج بُریا'' لکھ دیا، بعد میں انھوں نے پوچھا کہ کیا ہے، میں نے کہا کہ جو آپ نے کہا وہی میں نے لکھا، تو انھوں نے لکھ کر بتایا کہ میں نے ''عُجب وریاء'' کہا تھا، مگر ملتانی پنجابی لہجہ کی وجہ سے آپ اس کو نہیں سمجھ سکے، تنظیم کے صدر محمود خان نواب لغاری اور مولانا ایک مرتبہ بات کررہے تھے، مجھے اندازہ ہوا کہ کسی معاملہ میں دونوں جھگڑا کررہے ہیں، میں نے منع کیا تو مولانا نے کہا کہ ہمارے یہاں کا یہی لب ولہجہ ہے، ایک مرتبہ کسی بات پر میں نے ''لال'' کے بجائے ''لال

والا'' کہہ دیا تو مولانا نے تنبیہی لہجہ میں کہا کہ ''لال والا'' کیا؟ صرف ''لال'' کافی ہے، آپ لوگ یوپی والے اہل زبان ہیں، ہم آپ سے اردو سیکھتے ہیں، آپ ہی لوگ اس قسم کے الفاظ استعمال کریں گے تو حجت بن جائیں گے، امرتسر پہونچنے کے دوایک دن بعد ایک مسجد مین نماز پڑھنے گیا، وہاں ایک صاحب کوٹ پتلون میں جلدی جلدی نماز پڑھ رہے تھے، رکوع وسجود بھی ٹھیک سے نہیں کرتے تھے، میں نے ان کو ٹوک دیا، اس پر وہ مجھ پر برس پڑے، اور مولویوں کو بہت سخت سست سنایا، میں اپنی اجنبیت اور بے زبانی پر خاموش سنتا رہا۔

قیام امرتسر بہت مختصر رہا، اس مدت میں شہر سے کوئی خاص انس وتعلق پیدا نہیں ہو سکا، ویسے بھی وہاں کوئی علمی وادبی سرگرمی نہیں تھی، البتہ مولانا ثناءاللہ صاحب امرتسری کی ذات مرجع تھی، وہ مبارک پور کے اہل حدیث علماء خاص طور سے مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوریؒ، مولانا عبدالسلام مبارکپوری وغیرہ سے خاص تعلق رکھتے تھے، میں ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا تھا، ہال بازار میں مشرقی جانب ثنائی پریس ان کے صاحبزادے مولانا عطاءاللہ چلاتے تھے، اسی کے قریب مولانا کا مکان تھا، ہفتہ وار ''اہلحدیث'' جاری تھا، مولانا پرانے طرز کے ایک بڑے مکان میں پہلے منزلہ پر قیام فرماتے تھے، ایک صاحب فتویٰ لکھنے پر مامور تھے، مولانا بولتے تھے اور وہ لکھتے تھے، جب میں پہونچ جاتا تو مولانا ان سے کہتے کہ ان کو لکھنے کو دے دو، یوپی والوں کا خط اور ان کی زبان دونوں اچھے ہوتے ہیں، اس طرح مولانا نے کئی فتاوے مجھ سے لکھوائے، میرے لئے یہ شرف باعث فخر ہے، مولانا میرا بہت لحاظ فرماتے تھے اور بڑے انشراح سے ملتے تھے۔

ہال بازار کی مسجد خیر الدین میں کبھی کبھی نماز پڑھنے چلا جاتا تھا، کبھی ثنائی پریس میں امرتسر کے قیام کے دوران سکھوں کا سنہری گرودوارہ اور جلیان والا باغ تک نہیں دیکھا، شاید کچھ مدت وہاں قیام رہتا تو کوئی حلقۂ احباب پیدا ہو جاتا، ویسے وہاں جی نہیں لگتا تھا، کچھ دوری پر لاہور تھا، جس مین ہر طرح کی کشش تھی، اسی دوران میں ایک مرتبہ سونی پت ضلع کرنال میں ایک دینی جلسہ میں مرکز تنظیم اہل سنت کی طرف سے گیا، سخت سردی کا زمانہ تھا، چار پانچ سیر روئی کی رضائی اور بستر کے ساتھ امرتسر سے کالکا میل میں سوار ہوا، اور امبالہ تک بستر لئے کھڑا کھڑا آیا، پلیٹ فارم پر سویا، صبح سونے پت کی گاڑی پر وہاں گیا، وہاں سے دہلی آیا، اور وہاں سے پھر امرتسر واپس

گیا، الغرض ۲۵ رنومبر ۱۹۴۴ء سے ۱۲ رجنوری ۱۹۴۵ء تک تقریباً ڈیڑھ ماہ امرتسر میں قیام رہا، اس کے بعد مستقل طور سے لاہور چلا گیا، اس درمیان میں کوئی علمی یا ادبی کام نہیں ہوسکا۔

امرتسر سے لاہور

بتا چکا ہوں کہ میں امرتسر سے مرکز تنظیم اہل سنت کے نشریات کے سلسلے میں لاہور جایا کرتا تھا، اور اکثر رات کو اخبار ''زمزم'' کے دفتر میں سو جاتا تھا، اسی درمیان میں پنجاب کے کسی کالج کے پروفیسر پنجاب یونیورسٹی میں امتحان دینے کے لئے آئے، اور اخبار ''زمزم'' کے دفتر میں قیام کیا، ایک رات وہ ''دیوان غنی کشمیری'' کا مطالعہ کر رہے تھے۔ جو نصاب میں داخل تھا، ایک غزل کے اشعار حل کرنے میں ان کو مشکلات درپیش تھیں اور دیر تک الجھے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی پریشانی دیکھ کر کہا کہ کتاب لایئے، میں بھی ذرا دیکھوں اور تھوڑی دیر مطالعہ کرنے کے بعد میں نے پوری غزل کا مطلب ان کو سمجھا دیا، انھوں نے پوچھا کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ میں نے جب اپنا وطن ''اعظم گڈھ'' بتایا تو انھوں نے کہا کہ جبھی آپ نے ان مشکل اشعار کو اتنی جلدی حل کر دیا، ہندوستان کا کوئی علمی ادارہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس میں اعظم گڈھ کا کوئی عالم نہ ہو، اس کے بعد انھوں نے میرا نام وغیرہ دریافت کیا، اور میں نے بتا دیا۔

صبح کو انھوں نے مولانا محمد عثمان فارقلیط اور منشی عبدالرحیم وغیرہ سے اس کا تذکرہ کر کے میرا نام وغیرہ بتایا، اس کے بعد دونوں صاحبوں نے مجھے بلا کر سخت فضیحت کیا، اور کہا کہ اب تک آپ نے اپنے کو چھپائے رکھا، اس کے بعد دفتر کے تمام عملہ سے خاص تعلق پیدا ہو گیا، اور سب لوگ خلوص و محبت سے پیش آنے لگے، ''زمزم'' میں میرے اشعار ۱۹۴۱ء سے شائع ہوتے تھے، (۱۵ رستمبر ۱۹۴۰ء میں میری پہلی غزل ''اسرار'' کے عنوان سے ''زمزم'' میں چھپی، ۹ راشعار تھے، مطلع یہ تھا:

خلوتِ بے نیاز کو سلطنتِ شہی سمجھ   بے خودیٔ خودی میں ڈوب، سر قلندری سمجھ)

جن میں غزلیں، نعتیں، قومی و سیاسی نظمیں ہوا کرتی تھیں، اور دفتر والے غائبانہ مجھے جانتے تھے، اس طرح میری شاعری امرتسر اور لاہور تک آنے کا ذریعہ بنی بلکہ اس نے مجھے بمبئی تک پہونچایا۔

چند دن کے بعد منشی عبدالرحیم صاحب اور مولانا فارقلیط صاحب نے اصرار کے ساتھ کہا کہ آپ وہاں کیا کرتے ہیں، یہاں چلے آیئے، ہم آپ کو ساٹھ روپیہ ماہوار دیں گے، ''زمزم لمیٹڈ کمپنی، لاہور'' کی طرف سے ایک تفسیر شائع ہونے والی ہے۔ مولانا فارقلیط کی نگرانی میں یہ کام ہوگا، آپ اس کے جمع وترتیب کی ذمہ داری سنبھال لیں، اس کی صورت یہ ہوگی کہ ہندوستان میں مروجہ تمام تفسیروں کا خلاصہ یکجا کیا جائے گا۔ طویل مباحث کا اختصار ہوگا، اہم اور مختصر مضامین کی تشریح ہوگی، اس کام کے لئے کمپنی نے دو لاکھ روپیہ منظور کیا ہے، ایک لاکھ تالیف وترتیب اور طباعت واشاعت پر خرچ ہوگا، حاشیہ پر تفسیر ہوگی، قرآن کے متن، ترجمہ اور تفسیر میں سے ہر ایک کی طباعت مختلف رنگ میں ہوگی۔ یہ ایک مستقل کام ہے، اس کے بعد آپ اخبار ''زمزم'' سے آپ منسلک ہو جائیں گے، لاہور علمی وادبی مقام ہے، یہاں ترقی کے مواقع ہیں۔
الغرض مجھے ہر طرح تیار کرنے کی کوشش کی گئی، میں بھی اس موقع اور پیشکش کو غنیمت سمجھتا تھا، مگر خیال ہوتا تھا کہ ''مرکزی تنظیم اہل سنت'' کی دعوت پر آیا ہوں، ابھی چند دن ہوئے ہیں، مولانا نورالحسن صاحب سے اس کا تذکرہ کس انداز میں کروں؟ کئی دن اسی حیص بیص میں رہا، اور ایک دن اس کا تذکرہ مولانا نورالحسن صاحب سے کردیا، انھوں نے نہایت خوشی سے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے، چلئے میں بھی منشی صاحب اور مولانا فارقلیط صاحب کو آپ کے بارے میں مزید معلومات دے دوں۔ میں بھی جنوری سے آپ کی تنخواہ پچاس روپیہ کرتا، مگر جب اس سے زیادہ کی بات ہے، اور کام بھی دینی وعلمی ہے تو ضرور آپ جایئے، آپ ضروریات زندگی کے سلسلے میں وطن سے نکلے ہیں، اس لئے جہاں زیادہ سہولت ملے، جانا چاہئے، مولانا نورالحسن صاحب نہایت با اخلاق، قدرشناس، اور حساس عالم تھے، ان کو اہل علم کی ضرورت کا پورا احساس تھا، بعد میں انھوں نے لاہور جاکر میرے بارے میں مولانا فارقلیط اور منشی عبدالرحیم سے بات کی اور میرا لاہور جانا طے ہوگیا، چنانچہ میں ۱۳ر جنوری ۱۹۴۵ء کو اپنا بکس بستر لے کر لاہور چلا گیا۔
اخبار ''زمزم'' کے دفتر میں ایک کمرہ اس کام کے لئے مخصوص کیا گیا، میز، کرسی، قلم، دوات، کاغذ اور دیگر چیزیں مہیا کی گئیں، مولانا تھانوی کے ترجمہ کا ایک حمائل دیا گیا، اور تفسیر میں، تفسیر ''بیان القرآن''، تفسیر حقانی، تفسیر ثنائی، ترجمان القرآن، تفہیم القرآن اور تفسیر ماجدی

کے مطبوعہ حصے جمع کئے گئے، کمرہ کے دروازے پر پردہ ڈال دیا گیا کہ سکون واطمینان سے ''منتخب التفاسیر'' کے نام سے ایک ایسی تفسیر تیار کی جائے، جس میں ہندوستان کے مفسرین کی تفسیروں کا خلاصہ آجائے، میں دو ایک دن تک بیٹھا سوچتا رہا کہ کام کیسے شروع کروں، کام بڑی ذمہ داری کا تھا، ذمہ داران نے میرا انتخاب کچھ سمجھ کر کیا تھا، اللہ کا نام لے کر کام شروع کیا، منشی عبدالرحیم صاحب بار بار جھانکتے تھے اور دیکھتے تھے کہ میں الجھن میں ہوں تو دوسرے یا تیسرے روز خود ہی کہا کہ کام مشکل ہے، آپ کی تنخواہ ساٹھ نہیں بلکہ سو روپیہ رہے گی، میں نے اس بے طلب اضافہ پر اللہ تعالیٰ کا اور منشی صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ ۱۵ سے ۱۸ پھر ۳۰ پھر ۶۰ اور اب ۱۰۰/ تنخواہ ملنے لگی ہے، کچھ دن کے بعد کام قابو میں آگیا، اور دن میں تقریباً دو صفحہ لکھ لیا کرتا تھا۔

مکان آنا اور انور جمال کا انتقال:۔ ابھی لاہور آئے بارہ تیرہ دن ہوئے تھے، اور کام اچھی طرح قابو میں نہیں آیا تھا کہ گھر سے عزیزم انور جمال مرحوم کی بیماری کا خط آیا، وہ بچپن سے خنازیر کے خطرناک مرض میں مبتلا تھا، اور اس زمانہ کی وسعت اور حیثیت کے لحاظ سے میں نے ہر طرح کا علاج کیا مگر اس میں کمی نہیں ہوئی، اسی حال میں چیچک نکل آئی، اور آنتوں تک پھیل گئی، میں ۲۶/ جنوری ۱۹۴۵ء کی شام لاہور سے چل کر ۲۸/ جنوری کو دو پہر میں گھر پہونچا تو دیکھا کہ انور جمال اور اس کا بڑا بھائی خالد کمال دونوں شدید چیچک میں مبتلا ہیں، انور جمال ۲۸/ فروری ۱۹۴۵ء کو انتقال کر گیا، اس وقت اس کی عمر سات سال کی تھی، خالد کمال اس لائق نہیں تھا کہ اپنے بھائی کے جنازہ میں شریک ہو سکے، یہ بچہ نہایت حسین وجمیل تھا، میں اس سے اور وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا، بڑا نازک مزاج اور نفاست پسند تھا، مجھے اس کے انتقال کا بہت زیادہ غم ہوا۔

لاہور واپسی اور مشاہرہ میں اضافہ:۔ چند دن گھر رہ کر لاہور چلا گیا، غالباً اس کے بعد ہی ''زمزم کمپنی لمٹیڈ'' کے ارکان نے میری تنخواہ میں خود بخود اضافہ کر کے ۱۶۰/ روپیہ ماہوار کر دیا، اصل میں یہ کام جتنا دقت طلب ہوا، اسی کے پیش نظر حق المحنۃ میں اضافہ ہوتا رہا۔

لاہور میں یہ بات عام تھی کہ کام کرنے والوں کی ضرورت کا پورا احساس ذمہ داروں کو رہتا تھا، وہ بے جا استحصال نہیں کرتے تھے، اپنے آدمیوں کو حتیٰ الامکان مطمئن کر کے رکھتے تھے، اور

اگر اچھا کام مل جاتا اور تنخواہ زیادہ ہوتی تو بڑی فراخدلی اور انشراح سے دوسری جگہ جانے کی ترغیب دیتے تھے، بشرطیکہ ان کے یہاں گنجائش نہ ہو، ''منتخب التفاسیر'' کا کام پوری طرح میرے قابو میں آ گیا، اور یہ کام میں نے ۱۵؍جنوری ۱۹۴۵ء سے یکم؍جون ۱۹۴۶ء تک ۱۶؍ ماہ کی مدت میں پورا کرلیا۔ اور تقریباً ۹۵۰ (ساڑھے نوسو صفحات، بڑی سائز کے) میں مکمل کر کے اراکین کے حوالہ کر دی، میری موجودگی میں اس کی کتابت بھی ہو رہی تھی، ساڑھے تیرہ پارہ کی کتابت ہو چکی تھی، خطاط منشی محمد قاسم لدھیانوی کے پوتے اس کی کتابت کر رہے تھے، مگر افسوس کی تقسیم ملک کے پُر آشوب ہنگامہ میں یہ تفسیر طباعت واشاعت سے رہ گئی، معلوم نہیں اس کا مسودہ بھی محفوظ ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ابتداء ہی میں مجھے قرآن کریم کی خدمت کی توفیق ملی، اور جوانی کے دور کا یہ پہلا کارنامہ آئندہ میرے حق میں باعثِ خیر وبرکت ہوا، مگر افسوس کی اس کی اشاعت نہیں ہوسکی۔

''منتخب التفاسیر'' کی تدوین وتالیف کے دوران ۲۸؍جنوری ۱۹۴۵ء، ۱۸؍مئی، اگست، ۳۰؍ستمبر اور جون ۱۹۴۶ء میں پانچ مرتبہ وطن آیا، اس زمانہ میں ریل کا کرایہ شاہ گنج سے لاہور تک ساڑھے بارہ روپیہ تھا، شاہ گنج سوار ہوتا تھا اور لاہور اترتا تھا، اسی طرح لاہور سوار ہوتا تھا اور شاہ گنج اترتا تھا، شام کو لاہور سے چلتا تھا، اور دوسرا دن گذار کر، رات میں دو بجے شاہ گنج اترتا تھا، ایک مرتبہ منشی عبدالرحیم صاحب کے کام سے آیا تھا، انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کا کوئی امتحان دیا تھا، جس میں کسی مضمون کا پرچہ مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کے پاس تھا، اسی سلسلہ میں انھوں نے مجھے بھیجا تھا، مگر آنے سے پہلے ہی مولانا نے پرچہ دیکھ کر یونیورسٹی کو بھیج دیا تھا۔

میں ابتداء میں اخبار ''زمزم'' کے دفتر ہی میں رہتا تھا، کھانا پیسہ اخبار کے ایک معمولی ہوٹل میں کھاتا تھا، ماہوار دو وقت کھانے کی قیمت بڑے گوشت کی ۱۳؍روپیہ اور چھوٹے گوشت کی ۱۵؍ روپیہ تھی، میں بروقت قیمت دیا کرتا تھا، لاہور میں چائے اور پان کی دوکانیں بہت کم تھیں، لسی، دودھ، دہی، کلچہ، حلوہ، پراٹھہ اور پھل کی دوکانیں زیادہ تھیں، میں صبح کو ناشتہ میں عام طور سے ایک کلچہ اور ایک گلاس دودھ استعمال کرتا تھا، پنجابی جسم وجثہ کے اعتبار سے گلاس بھی بڑا ہوتا تھا، غالباً ۴؍آنے میں کام چل جاتا تھا، کچھ پیسہ اخبار کے جنوبی حصہ کی ایک گلی کے مکان میں رہا، جس میں

بجنور کے مزدور رہا کرتے تھے، اسی میں مولوی مجید حسن مالک مدینہ بجنور کے بھائی مولوی ظہور الحسن بھی رہتے تھے، وہ مدینہ بکڈ پو کے ایجنٹ تھے، اور ہم لوگوں کے گویا سرپرست تھے اور کھانے پکانے میں شریک تھے، سالن کمرے میں پکا لیتے تھے، اور روٹی تندور میں پکوا لیتے تھے، یہاں کا قیام بہت مختصر رہا، اور جلد ہی ''زمزم'' کی طرف سے اندرونِ بھائی گیٹ مبارک منزل میں رہنے لگا، اسی میں مولانا فارقلیط صاحب رہتے تھے، اور بعد میں مرکز تنظیم اہل سنت کا دفتر بھی اسی بلڈنگ میں آگیا، اور مولانا نور الحسن صاحب بھی یہیں آگئے۔

ابوسعید بزمی:۔ کچھ دنوں کے بعد سید ابوسعید بزمی صاحب بھی اسی میں آگئے، وہ پہلے ''زمزم'' میں تھے، بعد میں اخبار ''احسان'' کے اڈیٹر ہوگئے، اس طرح مبارک منزل میں کئی اہل علم یکجا ہوگئے، مولانا فارقلیط اور بزمی صاحب اوپر کے منزلہ پر رہتے تھے، اس زمانہ میں بزمی صاحب جناب احسان دانش کے مشورہ پر ''تاریخ انقلابات عالم'' لکھ رہے تھے، وہ اکثر میرے پاس آتے تھے، اور امیر شکیب ارسلان کی کتاب ''**حاضر العالم الاسلامی**'' کے معانی ومطالب معلوم کرتے تھے، ایک مرتبہ وہ اس حال میں آگئے کہ میں اور ایک ساتھی چائے پی رہے تھے، میں کپ میں پی رہا تھا، اور ساتھی کپ نہ ہونے کی وجہ سے لوٹے میں پی رہا تھا،، بزمی صاحب نے یہ منظر دیکھ کر کہا کہ مولانا! بہت خوب، اب بھی آپ لوگ کبھی کبھی طالب علمی کا لطف اٹھا لیتے ہیں، مبارک منزل کا یہ ایک واقعہ قابل ذکر ہے کہ میں گرمی کی دوپہر میں ہوا کے خیال سے ایک دروازہ کے سامنے چارپائی پر سوتا تھا، تو کسی نہ کسی مردے کا خواب ضرور دیکھتا تھا، اور جب چارپائی وہاں سے ہٹا کر سوتا تھا تو یہ خواب نہیں دیکھتا تھا، آزمانے کے لئے بارہا میں نے ایسا کیا، یہ خواب پریشان کُن نہیں ہوتا تھا، مگر یہ واقعہ ضرور ہوتا تھا، شاید کسی زمانہ میں وہاں کوئی قبر رہی ہو۔

مدرسہ احیاء العلوم میں عارضی مدرسی:۔ شوال ۱۳۶۶ھ تا صفر ۱۳۶۷ھ (یکم اکتوبر ۱۹۴۶ء تا جنوری ۱۹۴۷ء) پانچ ماہ احیاء العلوم میں عارضی طور پر تدریسی خدمت ۴۵ روپیہ مشاہرہ پر کی، والد صاحبؒ اس سال حج وزیارت کے لئے تشریف لے گئے تھے، اور میرا گھر پر رہنا ضروری تھا، میں نے ان کے ذریعہ امام عبد البر کی ''جامع بیان العلم'' اور امام ابوعبید قاسم بن

سلاّم کی ''کتاب الاموال'' منگوائی تھی، اس زمانہ میں مولانا عبدالغنی بارہ بنکویؒ صدرالمدرسین تھے، انھوں نے میری زیر تدریس کتابوں میں ''تفسیر بیضاوی'' بھی رکھی، مگر میں نے یہ کہہ کر اس کے پڑھانے سے انکار کردیا کہ میں اس کو پڑھا سکتا ہوں، مگر اس نوعمری میں اپنے کو اس کا اہل نہیں پاتا ہوں، امہات کتب پڑھانے کے لئے علم کے ساتھ ساتھ حلم ووقار بھی چاہئے۔

روزنامہ ''زمزم'' میں:۔اسی درمیان مولانا فارقلیط صاحب نے مجھے لکھا کہ جلد آجایئے، سہ روزہ ''زمزم'' کو روزانہ کرنے کا پروگرام بن رہا ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ رہ کر میرا ہاتھ بٹائیں، چنانچہ میں لاہور چلا گیا، اور ۲۸؍جنوری ۱۹۴۷ء سے مولانا مرحوم کی زیرنگرانی بلکہ زیرتربیت صحافت کے میدان میں قدم رکھا، مولانا میری صحافت کے استاذ ہیں، اور اخبارنویسی میں نے ان ہی سے سیکھی ہے، انھوں نے مجھے اپنا نائب بنایا، درمیان میں ان کا آرٹیکل ہوتا تھا، اور دائیں بائیں میرے نوٹ ہوتے تھے، عموماً دونوٹ سیاسی ہوتے تھے، اور مختصر سا اخلاقی ودینی مضمون ہوتا تھا، وہ زمانہ بڑے بحران کا تھا، ملک کی تقسیم کا مسئلہ چل رہا تھا، مسلم لیگ اور کانگریس میں سخت اختلافات تھے، ملک میں فسادات کا طوفان جاری تھا، اخلاق وانسانیت ختم ہورہی تھی، ان احوال وظروف کی مناسبت سے یہ اخلاقی ودینی مضامین ہوتے تھے، میں ان کو محفوظ کرلیتا تھا، اور بعد میں جب بمبئی گیا تو ''اسلامی نظامِ زندگی'' کے نام سے ان ہی مضامین کا مجموعہ ایک مختصر سی کتاب کی صورت میں میری کتاب بنا۔

جس طرح ''منتخب التفاسیر'' کی ترتیب کی ابتداء میں ذہنی پریشانی تھی، اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، اسی طرح ابتداء میں صحافت کے میدان میں بھی راستہ نہیں ملتا تھا، مولانا فارقلیط نے اپنے مقابل میرے لئے میز، کرسی اور دیگر ضروریات کا انتظام کرادیا، اور میں بیٹھا سوچتا تھا کہ کیا لکھوں؟ مولانا نے دوچار دن میری طرف سے سیاسی نوٹ لکھ کر شائع کئے، پھر اخبارات کی بعض سرخیوں پر نشان لگا کر کہا کہ اس کو پڑھ کر اس پر اپنی رائے لکھئے، اور اس کے ہر پہلو پر خوب غور کرنے کے بعد رائے ظاہر کیجئے، جہاں تک خیال آتا ہے، میں نے سب سے پہلا نوٹ کانگریسی لیڈر مسٹر عبدالباری بہاری کے قتل پر لکھا تھا، ابتداء میں مولانا میرے نوٹ دیکھ کر کہتے کہ بہت اچھا ہے، مگر اس کو دوبارہ لکھئے، اور اس میں پھر کاٹ چھانٹ کرتا تھا، مولانا اس میں

معمولی تبدیلی کر کے اشاعت کے لئے دیدیتے تھے، پھر ایک ہفتہ کے بعد کہا کہ اب مجھے دکھانے کی ضرورت نہیں ہے، مضمون لکھ کر کاتب کے حوالے کر دیں۔

مولانا فارقلیط کا مشورہ:۔صحافت وانشاء کی زبان کے بارے میں مولانا فارقلیط نے مجھے مشورہ دیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی کتابوں کو پڑھنا چاہئے، مگر ان کا انداز اختیار کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ان کا اسلوب نگارش ان ہی کا حق ہے، البتہ ان کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد اپنا اسلوب پیدا کرنے کی کوشش کیجئے، عبدالماجد سالک، غلام رسول مہر، نصر اللہ خاں عزیز، ابوالاعلی مودودی اور دوسرے مشاہیر اہل علم اور خود میں، سب نے مولانا آزاد کو پڑھ کر اپنا اپنا طرز اور اسلوب بنایا۔

چونکہ زمانۂ طالب علمی سے مضامین لکھا کرتا تھا، اس لئے صحافتی اسلوب مین زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی، کسی اہم بات پر نوٹ لکھنا ہوتا تو مولانا اس کے بارے میں ہدایت اور مشورہ دیتے تھے، لاہور اور پنجاب کے مسلمان عام طور سے مسلم لیگ کے پر جوش حامی تھے، اور ''زمزم'' نیشنلسٹ اخبار تھا، اس کی پالیسی مسلم لیگ کے خلاف تھی، اس لئے مولانا فارقلیط بڑی سنجیدگی اور متانت سے لکھتے تھے، وہ نفسیات کے زبردست ماہر عالم تھے، انداز تحریر بھی پختہ اور دلآویز تھا، اس کے باوجود کبھی کبھی سخت مخالفت کی صورت ہو جاتی تھی، راستہ چلتے مولانا کو مسلم لیگی پکڑا کرتے تھے، اور وہ کہتے تھے کہ دفتر میں آؤ تو تفصیلی بات ہو، اسی ہنگامی دور میں ایک مرتبہ میں نے مسٹر محمد علی جناح کے خلاف ایک نوٹ لکھا، جس میں بعض سخت ترین جملے آگئے تھے، جس پر بڑا ہنگامہ ہوا، مولانا نے مجھ سے کہا کہ اس نازک دور میں اس قسم کی تحریر سے بچنا چاہئے، معلوم ہوتا ہے کہ بھنگ کھا کر یہ نوٹ لکھا تھا، اور رات کو کہا کہ جایئے جلدی دروازہ بند کرلیں، شاید کہ سر پھرے حملہ نہ کر دیں، ایک مرتبہ مولانا نے ''دریابادی کا فلسفۂ خیر وشر'' کے عنوان سے مجھ سے ایک مضمون لکھوایا، مولانا عبدالماجد دریابادی نے ''صدق'' میں لکھا تھا کہ جن مولانا حسین احمد مدنی کی توہین وتذلیل کی جارہی ہے، وہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور مجاہد و بزرگ مولانا حسین احمد مدنی نہیں ہیں، بلکہ یہ تو ان مولانا حسین احمد مدنی کی بات ہے جو سیاست میں کانگریس کے ساتھ ہیں، اور ایسے ویسے ہیں، یہ باتیں انھوں نے اپنے خاص اسلوب تحریر میں لکھی تھیں، اس کا جواب

فارقلیط صاحب نے مجھ سے لکھوا کر اخبار میں شائع کیا تھا۔

''اصلاح'' کابل:- ''زمزم'' ایک مذہبی واخلاقی، اور دو سیاسی نوٹ مستقل طور پر لکھتا تھا، اس کے علاوہ کابل کے روزنامہ ''اصلاح'' سے فارسی خبروں کا ترجمہ کرتا تھا، جو برید افغانستان کے عنوان سے شائع ہوتا تھا، اس میں پشتو اور فارسی میں خبریں اور مضامین ہوتے تھے،

علامہ محمد روحی:- علامہ محمد روحی سنکیانگ (چینی ترکستان یا مشرقی ترکستان) کے عربی اور فارسی میں لکھے ہوئے مضامین کا ترجمہ کرتا تھا، ان کے متعدد مضامین کے ترجمے کئے، جن میں روس میں کمیونسٹ حکومت کے مظالم کی، اور مسلمانوں کے ابتلاء کا بیان ہوتا تھا، اس کے علاوہ مستقل مضامین بھی لکھتا تھا، یہ ''نصیحت ہے یا فتنہ انگیزی'' مولانا عبدالماجد صاحب کا ''جدید فلسفۂ خیر وشر'' کے عنوان سے ۷/نومبر ۱۹۴۵ء کے ''زمزم'' میں پورے دو کالم میں ایک مضمون لکھا، اس مضمون میں بڑی تیزی تھی، اور جواب ترکی بہ ترکی تھا۔ ''جزائر شرق الہند کے تاریخی حالات'' کے عنوان سے ایک لمبا چوڑا معلوماتی مضمون ۱۵/نومبر ۱۹۴۵ء کی اشاعت میں لکھا، جس کو پڑھ کر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں سماٹرا کے ایک طالب علم محمد صابر نے مجھ کو خط لکھا اور ان معلومات کے بارے میں مزید تحقیق چاہی، انھوں نے اس سے پہلے اس موضوع پر مضمون لکھا تھا، ''غلامی اور ذہنی تسفل''، ''مردان کار کا قافلہ، منزل آزادی میں'' کے عنوان سے دو کالمی مضمون ۲۳/اکتوبر ۱۹۴۵ء کے شمارے میں لکھا، اسی طرح کئی اور مستقل مضامین لکھے جن کو مولانا فارقلیط کی رہنمائی حاصل تھی۔

مولانا آزاد سے ملاقات:- ''منتخب التفاسیر'' کی جمع وترتیب کے دوران مولانا ابو الکلام آزاد لاہور تشریف لے آئے، اس وقت وہ کانگریس کے صدر تھے، اور ترجمان القرآن جلد دوم کی طباعت کے لئے ''زمزم کمپنی لمیٹڈ'' سے معاملہ کر رہے تھے، ''فلیٹز'' ہوٹل میں قیام تھا، طباعت واشاعت کے معاملات طے کرنے کے لئے مولانا فارقلیط اور منشی عبدالرحیم ان کے یہاں گئے، میں بھی ساتھ تھا۔ ہوٹل کے سامنے بہت بڑا مجمع تھا، مختلف جماعتیں اور ان کے نمائندے اپنے اپنے حقوق ومقاصد کے لئے مولانا آزاد سے بات کرنا چاہتے تھے، ان میں ہجڑوں کا بھی ایک نمائندہ تھا جو اپنی پارٹی کے حقوق کے لئے بات کرنا چاہتا تھا، ہوٹل کا دو تین

دروازہ طے کرنے کے بعد ہم لوگ مولانا کے پاس پہونچے، ہر دروازہ پر سنتری رہتے تھے، مولانا چارپائی پر کھادی کا کرتا پائجامہ پہنے ہوئے، ننگے سر بیٹھے ہوئے تھے، بڑے تپاک سے ملے، منشی جی نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے یہاں ''منتخب التفاسیر'' لکھ رہے ہیں، مولانا نے کہا کہ بہت خوب، اللہ تعالیٰ جزاء خیر دے، ترجمان القرآن کے سلسلے میں کہا کہ پہلا اڈیشن دو ہزار کا ہوگا، اس کا حق تصنیف پندرہ ہزار روپئے ہوگا، نصف پیشگی ہوگا اور قیمت اتنی ہوگی، دوسرے اڈیشن کے لئے آپ کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابت میرے کاتب منشی عبدالقیوم صاحب کریں گے وغیرہ وغیرہ۔ منشی صاحب نے کہا کہ ہم الہلال کو دوبارہ جاری کرنا چاہتے ہیں، آپ وقتاً فوقتاً مضامین عنایت کر دیا کریں۔ مولانا نے کہا کہ میں اس کا وعدہ تو نہیں کرتا، مصروفیات تو زیادہ ہیں مگر اس کا خیال رکھوں گا۔ بات آئی، گئی، ہوئی، انداز گفتگو انداز تحریر سے ملتا جلتا تھا، ''میرے بھائی'' کا جملہ بار بار دہراتے تھے، یہ مولانا آزاد سے میری پہلی ملاقات تھی، اس کے بعد ایک مرتبہ بمبئی کے تاج ہوٹل میں جمعیۃ علماء کے وفد کے ساتھ ان کے دیدار وگفتار سے استفادہ کا موقع ملا، اور ایک بار جب وہ وزیر تعلیم تھے، رجال السند والہند کے سلسلے میں ان کو خط لکھا تھا، جس کا جواب پروفیسر اجمل نے دیا تھا۔

اسی وقت مولانا آزاد نے ''غبار خاطر'' کی طباعت واشاعت کا انتظام کیا، عبدالمجید سالکؔ اور غلام رسول مہرؔ سیاسی اختلاف کے باوجود مولانا کے پرستاروں می سے تھے، انھوں نے اس کے لئے کاغذ وطباعت وغیرہ کا انتظام کیا، اس زمانے میں دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے بڑی مشکلات تھیں، میں نے ''غبار خاطر'' کا مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ دیکھا، ہاتھ میں رعشہ کا اثر ظاہر تھا، اور جگہ جگہ نظر ثانی تھی۔

مولانا کے کاتب خاص منشی عبدالقیوم صاحب خطاط مرادآبادی دفتر ''زمزم'' میں رہ کر ترجمان القرآن کی کتابت کرتے تھے، وہ کلکتہ مین بھی مولانا کی کتابیں لکھا کرتے تھے، اور مولانا کے واقعات بیان کرتے تھے، دو ایک واقعات درج کئے جاتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کلکتہ میں بعض اوقات مولانا سخت تنگی میں مبتلا ہو جاتے تھے، حتیٰ کہ بجلی کا کنکشن کاٹ دیتے تھے، اور دو آنے کا باہر سے کباب اور روٹی منگا کر وقت گزار لیتے تھے، ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ترجمان

القرآن لکھتے وقت اصحاب کہف کے غار کا جونقشہ بیان کیا تھا، اس سے مجھے اختلاف ہوا، اور میری سمجھ میں بات نہیں آئی، میں نے مولانا سے اس کا تذکرہ کر کے ان کو بتایا کہ یوں نہیں یوں ہونا چاہئے، مولانا کمرے سے باہر صحن میں آئے، اور زمین پر نقشہ بنایا، اور میری بات کی تصدیق کی، اور کتاب میں فوراً ترمیم وتنسیخ کردی۔ ترجمان القرآن کے مطبوعہ فرمے کی ہم لوگ تصحیح کرتے تھے۔ ۱۶ر صفحے کے ایک فرمے پر ایک روپیہ ملتا تھا، منشی صاحب نے بتایا کہ ترجمان القرآن کی پہلی جلد کی کتابت میں نے کی تھی، جو مدینہ پریس بجنور میں چھپی تھی، اس کے مطبوعہ فرمے مولوی مجید حسن صاحب مالک اخبار مدینہ نے مولانا آزاد کو پڑھنے اور تصحیح کرنے کو بھیجا تو مولانا نے اس مین اس قدر کاٹ چھانٹ اور اس قدر زیادہ اضافہ کردیا کہ دوبارہ کتابت کرانی پڑی، اس کے بعد مولانا کے پاس نہیں بھیجا، کیونکہ وہ پھر اس میں پہلے کی طرح حک واضافہ کرتے اور دوبارہ کتابت کرانی پڑتی۔

یہ بات صرف مولانا آزاد ہی کی نہیں ہے، بلکہ ہر مصنف اور مضمون نگار جب اپنی تحریر کو دیکھتا ہے تو اس میں حک واضافہ کرتا ہے، اسی لئے کاتب اور مصنف میں ان بن رہتی ہے، مصنف اپنی کتاب کو آخری حدتک کامل ومکمل کرنا چاہتا ہے اور کاتب پہلا مسودہ لکھنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

مولانا فارقلیطؒ:- میں چند دنوں کے بعد لاہور کی ادبی فضا سے مانوس ہوگیا، خاص طور سے وہاں کے شعراء وادباء اور صحافیوں سے تعلقات ہوگئے، مولانا فارقلیط صاحب بہت کم آمیز آدمی تھے، عربی کے عالم ہونے کے ساتھ انگریزی سے اچھی طرح واقف تھے، ان کو علم النفس (سائکلوجی) سے خاص تعلق تھا، اس فن کی انگریزی کتابیں خریدتے اور خوب پڑھتے تھے، حدیث کی کتاب ریاض الصالحین ہمیشہ مطالعہ میں رکھتے تھے، مسلکاً اہل حدیث تھے، فناً حداد (لوہار) تھے، وطن پلکھوہ ضلع میرٹھ تھا۔ ۱۹۰۱ء کی پیدائش تھی، قیام لاہور کا پورا زمانہ ان ہی کے ساتھ گزرا ہے، اندرونِ بھاٹی گیٹ کی مبارک منزل میں وہ پہلے منزلہ پر بال بچوں کے ساتھ رہتے تھے، میں نیچے ایک کمرہ میں رہتا تھا، اسی کے پاس مرکز تنظیم اہل سنت کا دفتر بھی آگیا تھا، دفتر میں میری میز ان کی میز سے متصل ہوتی تھی، ان کے بارے میں مزید باتیں آئندہ لکھوں گا۔

احسان دانشؒ:- ان کے بعد سب سے زیادہ تعلق حضرت احسان دانش سے تھا، زمانۂ طالب علمی میں مرادآباد میں ایک ادبی رسالہ میں ان کی غزل چھپی تھی، جس کا مطلع یہ تھا۔

احسان وہ دن یاد آتے ہیں جب کیف تھا حاصل جینے میں
آنکھوں میں تبسم رقصاں تھا، ارمان بھرے تھے سینے میں

اس پوری غزل کو میں نے بار بار پڑھا اور اس سے متاثر ہوا، اس کے چند مہینے کے بعد شبلی کالج اعظم گڈھ میں آل انڈیا مشاعرہ ہوا، جس میں احسان دانش صاحب بھی آئے تھے، میں اسی سال فارغ ہوا تھا، دوستوں کے ساتھ مشاعرہ سننے کے لئے گیا۔ جس میں انھوں نے اپنے خاص ترنم اور مخصوص انداز میں ''جشنِ بیچارگی'' سنائی، جس میں ایک مزدور کی لڑکی، کی رخصتی کا منظر تھا، یہ ان کی خاص نظم تھی، جس کو سامعین کے اصرار پر دوبارہ سنایا، ایک غزل بھی پڑھی جس کا مطلع یہ تھا

پرسش غم کا شکریہ کیا تجھے آگہی نہیں   ترے بغیر زندگی درد ہے، زندگی نہیں

اس نظم اور غزل کو سن کر ہم لوگوں نے وہیں ان کی دو کتابیں ''نوائے کارگر'' اور ''آتش خاموش'' خریدی، اور لاکر خوب خوب ان کو سنتے سناتے تھے،، مناظر قدرت کی عکاسی، تشبیہات، اشارات، کنایات اور تمثیلات ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیات تھے، میں ان سے متاثر بلکہ مرعوب تھا، ایک مرتبہ لاہور میں ایک مکتبہ میں ان کو دیکھا مگر تعارف نہ ہونے کی وجہ سے نہ مل سکا،

علامہ انور صابری کے ذریعہ تعارف:- اسی درمیان علامہ انور صابری مرحوم لاہور آئے، ان کا قیام دفتر احرار اسلام میں تھا۔ وہ ہماری طالب علمی کے دور میں مبارکپور کے سیاسی وقومی اور دینی جلسوں میں آیا کرتے تھے، بعد میں وہ مہینوں مہینوں مبارکپور مدرسے میں پڑے رہتے تھے، اور ہم لوگوں کی محفلیں جمتی تھیں، اخبار ''زمزم'' کی پیشانی پر یہ شعر ان ہی کا تھا۔

جس کے پیتے ہی کھلیں مومن پہ اسرار حیات   دین ابراہیم کی وہ مے اسی ''زمزم'' میں ہے

اسی لئے وہ جب بھی لاہور آتے تو ''زمزم'' کے دفتر میں ضرور آتے، جب وہاں پہونچا تو اس مین مزید اضافہ ہوگیا، پہلی بار لاہور میں ملے تو مجھے وہاں کے اکثر شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں سے ملایا، ایک تانگہ طے کیا اور کئی گھنٹے تک اسی پر لوگوں سے ملتے رہے۔ احسان دانش سے مل کر ان سے میرا تعارف بڑے شاندار الفاظ میں کرایا، اور یہ کہ یہ شخص عربی کا زبردست عالم

ہے۔عربی سے اردو ترجمہ کرنے مین ماہر ہے،اسی قسم کے جملے کہے،اور احسان صاحب نے مجھ سے کہا کہ استاد ہمارے یہاں آیا کرو، ہمارے یہاں کسی قسم کا کوئی تکلف نہیں۔وہ سب کو''استاذ'' کہتے تھے،اور ہم سب ان کو استاد کہتے تھے،اس کے بعد احسان صاحب سے اتنا زیادہ ربط ضبط بڑھا کہ دن میں جب بھی موقع ہوتا''مزنگ'' گندم منڈی میں ان کے یہاں چلا جاتا تھا،اور یہ معمول تھا کہ رات کو''مزنگ'' میں احسان صاحب کے یہاں ہم لوگ جمع ہوتے،اور گیارہ بجے وہاں سے واپس آتے، یہ آمدورفت پیدل ہوا کرتی تھی۔

ہم عصر شعراء:۔یہاں ایک مختصر سا حلقہ احباب بھی پیدا ہوگیا تھا،جس میں سب شاعری کرتے تھے،۔عشرت کرتپوری،اظہار اثر کرتپوری،سردار ہربنس سنگھ باغی،شیو پرساد بہار لکھنوی،ہم پانچ شعراء اکثر ساتھ رہا کرتے تھے۔اور جب کبھی فرصت ملتی،شعری محفل جم جاتی تھی،عشرت اور اثر انارکلی بازار میں''کرنال شباب'' جوتے کی دوکان میں ملازم تھے،شیو پرساد بہار لکھنوی،شاہ عالمی گیٹ کے پاس ٹاٹا کمپنی میں ملازم تھا۔ہم لوگ اکثر ہوٹل میں ایک ساتھ کھاتے پیتے تھے،ان میں عشرت کرتپوری سے خاص تعلق تھا،اس میں بڑا اخلوص تھا،کبھی کبھی اتوار کی رات میں میرے یہاں آکر سوجاتا تھا،تقسیم کے بعد ایک مرتبہ مبارکپور بھی آیا تھا۔اس نے''کاکل'' کے نام سے صبح بنارس پر نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے،جس میں میری بھی ایک نظم ہے،لاہور میں ہم لوگ ایک ساتھ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے،اور واپسی پر ایک دوسرے کو اس کی قیام گاہ پر پہونچاتے تھے،بعض مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ وہ سب مجھے پہونچانے آتے تھے،اور پھر میں ان کو پہونچانے جاتا۔اور وہ پھر مجھے پہونچانے آتے تھے،اس طرح رات کا اکثر حصہ حق رفاقت کی نذر ہوجاتا تھا،شیو پرساد بہار کا ایک شعر اب تک یاد ہے ؎

زمانہ بھر کی تکلیفوں سے چھوٹے　　　قفس بہتر رہا کچھ آشیاں سے

انارکلی بازار، پیسہ اخبار اور موہن لال روڈ سب قریب قریب تھے،انارکلی بازار کے شمالی سرے پر گنپت روڈ میں مکتبہ دانش تھا،جہاں احسان دانش دن میں اکثر آیا کرتے تھے،انھوں نے اسی دکان میں اوپر لکھنے پڑھنے کا انتظام کیا تھا۔

علامہ تاجور نجیب آبادی:۔شمس العلماء مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی اور

مولانا وارث کامل بھی وہاں آیا کرتے تھے، احسان صاحب مولانا وارث کامل سے ''تاریخ مجاہدین اسلام'' مرتب کرارہے تھے، جن سے میری ملاقات ہر وقت ہوا کرتی تھی، بعد میں وہ ''غنچہ'' بجنور (بچوں کا رسالہ) کے اڈیٹر ہوئے، مولانا تاجور نجیب آبادی، شنکر دیال کالج میں پروفیسر تھے، ان سے یہیں مکتبہ دانش گنپت روڈ میں اکثر ملاقات ہوتی تھی، کبھی کبھی میں، عشرت اور اظہار اثر ان کے مکان پر جایا کرتے تھے، بڑے بے تکلف اور سادہ مزاج عالم، پروفیسر اور شاعر بلکہ استاذ الشعراء تھے، ایک مرتبہ باتوں بات میں کہنے لگے کہ بعض اوقات مشاعروں میں مجھے جھجھک اور مرعوبیت کا احساس ہونے لگتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ دارالعلوم کی روٹی کا اثر ہے، (موصوف دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے)

__ظفر ملتانی__:۔ احسان صاحب بے تکلفی میں اپنے ذوق کے مطابق اپنے مصاحبوں اور دوستوں کا بھی نام تجویز کیا کرتے تھے، بھیم سین ظفر ملتانی ان کے خاص شاگردوں میں تھے، انھوں نے احسان صاحب کے اقوال وآراء کو جمع کر کے شائع کیا تھا، وہ موٹے سیاہ رنگ کے آدمی تھے، احسان صاحب ان کو ''اللہ میاں کی بھینس'' کہا کرتے تھے، ظفر بعد میں دہلی آگئے تھے احسان پر کچھ لکھ رہے تھے، مجھے بمبئی لکھا کہ کوئی مضمون بھیجئے، مگر جلد مر گئے، مجھ کو ''ہمارا قاضی چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا'' کہتے تھے، عشرت کو ''کابک سے جھانکتا ہوا کبوتر کا بچہ'' سے تشبیہ دیتے تھے، ہم لوگوں نے کبھی احسان صاحب کو شاعری کرتے ہوئے نہیں دیکھا، شاعر مزدور تھے، مزدوروں کی سی زندگی بسر کرتے تھے، ان کے پاس کبھی کسی بڑے آدمی کو آتے جاتے نہیں دیکھا، نماز کے سخت پابند تھے، اور بڑے اہتمام سے پڑھتے تھے، ایک مرتبہ جمعرات کی شام کو مزنگ گیا، احسان صاحب مصلّے پر بیٹھے تھے، سامنے شیرینی تھی، اور اپنی والدہ مرحومہ کیلئے ایصال ثواب کررہے تھے، مجھے بھی ایک عدد شیرینی دی، میں نے لینے سے انکار کیا تو کہا کہ استاد! مولوی الیاس (بانی جماعت تبلیغ، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب) میرے چچا ہوتے ہیں، میں فاتحہ اور چادر قوالی والوں میں سے نہیں ہوں، انھوں نے مولانا وارث کامل سے ''تاریخ مجاہدین اسلام'' ابوسعید بزمی سے ''تاریخ انقلابات عالم'' اور مجھ سے ''علمائے اسلام کی خونیں داستانیں'' لکھوائی تھیں، جن کا ذکر آئندہ آئے گا، احسان دانش صاحب نے ایک مرتبہ اپنی والدہ کا مرثیہ ''گورستان'' پورا

پڑھ کر ہم لوگوں کو سنایا تھا، انھوں نے بعض ان بلڈگوں کو دکھایا، جن میں انھوں نے مزدوری اور گارامٹی کی تھی، اپنے بچپن کے عجیب عجیب واقعات سناتے تھے، اور لاہور آنے کے بعد کن حالات سے گزرے، اور شعروادب کی فضا میں کیسے آگے بڑھے، یہ سب باتیں بیان کرتے تھے۔

شاہ عالمی گیٹ آسٹریلیا مسجد کے قریب جنوب میں رسالہ ''بیسویں صدی'' کا دفتر تھا، اس کے پاس ہی مسجد ''یک شبی'' تھی، جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا۔

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا

غازی خاں کابلی:۔ ''بیسویں صدی'' میں غازی خاں کابلی مشہور شاعر ملازم تھے، ان سے ملاقات کیلئے میں اکثر جایا کرتا تھا، وہ بڑے بے تکلف سیاسی شاعر تھے، بعد میں پختونستان کی تحریک میں شریک ہوکر اس کے صدر ہوگئے تھے، اور میرے قیام بمبئی کے زمانہ میں بمبئی میں اس کا اجلاس کیا، جس کا خطبہ صدارت مجھ سے لکھوایا، اس وقت میں جمعیۃ علماء کے دفتر وزیر بلڈنگ میں رہتا تھا۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ:۔ دفتر احرار اسلام میں اکثر جاتا تھا، اس کے اراکین سے خاص تعلق تھا، حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، جانباز مرزا امرتسری، مولوی مظہر علی اظہر اور علامہ انور صابری وغیرہ، اکثر یہاں جمع ہوتے تھے، ''دفتر احرار'' کے اوپر ایک اور دفتر تھا، جس کے لمبے چوڑے بورڈ پر ''انجمن چارسو بیساں'' لکھا تھا، حضرت شاہ صاحب کی مجلس بڑی پُر کیف ہوتی تھی، بڑی بے تکلفی سے احباب میں گھلے ملے رہتے تھے، اور مزے لے لے کر اشعار سناتے تھے، ایک شعر اب تک یاد ہے، جسے جھوم جھوم کر دیر تک پڑھا کرتے تھے۔

سمٹتا ہی رہا دامن کسی کا　　لپکتا ہی رہا خونِ شہیداں

مولانا احمد علی لاہوریؒ:۔ جمعہ کی نماز اکثر انجمن خدام الدین شیرانوالہ میں پڑھتا تھا، مولانا احمد علی لاہوریؒ سے نیاز حاصل ہوتا تھا، وہاں پہونچ کر اپنا دینی وعلمی ماحول ملتا تھا، ان کے صاحبزادے مولانا عبید اللہ صاحب سے بھی تعلق تھا، زمانۂ طالب علمی میں ہم لوگ انجمن

خدام الدین کی طرف سے شائع ہونے والے چھوٹے چھوٹے رسالے منگوایا کرتے تھے، اس طرح یہاں سے دینی وعلمی تعلق تھا، مولانا احمد علی صاحب کہا کرتے تھے کہ اگر میں پنجابی نہ ہوتا تو یہاں کے لوگ مجھے مار ڈالتے، کیونکہ حق گوئی و بے باکی میں مشہور تھے، اوران کے مخالفین بہت زیادہ تھے۔

علامہ محمد روحی سنکیانگ :۔اسی زمانہ میں سنکیانگ (مشرقی ترکستان) کے ایک عالم علامہ محمد روحی سے ملاقات ہوئی، ۱۹۱۲ء مین چین اور روس کے درمیان مشرقی ترکستان (سنکیانگ) میں وہاں کے مغل نسل کے حنفی مسلمانوں نے جمہوریہ اسلامیہ قائم کی، علامہ عبدالقادر آرنوشی صدر، اور علامہ مبشر طرازی وزیر ہوئے، ان ہی میں علامہ محمد روحی بھی شامل تھے، مگر چند سال کے بعد (غالباً ۱۹۱۷ء) میں چین نے اس پر قبضہ کرلیا، اور یہ حضرات وہاں سے ہجرت کر کے افغانستان چلے آئے، انگریزوں کے اشارے پر شاہ افغانستان نادرشاہ نے ان کو گرفتار کر کے نظر بند کردیا، اور چودہ سال کے بعد رہائی نصیب ہوئی، مبشر طرازی سعودی عرب، مصر وغیرہ چلے گئے، جن کے صاحبزادے عبداللہ مبشر طرازی ہیں، جو فی الحال سعودی عرب میں **جامعة الملک جده** میں معلم ہیں، اور پاکستان کی تاریخ دو جلدوں میں عربی میں لکھی ہے، اور مجھے ہدیہ کی ہے، ان سے اسلام آباد میں ملاقات ہوئی ہے، وہ روسی، عربی، فارسی اور اردو کے عالم ہیں۔ علامہ محمد روحی لاہور آ گئے، سخت بدحالی و پریشانی میں مبتلا رہتے تھے، روس کی کمیونسٹ حکومت کے مظالم پر عربی اور فارسی میں مضامین لکھتے تھے، اور اس کا ترجمہ کر کے ''زمزم'' میں شائع کرتا تھا، اس کا ان کو مختصر سا معاوضہ ملتا تھا، اکثر دفتر میں آتے تھے، میں نے ان سے روسی اُوَیُغَری زبان پڑھنی شروع کی، مگر چند اسباق سے آگے نہ بڑھ سکا، پھر معلوم نہیں وہ کہاں تشریف لے گئے۔

نصراللہ خاں عزیز:۔مولانا فارقلیط صاحب اور ملک نصراللہ خاں عزیز بی، اے دونوں کسی زمانہ میں ''مدینہ'' بجنور کے مدیر تھے، ''زمزم'' کے اڈیٹر ملک نصراللہ خاں عزیز تھے۔ باہمی اختلافات ہوئے تو وہ عبدالمجید سوہدری کے اخبار ''مسلمان'' کے اڈیٹر ہو گئے، اور مولانا فارقلیط ''زمزم'' میں رہے، اور دونوں میں میرے اشعار چھپتے تھے، مولانا فارقلیط، ملک صاحب سے

ملنے کیلئے اکثر تھانہ گاول منڈی جایا کرتے تھے، میں بھی ساتھ ہوجاتا تھا، ملک صاحب بڑے تپاک اور محبت سے ملتے تھے، ایک روز انھوں نے کہا کہ معلوم نہیں کیا بات ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب مسٹر مذہب کی طرف آتا ہے تو مولوی ملّا کو ماند کردیتا ہے، اور جب مولوی ملّا روشن خیال بنتا ہے تو الحاد و بد دینی کی راہ اختیار کرتا ہے۔ ملک صاحب کی والدہ قادیانی تھیں، وہ ان کو ماہ بماہ خرچہ دیا کرتے تھے۔

علامہ عنایت اللہ مشرقی بانی خاکسار تحریک کو ایک مرتبہ پیسہ اخبار میں دیکھا تھا۔ اسی طرح مولانا فارقلیط کے ساتھ ایک مرتبہ لارنس گارڈن (جناح باغ) میں مولانا ظفر علی خاں کو ٹہلتے ہوئے دیکھا تھا، اس وقت وہ بڑھاپے کی آخری منزل میں تھے۔

مولانا حبیب الرحمٰن:۔ لاہور میں ایک عالم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مولانا سلمان منصور پوری مصنف ''رحمۃ للعلمینؐ'' کے بھتیجے تھے، وہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ فیروز پور میں میرا کتب خانہ ہے، وہیں چل کر تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری کیا جائے، جھنگ کالج کے پروفیسر خان عبد المجید خان مؤلف ''جدید آلات جنگ'' اپنی کتاب کی طباعت کے سلسلے میں لاہور آتے، اور دفتر ''زمزم'' میں قیام کرتے تھے، ان سے تعلقات وسیع ہوئے تو انھوں نے بار بار تقاضا کیا کہ آپ انگریزی پڑھ لیں، پڑھنے پڑھانے کا انتظام میں کروں گا، پاس میں کراؤں گا۔ اور اپنے کالج میں ملازمت دلاؤں گا، جناب ابوسعید بزمی کہا کرتے تھے کہ آپ تھوڑی انگریزی زبان حاصل کرلیں تو آپ کی قیمت دوگنا ہوجائے گی، احسان دانش صاحب نے تصنیف و تالیف کے لئے ایک ادارہ قائم کرنے کا پروگرام بنایا تھا تاکہ ہم لوگ وہاں اطمینان سے کام کریں۔ اس کیلئے انھوں نے نواب باغپت (غالباً جمشید علی خاں) کو لکھا، اور انھوں نے اس کے لئے اپنا باغ اور بنگلہ پیش کیا، مگر ان سے کوئی کام نہیں ہوسکا، نیلے گنبد کی مسجد میں مدرسہ اشرفیہ تھا، میں وہاں بھی اکثر جایا کرتا تھا۔

میونسپل لائبریری سے کتابیں:۔ میں لاہور کی میونسپل لائبریری کی فیس داخل کرکے وہاں سے کتابیں لاکر پڑھتا تھا، اور ان سے مضامین نقل کرتا تھا۔ اسی سے پہلی بار طبقات الشافعیہ الکبریٰ اور تاریخ ابن عساکر پڑھی، اور ان دونوں کتابوں کے اقتباسات نقل

کئے، جو میری کتاب ''ائمہ اربعہ'' میں کام آئے، اس کتاب میں ان دونوں کے جتنے حوالے ہیں، وہ سب ان ہی اقتباسات سے ہیں، جن کو میں نے محفوظ کر رکھا ہے۔ اور طبقات الشافعیہ الکبریٰ کو بعد میں خریدا، اس لائبریری سے امام احمد بن حنبل کے حالات میں ایک کتاب مطبوعہ یورپ لے کر پوری کتاب نقل کر لی، غالبًا جرمن یا فرنچ زبان میں اسکے تعلیقات وحواشی تھے۔ اس کتاب کے مندرجات بھی ''ائمہ اربعہ'' میں آ گئے ہیں، مجھے اسی زمانہ میں یہ احساس ہوا کہ امام احمد بن حنبل کے حالات وسوانح پر اردو میں نہ ہونے کے برابر کام ہوا ہے، اس لئے ان کی مفصل سوانح لکھنے کی ضرورت ہے، اعظم گڈھ میں ''سیرۃ النعمان'' اور ''حیات امام مالک'' لکھی گئی ہیں، یہیں سے حیات امام احمد بن حنبل بھی لکھی جانی چاہئے، اور ''افادات امام احمد بن حنبل'' کے نام سے بعد میں ایک کتاب بمبئی میں کتابت کرائی جو کتابت شدہ اب تک میرے پاس محفوظ ہے، نہ وہ شائع ہو سکی اور امام صاحب کی مستقل سیرت لکھ سکا، البتہ ''ائمہ اربعہ'' میں ان کے مختصر حالات آ گئے ہیں۔

<u>خریداریٔ کتب</u>:۔ اپنی حیثیت اور استطاعت کے مطابق کتابیں خریدتا تھا، اور جمع کرتا تھا، انارکلی بازار سے اتوار کے دن پرانی کتابوں کے ڈھیر سے ''الامعان فی اقسام القرآن'' لابن قیم اور ''الصراع بین العلم والدین'' خریدی، یہ کتاب غالبًا ڈریپر کی انگریزی کتاب کا عربی میں ترجمہ تھا، جس کا اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے ''معرکہ سائنس ومذہب'' کے نام سے کیا، اور میں نے فراغت کے بعد لکھنؤ کے نخاس بازار سے خریدا تھا، ''الامعان'' بعد میں مولانا عبد الحفیظ بلیاوی نے مطالعہ کے لئے طلب کی، اور میں نے ان کو دے کر واپس نہیں لی، اور ''الصراع بین العلم والدین'' کہیں کرم خوردہ پڑی ہے، (رجب ۱۳۶۵ھ ۔ ۱۹۴۵ء) میں ابن بحتری کا دیوان ''الحماسہ'' مطبوعہ حیدرآباد خریدا، اس سے پہلے شعبان ۱۳۶۴ھ میں ''تہذیب التہذیب'' لابن حجر جو بارہ جلدوں میں حیدرآباد میں چھپی تھی، اس وقت اس کی قیمت تیس روپیہ تھی، کشمیر کی تاریخ اعظمی اور شیخ علی ہجویری کی ''کشف المحجوب'' بھی خریدی، اس وقت ''منتخب التفاسیر'' جمع کر رہا تھا، ''تہذیب التہذیب'' کی ایک جلد زمانۂ طالب علمی میں ''قائد'' مرادآباد میں ''ائمہ اربعہ'' پر مضمون لکھنے کے دوران مولانا عبد الرحمٰن محدث مبارکپوریؒ

کے کتب خانہ سے عاریتاً لے کر استفادہ کیا تھا، اسی زمانہ سے اس کے خریدنے کا شوق تھا، قیمت بھی غالباً ۱۲؍روپیہ تھی، مگر اس کی باری لاہور جانے کے بعد آئی، اور اس کتاب سے میں نے اپنی تصانیف میں خوب خوب استفادہ کیا۔

مولانا فارقلیط صاحب مجھ کو کتابیں لکھنے کی بار بار تاکید کرتے تھے، اور میں کہتا تھا کہ ذرا فرصت ملے تو اس کی طرف توجہ دوں، ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ اگر آپ فرصت کے انتظار میں رہیں گے تو کبھی فرصت نہیں ملے گی، کاموں کے ہجوم میں کام ہوتے ہیں، اور انھوں نے یورپ کے ایک مصنف کا واقعہ بیان کیا جو بہت معمولی زندگی بسر کرتا تھا، اور مزدوری پر اس کی بسر اوقات ہوتی تھی، اس کے باوجود وہ رات کو لکڑی کے صندوق پر چراغ رکھ کر کچھ لکھا کرتا تھا، اس طرح اس نے ایک ناول تیار کی، اور پبلشروں کے پاس لے گیا، مگر جس نے دیکھا مذاق اڑایا، اور مسودہ واپس کر دیا، ایک پبلشر نے اس پر رحم کھا کر اس کا ناول چھاپ دیا تو وہ اس قدر مقبول ہوا کہ کئی ایڈیشن شائع کرنے پڑے، اس کے بعد اس آدمی کی قدر و قیمت اتنی بڑھ گئی کہ وہ مشہور ناول نگار تسلیم کیا گیا۔

الصالحات:۔ اِدھر احسان صاحب، ابوسعید بزمی، مولانا وارث کامل، اور مجھ کو کتابیں لکھنے پر ابھار رہے تھے، چنانچہ میں نے اس کی طرف توجہ کی، ابتداء میں ایک چھوٹا سا رسالہ ''الصالحات'' کے نام سے لکھا، جس میں صحابیات رضی اللہ عنہن کے چھوٹے چھوٹے واقعات جمع کئے، اور اس کو اشاعت کے لئے محمد عارف مالک ملک دین اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور کو دیا، انھوں نے پچاس روپیہ میں گویا یہ رسالہ مجھ سے خرید لیا، اور ایک تحریر لکھوائی، زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ اپنی پہلی کتاب پر رائلٹی یا قیمت ملی، اور وہ کتاب غالباً چھپ نہ سکی، اس کے بعد میں نے اپنی علمی کاوش کو فروخت نہیں کیا، وہ تحریر یہ ہے،

باعثِ تحریر اینکہ

مبلغ پچاس روپئے نصف جس کے پچیس روپئے ہوتے ہیں، بابت حق تصنیف وطباعت دائمی مسودہ کتاب ''الصالحات'' جو میرا تصنیف کردہ ہے، فرم ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب لاہور سے وصول پائے، اقرار ہے کہ میں اس مسودہ کو نہ خود طبع کروں گا، اور نہ اس

کے طبع کرنے کی کسی پبلشر یا تاجر کتب کو اجازت دوں گا۔ لہٰذا یہ رسید لکھ دی تاکہ سند رہے۔ قاضی اطہر مبارکپوری ''مدیر اخبار زمزم'' لاہور، ۱۴ر فروری ۱۹۴۷ء

علمائے اسلام کی خونیں داستانیں:۔ احسان دانش صاحب کے اصرار و مشورہ پر ''علمائے اسلام کی خونیں داستانیں''، لکھی، جو پہلی صدی ہجری سے موجودہ دور تک اسلامی تحریکوں اور ان میں علماء پر ہونے والے مصائب کو بیان کیا تھا، پہلے ہر صدی میں پیدا ہونے والی تحریکوں اور فتنوں کا اجمالی ذکر تھا، اس کے بعد ان علماء کے کردار اور ان پر ہونے والے مظالم کی تفصیل تھی، یہ کتاب میں نے بڑے اہتمام سے مرتب کی تھی، اور احسان صاحب بھی بڑے اہتمام سے اس کی عبارت وغیرہ درست کرتے تھے، پورا مسودہ ان کی نظر سے گذرا تھا، اور زبان و بیان کی درستگی کی تھی، اس کی اشاعت کا انتظام انھوں نے خود کیا تھا، اس سلسلہ میں ہمارے مابین یہ تحریر ایک روپیہ کے کاغذ پر لکھی گئی۔

معاہدہ بابت علمائے اسلام کی خونیں داستانیں

قاضی اطہر مبارکپوری ولد حاجی محمد حسن صاحب ساکن مبارکپور ضلع اعظم گڈھ حال وارد لاہور کا ہوں، اور اپنی کتاب ''علمائے اسلام کی خونیں داستانیں'' کا مسودہ جناب احسان دانش صاحب منیجر دانش گاہ پنجاب مزنگ لاہور کو مندرجہ ذیل شرائط پر ایک ایڈیشن کے اختتام تک حقوق منتقل کر رہا ہوں۔

۱۔۔۔حق تصنیف کے طور پر کتاب چھپنے کے بعد تین سو جلدیں مجھے دی جائیں گی۔

۲۔۔۔یہ ایڈیشن دو ہزار کا ہوگا۔

۳۔۔۔دوسرے ایڈیشن کیلئے احسان دانش صاحب کو ترجیح دی جائے گی۔

العبد، قاضی اطہر مبارکپوری

اسسٹنٹ ایڈیٹر روزنامہ ''زمزم'' لاہور۔ ۱۱ر اپریل ۱۹۴۷ء

اس کتاب کے انجام کی داستان خود احسان صاحب اپنی کتاب ''جہانِ دانش'' (خود نوشت سوانح) کے ص: ۲۶۷ پر یوں درج کی ہے:

اول سے میری آرزو تھی کہ کسی طرح ایک معیاری قسم کا تصنیفی و تالیفی ادارہ قائم کیا جائے،

جس میں ادب عالیہ کی اشاعت ہو، اور موقع کی بنا پر اس کا آغاز بھی کر چکا تھا، لیکن جو میں چاہتا تھا، وہ ڈول نہیں پڑ سکا، اس کے باوجود میں نے ابوسعید بزمی سے دو جلدوں میں ''تاریخ انقلابات عالم'' لکھوائی، اور مولانا وارث کامل سے تین جلدوں میں ''تاریخ مجاہدین اسلام'' مرتب کرائی، اور اس کے بعد قاضی اطہر مبارکپوری سے ''علمائے اسلام کی خونیں داستانیں'' مکمل کرائی۔

اس کے بعد احسان صاحب لکھتے ہیں:

''**تاریخ انقلابات عالم** '' یہ کتاب شیخ نیاز احمد صاحب کو پریس ہی سے اونے پونے اٹھوادی تھی، ''تاریخ مجاہدین اسلام'' بقدر معاوضہ رسیدیں دیکھ کر آغا شورش کاشمیری لے گئے، ''علمائے اسلام کی خونیں داستانیں'' اسّی صفحات کم ہونے کے باعث ہنوز کتابت شدہ میرے پاس موجود ہے''

تقریباً ساڑھے چار سو صفحات تک اس کی کتابت ہو چکی تھی، میں نے مسودہ کا معتد بہ حصہ احسان صاحب کے پاس رکھ دیا، پھر باقی حصہ اس خیال سے لے کر وطن چل دیا کہ واپسی کے بعد باقی حصہ دے دوں گا، مگر تقسیم ملک کا وہ طوفان اٹھا کہ میں نہ لاہور جا سکا اور نہ مسودہ روانہ کر سکا، یہ حصہ آج تک میرے پاس محفوظ ہے، ایک مرتبہ احسان صاحب ایک مشاعرہ میں بمبئی آئے اور کئی روز تک رہے، بار بار میں ان سے ملتا تھا اور وہ میرے کمرے میں آتے تھے جب اس کی کتابت کی بات نکلی تو کہا کہ کتابت شدہ کاپیاں میرے پاس محفوظ ہیں، ان کو ڈاک سے نہیں بھیجا جا سکتا ہے، مرحوم نے ''تاریخ انقلابات عالم'' اور ''علمائے اسلام کی خونیں داستانیں'' اور بعض دوسری کتابوں کے اشتہار دو ورقہ پمفلٹ پر بلاک بنوا کر بڑے اہتمام سے چھاپا تھا اور ان کتابوں کی خوب خوب تشہیر کی تھی، میری کتاب کا اشتہار پورے صفحہ پر یہ تھا،

''علمائے اسلام کی خونیں داستانیں''

از:۔ قاضی اطہر مبارکپوری

تاریخ و رجال کی صدہا نادر و نایاب کتابوں کا نچوڑ، اس صدی کے اسلامی اور سیاسی لٹریچر میں غیر

فانی شاہکار کا اضافہ، آغاز اسلام سے لے کر موجودہ دور تک تاریخ کے خونیں اوراق کا البم، ہر صدی کی ابتداء میں فتنوں اور تحریکوں کا تجزیہ، اور علماء کے مختصر حالات واہم واقعات جو تاریخ میں ہمیشہ تابان ودرخشاں رہیں گے، جابر بادشاہوں، ظالم امیروں، ضمیر فروش پیشواؤں اور جاہل عوام کے ناروا سلوک اور سفاکیوں کی جیتی جاگتی تصویریں، قید خانوں کی گہری تاریکیوں، طوق وزنجیر کی مہیب جھنکاروں، دارورسن کی جانگداز گرفتوں، اور درّوں کی دردناک آوازوں میں صداقت کی مسکراہٹ، بے گناہوں کی سینہ سپری، حق گوئی وبے باکی اور سچے مسلمانوں کی عزیمت کے بولتے چالتے خاکے، قیمت: پانچ روپئے مجلد: چھ روپئے

افسوس کہ میری نوعمری کی دینی وعلمی کاوش کے دونوں عظیم اور یادگار شاہکار ''منتخب التفاسیر'' اور علمائے اسلام کی خونیں داستانیں منصۂ شہود پر نہ آسکے اور نہ ہی ایسی کوئی امید ہی ہے

ائمہ ءاربعہ:۔ ایک اور کتاب ائمہ ءاربعہ کے نام سے لکھی، جس کی بنیاد رسالہ قائد مرادآباد زمانہ ءطالب علمی میں پڑی تھی، مرکز تنظیم اہل سنت نے اس کی کتابت کرائی اس درمیان میں ملک تقسیم ہوا میں اس سے پہلے وطن آ گیا تھا، کتابت شدہ کاپی میرے پاس مبارک پور ڈاک سے آئی، اس وقت ملک تقسیم ہوئے ہفتہ دو ہفتہ گذر رہا تھا اور پورا ملک خون اور آگ میں جل رہا تھا میں نے اس حالت میں رجسٹری کے ذریعہ تصحیح کے بعد روانہ کی جس کا آج تک پتہ نہیں چلا کہ پہونچی بھی یا نہیں، اس کی اصل میرے پاس تھی، بمبئی گیا تو سلطان پریس بھنڈی بازار کو دیا، اس کے مالک سلطان احمد مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) چلے گئے اور اس کا پتہ نہ چلا، بعد میں اس کی تلافی ائمہ اربعہ لکھ کر کیا جس کو شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند نے ۱۴۰۹ھ ۱۹۸۹ء میں شائع کیا،

مولانا فارقلیط مجھ سے کہا کرتے تھے کہ آپ کی معلومات زیادہ ہیں خاص طور سے تاریخی مطالعہ زیادہ ہے، معتزلہ کی ایک تاریخ مرتب کردیں، مولانا چونکہ ابتدا میں آریوں، عیسائیوں سے مناظرہ کرتے تھے اور ان کو اس سلسلے میں نقلی سے زیادہ عقلی استدلال سے کام لینا پڑتا تھا اس لئے وہ معتزلہ کے معقولی طرز استدلال سے متاثر تھے اور کہتے تھے کہ معتزلہ نے اسلام کی طرف سے دفاع میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، اس لئے مجھ سے اس کی فرمائش کرتے تھے، مگر اس لئے آمادہ نہیں ہوا اور کہا کہ علامہ شبلی نے آخر عمر میں الکلام اور علم الکلام لکھ کر مورد الزام بنے، میں

نوعمری ہی میں ملزم بننا نہیں چاہتا تھا، اور بعد کے دوران قیام میں ان مستقل کتابوں کے علاوہ میں نے کچھ مضو عات پر مسودے کی صورت میں معلومات جمع کی تھیں جواب تک میرے پاس موجود ہیں، مثلاً

طبِ عربی:۔ الطبابة عن العرب (عربوں کا علم طب) اس موضوع پر اچھی خاصی معلومات جمع کیں، مستقل کتاب لکھنے کا ارادہ تھا اور اس کا بیشتر حصہ ''عرب وہند کے طبی تعلقات'' کے عنوان سے جناب مالک رام کی فرمائش پر ایک مضمون لکھا جو ان کی تالیف ''نذر حمید'' (حکیم عبد الحمید ہمدرد دہلی والے) میں چھپا صفحہ ۴۳۹ سے صفحہ ۴۵۱ تک، اور کسی نہ کسی حد تک یہ محنت کام آ گئی،

کتب اور کتب خانے:۔ ''کتب اور کتب خانے'' کے عنوان سے کافی معلومات جمع کیں۔

حیات امام احمد بن حنبل:۔ اس موضوع پر بہت زیادہ معلومات یکجا کر لی تھیں، تاریخ ابن عساکر اور طبقات الشافعیہ الکبریٰ سے کافی مواد نقل کیا، اور میونسپل لائبریری سے امام صاحب پر عربی میں ایک نقل حاصل کی جو مطبع بریل میں ۱۸۹۷ء میں چھپی تھی اور انگریزی یا فرنچ یا جرمنی زبان میں اس کے حواشی وغیرہ تھے مصنف کا نام معلوم نہیں ہوسکا، گویا وہ پوری کتاب نقل کر لی، اور یہ سب ابتک میرے پاس موجود ہے بلکہ ائمہ اربعہ کی تالیف میں ان سے بہت زیادہ مدد ملی۔

حیات لیث بن سعد:۔ پر کافی معلومات جمع کیں اس کا اصل ماخذ حافظ ابن حجر کی کتاب ''الرحمة الغيثية فى الترجمة الليثية'' مطبوعہ بولاق مصر ۱۳۰۱ھ تھی، اس مسودہ کے حاشیہ پر میں نے لکھا ہے اور ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۶۶ھ (۳ مارچ ۱۹۴۷ء) سے جبکہ لاہور میں گولی چل رہی ہے اپنے کمرے میں بیٹھکر اس امام جلیل کا تذکرہ مرتب کر رہا ہوں۔ قاضی اطہر مبارک پوری نائب مدیر ''زمزم'' لاہور، (مسودہ میں تاریخ ۵ مارچ ۱۹۴۷ء درج ہے) اس وقت لاہور میں نہایت شدید قسم کا ہندو مسلم فساد برپا ہوگیا تھا اور کئی دن تک قدیم شہر کا شمال مشرقی حصہ قتل وغارت اور آتش زنی کی آماجگاہ بنا رہا، اس وقت صرف روزنامہ ''زمزم'' کسی طرح چھپتا تھا کیونکہ بھاٹی گیٹ کا علاقہ نسبۃً محفوظ تھا، میں ''زمزم'' میں اتحاد واتفاق کیلئے قطعات لکھتا تھا،

اقوال حکماء:۔ کے عنوان سے قرآن وحدیث، ائمہ دین، حکماء، سلاطین، ادباء کے

اقوال جمع کئے خاصے کی چیز بن گئی تھی، لاہور علم وادب کا مرکز تھا، ادباء وشعراء اور مصنفوں اور صحافیوں کی چھل پہل تھی معمولی قسم کے شاعر وادیب ہوٹلوں میں شعروشاعری اور چائے نوشی کیا کرتے تھے، جہاں چار ادیب وشاعر بیٹھے کوئی نہ کوئی ادبی پروگرام بن گیا، اور فوراً اس پر عمل بھی ہونے لگا، مصنف تیار، کاتب تیار اور کام چالو، مصنف روزانہ لکھ کر کاتب کو دیتا اور دوسرے دن پھر یہی ہوتا اور ماہ دو ماہ میں کتاب مارکیٹ میں آجاتی، ایک مرتبہ احسان دانش کی مجلس میں بات آئی کہ اس موضوع پر ایک دلچسپ کتاب ہوسکتی ہے، اور یہ میرے ذمہ کردیا گیا، نئے نئے موضوعات سوچ کر نکالے جاتے تھے، منشی عبدالرحیم صاحب نے ایک موضوع یہ رکھا کہ لاہور میں جتنے قبرستان ہیں، ان کے کتبات نقل کر کے ایک بہترین معلوماتی کتاب تیار ہوسکتی ہے، یہ میرے بس کا نہیں تھا، اور اب بہت بعد میں بعینہٖ یہی کام ڈاکٹر محمد اسلم پروفیسر تاریخ پنجاب لاہور نے الواح الصنادید کے نام سے کیا اور کئی قسطوں میں رسالہ برہان دہلی میں شائع کیا، غالباً کتاب تیار ہوگئی ہوگی،

مشکلات القرآن اور کلمات اکابر کی اشاعت:۔ مولانا داؤد اکبر اصلاحی کی کتاب مشکلات القرآن میرے توسط سے احسان دانش صاحب نے اپنے مکتبہ سے شائع کیا، مولانا محمد اسحاق بنارسی کی کتاب حکمات اکابر بھی میرے توسط سے لاہور میں پہلی بار چھپی، احسان دانش صاحب نے اپنے کاغذ کے کوٹے سے کاغذ دیا اور اپنی نگرانی میں کتابت کرائی، اس سلسلے میں مولانا محمد اسحاق صاحب مہینوں ہمارے ساتھ مبارک منزل میں رہے اور مولانا فارقلیط صاحب کے ساتھ خوب محفلیں جمتی تھیں،

اسیر ادروی اور پرواز اصلاحی:۔ میرے محترم دوست مولانا نظام الدین صاحب اسیر ادروی بھی چند ماہ لاہور میں ہمارے ساتھ رہے، مگر بیماری کی وجہ سے واپس چلے گئے۔ مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی کو میں نے لاہور بلایا اور احسان دانش صاحب کی یہاں رہ کر انھوں نے مومن دہلوی پر ایک کتاب لکھی جو بعد میں چھپی اور ان کا نام کتاب کے اندر آیا۔

مولوی محمد عثمان ساحر مبارکپوری:۔ میرے دوست مولوی محمد عثمان صاحب بھی چند ماہ لاہور میں رہے، وہ مرادآباد میں بھی میرے ساتھ رہے، وہ ایک سال پہلے فارغ ہوچکے تھے،

یہ باہمی انس ومحبت کی بات تھی۔

مولانا بشیر احمدؒ ومولانا شمس الدین:۔ ایک مرتبہ مولانا بشیر احمد صاحبؒ ومولانا شمس الدین صاحب بھی میرے یہاں آئے اور چند دن رہ کر واپس ہوئے، ایک شاگرد بھی میرے ساتھ رہا۔

والد صاحب لاہور میں:۔ ایک مرتبہ والد صاحب مرحوم اور محلّہ کے دو اور شخص اچانک لاہور پہونچ گئے، رات کو دفتر سے ایک ملازم ساتھ لے کر مبارک منزل میں آئے، ان کا یہ سفر امرتسر سے ریشم خریدنے کے لئے تھا، کئی دن رہے اور میرے ساتھ امرتسر آتے جاتے رہے، بڑے والد حاجی اسداللہ، حاجی محمد حسین اور چچا حاجی محمد عمر اور قصبہ کے دیگر حجاج کراچی سے حج کو جارہے تھے، میں بھی ان کے ساتھ تھا، لاہور میں اترے اور سب لوگ میرے یہاں آئے، اور دوسرے روز کراچی کے لئے روانہ ہوئے۔

وطن کے لوگ:۔ اس طرح جب کوئی شخص کسی جگہ جاتا ہے اور کچھ دنوں رہتا ہے تو اس کے متعلقین اور علاقہ کے لوگ کسی بہانے سے وہاں پہونچتے ہیں اور وہ ذریعہ بنتا ہے، اس زمانہ میں لاہور میں بجنور اور مغربی یوپی کے لوگ نسبۃً زیادہ رہتے تھے، مشرقی یوپی کے لوگ خال خال نظر آتے تھے، جن سے مل ک بڑی خوشی ہوتی تھی، وہ بھی خوش ہوتے تھے، اپنے علاقہ کا کوئی دیہاتی مل جاتا اور میں اس سے وطن پوچھتا تو وہ پہلے گھبراتا تھا اور مجھ سے پوچھتا تھا جب اعظم گڈھ بتاتا تو پھر محلّہ کا آدمی بن جاتا تھا، انسان جب اپنے محلّہ سے باہر جاتا ہے تو محلّہ والوں کو پاکر خوش ہوتا ہے، جب دوسرے شہر میں جاتا ہے تو اپنے شہر والوں کو پاکر مسرور ہوتا ہے، اور جب دوسرے ملک میں جاتا ہے تو اپنے ملک والوں سے مل کر مسرت محسوس کرتا ہے، یہ فطری جذبہ ہے۔

لدھیانہ:۔ قیامِ لاہور کے زمانہ میں پنجاب کے دوسرے علاقوں جانے کا اتفاق نہیں ہوا، البتہ ایک مرتبہ اپنے یہاں کے ایک صاحب کیلئے ہوزری کا سامان خریدنے اور بھجوانے کیلئے لدھیانہ گیا اور کئی دن مقیم رہا، یہاں بھی بجنور کے لوگ بہت زیادہ تھے اور ان ہی کے یہاں میرا قیام تھا، کبھی کبھی میرے دوست مولوی محمد عثمان صاحب اور میں ٹہلتے ٹہلتے شہر کے باہر شاہدرہ جایا کرتے تھے جہاں جہانگیر اور نور جہاں کا مقبرہ ہے، ایک روز ہم دونوں وہیں ایک باغ میں

لیٹے ہوئے تھے، میں نے مولوی عثمان سے کہا کہ آج ہم دونوں پنجاب کے اس جگہ ہیں، معلوم نہیں زندگی میں پھر یہاں اس طرح یکجا ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ اور اب ایسا ہوا کہ شاہدرہ تو کیا لاہور جانا مشکل ہے، اس درمیان میں ایک مرتبہ مولانا فارقلیط کی موجودگی میں لاہور جاتے ہوئے ان کے گھر پلکھوہ میں دودن قیام رہا،

حضرت داتا گنج کے دربار میں:۔ کبھی کبھی جمعرات کو حضرت داتا گنج کے دربار میں جاتا تھا، مغرب اور عشاء کے درمیان جمعرات کو نعت خوانی کی محفل ہوتی تھی، اردو، فارسی اور پنجابی میں نعتیں اور مذہبی اشعار خوش الحانی سے پڑھے جاتے تھے، محفل میں ایک شخص کھڑا ہو کر اشعار سناتا اور اسی کے بعد ہی فوراً دوسرا شخص کھڑا ہوجاتا۔

شاہی مسجد لاہور:۔ شاہی مسجد لاہور میں نماز پڑھنے کے لئے جایا کرتا تھا اس وقت اس کے مینارے بنائے جارہے تھے اور حکومتِ پنجاب کی جانب سے اس کا انتظام تھا، پتھر افغانستان سے آتے تھے، لاہور کے بعض لوگوں نے بتایا کہ بڑے بوڑھے بیان کرتے ہیں کہ ہم نے وہ زمانہ دیکھا ہے جبکہ لاہور کی شاہی مسجد کے صحن میں سکھوں کے گھوڑے بندھے رہتے تھے اور کمروں میں ان کے لوگ رہتے تھے، اسی کے سامنے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بارہ دری تھی، اس کے بعد شاہی قلعہ تھا کبھی کبھی شاہی قلعہ میں جانا ہوتا تھا۔

پکنک:۔ لاہور کے صحافی برسات میں پکنک (سیر وتفریح) کے لئے اجتماعی طور سے شاہدرہ جاتے تھے جن میں اخبارات کے مالک اور مدیر اور دوسرے متعلقین ہوتے تھے، اس میں خاص طور سے آم کھانے اور دودھ پینے کا اہتمام ہوتا تھا، یہ مشغلہ دن بھر رہتا تھا، ایک مرتبہ میں نے ابو سعید بزمی سے کہا کہ چلئے جہانگیر کے مقبرہ کی سیر کریں جو سامنے ہی تھا تو انھوں نے برجستہ کہا کہ آپ جایئے، میں نہیں جاؤں گا، بادشاہوں نے مقبروں کے علاوہ ہمارے لئے کیا چھوڑا ہے، ہم کب تک ان کی مجاوری کریں گے؟

روزنامہ ''زمزم'' کی نائب اڈیٹری:۔ روزنامہ ''زمزم'' میں ۱۷/جنوری ۱۹۴۷ء سے نائب ڈیٹر کی حیثیت سے مولانا فارقلیط کی زیر نگرانی کام کرتا رہا، اس درمیان میں ملک کی تقسیم کی شرائط اور تفصیلات طے ہورہی تھیں، پورا ملک ہیجانی دور سے گزر رہا تھا، فارقلیط صاحب کہتے

تھے کہ امرتسر اور لاہور میں لڑائی ہوگی اس لئے ہم لوگوں کو اس سے پہلے لاہور چھوڑ دینا چاہئے بعد میں جب سکون ہوگا تو آ جائیں گے، کیونکہ اس طرح کی تقسیم کا وہم وگمان بھی نہیں تھا جس طرح ہوئی، ابوسعید بزمی نے فیصلہ کیا کہ مجھے یہیں رہنا ہے، وہ اخبار ''احسان'' کے اڈیٹر تھے، وہ کہتے تھے کہ ہندوستان میں تقسیم کے بعد مسلمانوں پر بڑی آفت آئے گی۔

۱۰؍جون ۱۹۴۷ء کو وطن واپسی:۔ میں ۱۰؍ جون ۱۹۴۷ء کو وطن پہونچ گیا اور میرے بعد مولانا فارقلیط بھی آ گئے، پھر ہم میں سے کوئی لاہور نہ جاسکا، ان کی آمد کی اطلاع اخبار ''الجمیعۃ'' کے ذریعہ ہوئی، معلوم نہیں ''زمزم'' کے دوسرے اراکین کہاں رہے اور ان پر کیا گذری۔

احسان دانش کا خط اور مولانا سید نورالحسن کا خط:۔ کچھ دنوں کے بعد احسان دانش نے مجھے لکھا کہ یہاں ''ادارہ ثقافتِ اسلامیہ'' سرکاری زیر انتظام قائم ہوا ہے، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس کے صدر ہیں اور میرے ایک شاگرد اس کے خاص رکن ہیں، آپ ایک درخواست اس پتہ پر بھیج دیں جس میں اپنی صلاحیتوں کا بے تکلف اظہار کردیں، اور مجھے اطلاع دیں، میں کوشش کرکے اس میں رکھوادوں گا، اور مولانا سید نورالحسن صاحب بخاری نے خیریت معلوم کرتے ہوئے لکھا کہ آپ ہندوستان میں رہیں، وہاں بھی اہل علم کی ضرورت ہے۔

جامع مسجد (مبارکپور) کیلئے کتبے:۔ جامع مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں اب تک کام ہو رہا تھا، میں نے لاہور میں عبدالرشید ایوب الرقم سے معوذتین کے تین کتبے غالباً بیس بیس روپئے میں لکھوائے، جو جامع مسجد کے محراب کے اندر کندہ حروف میں موجود ہیں۔

عہدِ رفتہ کی جستجو:۔ ۱۰؍مئی ۱۹۷۸ء کو بلادِ عرب وافریقہ کے سفر سے واپسی پر کراچی ہوتا ہوا لاہور پہونچا، مگر میرے زمانہ کا لاہور نہیں ملا، حالانکہ پیسہ اخبار انارکلی میں قیام رہا، اسی طرح مارچ ۱۹۸۴ء میں پاکستان کے سرکاری سفر میں پورے پاکستان کی سرکاری سطح پر سیر کرتے ہوئے لاہور گیا اور گیسٹ ہاؤس میں دودن قیام رہا مگر اخبار ''زمزم'' کے دفتر کی بلڈنگ نہیں پاسکا، مگر معلوم ہوا کہ وہ بلڈنگ اب تک اسی جگہ موجود ہے۔

............☆☆☆☆☆............

اخبار ''انصار'' بہرائچ

قیام لاہور کا پورا دور ملک میں سخت انتشار، بے چینی اور فتنہ وفساد سے پُر تھا، ملک کی تقسیم طے ہو چکی تھی، تفصیلات طے ہو رہی تھیں، بلکہ ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ بھی مقرر ہو چکی تھی، مولانا فارقلیط نے کہا کہ تقسیم کے وقت امرتسر اور لاہور میں فسادات کا خطرہ ہے، اس لئے ہم لوگوں کو یہاں سے وطن چلا جانا چاہئے، جب سکون ہوگا تو واپس آجائیں گے، ان کو اندازہ نہیں تھا کہ تقسیم ملک اس طرح ہو جائے گی کہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے، چنانچہ پہلے میں چلا آیا، بعد میں فارقلیط صاحب بھی آگئے، اس کے بعد وہ اخبار الجمعیۃ سے منسلک ہو گئے اور میں بیکار رہا، جگہ کی تلاش میں مدرسوں کا چکر کاٹا مگر کہیں کام نہیں چلا، اسی میں چار پانچ مہینے گذر گئے، سخت پریشانی تھی، مدرسے والے کہتے تھے کہ وہ باہر رہ چکے ہیں اس لئے جب بھی موقع پائیں گے پڑھانا چھوڑ دیں گے۔

اس دور میں مولانا محفوظ الرحمٰن نامی مبارکپور آئے، وہ یوپی کی پہلی کانگریسی حکومت کے پارلیمنٹری سکریٹری بنائے گئے، انھوں نے اپنے وطن بہرائچ سے ہفتہ وار ''الانصار'' جاری کرنے کا پروگرام بنایا تھا اسکی ادارت کے لئے بات طے ہوگئی، مشاہرہ ۷۵ روپے طے ہوا، قیام وطعام کا انتظام ان کے گھر تھا، اور محرم ۱۳۶۷ھ (نومبر ۱۹۴۷ء) تا رجب ۱۳۶۷ھ (۱۹۴۸ء) بہرائچ میں قیام رہا، اکلیل پریس اور کاتب ان کے گھر کے تھے،

مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاویؒ اس وقت مدرسہ نور العلوم میں مدرس تھے، جس کے ذمہ دار مولانا محفوظ الرحمٰن نامی صاحب تھے، وہ نائب اڈیٹر بنائے گئے، ان کا قیام بھی مولانا نامی کے مکان کے ایک حصہ میں تھا، وہ خالص علمی آدمی تھے، اس وقت ''مصباح اللغات'' کے مسوڈات صاف کر کے ''ندوۃ المصنفین'' دہلی بھیجا کرتے تھے، بڑے چاق چوبند، بے تکلف، مخلص اور علمی مزاج کے ہم ذوق آدمی تھے، ان سے خوب بنتی تھی۔

یہ زمانہ پورے شمالی ھند خصوصاً پنجاب میں مسلمانوں کے حق میں بڑا پر آشوب تھا، معلوم ہوتا تھا کہ یہاں سے مسلمانون کا نام ونشان مٹا دیا جائے گا، قتل وغارت گری، آتش زنی اور

دوسرے طرح طرح کے فسادات تھے، اور میں ''انصار'' میں ان فرقہ پرستوں، قاتلوں اور مسلمان دشمن جماعتوں کے خلاف تیز وتند انداز میں لکھتا تھا، اور یو پی حکومت کی طرف سے بار بار تنبیہ اور نوٹس آتی تھی، حتیٰ کہ گرفتاری اور سزا کی باری آگئی مگر مولانا نامی نے حکومت کو اطمینان دلایا کہ وہ اخبار پر کنٹرول کریں گے، اور مجھ سے کہا کہ آپ یو پی میں پنجاب کا انداز تحریر اختیار نہ کریں ورنہ اخبار بند ہو جائے گا، میں نے مولانا فارقلیط صاحب کو اس سلسلہ میں لکھا تو انھوں نے بھی یہی کہا کہ دہلی کا معاملہ اور ہے، یو پی کا اور! قلم سنبھال کر لکھئے! اسی دوران یو پی حکومت کا ایک سرکلر تمام عدالتوں میں پہونچا کہ اخبار ''انصار'' کو کوئی اشتہار نہ دیا جائے، وہ حکومت کے نزدیک غیر مقبول اخبار ہے، اسلئے کسی طرح سات ماہ جاری رکھ کر اسے بند کر دینا پڑا، میرے مضامین مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ ''صدقِ جدید'' میں بڑے انشراح سے ''ایک غیور صحافی'' ''ایک بے باک صحافی'' وغیرہ کے حوالہ سے بلاتبصرہ نقل کرتے تھے، عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنے اخبار ''عصرِ جدید'' میں مولانا دریابادی کے خلاف ایک نہایت گستاخانہ مضمون لکھا، میں نے انصار میں اسی انداز کا جواب لکھا اور مولانا دریابادی سے وقتی اختلاف کے باوجود ان کی طرف داری کی، اس وجہ سے وہ میری حوصلہ افزائی کرنے لگے، ورنہ اس سے پہلے ''زمزم'' میں ان کے خلاف دو کالم میں لمبا چوڑا مضمون لکھ چکا تھا۔

زندہ دلانِ پنجاب کے رنگین شہر اور مرکز شعر وادب لاہور جیسے بارونق وپُر بہار جگہ کے مقابلہ میں بہرائچ ایک سنسان اور بے کیف وکم مقام تھا، جس کو غازی میاں کی وجہ سے شہرت تھی، لاہور کے مقابلہ میں یہاں کا قیام بالکل بے کیف تھا، مگر چونکہ مزاج مدرسہ کا تھا اس لئے یہاں مدرسہ نور العلوم دلچسپی کا مرکز بن رہا، مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی، مولانا سید حمیدالدین صاحب، حافظ محمد نعمان صاحب، مولانا سلامت اللہ صاحب، حافظ عبدالعزیز صاحب اور حافظ اعمیٰ صاحب یہاں کے مخلص وبااخلاق اساتذہ تھے، میں بھی بعض کتابیں پڑھاتا تھا، اکثر وقت وہیں گذرتا تھا، خصوصاً مولانا بلیاوی کی دلچسپ علمی وادبی مجلس بڑی پُرکشش تھی، طلبہ ومدرسین میں وقت گذرتا تھا، مبارکپور کے کپڑوں کے بعض تاجر بھی آتے جاتے تھے، اخبار کے کاغذ کے سلسلہ میں مولانا نامی کے یہاں لکھنؤ آنا جانا ہوتا تھا، راستہ میں گونڈہ شہر کے مدرسہ فرقانیہ سے بھی

تعلق ہوگیا تھا، ابوزکریا بن علی خطیب تبریزی کی شرح ''دیوان الحماسة'' پہلی بار یہیں کے کتب خانہ سے لے کر دیکھی تھی، یہیں کے دوران قیام تقسیم کے بعد مسلمانوں کی پہلی کانفرنس مولانا آزاد کی زیر صدارت لکھنؤ میں ہوئی جس میں مسلم جماعتون کو سیاسی سرگرمی الگ ہوکر ثقافتی وتہذیبی اور دینی ومذہبی خدمات کا فیصلہ کیا گیا تھا، اور میں اس میں شریک ہوا تھا، اسی دوران گاندھی جی کا قتل ہوا تھا، اور بہرائچ میں ماتمی جلوس نکلا تھا، جس میں ہم لوگ شریک تھے۔

یہاں کے خواجہ محمد خلیل اسمبلی کے ممبر اور درگاہ سالار مسعود غازیؒ کی کمیٹی کے چیرمین تھے، وہ اپنے ذہن ومزاج کے آدمی تھے، ہم لوگ اکثر درگاہ میں تفریح کے لئے جاتے تھے، اسی کے قریب انارکلی نام کا ایک تالاب ہے اس میں مچھلی کے شکار کے لئے جایا کرتے تھے، ابن بطوطہ نے بہرائچ میں بانس کے جنگل اور اس میں گینڈے کا ذکر کیا ہے، درگاہ کے شمال میں بانسوں کا جنگل تھا وہاں سے میں نے ایک چھڑی کاٹی تھی، یہاں شاہ نعیم اللہ بہرائچی اور بعض دوسرے مشائخ کے مزار ہیں، یہاں ایک معمولی سے کتب خانہ میں ابوالعلاء معرّی کا دیوان ''سقط الزند'' تھا جس کو میں نے ۸؍صفر ۱۳۶۷ھ میں ڈھائی روپئے میں خریدا، جو ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں مصر میں چھپا ہے۔

تذکرہ مشاہیر اعظم گڈھ ومبارکپور:۔ قیام بہرائچ کے دوران میں نے ''تذکرہ مشاہیرِ اعظم گڈھ ومبارکپور'' کے عنوان سے کتاب لکھنے کی ابتداء جمادی الاولیٰ ۱۳۶۷ھ میں کی، اور اچھا خاصا مسوّدہ تیار ہوگیا، بعد میں اسی سے ''تذکرہ علمائے مبارکپور'' ۱۹۷۴ء میں شائع کیا، یہ پوری بیاض منتشر شکل میں میرے پاس موجود ہے۔

..................☆☆☆☆☆☆☆..................

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں (شوال ۱۳۶۷ھ تا شعبان ۱۳۶۹ھ)

میں رجب ۱۳۶۷ھ میں اخبار ''انصار'' بند کر کے وطن چلا آیا، اب پھر کام کی تلاش ہوئی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کو لکھا کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرسی کی جگہ ہوتو مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے یہاں میرے بارے میں سفارش کر دیں جو اس کے صدر مدرس تھے، (مدرسہ

عالیہ کلکتہ تقسیم کے بعد ڈھاکہ چلا گیا، عمارت باقی تھی اسی میں مولانا آزاد نے اپنے اثر ورسوخ سے دوبارہ جاری کیا تھا اور نئے نظام کے تحت مدرسین رکھے گئے تھے) مفتی صاحب نے جواب دیا کہ میرے حوالہ سے آپ ان کو خط لکھیں کوئی جگہ ہوگی تو لے لیں، مگر میرا خط جانے سے پہلے ہی وہاں کسی کا تقرر ہو چکا تھا جیسا کہ مولانا اکبرآبادی نے مجھے جواب دیا۔

اس زمانہ میں جامعہ ڈابھیل کے لئے طلبہ اور مدرسین کی تلاش تھی، اور سفرخرچ بھی دیا جاتا تھا، تنخواہ بھی اس وقت کے لحاظ سے اچھی ہوتی تھی، مگر اکثر درمیان سال میں مدرسین کو کسی نہ کسی بہانے سے رخصت کر دیا جاتا تھا، اور یہ بے چارے کسی طرف کے نہیں ہوتے تھے، اس لئے وہاں جانے میں پس وپیش تھا مگر مرتا کیا نہ کرتا سو روپیہ کے مشاہرہ پر چلا گیا،

ڈابھیل کا یہ سفر مبارکپور کے حجاج کے ساتھ ہوا تھا، راستہ میں ریل میں میرا بستر گم ہو گیا، ان ہی میں سے کسی کے بستر میں لوگوں نے ڈال دیا تھا، بھساول میں بہت تلاش کیا لیکن نہیں ملا تو ڈابھیل پہونچ کر دوسرے دن اس کی تلاش میں بمبئی گیا، یہ بمبئی کا پہلا سفر تھا بستر تو نہیں ملا مگر اس سفر کی یادگار میں نے امام ابن قیم کی کتاب ''**الجواب الکافی لمن سئل عن الدواء الشافی**'' شرف الدین الکتبی کے یہاں سے ۲۰؍شوال ۱۳۶۷ھ کو خریدی، محمد علی روڈ پر **المکتبة الحجازیه** کا بورڈ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، اور بعد میں اسی میں ''رجال السند والھند'' چھپی، اس کو بارہ بنکی کے مولوی عطاء اللہ نے جاری کیا تھا، ان کے لڑکے مولوی ضیاء اللہ نے میری کتاب طبع کی، بہار کے محمد مشتاق نے کمپوز کیا۔

یہاں میرے ذمہ شرح جامی، مقاماتِ حریری، مختصر المعانی، سفینۃ البلغاء، النحو الواضح اور اسی قسم کی کتابیں تھیں، درمیان سال میں سات مدرس واپس کئے گئے جن میں فتاویٰ دارالعلوم کے مرتب بھی تھے، یہ یہاں کی پرانی روش تھی، بڑے بڑے اہل علم اور بزرگ یہاں سے اسی طرح الگ کئے جا چکے تھے جن کے قصے ہم مدرسین سنتے سناتے تھے، میری تنخواہ میں صفر ۱۳۶۸ھ میں دس روپیہ کا اضافہ ہوا تھا۔ مگر درمیان سال ہی میں اندازہ ہو گیا کہ آئندہ یہاں آنا نہیں ہوگا، یہاں افریقہ اور لندن وغیرہ جانے کیلئے گجراتی طلبہ مولویت کی سند کیلئے پڑھتے تھے تاکہ امامت وخطابت اور فتویٰ کے نام پر ان کو وہاں قیام مل جائے، اس لئے پڑھنے میں محنت بہت

کم کرتے تھے اور مدرسین کے بارے میں ان ہی کا فتویٰ چلتا تھا، جس مدرس کے بارے میں طلبہ کی جیسی رائے ہوتی تھی ویسا ہی معاملہ ہوتا تھا، درمیان میں ساتوں مدرسین کی رخصتی ان کے شاگردوں کی ناپسندیدگی کی بنا پر ہوئی تھی، یہاں جو مدرس گردن اٹھا کر لمبی چوڑی تقریر کرتا تھا اور اناپ شناپ حوالے دیتا تھا وہ بہت قابل ''موٹا مولوی چھے'' مانا جاتا تھا، اور جو مدرس سنجیدگی سے نفس مضمون اور کتاب پڑھاتا تھا وہ ناقابل تھا، میں مقامات حریری اور ادب کی دوسری کتابیں پڑھاتے وقت کبھی کبھی لغات اور حواشی کی مراجعت کرتا تھا، اس لئے میں ناقابل مولوی تھا اور میں انتہائی احتیاط کی بنا پر ایسا کرتا تھا حالانکہ میں بھی بے پر کی اڑا سکتا تھا مگر یہ بات دیانتداری اور ایمان داری کے خلاف تھی، اس لئے مجھے معلوم ہو گیا کہ آئندہ سال مجھے یہاں آنا نصیب نہیں ہوگا اور وہاں سے نکلتے وقت ایک شعر کہا تھا ؎

خلوصِ سکنۂ گجرات تاجرانہ   یہاں کے لوگ عموماً وفا شعار نہیں

چنانچہ شعبان میں وطن آیا تو وہاں سے بصورت الفاظ علیحدگی کا رجسٹری لفافہ آ گیا، اللہ کا شکر ہے کہ درمیان سال میں اس کی نوبت نہیں آئی، جب کہ بے چارے سات مدرسین درمیان میں الگ کئے گئے۔

مولانا محمد یوسف بنوری و مولانا محمد مالک کاندھلوی:۔ اس وقت جامعہ اسلامیہ میں مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ شیخ الحدیث تھے، ان کے علاوہ مولانا محمد مالک بن مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، مولانا اسلام الحق صاحب کوپا گنجیؒ، اور مولانا عبد الجبار صاحب معروفیؒ مشاہیر مدرسین میں سے تھے، مولانا عبد الجبار صاحب معروفیؒ بعد میں آئے تھے، مولانا اسلام الحق صاحب کوپا گنجی خاموش طبیعت کے نیک عالم تھے مگر میں نے ان کو بہت بے تکلف بنا دیا تھا، وہ مجھ سے بیحد مانوس رہتے تھے۔

ایک اصولی بات:۔ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری بستی میں بال بچوں کے ساتھ رہتے تھے، ڈابھیل جانے کے چند دن بعد انھوں نے عصر کے بعد مدرسین کو چاء کی دعوت دی، ان میں مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہانپوریؒ بھی تھے جو مدت سے سورت میں قیام پذیر تھے، اور جامعہ اسلامیہ میں تشریف لایا کرتے تھے، مولانا بنوری نے سب سے پہلے چاء کی پیالی میری

طرف بڑھائی اور میں نے حضرت مفتی صاحب کی طرف بڑھادی، مولانا بنوری نے فوراً مجھے ٹوکا کہ آپ پہلی بار میرے یہاں آئے ہیں اور میرے انتظام میں دخل دیتے ہیں، میں مفتی صاحب کے مقام ومرتبہ سے واقف ہوں، اس کے باوجود میں نے چاء کی پیالی کچھ سمجھ کر آپ کے سامنے رکھی ہے، میں نے اس اصول پر اپنی غلطی تسلیم کرلی، کسی کے یہاں جاکر اس کے معاملات میں دخل دینا بالکل غیر مناسب حرکت ہے۔

ہم لوگ اکثر جمعہ کو سورت اور راندیر جایا کرتے تھے، جہاں مدرسہ اشرفیہ اور مدرسہ حسینیہ تھے، اس زمانہ میں گجرات میں جامعہ اسلامیہ کے بعد یہی دونوں مدرسے مرکز کی حیثیت رکھتے تھے، بعد میں کئی بڑے مدارس جاری ہوئے، کبھی کبھی نوساری بھی جانا ہوتا تھا۔

كتاب الحجة علىٰ اهل المدينة:۔ مولانا مفتی مہدی حسن صاحب امام محمدؒ کی کتاب كتاب الحجة علىٰ اهل المدينة کا حاشیہ (جو شرح کی حیثیت رکھتا ہے) مکمل کرچکے تھے، ہم لوگ سورت جاتے تو اس کے خاص خاص مقامات پڑھ کر سناتے تھے، انھوں نے ہم لوگوں کو امام ابن قیمؒ کی تصوف کی کتاب ''مدارج السالکین'' کی دو ضخیم جلدیں عنایت کی تھیں جو تین جلدوں میں چھپی تھی، ان کی زندگی کے آخری دور میں كتاب الحجة علىٰ اهل المدينة اس کے شروح وحواشی کے ساتھ لجنۃ احیاء المعارف حیدرآباد سے چار ضخیم جلدوں میں چھپی اور میں نے ''معارف'' میں اس پر تبصرہ لکھا،

مجلس علمی:۔ یہاں کی مجلس علمی کی سرگرمی اس وقت تقریباً ختم تھی، مولانا بنوریؒ اس کے مشرف بلکہ روح تھے، مگر دوسرے ارکان کی بے توجہی سے کوئی کام نہیں ہورہا تھا۔

جامعہ اسلامیہ کے تقریباً جملہ اخراجات افریقہ کے گجراتی تاجروں اور مالداروں کی طرف سے آتے تھے، خاص طور سے ابراہیم گارڈی صاحب کا نام سرِ فہرست تھا، اس وقت جامعہ اسلامیہ میں ایک شعر مشہور تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ ''گارڈی نے علم کی میخ گاڑ دی''

جامعہ کا عظیم الشان کتب خانہ اور ''رجال السند والہند'' کی ابتداء:۔ دارالعلوم دیوبند میں اس وقت کے اختلاف کا خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں کے مشہور اساطین علم اٹھ کر مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل میں آگئے اور اس کو جامعہ اسلامیہ بنادیا، مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ، مولانا شبیر

احمد عثمانیؒ، مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب امروہوی اور دوسرے اہل علم، اہل تحقیق اور اہل ذوق نے یہاں آکر دیگر علمی و دینی خدمات کی طرح ایک اہم خدمت یہ انجام دی کہ جامعہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا اور ہر علم وفن کی امہات کتب جمع کیں کرائیں، اہل علم واہل دل نے مل کر یہ بڑا کام کیا، یہ کتب خانہ میرے لئے بڑا پُر کشش تھا مختلف علوم وفنون خصوصاً تاریخ وادب کی کتابیں خوب پڑھتا تھا اور اپنے ذوق کی باتیں نقل کرتا تھا، ایک روز احمد امین کی ''ضحیٰ الاسلام'' کا مطالعہ کررہا تھا جس میں مشہور امام لغت وادب ابن الاعرابی کے متعلق **کان اصلہٗ سندیاً** دیکھا تو ذہن میں فوراً یہ بات آئی کہ اتنا عظیم امام لغت سندی الاصل ہے، معلوم نہیں کیسے کیسے اہل علم وفضل سندی ھندی ہوں گے جن کا ہم کو علم نہیں ہے، وقت وقت کی بات ہے، ورنہ اس سے پہلے دیوان حماسہ وغیرہ میں ابوعطاء السندی کے اشعار بار بار نظر سے گزرے مگر اس کا احساس نہیں ہوا، بس اسی وقت ابن الاعرابی کا تذکرہ نقل کیا اور اس کا سلسلہ چل پڑا جو آخر میں **رجال السند والھند** کی شکل میں سامنے آیا، ''تھیج صغیرات الامور کبیرھا'' بالکل صحیح ہے

اب رات دن چلتے پھرتے حتیٰ کہ کھانا کھاتے وقت بھی تاریخ ورجال کی کتابیں مطالعہ کرنے لگا، ایک دن میں کئی کئی کتابیں سرسری طور سے دیکھتا اور جہاں کوئی سندھی اور ھندی شخصیت نظر آتی فوراً نقل کرلیتا، ایک دن کتب خانہ کے ناظم نے کہا کہ مولانا ساری کتابیں کمرے میں لیجایئے تاکہ بار بار داخل خارج نہ کرنا پڑے، **رجال السند والھند** کے مسودّے کے پہلے صفحہ پر یہ عبارت درج ہے۔ ''إبتداء التالیف فی ۱۲/ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۸ھ و ذٰلک فی الجامعة الاسلامیة ،دابیل (سورت)التدوین جارٍ'' ۲۱/سال کے بعد تحریر ملی:۔ میں کتب خانہ کی نادرونایاب کتابوں سے اپنے ذوق کی چیزیں نقل کرلیا کرتا تھا، چنانچہ ابوعلی قالی بغدادی کی کتاب ''الامالی'' سے ادبی شہ پارے بڑے سائز کے دس صفحات میں نقل کئے جو کلبی کی کتاب ''الاصنام'' میں پڑے رہ گئے اور میں ان کو بھول گیا، اور قیام بمبئی کے دوران ۱۴/ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ کو مدرسہ فلاح دارین ترکیسر گیا واپسی پر جامعہ اسلامیہ گیا تو اتفاق سے کتب خانہ کے نوادرات میں کتاب الاصنام میں وہ صفحات مل گئے اور میں نے ناظم کتب خانہ سے اجازت لے کر اپنے پاس رکھ لیا جو اس وقت

میرے پیش نظر ہے۔

اس کے اور بہت سے اقتباسات میں نے اس کتب خانہ کے نوادرات سے لئے، عام طور سے مدرسوں کے کتب خانوں میں درسیات اور ان کے متعلق شروح وحواشی ہوتے ہیں، مگر یہاں ہر علم وفن کی نادر ونایاب اور امہات کتب تھیں، اس سے پہلے میں نے کسی مدرسہ میں ایسا کتب خانہ نہیں دیکھا تھا، کتب بینی ومطالعہ کا شوق بچپن سے تھا اس لئے اس سے خوب خوب استفادہ کیا اور ''رجال السند والہند'' کی تالیف کی ابتداء یہیں کی۔

.............................☆☆☆☆☆☆☆........................

........................☆☆☆☆☆..................

سفرِ بمبئی (ذوالحجہ ۱۳۶۸ھ، نومبر ۱۹۴۹ء)

زمانۂ طالب علمی میں یہ خیال ہوتا تھا کہ کبھی اللہ تعالیٰ حج وزیارت کی توفیق دے گا تو بمبئی بھی دیکھنے کا موقع ملے گا، کسے معلوم تھا کہ جس شہر میں اعظم گڈھ کے علامہ شبلی غزل کہا کرتے تھے اس میں اسی ضلع کا ایک شخص بقول مولانا عبدالماجد دریابادی تحقیقی وعلمی اور دینی مقالات اور کتابوں کا انبار جمع کرے گا، اور دولت وتجارت کے بین الاقوامی شہر کے ایک گوشے میں بیٹھ کر زندگی کا بہترین حصہ تصنیف وتالیف اور صحافت میں گزارے گا، مقدرات کا علم کسی کو نہیں ہے۔

مبارکپور، امرتسر، لاہور، بہرائچ اور ڈابھیل کا چکر کاٹنے کے بعد بھی صحرانوردی اور بادیہ پیمائی کا ذوق کم نہ ہوا، ایک طرف علمی ذوق وشوق کی فراوانی اور دوسری طرف حالات کی تنگ دامانی، عجیب کشمکش میں مبتلا تھا، اسی دوران خیال آیا کہ بمبئی میں مولانا حکیم اعظمی ناظم جمعیۃ علماء صوبہ بمبئی کو اس سلسلہ میں خط لکھوں، مولانا حکیم فصیح اللہ خان صاحب اعظمی، موضع حمید پور، ندوہ سرائے، کے رہنے والے تھے، مستقل قیام بمبئی میں تھا، جمعیۃ علماء صوبہ بمبئی کے ناظم اور بمبئی کی مسلم سیاست کے سرگرم رکن تھے، عوام اور حکومت میں اثر ورسوخ رکھتے تھے، وہ ''زمزم'' اور ''انصار'' میں میرے مضامین اور اشعار دیکھتے تھے اور وطنیت کی بنا پر جانبین کو غائبانہ تعلق تھا، کبھی کبھی وہ جمعیۃ علماء کے مراسلات بھی بھیج دیا کرتے تھے، چنانچہ میں نے ان کو لکھا کہ میں اس

وقت ملازمت کی تلاش میں ہوں، بمبئی میں کوئی جگہ ہوتو مجھے بلالیں، یہ خط جمعیۃ علماء کے دفتر میں ایسے وقت پہونچا کہ جب جمعیۃ علماء کا ایک وفد حج وزیارت کے سفر میں جاتے ہوئے دفتر میں مقیم تھا، جس میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، ومولانا سید محمد میاں صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب شامل تھے، ان حضرات نے حکم دیا کہ یہ شخص بڑے کام کا ہے، حالات سے پریشان ہے، آپ بلالیں کوئی نہ کوئی کام مل جائے گا، حکیم صاحب نے مجھے جواب دیا کہ فی الحال کوئی کام نہیں سامنے نہیں ہے مگر آپ آجایئے، میں آپ کو آرام پہونچانے کی کوشش کروں گا، اور میں یوم جمعہ ۲۸/ذوالحجہ ۱۳۶۸ھ، نومبر ۱۹۴۹ء کو بمبئی پہنچ گیا، اس وقت بمبئی کا کرایہ ۲۷/روپیہ تھا جبکہ اس سے پہلے ۱۷/روپیہ تھا۔

مجھ سے پہلے مبارکپور کے دو عالم بمبئی میں رہتے تھے، ملا رحمت علی اسمٰعیلی نے زندگی کا بیشتر حصہ وہیں گزارا، آخر میں ملا سیف الدین طاہر سے اختلاف کے بعد وطن آگئے، دوسرے ہمارے محلّہ کے مولوی محمد یوسف ''آوارہ بمبئی'' وہاں کے اخبارات میں کام کرتے تھے، آخر میں بھیونڈی میں مدرسی کے زمانہ میں وہیں فوت ہوئے۔

میرا قیام دفتر جمعیۃ علماء وزیر بلڈنگ بھنڈی بازار میں رہا، حکیم صاحب نے اپنے ایک دوست غیاث الدین ہوٹل والے کے یہاں دونوں وقت کھانے کا انتظام کردیا اور میرے ذمہ دفتر میں فتویٰ نویسی کردی نیز بعض دوسرے تحریری کام سپرد کئے، انچارج آفس مولانا معین الدین صاحب مرحوم ندوہ سرائے کے تھے، بہت نیک آدمی تھے، میرا بہت خیال کرتے تھے وہی میرے ہمدم ورفیق تھے، حکیم صاحب کسی کسی موقع سے میری جیب میں دس پانچ یا اس سے کم زیادہ روپیہ ڈال دیا دیتے تھے، دفتر ہی میں دو لڑکوں کو شرح وقایہ، اصول الشاشی وغیرہ پڑھاتا تھا، ان سے پچاس روپے مل جاتے تھے، اس زمانہ میں صبح کو صرف ایک کپ چائے ایک آنے میں پی لیتا تھا، اور کہتا تھا کہ مجھے ناشتہ کی عادت نہیں ہے، اس طرح میں نے نومبر ۱۹۴۹ء سے جون ۱۹۵۰ء تک تقریباً ۸/ماہ گزارے، خیال آتا ہے کہ اسی دور میں دو کرتے بھی سلوائے، دفتر جمعیۃ علماء کے کتب خانہ میں کنز العمال، مستدرک حاکم، سنن الکبریٰ بیہقی اور بعض دوسری احادیث کی کتابیں تھیں، ان سے استفادہ کرتا تھا، اسی زمانہ کی نقل کی ہوئی احادیث وآثار میری کتاب ''اسلامی شادی''

میں ہیں، نیز اسی زمانہ میں رسائل جاحظ اور جمہرۃ اشعار العرب، ابوزید محمد بن ابوالخطاب قرشی پرانی کتابوں کے ایک مکتبہ سے خریدی، یہ دونوں کتابیں ہندوستان کے مشہور عربی ادیب مولانا ابوعبداللہ محمد بن یوسف سورتی کی ملکیت اور استعمال میں رہ چکی تھیں اور دونوں پر ان کے جگہ جگہ نہایت نادر اور قیمتی حواشی ہیں، جمہرۃ اشعار العرب کے پہلے صفحہ پر میں نے یہ یادداشت لکھی۔

''قال ابو المعالی القاضی اطہر المبارکفوری إنتقلت إلیّ هذہٖ النسخة الفقیدة الفریدة المحشّاة بتحشیة الادیب الاریب السورتی المرحوم فی ۲۹/ صفر ۱۳۶۹ھ یوم الثلاثاء من مکتبة المنار بمبئی وإشتریتها بخمس روبیاتٍ وکان قدامی إلیها فی سبیل إبتغاء فضل اللہ تعالیٰ فی یوم الجمعة ۲۸/ذی الحجه ۱۳۶۸ھ

میری پہلی کتاب ''اسلامی نظام زندگی'' بمبئی کے لئے میں اور میرے لئے بمبئی دونوں اجنبی تھے، میں اپنی تمام تر حیثیات کو سمیٹے ہوئے معمولی لکھے پڑھے آدمی کی طرح رہنے لگا، اس شہر میں مقام پیدا کرنے میں دیر لگتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور حکیم اعظمی صاحب اور بعض دوسرے مخلصوں کی وجہ سے چند ہی دنوں میں بعض قدردان مل گئے جن میں سب سے پہلے جناب عبداللہ بن احمد عرب سمکری مکی، خان منزل، کھانڈیا اسٹریٹ تھے، حاجی عبداللہ عرب صاحب نسلاً تو ہندوستانی تھے مگر ان کے آباء واجداد مکہ مکرمہ میں مقیم ہو گئے تھے، نہایت نیک، بزرگ اور علماء کے قدردان خاص طور سے مولانا آزاد اور جمیعۃ علماء سے بے حد عقیدت ومحبت رکھتے تھے، قدوقامت، لب ولہجہ اور شکل وصورت میں بالکل عرب معلوم ہوتے تھے، اپنے علاقہ کے کانگریس کے صدر تھے اور ٹرنک کے ایک چھوٹے سے کارخانہ کے مالک تھے، ان کی عرب بیوی جمیلہ بنت ابوحمیدی کا چند ماہ پہلے انتقال ہو گیا تھا، بالکل مجرد تھے، تقریباً اسی سال کی عمر تھی، حکیم اعظمی کے ذریعہ ان سے اچھا خاصا تعارف ہو گیا اور وہ میرے حال پر شفقت کی نظر رکھنے لگے، میں خان منزل کی سطح پر مغرب کے بعد عربی پڑھانے لگا اور نصاب میں مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی کی تحریک ترجمہ قرآن کی کتاب ''مفتاح القرآن'' کو رکھا، اسی بلڈنگ میں ایک صاحب عبدالغفور لادی والا تھے، وہ مجھے مہینہ میں غالباً ۲۵/روپیہ دیتے تھے، ایک دن

باتوں بات میں حاجی عبداللہ صاحب نے اپنی مرحومہ بیوی کے ایصالِ ثواب کے لئے کوئی دینی مختصر سی کتاب چھپانے اور تقسیم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، وہ اس سے پہلے مشکوٰۃ شریف کی کچھ احادیث کو کتابی شکل میں شائع کر چکے تھے، میرے پاس ''زمزم'' کے دینی واخلاقی مضامین کے تراشے تھے، حاجی صاحب نے ان کو پسند کر کے جیب سائز کے ۲۵۶ر صفحات میں ''حیات جمیلہ'' یعنی اسلامی نظام زندگی'' کے نام سے شائع کیا، یہ میری پہلی کتاب ہے، مقدمہ میں ۱۵ر محرم ۱۳۶۹ھ درج ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے بمبئی آنے کے ۱۵۔۱۶۔ دن کے بعد اس کی تیاری ہو چکی تھی، حضرت مولانا سید محمد میاں اس وقت بمبئی تشریف لائے تو ان سے مقدمہ لکھوایا، ۱۶ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو لکھا گیا ہے یہ کتاب دو ہزار میں سلطانی پریس بمبئی میں چھپی اور حاجی صاحب نے ان کو مفت تقسیم کیا اور ملک کے مختلف علاقوں سے لوگوں نے طلب کیا، اس قدر جلد اس کتاب کی اشاعت سے میرے تعارف میں بڑی مدد ملی۔ اسی زمانہ میں یعنی ۱۹۵۰ء میں ''افادات حسن بصریؒ'' کے نام ایک رسالہ ۵۶ر صفحات کا میں نے دائرہ ملیہ مبارکپور اعظم گڈھ کی طرف سے شائع اس کے مقدمہ میں ۸ر ذی قعدہ ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۷ء درج ہے، میں نے اس کو احیاء العلوم کی عارضی مدرسی کے زمانہ میں لکھا تھا۔

میرا مزاج مدرسوں اور کتابوں کا تھا اور اسی فضا میں زندگی بسر کرنے کا ارادہ تھا مگر اللہ تعالیٰ نے کسی نہ کسی صورت میں اس سے منسلک رکھا البتہ مدرسوں کی سیاست کی وجہ سے ظاہری دوری رہی، بمبئی میں کوئی عربی مدرسہ نہیں تھا، محلّہ محلّہ انجمنوں اور مسجدوں میں مدرسہ عربیہ جاری تھا جس میں قرآن شریف اور دینیات کی معمولی تعلیم ہوتی تھی، یہ عجیب سانحہ ہے کہ ھندوستان کے مدارس بمبئی کے صدقات وتبرعات سے مستفید ہوتے ہیں، مگر وہاں کوئی بڑا مدرسہ نہیں ہے، کسی زمانہ میں مدرسہ ہاشمیہ اور مدرسہ محمدیہ تھے مگر دونوں ہاشمیہ ہائی اسکول اور محمدیہ ہائی اسکول بن گئے، ابتدائی عربی درجات کا ایک مدرسہ مولانا مفتی عبد العزیز صاحب بہاری چلا رہے تھے، اور پورے مہاراشٹر میں مالیگاؤں میں مدرسہ بیت العلوم (اورینٹل کالج) تھا جس میں مولانا مفتی محمد نقی صاحب وغیرہ دیوبندی تعلیم دیتے تھے، اسی دور میں جمعیۃ علماء کے اراکین بمبئی آئے اور مجھے مدرسہ بیت العلوم مالیگاؤں میں مدرسی کی پیشکش کی، مگر بعض وجوہ کی بنا پر میں نہیں جاسکا، البتہ

مالیگاؤں آمدورفت مختلف تقریبات میں ہوتی رہی۔

جمہوریت، ۱۵؍جون ۱۹۵۰ء:۔ اسی دوران جمعیۃ علماء کے حلقہ کے چند لوگوں نے ''جمہوریت'' کے نام سے ایک روزنامہ نکالنے کا پروگرام بنایا، اخبار کی پالیسی جمعیۃ علماء کے مطابق رہے گی، مشورہ میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب وغیرہ بھی شریک تھے، اخبار مدینہ بجنور سے مولانا حامد الانصاری غازی صاحب کو بلایا گیا، اور مجھ کو ان کے نائب کی حیثیت سے رکھا گیا، غازی صاحب کا مشاہرہ چار سو روپیہ طے کر کے قیام کے لئے ایک فلیٹ دیا گیا اور میرا مشاہرہ ایک سو چالیس روپیہ ٹھہرا، قیام جمعیۃ علماء کے دفتر میں تھا ہی، ۱۵؍جون ۱۹۵۰ء کی صبح کو پہلا شمارہ نکلا، ''افکار و مطالعات، علمی، تاریخی، سیاسی'' کے مستقل عنوان سے روزانہ چار پانچ کالم لکھتا تھا، درمیان میں ''قرآنی جواہر پارے'' کے عنوان سے ایک آیت کی تشریح ہوتی تھی، اس کے علاوہ اکثر بیشتر لمبے چوڑے علمی تاریخی اور سیاسی مضامین لکھتا تھا، میری غزلیں اور نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں، اس کے ساتھ مراسلات کی کانٹ چھانٹ اور پریس کے لئے اخبار کی کاپی جوڑنا بھی میرے ذمہ تھا اور انتہائی ذوق وشوق کے ساتھ دلچسپ، معلوماتی، علمی تاریخی، دینی اور سیاسی مضامین لکھتا تھا، دوسری طرف غازی صاحب کا الفاظ سے کھیلنے والا جوشیلا ایڈیٹوریل ہوتا، اور دیکھتے ہی دیکھتے جمہوریت بمبئی کا مقبول ترین اخبار بن گیا، اور یہاں کا قدیم مشہور روزنامہ ''انقلاب'' کی مقبولیت کم ہونے لگی، اس کے مالک جناب عبدالحمید انصاری سخت پریشانی میں پڑ گئے، کئی مولویوں سے ''انقلاب'' میں دینی و اخلاقی مضامین نقل کروانے لگے، اور دونوں اخبار ایک دوسرے کے حریف بن گئے، نیز بمبئی کے دوسرے اخبارات پر اس کے اثرات پڑنے لگے، یہ صورت صحافیوں اور اخبار بینوں میں ایک دلچسپ وقتی مشغلہ بن گئی اور میرے لئے وقتی پریشانی کا باعث بن گئی، کیونکہ میں چار چار پانچ پانچ کالم میں علمی تاریخی، دینی اور سیاسی مضامین لکھنے کے ساتھ اکثر و بیشتر طول طویل مضامین بھی لکھتا تھا مگر میرا نام کہیں نہیں آتا تھا، مولانا حامد الانصاری غازی مجھے اخلاص سے دینی خدمت کرنے کی تلقین کرتے تھے، نام و نمود اور ریا سے منع کرتے تھے، کہتے تھے کہ بنیاد کا پتھر نیچے ہوتا ہے، آپ بنیاد کے پتھر ہیں، اگر میں اپنا نام اوپر یا نیچے لکھتا تو قلم زد کر دیتے تھے، اور میں سمجھتا تھا کہ عمارت جس قدر بلند بالا ہوتی جائے گی بنیاد کا پتھر اتنا ہی زیر

زمین ہوتا جائے گا، جب میں اخبار کے ذمہ داروں سے کہتا کہ یہ سب میرے مضامین ہوتے ہیں تو وہ کہتے تھے کہ ہم کیا جانیں، غازی صاحب کہتے ہیں کہ قاضی صاحب صرف قرآنی جواہر پارے اور مراسلات دیکھتے ہیں، اخبار بیں طبقہ بھی کہتا کہ ہم تو مضامین غازی صاحب کے سمجھتے ہیں۔

لاہور میں مولانا فارقلیط صاحب نے غازی صاحب کے بارے میں کچھ باتیں بتائی تھیں ،جن کی وجہ سے میں محتاط رہا کرتا تھا، ویسے وہ بظاہر میری بڑی قدر کرتے تھے اور میری تعریف دوسروں سے بھی کیا کرتے تھے، اور میں سوچتا تھا کہ چھ سات مہینے تک اس عالمی شہر میں میں نے اپنی تمام تر حیثیات کو چھپائے رکھا اور اب موقع آیا کہ میرا تعارف ہو تو یہ صورت حال ہوگئی جس سے میں سخت پریشانی میں رہا کرتا تھا، اسی درمیان جمہوریت کے ڈائرکٹروں تاجرانہ ذہنیت کام کرنے لگی اور وہ اپنے اپنے مفاد میں کام کرنے لگے، سازشیں بھی ہونے لگیں، نیوز ایڈیٹر ذاکر حسین فاروقی کہا کرتے تھے کہ سب سے پہلے میں یہاں سے نکالا جاؤں گا، اس کے بعد قاضی صاحب کی باری آئے گی، وہ بمبئی کے مشہور صحافی تھے ان کے لئے میدان خالی تھا، اور مجھ سے کہا کرتے تھے قاضی صاحب جس دن آپ یہاں سے نکلیں گے اسی دن میں آپ کو کام دلاؤں گا، آپ بالکل مطمئن رہیں، چنانچہ وہ مجھ سے پہلے الگ ہوگئے۔

وفات شریف انور:۔ نومبر ۱۹۴۹ء بمبئی آیا تھا اور ایک سال کے بعد ۲۸/نومبر ۱۹۵۰ء میں مجھے وطن واپس آنا پڑا، جمہوریت کی ملازمت میں ساڑھے چار ماہ ہوئے تھے، میرے بچے شریف انور مرحوم کی بیماری کا خط پاکر میں رخصت لے کر ۲۸/نومبر کو گھر چلا آیا، وہ بھی اپنے بھائی جمال انور کی طرح چیچک میں مبتلا ہوکر ۲۲/جنوری ۱۹۵۱ء مطابق ۱۳/ربیع لآخر ۱۳۷۰ھ میں انتقال کرگیا، یہ اولاد کا دوسرا غم تھا، کچھ دنوں رہ کر بمبئی واپس گیا۔

جمہوریت سے انقلاب میں (۲۳/فروری ۱۹۵۰ء):۔ وطن سے واپس آکر اپنی ڈیوٹی کے مطابق ۲/ بجے دن میں جمہوریت کے دفتر میں گیا تو دیکھا کہ میری میز پر ایک دوسرے صاحب بیٹھے لکھ پڑھ رہے ہیں، غازی صاحب نے قریب ہی میرے لئے کرسی لگوائی، اور معلوم ہوا کہ جمہوریت کے ڈائرکٹر نے ان کو رکھا ہے، میں نے ان سے اٹھنے کے لئے کہا تو انھوں نے

انکار کر دیا، اس کے بعد سے معاملات بگڑتے گئے اور میری وقتی پریشانی میں مزید اضافہ ہوتا گیا، میں نے دہلی حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کو لکھا کہ مجھے دہلی بلا لیں، وہ اس وقت جمعیۃ علماء ھند کے ناظم تھے اور مولانا فارقلیط ''الجمعیۃ'' اخبار کے اڈیٹر تھے، سوچا کہ دہلی مین جگہ مل جائے تو وہیں چلا جاؤں گا مگر مولانا محمد میاں صاحب نے لکھا کہ آپ کو بمبئی ہی میں رہنا ہے، حالات کا مقابلہ کیجئے، ''قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید'' اگر میں بمبئی چھوڑ دئے ہوتا تو شاید میرے کام کرنے کے اتنے سارے مواقع نہ ملتے، مولانا حکیم اعظمی صاحب اور میرے دوسرے بہی خواہ اس صورت حال سے ایک گونہ پریشان تھے۔

اس زمانہ میں عام طور سے دس بجے رات کو دفتر جمہوریت سے نکلتے وقت راستہ میں دو چار آنے کی کھجور خرید لیتا اور وہ راستہ میں کھاتا ہوا جمعیۃ علماء کے دفتر میں آتا اور پانی پی کر سو جاتا اس کی خبر میرے کسی بھی بہی خواہ کو نہیں ہوتی تھی ورنہ وہ ایسا ہرگز نہیں کرنے دیتے، حالات روز بروز خراب ہوتے گئے، اور جمہوریت چھوڑنے کے علاوہ کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی تھی، آخر مجبور ہو کر ایک دن ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کے یہاں پہونچا اور کہا کہ اب میرا انتظام کر دو، اب بات قابو سے باہر ہو چکی ہے، انھوں نے دوسرے دن مجھے بلایا اور دفتر جمہوریت جاتے ہوئے انکے پاس گیا تو انھوں نے کہا کہ اسی طرف سے روزنامہ ''انقلاب'' جا کر عبدالحمید انصاری سے ملاقات کر لیں، میں نے ان کو فون کر کے آپ کا انتظام کرا دیا ہے، انصاری سے میں کہا کہ آپ کو مین جمہوریت کی روح نکال کر دے رہا ہوں فوراً رکھ لو، انھوں نے نام پوچھا کہ وہ خود آپ سے ملیں گے، ان کا نام جمہوریت میں نہیں آنے پاتا ہے اس لئے نام بتانے سے کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوگی۔

اس کے بعد میں دفتر انقلاب پہونچا اور انصاری صاحب سے بات چیت کی، ''جمہوریت'' کی اشاعت و مقبولیت سے انقلاب پر سخت زد پڑ رہی تھی اور وہ پریشان تھے، انھوں نے بڑے انشراح سے مجھے رکھ لیا، پوچھا کہ جمہوریت کا آپ کے ذمہ کچھ باقی تو نہیں ہے یا کوئی تحریر آپ نے ایسی تو نہیں دی ہے جس کی وجہ سے کوئی مسئلہ پیدا ہو، میں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے اور اب میرا قطعی اور آخری فیصلہ ہے کہ جمہوریت میں نہیں جاؤں گا، ان کو اندیشہ تھا کہ ''جمہوریت

’’ کے بانی اور اراکین سب قاضی صاحب کے آدمی ہیں، بھلا وہ کیسے ان کو چھوڑ سکتے ہیں اور جمہوریت والوں کی باہمی سیاست میرے بارے میں کوئی کردارادا نہیں کرسکتی تھی، مشاہرہ ۱۵۰؍ روپیہ طے ہوا۔

انصاری صاحب نے کہا کہ میں آج کے انقلاب میں آپ کے بارے میں اعلان کردیتا ہوں، میں نے کہا کہ ضرور اعلان کردیں، چنانچہ دوسرے دن ۲۲؍فروری ۱۹۵۰ء کی صبح کو انقلاب آیا تو اس کے آخری صفحہ پر درمیان میں جلی چوکھٹے میں یہ اعلان تھا’’ قارئین! یہ پُرمسرت خبردی جاتی ہے کہ اخبار جمہوریت میں لکھنے والے قاضی اطہر مبارکپوری کے رشحات قلم آج سے انقلاب میں شائع ہوا کریں گے،‘‘ یا اسی قسم کے الفاظ تھے، اور صبح ہوتے ہی یہ انقلابی خبر صحافی برادری اور اخبار بینوں میں بڑے تعجب سے پڑھی گئی، ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگا، اور ۲۳؍فروری کو میرا کالم چھپ گیا، ادھر میں انصاری سے مل کر جمہوریت کے دفتر میں پہونچا اور حسب سابق اپنے متعلقہ کام کئے، رات کو چلتے وقت غازی صاحب سے کہا کہ میں کل سے’’ انقلاب‘‘ میں جاؤں گا ، آپ لوگ کوئی انتظام کرلیں، غازی صاحب یہ سن کر چونکے اور کہا کہ آپ کے لئے دہلی بہت مناسب جگہ تھی، میں نے کہا کہ میں یہیں رہ کر لوگوں سے اپنی حیثیت منواؤں گا، میرے بعد غازی صاحب بھی فوراً دفتر سے نکلے اور ڈائرکٹروں کے پاس جاکر میری بے وفائی اور خودغرضی بیان کرنے لگے، صبح انقلاب میں یہ خبر پڑھ کر ڈائرکٹروں کو اس کا علم ہوگیا، اور ان میں میرے موافق اور مخالف پیدا ہوگئے، اور دفتر جمعیۃ علماء سے مجھ کو نکالنے کی دھمکیاں آنے لگیں، میں نے ذرا شدید لب ولہجہ اختیار کیا اور کہا کہ کس کی جرأت ہے کہ مجھ کو جمعیۃ کے دفتر سے نکال دے؟ میرے کرم فرما جناب اے اے شیخ انجینیر جذباتی آدمی تھے، مجھ سے خاص تعلق رکھتے تھے چونکہ میں نے ان کو پہلے سے اس کی اطلاع نہیں دی تھی اس لئے وہ میرے شدید ترین مخالف بن گئے،

شیخ انجینیر کا آبائی وطن مئو یا کوپا گنج تھا، پونہ میں مقیم ہوئے، شیخ انجینیر مستقل طور سے بمبئی میں ڈنکن روڈ رہتے تھے، حکیم اعظمی سے قدیم مراسم تھے، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی کے بڑے قدرداں تھے، مولانا ان کے یہاں ہفتوں مہینوں ٹھہرتے تھے، شیخ انجینیر نے ان کو متعدد بار حج کرایا، مولانا مئو سے چپکے بمبئی چلے جاتے تھے اور شیخ انجینیر ان کو حج پر بھیج دیا کرتے

تھے، اس وقت ہاتھوں ہاتھ پاسپورٹ وغیرہ بن جاتا تھا، اور بہت کم رقم میں حج ہوتا تھا، یہ سلسلہ میرے بمبئی جانے کے بعد تک جاری تھا۔

شیخ انجینیر سالوں تک مجھ سے بے حد خفا رہے اور میری صورت دیکھ کر بھاگ جاتے تھے، بکواس بھی کرتے تھے، ایک مرتبہ عبدالحمید انصاری نے ''انقلاب'' میں ''شہ سوار جنگ بہادر'' کے نام سے ایک تیز وتند بلکہ سوقیانہ تازیانہ لکھا، اس کے بعد معاملہ ٹھنڈا ہوا، مگر وہ بات نہیں رہی، حکیم اعظمی صاحب کہا کرتے تھے اگر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب چاہیں تو شیخ انجینیر کو منٹوں مین ٹھنڈا کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ شیخ انجینیر کی مغفرت فرمائے اس وقت ان سے بڑا میرا کوئی مخالف نہین ہوا تھا، انھون نے ایک مرتبہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کی دعوت کی اور مجھ سے کہا کہ دعوت میں آنا، حکیم اعظمی نے کہا کہ جب وہ خود بلاتے ہیں تو آپ چلے جائیں، اسکے بعد ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

''جمہوریت'' کے اراکین اپنے لوگ تھے، جمہوریت اپنا اخبار تھا، ''انقلاب'' غیر کا تھا اس سے کوئی تعلق نہیں بلکہ ایک گونہ بے تعلقی تھی، اس کے باوجود ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ مجھے بادل ناخواستہ انقلاب میں آنا پڑا اور مجھے بے حد قلبی تکلیف ہوئی، مگر اللہ تعالیٰ جو کرتا ہے، اچھا کرتا ہے، اب مجھے کھل کر کام کرنے اور اپنے علوم ومعلومات عوام تک پہونچانے میں ہر قسم کی آزادی نہیں بلکہ تشجیع بھی تھی،

نتیجہ کے طور پر جمہوریت آہستہ آہستہ رُو بہ زوال ہونے لگا، بعد میں غازی صاحب اس کو جمعیۃ کے دفتر کے بازو والے کمرے میں لائے اور ہفتہ وار جاری کیا، آخر میں جمیل مہدی نے آکر غازی صاحب کو اس سے بے دخل کر دیا، غازی صاحب کو بعد میں احساس ہوا اور مجھ سے کہا کرتے تھے کہ اس شخص کی بددعا نے جمہوریت کو غارت کیا اور میں کہتا تھا کہ میں نے بددعا نہین کی، البتہ اس کی جدائی سے میرا دل بہت دکھا اور ذہنی وقلبی اذیت پہونچی۔

مولانا فارقلیط صاحب نے روزنامہ ''زمزم'' میں مجھے نائب مدیر بنانے کے وقت کہا تھا کہ آپ عالم ہیں، صحافت کو پیشہ مت بنائیے گا، یہ پیشہ طوائفوں کا ہے جیسے حالات اور جیسی پالیسی ہوتی ہے ویسا ہی لکھنا پڑتا ہے اور ضمیر پر دباؤ پڑتا ہے، البتہ عوام وخواص میں تعارف کے لئے کچھ دنوں یہ کام کیجئے، میں خود اپنی ''مولویت'' سے دست بردار ہونے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہیں

تھا، مدرسی اور تصنیف وتالیف میرا خاص ذوق تھا مگر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۰ء کا تقریباً پورا دور صحافت ہی میں گذرا، درمیان میں وقفہ وقفہ سے مدرسی کی، مدرسوں سے تعلق رکھا، اور دوسرے مشاغل بھی رہے، اس کے باوجود الحمد للہ کہ میں نے جو راہ ابتداء میں اپنے علمی سفر کے لئے اختیار کی تھی، حالات کا مقابلہ کرتا ہوا اسی پر چلتا رہا۔ لاہور کا ماحول شعر وادب اور صحافت کا تھا، صرف مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ شیرانوالہ دروازہ کے ایک گوشے میں سلف صالحین کے انداز پر علمی اور دینی زندگی بسر کر رہے تھے اور قرآن حکیم کی تفسیر کی تعلیم دیتے تھے، وعظ وتبلیغ فرماتے تھے اور انجمن خدام الدین کی طرف سے چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کرتے تھے، نیلے گنبد کی مسجد میں مدرسہ اشرفیہ چل رہا تھا کبھی کبھی ان دونوں جگہوں پر حاضری ہوتی تھی۔

بمبئی میں اتنا بھی دینی وعلمی ماحول نہیں تھا، مسجدوں اور محفلوں میں مدرسہ عربیہ کے نام سے قرآن کی تعلیم ہوتی تھی، مسجد کے مؤذن وامام پڑھاتے تھے، جو عام طور سے باہر کے ہوتے تھے اور پیشہ کے طور پر کام کرتے تھے، مردہ نہلاتے تھے، فاتحہ، تیجہ، دسواں، چالیسواں کرتے کراتے تھے، مرغی ذبح کرتے تھے، دعا بھی کرتے تھے، اور ان سب کی فیس یا قیمت پاتے تھے، مولانا مفتی عبدالعزیز بہاری ایک چھوٹے سے کمرے میں مدرسہ امدادیہ جاری کئے تھے، جس میں عربی کی ابتدائی تعلیم بھی ہوتی تھی، ہر شہر میں کچھ مقامی مولوی اور عالم ہوتے ہیں مگر شہر بمبئی میں کوئی مقامی عالم نہیں تھا اور نہ اب ہی ہے، یہ اس شہر کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے، باہر کے مولوی یہاں کمانے کے لئے آتے ہیں اور سیٹھوں سے رقم وصول کرنے کے لئے ہر جائز ناجائز کام کرتے ہیں، مدرسہ ہاشمیہ اور مدرسہ محمدیہ کسی نہ کسی انداز میں چل رہے تھے جو بعد میں اسکول بن گئے تھے، مقامی لوگوں کا خیال تھا کہ یہ شہر تجارتی صنعتی اور کاروباری ہے، یہاں مولوی بنانے کے بجائے مولوی منگانے میں زیادہ فائدہ ہے، اسکول کالج میں پڑھ کر لڑکے کاروبار کریں گے مولوی بن کر کیا کریں گے، اس کے عوض صدقات وخیرات کا مزاج عام ہے، اس بارے میں بمبئی ہندوستان کے دیگر شہروں سے آگے ہے، بدعات وخرافات، دینی جہالت، پیر پرستی اور اوہام پرستی یہاں عام تھی، نیاز فاتحہ، میلاد شریف، صندل گاگر، عرس کا زور تھا، اور ان ہی خرافات کے حامل مولوی یہاں آکر سیٹھوں سے رقم وصول کرتے تھے، اہل حق خال خال تھے، اور علمائے حق

نے سخت حالات کا مقابلہ کر کے کچھ فضا صاف کی تھی۔

میں بمبئی تلاش معاش میں آیا تھا، اس کے ساتھ اپنی علمی حیثیت کو بچانا چاہتا تھا، اس لئے صحافت اور اخبار نویسی کو میں نے علمی اور دینی مشغلہ کے طور پر اختیار کیا اور پیشہ ور صحافی بننا پسند نہیں کیا، جواہر القرآن اور احوال معارف کے عنوان سے جمہوریت کے مضامین انقلاب میں لکھنا شروع کیا اور تین تین چار چار کالم روزانہ لکھتا تھا جن میں علمی، دینی، تاریخی، سیاسی مضامین ہوتے تھے، احادیث اور بزرگان دین کے واقعات اصلاحی انداز میں لکھتا تھا بڑی آزادی اور حوصلہ سے لکھتا تھا، عالم اسلام کے حالات اور اس پر تبصرہ لکھتا تھا، فقہی اور دینی مسائل کے جوابات بھی لکھتا تھا، الغرض احوال و معارف کا کالم ہر قسم کی معلومات کا خزانہ ہوتا تھا، غزلیں اور نظمیں بھی ہوتی تھیں، اور عوام وخواص سبھی اس کو پڑھتے تھے، چند ہی دنوں کے بعد بمبئی کے مسلمانوں میں میرا اچھا خاصا تعارف ہوگیا، ابتداء میں مشاعروں میں بھی شریک ہوتا تھا اور سامعین بڑے احترام سے میرے اشعار سنتے تھے، تحت اللفظ سناتا تھا، ہر مشاعرہ میں میری شرکت ضروری ہونے لگی، اور یہ بات میرے لکھنے پڑھنے میں حارج ہونے لگی تو بالکل ترک تعلق کرلیا، میرے مضامین کی وجہ سے انقلاب کو بڑا فروغ ہوا، عام طور سے لوگوں کا خیال تھا کہ ''انقلاب'' کی مقبولیت احوال و معارف کے کالموں کی وجہ سے ہے، قدیم وجدید دونوں طبقے اس کالم کو پڑھتے پڑھاتے تھے، بہت سے لوگ تراشے کاٹ کاٹ کر رکھنے لگے، ۲۳ر فروری ۱۹۵۱ء سے ۱۰ر اپریل ۱۹۹۱ء تک چالیس سال سے زائد مدت تک میں نے انقلاب میں لکھا ہے اس کے مضامین کو الگ الگ عنوان سے سے مرتب کیا جائے تو بلا مبالغہ صدہا معیاری کتابیں تیار ہوسکتی ہیں، کبھی کبھی سوچتا تھا کہ یہ میری علمی محنت اور کاوش صرف ۲۴ر گھنٹے تک باقی رہتی ہے، اس کے بعد ضائع ہوجاتی ہے مگر پھر خیال آتا کہ اس سے مسلمانوں کی اصلاح اور دینی معلومات مقصود ہے جو حاصل ہورہی ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس کالم نے قارئین انقلاب کو بڑی علمی اور دینی روشنی دی ہے اور اس سے مسلمانوں کو بہت فیض پہونچا ہے، یہی میرا مقصد تھا، ورنہ اس عظیم شہر میں اتنی معمولی تنخواہ پر کون یہ کام کرسکتا ہے، چالیس سال کے عرصہ میں ۱۵۰ر روپیہ سے بڑھتے بڑھتے آخر میں چند ماہ پہلے پانچ سو روپیہ تنخواہ ہوگئی تھی، وہ بھی بلا طلب، کیونکہ میں نے کبھی علمی و دینی

خدمت کے لئے مول بھاؤ نہیں کیا حالانکہ لوگ سمجھتے تھے کہ میرا مشاہرہ ہزار روپیہ کے لگ بھگ ہوگا، یوں بھی بمبئی کا مزاج استحصال کا ہے، جو شخص یہاں خلوص کا مظاہرہ کرتا ہے نقصان میں رہتا ہے، اور فن باز کامیاب رہتا ہے، ایک مرتبہ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے مجھ سے کہا کہ قاضی اطہر! تم بیوقوف ہو، یہاں مقالہ لکھنے آئے ہو، یہ کام یوپی میں جا کر کرو، یہاں تو حاجی ملنگ کی کرامتیں لکھو اور پیسے کماؤ

مدرسہ مفتاح العلوم بھیونڈی کا اجراء (۱۳۷۱ھ ۱۹۵۱ء) مولویت کا مزاج لاہور جیسے رنگین شہر میں نہیں بدلا، بمبئی آکر اس کی حفاظت کا احساس اور شدید ہوگیا، اب دنیا کمانے کے مواقع پیدا ہونے لگے تھے مگر ان کی طرف بالکل توجہ نہیں کی البتہ بمبئی میں یوپی کے طرز کا مدرسہ جاری کرنے کی فکر ہوئی، ''انقلاب'' میں آنے کے بعد یہ خیال اور پختہ ہوا، اتفاق کہ اسی زمانہ میں ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں بھیمڑی (بھیونڈی) جانا ہوا، جہاں اعظم گڈھ بلکہ مبارکپور اور اس کے حدود کے متعدد خاندان آباد اور خوشحال تھے، ۔اس کے بعد بعض کاموں کے سلسلہ میں بار بار جانا ہوتا تھا اور یہاں مدرسہ جاری کرنے کا ارادہ ہوا، پہلے تو بھیمڑی کے لفظ سے مجھے وحشت ہوتی تھی اور اس کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا مگر ایسا ہوا کہ یہی مقام میرے مقصد کا مظہر بنا، یہاں دو بزرگ حاجی ولی اللہ جان محمد جہانا گنجی اور حاجی محمد صابر خیر آبادی پوری بستی میں اپنے دینی ذوق میں نمایاں تھے، حاجی ولی اللہ صاحب کے یہاں میرا آنا جانا ہوتا تھا، ان دونوں کے مشوروں سے دوسروں کو تیار کیا اور بڑی مشکل سے دوسرے لوگ راضی ہوئے، اور ماسٹر حاجی محمد مبین، اور حاجی عبدالغنی رحیم اللہ نے بھی تعاون کیا، چنانچہ ۱۱/جمادی الثانیہ ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۱ء) کو ایک کمرے میں مفتاح العلوم کے نام سے ایک مکتب کا افتتاح ہوا، اور صفر ۱۳۷۴ھ میں ھندوستانی مسجد میں اس کے لئے شاندار عمارت کی بنیاد رکھی گئی، اور یہ مدرسہ عظیم الشان علمی و دینی قلعہ بن گیا ہے اور میری نگرانی میں چل رہا ہے، اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے، بمبئی میں کھانے میں جو رقم لگتی وہ بھیمڑی کی آمد و رفت میں خرچ کرتا تھا اور وہاں مہمان بن کر دو ایک دن رہتا تھا، اس طرح ایک زمانہ تک آتا جاتا رہا، اس راہ میں مجھے بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لوگ دیکھ کر وہابی وہابی چلاتے تھے، مارنے کے لئے آتے تھے، مخالفت کرتے تھے، میں تالیف و مصلحت سے کام لیتا تھا

حتیٰ کہ محرم کا کھچڑا جا کر کھاتا تھا تا کہ مخالفت کم ہو، عجیب حالات تھے،

میرے دوست مولوی محمد یٰسین ابراہیم پوریؒ اس کے پہلے مدرس ہوئے، وہ بمبئی میں تھے وطن آنے کے لئے ٹکٹ خرید لئے تھے میں نے ٹکٹ واپس کرا کر ان کو وہاں رکھا،

عبدالصمد شرف الدین سے تعلق:۔ بھیمڑی میں شرف الدین الکتبی واولادہ بمبئی کے صاحبزادے مولانا عبدالصمد شرف الدین اہلحدیث عالم وفاضل تھے، دارالقیمہ کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کر کے **المعجم الفهرست** اسی سے چھاپ رہے تھے، بڑے نفاست پسند، خشک اور بااصول عالم ہیں، رابطہ عالم اسلامی کے امین عام ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف کے ماموں ہیں، اور سعودی عرب سے ان کا خاص خاندانی تعلق ہے، ان سے اس زمانہ میں تعلقات ہوئے، وہ میرا بہت لحاظ پاس کرتے تھے، ان کے صاحبزادے عبدالواحد مرحوم بھی باپ کی طرح پیش آتے تھے، انھوں نے امام مزیؒ کی ''**تحفة الاشراف فی الاطراف**'' دس جلدوں میں نہایت اہتمام سے چھاپی، یہ تمام جلدیں مجھ کو مولوی عبدالرزاق سعید میمن مرحوم نے تحفۃً عنایت کیں، اسی دارالقیمہ سے ''**سنن النسائی الکبریٰ**'' بھی اسی اہتمام سے شائع ہونے لگی، اس کی دو جلدیں مرحوم عبدالواحد نے مجھے دیں تیسری جلد کی طباعت کے دوران ان کا انتقال ہو گیا، اللہ تعالیٰ مغفرت کرے۔

حیات النبی کو بمبئی بلایا:۔ اسی دور میں اپنے چھوٹے بھائی قاضی حیات النبی مرحوم کو بمبئی بلایا، وہ خوشحالی کے دور میں پیدا ہوا تھا، ناز ونعمت میں پروان چڑھا تھا، فطرۃً ضعیف و ناتواں تھا، مزاج میں تیزی تھی، بڑا کام نہیں کر سکتا تھا، ذہین، معاملہ فہم اور صاف گو تھا، اس زمانہ میں رامپور کے ایک علامہ شرف زیدی نے بمبئی سے ایک روزنامہ ''مشعل'' کے نام سے جاری کیا، اسی میں کتابت کے لئے حیات النبی مرحوم کو ۶/آنے فی کالم رکھ دیا، حالانکہ وہ پہلے سے کتابت نہیں جانتا تھا، چند ماہ میں ''مشعل'' بند ہو گیا تو اس کو وطن واپس کر دیا، اور بعد میں ''البلاغ'' میں مستقل کاتب بن کر میرے ساتھ رہا اور حج وحجاج کی پیش بہا خدمات انجام دیں اور پانچ مرتبہ حج وزیارت سے مشرف ہوا۔

میری تیسری کتاب ''مسلمان'':۔ میری تیسری کتاب ''مسلمان'' جمعیۃ المسلمین

جنجیرہ نے دسمبر ۱۹۵۲ء مطابق ۱۳۷۲ھ میں بڑے اہتمام سے شائع کی اور کوکن کے اسکولوں کے نصاب میں داخل کیا، مجھے بمبئی آئے ہوئے تین سال گذر چکے تھے اور شہرت ومقبولیت عام ہوچکی تھی، جمعیۃ المسلمین جنجیرہ (بمبئی) نے بارہا میرے تبلیغی اصلاحی دورے کا اہتمام کیا اور میں کوکن کے مختلف علاقوں میں آیا گیا، اسی مناسبت سے میری کتاب ''مسلمان'' شائع کی، اور اس کو اصلاحی کتب کی اشاعت کا پہلا اقدام بتایا، مقدمہ میں اراکین نے لکھا:

''جمعیۃ کے محسن مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری نائب مدیر روزنامہ انقلاب بمبئی کے ہم بیحد ممنون ومشکور ہیں کہ جناب موصوف نے جمعیۃ کی درخواست پر اس مختصر لیکن مفید رسالہ کو بڑی کاوش اور محنت شاقہ سے مرتب فرمایا، اور جمعیۃ کے اصلاحی رسالوں کی اشاعت کے مقصد کو عملی جامہ پہنانے میں بسم اللہ کرنے کی سعادت سے مشرف کیا، خدائے قدیر جناب موصوف کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے، اور جمعیۃ کو اس رسالہ کی اشاعت سے مذکورہ بالا مقصد میں کامیابی سے ہمکنار کرے، آمین''

اور مولانا حکیم اعظمی صاحب نے ''عنوان حدیث'' کے ذیل میں لکھا:

''اس رسالہ کے مرتب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کے فکر ومطالعہ کا محور اسلام ہے، اس سے پہلے آپ کی تصانیف میں سے اسلامی نظام زندگی اور افادات حسن بصریؒ شائع ہوچکی ہیں، اور ملک ان سے استفادہ کررہا ہے، ان کے علاوہ آپ کی اور بھی اردو، عربی کی کتابیں زیر ترتیب ہیں، ان میں ''رجال السند الہند'' (عربی) اسلامی ہند کے قدیم رجال کی بیش بہا تاریخ ہے، موصوف کی علمی وفکری صلاحیت اور طبعی وذہنی سلامت روی نے ادھر دو تین سالوں سے صوبہ بمبئی کے مسلمانوں میں بہت کچھ دینی اور ملّی بیداری پیدا کردی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج بمبئی کا تقریباً ہر پڑھا لکھا طبقہ آپ کے علمی وفکری مقام سے اچھی طرح واقف ہے، میری دعا ہے کہ جس طرح آپ کے علمی ودینی، اسلامی وتاریخی مقالات سے مسلمانوں کو فائدہ پہونچ رہا ہے، اسی طرح اس ٹھوس اور اہم کتاب سے بھی فائدہ ہو اور مسلمان اس پر عمل کرکے اپنے اندر اسلامی زندگی پیدا کریں''

اور میں نے اس کے ابتداء میں لکھا:

''اگست ۱۹۴۷ء کے بعد لاہور کو خدا حافظ کہنا پڑا اور اسکے دو سال بعد جمعہ ۲۸؍ ذوالحجہ ۱۳۶۸ھ کو عروس البلاد بمبئی میں آنا ہوا، اب ربیع الاول ۱۳۷۲ھ ہے، اس سوا تین سال کی مدت میں بمبئی اور اس کے اطراف کے اکثر و بیشتر مقامات پر آنے جانے اور وہاں کے لوگوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا، ان میں دیارکوکن اور ان کے ساکنانِ جنات در کنار کی کشش کے ظاہر رسم وراہ سے گذر کر قلبی اور دینی علاقہ استوار کر دیا ہے، زیر نظر رسالہ بھی اسی علاقہ مؤدت واخوت کا ایک ثبوت ہے جسے جمعیۃ المسلمین جنجیرہ کی طرف سے شائع کیا جارہا ہے اور عامۃ المسلمین خصوصیت سے مسلمانان کوکن اس کے مخاطب ہیں''

اس رسالہ کو اللہ تعالیٰ نے بری مقبولیت دی، اور اب تک چار مرتبہ اس کی اشاعت ہو چکی ہے، سب سے پہلے ساجد لکھنوی نے چھاپ کر شائع کیا، پھر میں نے انجمن اسلام ہائی اسکول میں معلّمی کے زمانہ میں وہاں کے طلبہ کے لئے شائع کیا، اور اس کے بعد مدرسہ دینیہ غازی پور، ویلفیر اکیڈمی مبارکپور، اور جمعیۃ علماء ہند دہلی نے مشترکہ طور پر چھاپ کر شائع کیا،

قادری صاحب سے تعلق:۔ بمبئی جانے کے بعد جن لوگوں سے تعلقات ہوئے، ان میں ہمارے محترم ومکرم جناب سید محمد صدیق صاحب قادری مہر مُہسلائی سب سے زیادہ قریب ہوئے جیسے ہم لوگ ایک خاندان کے ہیں، میں بمبئی میں نیا نیا گیا تھا، عید میلادالنبی کے ایک جلسہ کے سلسلہ میں جناب محمد بیگ چغتائی مرحوم کے ساتھ کوکن کے مقام شری وردھن گیا، یہ سفر جہاز کے ذریعہ ہوا، واپسی پر رات میں بندرگاہ پر ایک جوان، نیک سیرت آدمی سے ملاقات ہوئی، اور پہلی ہی ملاقات میں دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو گئے، یہ جناب سید محمد صدیق صاحب قادری مہر مُہسلائی انڈر سکریٹری حکومت مہاراشٹر تھے، واپسی ساتھ ہوئی بعد میں وہ جمعیۃ علماء کے دفتر میں ملنے کے لئے آئے اور میں ان کے ساتھ ان کی قیام گاہ پر گیا، اس دن سے آج تک ہمارے تعلقات حد درجہ شگفتہ اور مخلصانہ ہیں، طے ہوا کہ میں ہر جمعہ کو ناشتہ کے لئے ان کے یہاں آیا کروں، اس طرح ملاقات ہوتی رہے گی، چنانچہ اس وضعداری کو دونوں نے ہر حال میں نبھایا، اس کے بعد یہ تعلق میرے بھائی حیات النبی سے اور میرے لڑکوں سے ہوا اور سب لوگ ایک خاندان کے افراد معلوم ہونے لگے، قادری صاحب کا وطن کوکن کا مقام مُہسلہ تھا جو

نوابان جنجیرہ کا ایک تعلقہ تھا، مگر قادری صاحب نہایت باذوق شاعر تھے اور یوپی والوں سے خاص تعلق رکھتے ہیں، اس تحریر سے چار دن پہلے ان کا خط آیا کہ ان کی اہلیہ محترمہ ۲۵/ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو انتقال کر گئیں، اللہ تعالیٰ مغفرت کرے۔

ماسٹر الحاج سید محی الدین صاحب:۔ بالکل ابتدائی دور میں جن حضرات سے تعلق ہوا اور چالیس بیالیس سال سے اب تک نہایت خلوص کے ساتھ قائم ہے ان مین ہمارے محترم اور بزرگ ماسٹر الحاج سید محی الدین صاحب (سارین، اعظم گڈھ) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ان کا آبائی وطن املو ہے، پیرزادہ خاندان سے ہیں، اس وقت وہ بمبئی میں اردو ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، خاندانی آدمی ہیں، میں جس زمانہ میں کھانڈا محلّہ خان منزل کے اوپر رات کو مفتاح القرآن پڑھاتا تھا وہ بھی پڑھنے آتے تھے، حالانکہ وہ ہیڈ ماسٹر تھے، ہم دونوں میں مزاج کی ایسی ہم آہنگی تھی کہ اس وقت کے وہ میرے مونس و غمخوار تھے، راتوں کو بمبئی کے ساحلوں کی سیر کراتے تھے، میں ان سے اور وہ مجھ سے بیحد مانوس تھے، آج تک ان سے خاندان کی طرح تعلق ہے، میری طرح وہ بھی وطن ہی میں رہنے لگے اور جانبین سے آمدورفت اور دید وملاقات جاری ہے، الحمدللہ

مدرسہ احیاء العلوم کے چندہ کی ابتداء:۔ بمبئی جانے کے بعد مدرسہ احیاء العلوم کے لئے وہاں چندہ کرنے کا خیال پیدا ہوا اور مدرسہ کے نائب ناظم مولانا شمس الدین صاحب حسینی سے اس کے بارے میں بات ہوئی، چنانچہ وہ رمضان میں اس کام کے لئے بمبئی پہونچے اور ہم دونون نے مدرسہ کے لئے چندہ کی کوشش شروع کی، راتوں کو لوگوں سے مل کر چندہ وصول کرتے تھے، اس کیلئے بھمڑی بھی آنا جانا ہوتا تھا، ان تھک کوشش کے بعد آہستہ آہستہ کام بڑھتا رہا یہاں تک کہ یہ سلسلہ مالیگاؤں، دھولیہ، برہان پور اور ناگ پور وغیرہ تک پھیل گیا، ان علاقوں کی جو فصلیں کٹ کر آج بھی احیاء العلوم میں آرہی ہیں، وہ سب ہمارے بنائے ہوئے کھیت کی ہیں، دیہاتی مثل ہے، ''کمائے دھوتی والا کھائے ٹوپی والا''

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے — یہ سب پود ان ہی کی لگائی ہوئی ہے

مرحوم احمد غریب اور انجمن خدام النبی سے تعلق:۔ ابتدائی دور میں حکیم

اعظمی صاحب مرحوم ایک شخص کی ملاقات کیلئے مینارہ مسجد کے سامنے فینسی محل میں گئے، مجھے بھی ساتھ لے لیا، وہ صاحب بڑے تپاک سے ملے، چائے وغیرہ پیش کی اور دونوں میں کچھ باتیں ہوئیں، واپسی پر حکیم صاحب سے میں نے پوچھا کہ یہ کوئی ہیں یا میمن؟ تو بتایا کہ میمن جماعت کے نہایت مخیر، اور مذہبی آدمی احمد غریب ہیں، یہ احمد بھائی سے میری پہلی ملاقات تھی۔

یہ چار بھائی علی الترتیب محمد، احمد، حافظ محمد صدیق اور عبدالکریم تھے، جامع مسجد کے پاس ان کی کٹلیری کی بہت بڑی دوکان تھی، ۱۹۴۴ء سے مکہ مکرمہ میں شارع فیصل پر بھی ان کی کٹلیری وغیرہ کی دوکان تھی، چاروں بھائی عربی زبان سے واقف تھے، میمنی، اردو، انگریزی اور عربی سب زبانوں سے واقف تھے، علمائے حق سے تعلق رکھتے تھے اور میمنوں میں کھلے ہوئے موحد وحق پرست تھے، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے خاص معتقد تھے، ان سے غائبانہ عقیدت تھی، مولانا بھی ان سے غائبانہ تعلق رکھتے تھے، احمد بھائی ان کے مضامین کا ترجمہ ''میمن ویلفیر'' اخبار میں لکھتے تھے، مولانا علی میاں سے بھی عقیدت تھی، صابو صدیق مسافر خانہ میں انجمن خدام النبی کے سکریٹری تھے، بلکہ روح رواں تھے اور حجاج کی ہر طرح خدمت کرتے تھے، حج کمیٹی کے ممبر تھے، اور بمبئی کے دینی وملّی کاموں میں بڑھ چڑھ کر مالی تعاون کرتے تھے، ۱۹۵۵ء میں دینی تعلیمی کونسل کا اجلاس ان ہی کی کوشش اور مالی تعاون سے ہوا تھا، ان حضرات کا وطنِ ثانی گویا مکہ مکرمہ تھا، اس وقت وہاں کی حکومت کے ارکان سے خصوصی ربط ضبط اور اثر تھا، احمد بھائی سے اس ملاقات کے بعد غالباً پھر ملنا نہیں ہوا اور جب ''جمہوریت'' کا اجراء ہوا تو مجھ کو اور غازی صاحب کو انھوں نے انجمن خدام النبی کے شعبۂ نشر واشاعت سے منسلک کر کے مراسلت وغیرہ شائع کرانے لگے، اور جب میں وطن واپس آنے لگا تو احمد بھائی نے مجھے ایک سو روپیہ دیا، میں نے اس روپیہ سے پانی کی مشین لگائی جس کو اس زمانہ میں اعظم گڈھ سے والد مرحوم کے ساتھ جا کر غالباً ۹۳/روپیہ میں لایا تھا، یہ مشین آج بھی کام دے رہی ہے۔

اس کے بعد جمعہ ۹/رمضان المبارک ۱۳۷۳ھ، ۱۴/مئی ۱۹۵۴ء کو ہفتہ وار ''البلاغ'' کا اجراء ہوا، اسی کے ساتھ ماہنامہ ''البلاغ'' کی تاسیس بھی ہوئی، اور دوسرے دو مدیروں کے ساتھ میں بھی ادارت میں شریک کیا گیا، کچھ دنوں کے بعد دونوں مدیروں نے ترک تعلق کر لیا اور میں

نے تقریباً ۲۶ رسال تک ''البلاغ'' کا مدیر تحریر رہ کر اس کو جاری رکھا، ہم لوگوں کو ۵۰ روپیہ ماہوار البلاغ سے ملتا تھا، ایک مرتبہ مجھے کچھ روپیہ کی ضرورت پڑی، میں نے احمد بھائی سے قرض کے طور پر طلب کیا اور انھوں نے مطلوبی رقم فوراً دیدی، اسی کے ساتھ پوچھا کہ آپ عربی پڑھا سکتے ہیں؟ وہ سمجھتے تھے کہ بمبئی کے باہری مولویوں کی طرح مین بھی چالو مولوی ہوں اور مضمون وغیرہ لکھ لیتا ہوں، میں نے کہا کہ میں عربی زبان کا ادیب ہوں، فلاں فلاں مدرسہ میں تدریسی خدمت کر چکا ہوں، میں ہر قسم اور ہر فن کی چھوٹی بڑی کتاب پڑھا سکتا ہوں، انھوں نے کہا کہ کل صبح آٹھ بجے سے نو بجے تک آ کر ہم لوگوں کو پڑھایئے، چنانچہ میں نے چاروں بھائیوں کر ''ریاض الصالحین'' پڑھانی شروع کی، ایک طرف چاروں بھائی بیٹھ کر مجھ سے حدیث پڑھتے دوسری طرف ان کے لڑکے بچے ایک حافظ وقاری سے قرآن اور تجوید کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور ایک کمرہ میں مکتب و مدرسہ دونوں جاری رہتے تھے اور گھر کے بچے بڑے سب پڑھتے تھے، ان کی والدہ بڑی عابدہ زاہدہ اور نیک دل خاتون تھیں، لڑکوں کو بھی اپنے جیسا بنایا تھا، اب مجھے مہینہ میں سو روپیہ ملنے لگا جو البلاغ کی ادارت اور گھر کی تعلیم کے عوض میں تھا یا یوں ہی وظیفہ تھا، یہی مشاہرہ آخر تک باقی رہا، نہ میں نے کبھی کچھ کہا اور نہ ہی ان حضرات نے اس کی طرف توجہ کی، مگر اس کے باوجود ان کی ذات سے مجھے بے حد علمی فائدہ ہوا اور وہ لوگ میرے محسن اعظم ہیں جیسا کہ معلوم ہوگا، ان کے پاکستان جانے کے بعد تک یہ تعلیمی سلسلہ جاری رہا، دو مرتبہ ''ریاض الصالحین'' پڑھائی، صحیح مسلم کا ایک خلاصہ پڑھایا، اور المنتقیٰ ابن جارود پڑھائی، اور بعض دوسری حدیث کی کتابیں پڑھائیں۔

اس محمد احمد برادرس اور انجمن خدام النبی نے مجھ کو ۱۳۷۵ھ (۱۹۵۵ء) میں پہلی بار حج وزیارت کی سعادت دلائی، اور مکہ مکرمہ میں ان ہی کے یہاں قیام رہا، ہر طرح آرام پہونچایا، اس کے بعد ۱۳۷۷ھ، ۱۹۵۸ء میں پانچ ہزار روپیہ سے زائد خرچ کر کے میری کتاب ''رجال السند والہند'' طبع کرائی، جس سے ملک و بیرون ملک کے علمی حلقوں میں میرا تعارف ہوا، اور اوساط علمیہ میں باوقار مقام نصیب ہوا، پاکستان جانے کے بعد بھی میرے ساتھ ان کا تعلق باقی رہا، انھوں نے بمبئی میں مشہور احمد بن عمر آئل مِل کے مالک اور ان کے رشتہ دار جناب عبدالستار

سیٹھ سے میرا تعارف وتعلق پیدا کرادیا، جن کی توجہ وعنایت ان کے انتقال ۱۹۹۰ء تک رہی، اور جب ۱۴۰۱ھ میں الجامعہ الحجازیہ مبارکپور میں جاری کیا تو حافظ محمد صدیق صاحب کے صاحبزادے عزیزی حافظ محمد امین مقیم مکہ مکرمہ نے اپنے والد مرحوم کی طرف سے مدرسہ میں حجازی مسجد تعمیر کرائی، اس میں تمام تر سرمایہ ان ہی کا لگا ہے، اس کے علاوہ مدرسہ کی تعمیر وترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس سلسلہ میں مبارکپور آئے، ان باتوں کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔

مولوی محمد عثمان صاحب بمبئی میں:۔ اس دوران مولوی محمد عثمان صاحب دوبار بمبئی آئے اور دونوں بار انجمن خدام النبی میں آفس انچارج کی حیثیت سے کام کیا، پہلی بار زیادہ دن تک نہیں رہ سکے، دوسری ۱۳۷۷ھ، ۱۹۵۸ء میں کافی مدت رہے، اور یہیں سے معہد ملت مالیگاؤں گئے اور وہاں سے مدرسہ سراج العلوم دھولیہ میں کافی دن تدریسی خدمت انجام دی۔

رجال السند والہند کی جمع وترتیب:۔ انقلاب اور البلاغ میں لکھنے کے ساتھ مشاعروں اور جلسوں میں بھی شریک ہوتا تھا، مگر بہت جلد مشاعرہ بالکل ترک کردیا اور جلسوں میں بھی جانا بہت کم کردیا کیونکہ ان باتوں میں باتوں میں وقت ضائع ہوتا تھا اور شہرت ونا موری کی ہوس میں علمی ذوق ختم ہوسکتا تھا جس کیلئے میں نے بچپن ہی سے بہت محنت کی تھی، اب فرصت کے اوقات میں رجال السند والہند کی تالیف وجمع وترتیب میں لگ گیا، صبح دس بجے سے دو بجے تک ابناء مولوی محمد بن غلام سورتی تاجر کتب جاملی محلّہ میں بیٹھ کر تاریخ ورجال اور طبقات کی کتابوں سے سندی وہندی رجال کے حالات جمع کرتا تھا، اسی طرح شرف الدین الکتبی واولادہ تجار الکتب محمد علی روڈ کے یہاں مستقل طور سے بیٹھ کر کتابوں سے استفادہ کرتا تھا، دونوں کتب خانوں میں اس سلسلہ کی جو کتاب ہوتی تھی، میں سرسری طور سے دیکھ کر اپنے مطلب کی بات نقل کرلیتا تھا، ان کے مالک میرے ساتھ نہایت محبت اور تعاون کا سلوک کرتے تھے، بعض اوقات کتابیں کمرے میں بھی لاکر نقل کرتا تھا، ان دونوں کتب خانوں سے میں نے خوب خوب استفادہ کیا، اسی کے ساتھ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ محمدیہ سے بھی استفادہ کرتا تھا اور محترم سید محمد قادری صاحب کے توسط سے اسمٰعیل یوسف کالج جوگیشوری کے عربی پروفیسر مرحوم احمد بہاء الدین داور کر صاحب کے ذریعہ کتب خانہ سے جغرافیہ کی قدیم کتابیں ’’المسالک

والممالک ''ابن خرداذبہ''مسالک الممالک''اصطخری،''احسن التقاسیم''مقدسی بشاری،'' مسالک الابصار''فضل اللہ عمری اور لائڈ کی مطبوعہ دیگر کتابیں لاکران سے نقل کرتا تھا، پروفیسر داور کرصاحب عربی انگریزی کے عالم تھے، بعد میں ان سے بہت سے انگریزی مضامین کا ترجمہ استاد احمد فرید یمانی کیلئے کرایا،ان سے تعلقات نہایت شگفتہ رہے۔

سلطان مُکلّا:۔ میں جن زمانہ میں ابناء مولوی محمد بن غلام سورتی کے کتب خانہ میں بیٹھا کرتا تھا، اس کے مالک عبدالعزیز تھے اور ان کے والد مولوی عبدالستار صاحب تقریباً اسی سال کے نہایت بزرگ جہاندیدہ آدمی تھے، اسی اثناء میں ایک مرتبہ ان کے یہاں مُکلّا کے سلطان (غالبًا نام) غالب قعیطی اپنے ملازموں کے ساتھ آئے، وہ حیدرآباد میں رہتے تھے، اور کتبخانہ والوں سے ان کا پہلے سے تعارف وتعلق تھا، انھوں نے ایک کتاب کسی دینی موضوع پر لکھی تھی مولوی عبدالستار صاحب نے ان کی کتاب پر مجھ سے عربی میں مقدمہ لکھوایا، ایک مرتبہ شادی کے سلسلہ میں ان کے وطن سورت بھی گیا تھا، حضرت مولانا ابوالوفاء افغانیؒ حیدرآباد سے آتے تو ان ہی کے یہاں قیام کرتے تھے اور میری ملاقات ہوتی تھی، مولانا افغانی سے میرے علمی تعلقات بہت گہرے تھے، حیدرآباد ان کا مہمان بننے کا شرف بھی مجھے حاصل ہے۔

ان کتب خانوں کے علاوہ سفر حضر میں جہاں کوئی ایسی کتاب مل جاتی جس میں میرے موضوع کی کوئی بات ہوتی تو فوراً اسے نقل کر لیتا تھا تاکہ کتاب جلد سے جلد مرتب ہوسکے۔

بعد میں ان تمام اقتباسات کو ترتیب کے ساتھ کتابی شکل میں جمع کیا جو میرے پاس دو ضخیم کتاب کی شکل میں موجود ہے اور اس کے علاوہ جغرافیائی اقتباسات علیحدہ علیحدہ کاپی میں محفوظ ہیں، جن سے اب تک کام لیتا ہوں۔

مولانا محمد اسحاق بنارسیؒ:۔ اسی زمانہ میں مولانا محمد اسحاق بنارسیؒ بہ سلسلہ تجارت بمبئی آئے اور مسافر خانہ کے پاس الکریم منزل مین رہائش اختیار کی، ان سے لاہور میں خاص تعلق پیدا ہو چکا تھا جب وہ اپنی کتاب کلمات اکابر کی طباعت میں میرے یہاں مہینوں مقیم رہے، ان کے والد مولانا مفتی محمد ابراہیم صاحب نانا مرحوم کے خاص شاگرد تھے، اس وجہ سے اور بھی تعلق تھا، مولانا محمد اسحاق صاحب بڑے نفاست پسند، باذوق، احباب نواز اور مجلسی تھے، ان کے یہاں

رات دن لوگوں کا جمگھٹا رہتا تھا، جب تک وہ بمبئی میں مقیم رہے، اہل علم وفضل کا مرجع بنے رہے، ان کی مجلسیں بمبئی کی یادگار مجلسیں ہیں، عربوں سے بنارسی کپڑوں کی تجارت کرتے تھے، اس لئے عرب بھی وہاں آیا کرتے تھے، مدتوں ان کی عدم موجودگی میں ان کا کمرہ میرے قبضہ واستعمال میں تھا، ویسے میں ان دنوں مدن پورہ میں احمد بلڈنگ میں رہتا تھا مگر صبح وشام دفتر البلاغ اوران کے یہاں آنا جانا رہتا تھا، اور بعد میں میں بھی 153 جنجیکر اسٹریٹ میں چلا آیا تو گویا ساتھ ہی رہنے لگا۔

استاذ احمد فرید یمانیؒ:۔ بمبئی میں عربوں کی اچھی خاصی تعداد تھی، ان کی آمدورفت بھی رہا کرتی تھی، بمبئی کی زبانوں میں عربی بھی ایک زبان تھی، یہاں کے مقیم عربوں اورآنے والے عربوں کے علاوہ سفارت خانوں کے ذمہ داروں سے بھی ملاقات رہتی تھی، ان میں یمن کے استاذ احمد فرید یمانیؒ سے خاص تعلق تھا، یہ اور محمد علی بجاش دونوں مسافرخانہ کے پاس جونا بنگالی پورہ میں ''محلات الفرات'' کے نام سے ایک فرم کے ذریعہ یہاں سے عرب کے ممالک میں مال بھیجتے تھے، استاذ احمد فرید بخاریؒ سیاسی اور علمی آدمی تھے، تعلیم زیادہ نہیں تھی مگر کتب بنی اور مطالعہ خوب کرتے تھے، عربی میں مضمون لکھتے تھے، میں اردو میں ترجمہ کرکے چھاپتا تھا، بعض کو صاف کرتا جس کو وہ عربی اخبارات میں شائع کراتے تھے، ان کے ذریعہ مجھے کئی نادر ونایاب کتابیں ملیں، دولت کویت کے شعبہ ''التراث العربی'' سے شائع کتاب ''التحف والذخائر'' انھوں نے مجھے دی، اورمیں نے براہ راست اس شعبہ سے خط وکتابت کی جس کے نتیجہ میں وہاں کی نادرونایاب مطبوعات میرے پاس ہدیہ وتحفہ کے طور پر آنے لگیں بلکہ وہاں کے ذمہ داروں نے مجھ کو علمی مشیر بنالیا تھا، استاذ احمد فرید یمانیؒ ۱۹۹۰ء میں بمبئی میں انتقال کرگئے، اللہ مغفرت کرے، ان سے اوران کے بال بچوں سے میرا خصوصی تعلق تھا ان کی بیوی ایک کوکنی خاتون ہیں، میرے حال پر بہت مہربان تھے۔

مولانا غلام محمد خطیب جامع مسجد بمبئی:۔ مولانا غلام محمد خطیب وامام جامع مسجد بمبئی نہایت نیک، خاموش اور دینی معاملات میں متشدد تھے، تقویٰ وطہارت میں بے مثال اور خوش خلقی وشرافت کا پیکر تھے، انگریزی میں ایم۔اے تھے، کسی زمانہ میں بمبئی کے ایک کالج میں

پروفیسر تھے، جناب محمد علی زنیل علی رضا جوہری کے مکہ مکرمہ کے مدرسۃ الفلاح میں چھ سال تک درس دے چکے تھے، علمائے حق کے معتقد اور آخر میں مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے دست گرفتہ تھے، ان سے ابتدائی چند مہینوں میں ''یاد اللہ'' ہوگئی تھی، خاص طور سے کوکن کے اصلاحی اسفار کی وجہ بہت قربت ہوگئی وہ بھی اسی علاقہ کوکن کے تھے، وہ میری قیام گاہ کے قریب ہی رہتے تھے میں ان کے یہاں صبح کو اکثر جایا کرتا تھا، اور بہت احترام وتکریم سے پیش آتے تھے، ان کے ذریعہ کتب خانہ محمدیہ جامع مسجد سے کتابیں لاکر پڑھتا تھا اور اقتباس لیتا تھا، ''معجم البلدان''، ''کتاب الکنیٰ'' دولابی ان کے ذریعہ کتب خانہ سے لاکر پڑھتا تھا، اور ان ہی کے ذریعہ ''تاریخ اسماء الثقات'' لابن شاہین کا نادر ونایاب نسخہ لاکر نقل کیا اور بعد میں اس کو تعلیق وتصحیح کے بعد شائع کیا، اسی طرح ''جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول'' کا قلمی نسخہ کتب خانہ محمدیہ سے ان کے ذریعہ لایا اور اپنے نسخہ سے مقابلہ کرکے شائع کیا۔

ایک مرتبہ انھوں نے تفسیر بیضاوی کے کچھ مقامات پر اشکال کیلئے مجھ سے کہا تو میں نے پہلوتہی کی، انھوں نے کہا کہ بمبئی میں کون عالم ہے جس سے رجوع کیا جائے، ان کے کتب خانہ میں بیٹھ کر کئی دن تک وہ مقامات حل کئے گئے، چند سال ہوئے وہ بھی انتقال فرماگئے، رحمہ اللہ، وہ میرے بمبئی کے مخلص علمی معاونین میں تھے۔

''البلاغ'' کا تعلیمی نمبر (۱۹۵۴ء):۔ ۸، ۹/ جنوری ۱۹۵۵ء میں آل انڈیا تعلیمی کنونشن کا اجلاس صابو صدیق مسافر خانہ بمبئی میں بڑے شاندار طریقہ پر ہوا، داعی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند اور منتظم الحاج احمد غریب صاحب سکریٹری انجمن خدام النبی تھے، اس موقع پر مجلّہ ''البلاغ'' کا شاندار تعلیمی نمبر ۴۳۲ صفحات کا شائع کیا گیا، جو ربیع الآخر، جمادی الاولیٰ، جمادی الآخریٰ ۱۳۷۴ھ، دسمبر ۱۹۵۴ء جنوری، فروری ۱۹۵۵ء پر مشتمل تھا، اس کی تیاری میں میں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور طول طویل مضامین لکھے، خاص طور سے ''مسلمانوں کے ہر پیشہ اور ہر طبقہ میں علم اور علماء'' ''استشراق اور مستشرقین'' بہت محنت سے لکھے تھے، جن کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے ''صدق'' میں ان دونوں مقالوں کے بارے میں اپنی قیمتی رائے ظاہر کی اور لکھا کہ: ان میں ''مسلمانوں کے ہر پیشہ اور ہر طبقہ میں علم اور علماء'' کو پڑھ کر

اچھے اچھے پڑھے لکھوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں'' ان کے علاوہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی تاریخ لکھی اور کتابوں پر تبصرہ بھی لکھا۔

البلاغ کا یہ نمبر ہندو پاک کی علمی و دینی تعلیم کے سلسلہ میں ماخذ بن گیا اور غیر ممالک سے اس کی طلب آنے لگی، یہ نمبر مسلمانوں کی علمی و تعلیمی تاریخ کا ریکارڈ ہے جو گذشتہ اور موجودہ صدی کا آئینہ دار ہے۔

معارف القرآن کی اشاعت:۔ اخبار انقلاب میں لکھتے ہوئے چار پانچ سال بیت چکے تھے، میں بڑے ہمت وحوصلہ سے لکھتا تھا اور ہر قسم کی دینی، علمی، تاریخی، سیاسی معلومات قارئین کے لئے فراہم کرتا تھا، عوام وخواص ان کالموں کی اور میری جس قدر تعریف کرتے تھے اسی قدر میرا یہ احساس بڑھتا جاتا تھا کہ میری محنت ضائع ہورہی ہے اور ان گراں قدر مضامین کی مدت بہت کم ہے، یہ ضائع ہورہے ہیں، اخبارات کے مضامین وقتی طور سے پڑھے جاتے ہیں، حالانکہ یہ خام خیالی تھی کیونکہ اس سے میرا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ان کی دینی خدمت تھی، اسی احساس کے ماتحت میں نے جواہر القرآن کا انتخاب کرکے ایک کتاب معارف القرآن کے نام سے ۱۳۷۶ھ، ۱۹۵۶ء میں شائع کی، جو ۱۲۵ رصفحات پر مشتمل تھی، جس کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے ''صدق'' میں لکھا: قاضی اطہر مبارکپوری صاحب ایک کہنہ مشق، صاحب قلم ہیں، بمبئی کے اخبارات وجرائد میں ان کے قلم سے دینی، اسلامی، اصلاحی، عنوانات پر مضامین سالہا سال سے نکل رہے ہیں، یہ ان کے اسی قسم کے مختصر مضامین کا مجموعہ ہے اور ہر مضمون کا تعلق قرآن مجید کی کسی نہ کسی آیت سے ہے، توحید، رسالت، کتاب اللہ اور دینی زندگی نظر آئے، قرآن مجید کی جو خدمت بھی خواہ کسی درجہ کی ہو اخلاص کے ساتھ کی جائے مستحق اجر ہوتی ہے، اور اس کتاب کے مصنف اجر کے حقدار تو بہر حال ہو چکے، حالات حاضرہ پر اشارے مصنف جابجا کرتے گئے ہیں، جو اکثر صورتوں میں مفید ہیں اور پُر لطف بھی، مثلاً الـــخ (صدق ۵ ربیع الثانی ۱۳۷۶ھ۔ ۹ رنومبر ۱۹۵۶ء)

البلاغ شاہ سعود نمبر:۔ ۱۳۷۵ھ، ۱۹۵۵ء میں جلالۃ الملک سعود الاول ہندستان تشرف لائے، یہ حرمین کے پہلے حکمراں تھے جو ہندستان آئے اور ان کے جود وسخا کی دھوم پورے ملک

میں مچ گئی، حاتم کی یاد تازہ ہوگئی، بمبئی میں ان کی آمد کے موقع پر انجمن خدام النبی نے اتوار ۱۱؍ دسمبر ۱۹۵۵ء کو ان کے اعزاز میں شاندار استقبالیہ جلسہ مسافر خانہ میں کیا، اس موقع پر البلاغ کا ''سعود نمبر'' ربیع الآخر، جمادی الاولیٰ، ۱۳۷۵ھ، (دسمبر ۱۹۵۵ء وجنوری، ۱۹۵۶ء) شائع کیا گیا ۱۲۵؍ صفحات کا، ابتداء کے ۱۶ صفحات میں عربی زبان میں مضامین تھے، اس میں ''افکار ومطالعات'' کے علاوہ ''ملک معظم کے تین خطبے'' اور ''مملکت سعودیہ کے مرکزی شہر'' اہمیت کے حامل تھے، ماموں مولانا محمد یحییٰ صاحب کا عربی زبان میں ایک منظّم استقبال تھا، شاہ سعود کی آمد کے دوران ''البلاغ'' اور خدام النبی کے علاوہ مختلف فرموں اور اداروں نے مجھ سے شاہ کے استقبال کے استقبالی خطبے اور اشتہارات وغیرہ لکھوائے جس سے مجھ کو ہزاروں روپئے ملے، اور اس سے میں نے مبارکپور میں سڑک والا مکان غالباً ۱۲۰۰؍ سو میں خریدا، میں اس وقت بمبئی تھا وہاں سے روپیہ بھیجا تھا والد مرحوم اور بھائی حیات النبی مرحوم نے معاملہ طے کیا تھا۔

شاہ سعود کے قیام بمبئی کے وقت بعض اہل علم ان کے متعلقین کے ذریعہ روپیہ وصول کرتے تھے، مجھ سے بھی بعض بہی خواہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کو کہا مگر میری غیرت وخودداری نے اس کو بالکل پسند نہیں کیا۔

الحاج محی الدین منیری اور الحاج مختار احمد:۔ البلاغ میں آنے کے بعد جناب الحاج محی الدین منیری بھٹکلی صاحب اور عزیزی الحاج مختار احمد صاحب جاوید سے تعلق ہوا، منیری صاحب انجمن خدام النبی کے آفس انچارج اور البلاغ کے مدیر مسئول تھے اور مختار احمد کے والد حاجی محمد مشتاق ساحب امروہہ کے ایک نیک آدمی تھے، بمبئی میں رومال اور گھڑی کی تجارت کرتے تھے، انھوں نے دوسرا نکاح بھٹکل کی ایک خاتون سے کیا، مختار احمد ۱۷/۱۸ سال کے تھے، مسافر خانہ میں عطر کی ایک دوکان پر ملازم ہوئے، میرے کمرے میں رہتے تھے، اور تعلق ہوجانے پر ایک معلم ان کو مکہ مکرمہ لوا گئے وہاں بھی عطر کی دوکان پر رہے، اور حجاج کے ایک وکیل کے یہاں بھی کام کرتے تھے، تقریباً ۲۵؍ سال سے مکہ مکرمہ میں ہیں، وطن بھٹکل آمدورفت ہے، نہایت شریف الطبع، حجاج اور عوام کے خادم، اور بے لوث وبے غرض خوش دل آدمی ہیں، ان سے تعلقات کی نوعیت خاندانی ہوگئی ہے، خالد کمال اور سلمان مبشر کے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے

قیام کے دوران گویا مختار صاحب ان کے چچا اور سرپرست رہے ہیں، **الجامعة الحجازیه** کے قیام میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اب تک اس کی طرف خاص توجہ رکھتے ہیں، انھوں نے مجھے مسعودی کی ''مروج الذہب'' اور شاطبیؒ کی ''الاعتصام'' ہدیہ میں دی ہے، وہ مبارکپور آچکے ہیں، میں بھٹکل جا چکا ہوں، منیری صاحب جب تک بمبئی میں رہے حجاج کی خدمت کرتے رہے اور ان کی ہر قسم کی ضرورت کا خیال رکھتے تھے، اب بھٹکل جامعہ اسلامیہ کے ناظم اور دوسری دینی تحریکات کے رکن ہیں۔

پہلا سفرِ حج (۱۳۷۴ھ):۔ رمضان ۱۳۷۳ھ (مئی ۱۹۵۴ء) میں انجمن خدال النبی کی طرف سے مجلّہ البلاغ جاری ہوا اور اس کی ادارت اور انجمن خدام النبی سے منسلک ہوا، اور ایک سال کے بعد ۱۳۷۴ھ میں حج وزیارت کی توفیق مل گئی، طالبعلمی کے زمانہ میں سوچا کرتا تھا کہ مدرسی کی تنخواہ سے بچا بچا کر بہت دنوں کے بعد یہ دولت نصیب ہوسکتی ہے، انجمن خدام النبی کے مخلص اراکین احمد بھائی وغیرہ اپنے متعلقین ومتوسلین کی بڑی قدر کیا کرتے تھے اور ان کو جہاں موقع ملا حج کو بھیج دیا کرتے تھے، اس زمانہ میں نہ آج کی طرح مشکلات تھیں اور نہ ہی اتنے اخراجات تھے، احمد بھائی نے کہا کہ ہم آپ کو حج پر بھیجنا چاہتے ہیں آپ کو منظور ہو تو اجازت دیں اور تیاری کریں، میں نے بڑے تشکر کے انداز میں اپنی خوش بختی کا اظہار کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا اور ۱۷/ اگست ۱۹۵۵ء اسلامی یا مظفری جہاز سے روانہ ہوا، زندگی میں پہلا حج تھا، جذبات واحساسات میں طوفان تھا جو بیان سے باہر ہے، اس سال مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ، مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری (شیخ اس سال شاہ عبدالقادر رائپوری کی علالت کی وجہ سے حج میں نہیں جاسکے تھے جیسا کہ ''آپ بیتی'' میں مذکور ہے، قاضی صاحب کو سہو ہوا ہے) اور مولانا محمد یوسف صاحب امیر جماعت تبلیغ کے علاوہ اور بہت سے متعارفین تشریف لے جارہے تھے۔ اس مقدس سفر کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، مکہ مکرمہ میں احمد بھائی کے یہاں قیام وطعام تھا، ان ہی نے ہر قسم کے اخراجات برداشت کئے، جدہ میں اتر کر دوسرے دن شہر میں گیا، وہاں یاقوت حموی کی معجم الادباء بیس جلدیں صرف بیس ریال میں مل رہی تھی، سوچا کہ بعد میں خریدوں گا مگر نہیں خرید سکا، پرانی کتابوں کی ایک دکان پر طبقات الخواص عدن کے عباد وصلحاء پر دیکھا اس کو نہیں خرید سکا، مکہ

مکرمہ سے امام ابن حزم مکی کی **محلیٰ** اوران ہی کی طرق الحمامہ خریدی، اس کے علاوہ رحلہ ابن جبیر خریدا، مدینہ منورہ سے سمہودی کی وفاء الوفاء اور ابن نجار کی تاریخ المدینہ خریدی مگر یہ دونوں کتابیں واپسی پر بستر موٹر کے اوپر سے گرجانے کی وجہ سے دوسرے تمام سامان کے ساتھ ضائع ہوگئیں، روضہ مطہرہ کے اندر کی خاک بھی اغوات سے حاصل کی تھی وہ بھی اس میں چلی گئی جسکا بہت افسوس رہا، عرفاء وصالحین نے کہا کہ دیار پاک کی کنکری بھی نہیں اٹھانی چاہئے، اوران کوان کے مقدس مقام سے جدا کرنا ادب کے خلاف ہے، شاید اس وجہ سے یہ خاک پاک وہیں رہ گئی، مولانا عبد اللہ زمزمیؒ ایک مجذوب قسم کے بزرگ تھے، انھوں نے مجھے کئی کتابیں دی تھیں جو میرے کتب خانہ میں بطور تبرک کے موجود ہیں۔ ان پران کا تہدیہ اور دستخط بھی ہیں۔ رجال السند والہند کا مسودہ ساتھ لیتا گیا تھا، اس پر استاذ احمد السباعی مفتش وزارت مالیہ اور تاریخ مکہ کے مؤلف نے عمدہ تقریظ لکھی تھی جو اس کے مطبوعہ بمبئی میں موجود ہے، مولانا سید علوی مالکیؒ مکہ مکرمہ کے مشہور عالم اور حمامۃ الحرم کہے جاتے تھے، ان کی مجلس میں حاضر ہوتا تھا، سید احمد کے جھوٹے ''وصیت نامہ'' پران کا ایک مضمون **مجلۃ الحج** میں چھپا تھا اس کا ترجمہ میں نے البلاغ میں شائع کیا تھا، اس کوان کو پیش کیا بہت خوش ہوئے، اور دعا دی، اس کے بعد والے حج میں بھی ان سے نیاز حاصل ہوتا رہا، پہلے باب السلام کے اوپر کمرہ میں رہا کرتے تھے بعد میں جنت المعلیٰ کی طرف مکان میں رہنے لگے تھے، ان کے صاحبزدے محمد حسن علوی مالکی سے بمبئی اور مکہ مکرمہ میں ملاقاتیں ہوتی رہیں، فرصت کے اوقات مکہ مکرمہ میں مکتبہ الثقافۃ عبد الشکور فدا (اندرون باب السلام) میں جایا کرتا تھا کتابیں پڑھتا تھا اور اہل علم سے ملاقات ہوتی تھی اور مدینہ منورہ میں مکتبہ علمیہ (باب الرحمۃ کے سامنے) میں جاتا تھا یہاں بھی یہی شغل رہتا تھا۔

رجال السند والہند کی طباعت:۔ ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۸ء) میں میری کتاب **رجال السند والھند** مطبعہ حجازیہ بمبئی میں طبع ہوئی، احمد بھائی مرحوم اوران کے بھائیوں کی توجہ سے، ایک دن صبح کو میں مسودہ لے کر حسب سابق پڑھانے کے لئے ان کے یہاں گیا اور اس کو دکھا کر طباعت کی خواہش ظاہر کی، ان حضرات نے فوراً کہا کہ انتظام کیجئے، خود دلچسپی لی اور دمشق کے ایک عالم سے جوان کے یہاں مہمان تھے دمشق میں چھپوانے کی بات کی، انھون نے وہان سے

معلومات حاصل کر کے لکھا کہ یہاں طباعت میں زیادہ صرفہ ہوگا اور پریشانی بھی ہوگی لہٰذا بمبئی میں طباعت کرالیں، چنانچہ مطبعہ حجازیہ بمبئی سے بات چیت کی، معاملہ طے ہوگیا، فی صفحہ دس روپیہ اجرت طباعت کاغذ کے علاوہ طے ہوئی، ایک ہزار روپئے کے مزید حروف......خریدے اور احمد بھائی نے کاغذ پریس میں پہونچادیا، کم وبیش پانچ ہزار روپیہ ان لوگوں نے خرچ کیا، بعض دوسرے اہل خیر نے تعاون کیا اور کتاب چھپ گئی اس کی اشاعت کے بعد اوساط علمیہ میں میرا خصوصی تعارف ہوگیا، کہنا چاہئے کہ اسی کتاب کی وجہ سے تصنیف وتالیف میں اپنا مقام پیدا کیا، ملک اور بیرون ملک کے اہل علم، جرائد ومجلّات نے شاندار استقبال کیا۔

رسالہ معارف سے تعلق (۱۹۵۸ء):۔ ''البلاغ'' کے تبادلہ میں رسالہ ''معارف'' دار المصنفین آتا تھا، میں زمانۂ طالب علمی سے اس کو نہایت ذوق وشوق سے پڑھتا تھا، اس کے اڈیٹر حضرت شاہ معین الدین احمد ندویؒ ناظم دار المصنفین تھے، نہایت نیک، بزرگ اور خاندانی عالم تھے، میں ان سے ملنے کے لئے اور کتابوں کی مراجعت کیلئے بمبئی سے آتا تو اکثر دار المصنفین جاتا تھا اور ان سے خاص طور سے ملتا تھا وہ مجھ سے بہت مانوس ہوگئے تھے، ایک مرتبہ ''رجال السند والہند'' کا مسودہ ان کو دکھایا تھا اور انھوں نے تشجیع فرمائی تھی ''البلاغ'' میں میرے تاریخی اور تحقیقی مضامین پڑھتے تھے، کہتے تھے کہ ''البلاغ'' آتا ہے تو میں آپ کے مضامین خاص طور سے پڑھتا ہوں اور یہ کہ یہ مضامین ''البلاغ'' کے قارئین سے بالاتر ہیں، آپ ان کو ''معارف'' میں دیجئے، میں عرض کرتا کہ میرے مضامین اس لائق نہیں ہوتے ہیں، کہتے تھے کہ میں کور کسر درست کردوں گا، بہر حال ان کی مشفقانہ فرمائش بلکہ اصرار پر میں نے رجال السند والہند کے مسودہ کا خلاصۃ الخلاصہ ''ساتویں صدی تک کے رجال السند والہند'' کے عنوان سے ایک طویل مقالہ ''معارف'' کیلئے تیار کیا، جس کو شاہ صاحب نے جنوری تا مارچ ۱۹۵۸ء کے معارف میں تین قسطوں میں شائع کیا اور پہلی قسط کو سر مقالہ بنایا، اس کے بعد ''معارف'' میں میرے مضامین ومقالات کا سلسلہ شروع ہوگیا، حضرت شاہ صاحب اکثر مقالات کو سر مقالہ بنایا کرتے تھے، ''معارف'' کی بزم میں مجھ کو لانے والے حضرت شاہ صاحب ہیں، اب میں بمبئی سے آتا تو بار بار ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور کھل کر باتیں کرتا تھا، دیر تک بٹھاتے تھے، اٹھنے

نہیں دیتے، فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو آپ سے محبت ہے، ایک مرتبہ ردولی سے تشریف لائے تھے، میں گیا تو مجھ کو اپنے کمرے میں یہ کہہ کر لے گئے کہ گھر سے مٹھائی لایا ہوں اور دفتر سے کمرہ تک میرے کندھے پر اپنا دست شفقت رکھے رہے، دوبار حج میں ان کا ساتھ رہا، وہاں بھی خوب گذرتی تھی اور بہت خیال فرماتے تھے دوسرے حج میں مولانا عبد السلام قدوائی بھی ان کے ساتھ تھے، وہ کہنے لگے کہ اب آپ کو دیکھ کر بڑھاپے کا احساس ہونے لگا ہے، بمبئی چھوڑ دیئے اور دار المصنفین آجیئے، میں نے کہا کہ حضرت شاہ صاحب کی نظامت میں رہ سکتا ہوں، فلاں صاحب کی ماتحتی میں نہیں رہ سکتا ہوں، شاہ صاحب نے کہا کہ ناظم تو میں ہی ہوں وہ میرے ماتحت رہ کر کام کرتے ہیں، میں نے کہا کہ ایک مرتبہ عالم اسلام کا سفر کرنے کے بعد سوچوں گا، شاہ صاحب کہا کرتے تھے کہ آپ اپنی کتابیں دار المصنفین کو دیا کریں، آپ کو مالی فائدہ بھی ہوگا، اور میں عرض کرتا کہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے میری کتابیں ابتداء میں شائع کر کے اوساط علمیہ میں میرا تعارف کرایا ہے، اب یہ بات مروّت واخلاق کے خلاف معلوم ہوتی ہے اور اس سے ان کو قلبی تکلیف ہوگی، شاہ صاحب کے انتقال کے بعد ''معارف'' میں میرے مضامین شائع کرنے کا سلسلہ بند کر دیا گیا تھا پھر بعد میں گاہے گاہے چھپنے لگے۔

انجمن اسلام ہائی اسکول میں (نومبر ۱۹۶۰ء):۔ انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی کے مشہور اسکولوں میں ہے، جو مسلمانوں کے تعاون وتوجہ سے چلتے ہیں، اس میں ایک بوڑھے مولوی صاحب دینیات واخلاقیات کا درس دیتے تھے، ان کے انتقال کے بعد اس جگہ کیلئے پرنسپل ضیاء الدین خلیفہ نے احمد بھائی سے میرے بارے میں کہا، احمد بھائی نے میری مصروفیات کو دیکھتے ہوئے عذر کیا، مگر ان کا اصرار رہا کہ قاضی اطہر مبارکپوری مشہور عالم ہیں ان کی وجہ سے ہمارے اسکول کو فائدہ ہوگا، احمد بھائی نے مجھ سے کہا کہ آپ منظور کرلیں، بچوں کو دینی فائدہ ہوگا اور آپ کو بھی مالی فائدہ ہوگا، اس وقت مجھ کو انقلاب سے ۱۵۰؍روپیہ اور ''البلاغ'' یا احمد بھائی وغیرہ کو پڑھانے پر ۱۰۰؍روپیہ ملتا تھا، میں لکھنے پڑھنے میں بے حد مصروف تھا، مگر قبول کرلیا مشاہرہ غالباً ۳۵۰؍روپیہ تھا، اور دس سال تک وہاں دینیات واخلاقیات کی تعلیم دی، یہ زمانہ بمبئی میں میری آمدنی کے اعتبار سے بہترین زمانہ تھا، ابتداء میں پورا وقت اسکول میں دیتا تھا بعد میں پرنسپل نے

میری مصروفیات کو دیکھتے ہوئے تمام اسباق پہلے وقت میں کرادئے اور میں ایک وقت جانے لگا تھا، ابتداء میں ٹیچروں اور بچوں کو سلام کرتا تھا تو مذاق اڑاتے تھے، مگر بعد میں پورے اسکول میں سلام کا یوں رواج ہوگیا کہ بعض اساتذہ کے بقول مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا سماں پیدا ہوگیا حتیٰ کہ ہندو اور عیسائی ٹیچر بھی سلام کرنے لگے، بچے بے حد مانوس ہوگئے، اور میرے ادب واحترام کا پورا پورا خیال رکھنے لگے، اسی سے متعلق اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ تھا، مرحوم عبدالرزاق قریشی (بسہم، اعظم گڈھ) اس کے رکن اور دوماہی رسالہ.......... کے مدیر تھے، وہ مجھ سے عربی پڑھنے لگے اور شدبد کی حد تک پڑھ لیا نہایت نیک، صالح اور مخلص آدمی تھے، نجیب اشرف ندوی ڈائرکٹر تھے، حامداللہ ندوی بھی تھے، ان سب سے تعلقات تھے،

انجمن اسلام کے میرے شاگرد اب تک بڑے بڑے عہدوں اور باحیثیت ہونے کے باوجود مل جاتے تھے تو احترام میں بچھے جاتے ہیں، یہ بات عربی مدرسوں کے طلبہ میں نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف معاملہ ہے۔

ڈاکٹر شیخ عبدالمنعم النمر اور شیخ عبدالعال العقباوی:۔ ڈاکٹر شیخ عبدالمنعم النمر اور شیخ عبدالعال العقباوی دونوں حضرات جامعہ ازہر قاہرہ سے دارالعلوم دیوبند میں مبعوث ہوکر جنوری ۱۹۵۶ء میں آئے، اور ۲۷/ ماہ یہاں قیام کرکے ۱۹۵۸ء میں واپس ہوئے، ڈاکٹر شیخ عبدالمنعم النمر سے میری پہلی ملاقات سورت میں جمعیۃ علماء کے سالانہ اجلاس میں ہوئی، وہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ جمع کررہے تھے، اس سلسلہ میں باتیں ہوتی رہیں، اسی زمانہ میں انھوں نے ''**مجلة الحج**'' مکہ مکرمہ میں ''**المسلمون فی الهند**'' کے عنوان سے مضامین شائع کئے، جس میں ''تھانہ'' کے ذکر میں میرا حوالہ دے کر بعض باتیں درج کیں، اور جب وہ دونوں حضرات واپس ہونے کیلئے بمبئی آئے اور ہفتوں بحری جہاز کے انتظار میں مسافر خانہ میں رہے تو ہر وقت ملاقات ہوتی تھی، اس وقت میری کتاب ''رجال السند والہند'' چھپ رہی تھی، اور اس کے مطبوعہ فرمے ڈاکٹر النمر ساتھ لے گئے اور کتاب پر اپنی رائے لکھی جو مطبوعہ بمبئی میں موجود ہے، آدمی متنور، ملنسار، علم وتحقیق کے ذوق کے تھے، اس لئے تعلقات بے تکلفانہ اور عمیق ہوگئے، اور میرے کمرے میں آنے جانے لگے، پہلی بار آئے اور چٹائی پر کتابوں اور اخبارات کو بکھرا ہوا دیکھا تو

بے ساختہ بول اٹھے ''یا سلام تأهلت بالکتب والکتابة '' یہ جامع جملہ میرا بہترین اور جامع تعارف ہے، قاہرہ جا کر تاریخ الاسلام فی الهند شائع کی تو ایک نسخہ مجھے ۲۲؍اپریل ۱۹۶۱ء کو بھیجا اور لمبا چوڑا خط بھی لکھا، اور ''رجال السند والہند'' کا تقاضا کیا جس کو میں نے بھیجا، اس زمانہ میں ہندوستانی سفارت خانہ قاہرہ نے ''صوت الهند '' کے نام سے عربی میں ایک کتابچہ پروپیگنڈہ کیلئے شائع کیا جس میں نمر صاحب نے ہندوستان کے بارے میں طویل مضمون لکھا اور اس میں انجمن خدام النبی رسالہ البلاغ اور میرا ذکر کیا، بعد میں ''مجلّہ الوعی الاسلامی'' کویت کے اڈیٹر ہو کر آئے اس زمانہ میں کویت کے ایک صاحب کو جو بمبئی آرہے تھے، میرا پتہ دے کر ملاقات کرنے کی تاکید کی تھی وہ کوئی علمی آدمی رہے ہوں گے، مغرب کے بعد میں کمرے میں لکھ پڑھ رہا تھا وہ صاحب کوٹ پتلون میں ملبوس تھے دروازہ کھولا، سلام کے بعد بیٹھنے کو کہا تو انھوں نے کہا کہ کہاں بیٹھوں؟ میں نے کرسی کھول دی مگر وہ کھڑے رہے اور کہنے لگے کہ میں تاج محل (ہوٹل) کے فلاں کمرے میں مقیم ہوں، وہاں ملئے، میں نے اچھا تو کہا مگر ملنے کیلئے نہیں گیا، وہ بیچارے نمر صاحب کی ہدایت پر آئے، اپنے موجودہ عربی ذوق کے مطابق ذہن میں بلند خیالات رہے ہوں گے مگر یہاں گرا پڑا کمرہ ٹوٹی گندی چٹائی اور کتابوں کے ڈھیر دیکھ کر ان کو وحشت ہوئی ہوگی، شیخ عبدالمنعم النمر نے مولانا ابوالکلام آزاد پر ڈاکٹریٹ کی تھی، اور ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کی جدوجہد پر عربی میں کتاب لکھی تھی، عرب افریقہ کے سفر میں قاہرہ آتے جاتے ان سے بار بار ملاقات ہوتی تھی، ایک مرتبہ ان کے مکان پر بھی گیا تھا، اس وقت وہ جامعہ ازہر کی بعثات کے مدیر تھے اور مبعوثین ومدرسین کا مجمع ان کے آفس میں لگا رہتا تھا، اس کے بعد بمبئی آئے تو ملاقات ہوئی اور آخر میں گزشتہ سال مولانا آزاد صدی پر حکومت ہند کی دعوت پر دہلی آئے تو دارالعلوم دیوبند سے ان کی ملاقات کیلئے ہوٹل میں گیا اور 'العقد الثمین' ان کی طلب پر پیش کی، انھوں نے ''الحکومات العربیه فی الهند '' پر شاندار مقدمہ لکھا۔ افسوس کہ ذوقعدہ ۱۴۱۱ھ میں قاہرہ میں انتقال کر گئے، ہاں دارالعلوم دیوبند کے جشن صد سالہ پر تشریف لائے تھے، اس وقت وزیر اوقاف تھے، اس وقت بھی برابر ملنا ہوتا تھا،

علی وحسین (۱۹۶۰):۔ ۱۹۵۹ء کے حدود میں پاکستان (کراچی) سے محمود احمد عباسی

امروہوی کی فتنہ انگیز کتاب ''خلافت معاویہ ویزید'' شائع ہوئی اور ہندو پاک کے بعض طبقوں نے اس کو خوب خوب اچھالا اور چھاپ کر شائع کیا، اس کے متعدد جوابات اخبارات ورسائل اور کتابوں میں دیئے گئے، میں نے بھی اخبار انقلاب میں ۴/۴/ جمادی الاولیٰ لغایت ۱۶/ جمادی الثانی ۱۳۷۹ھ مطابق ۷/ نومبر تا ۱۷/ دسمبر ۱۹۵۹ء ۳۵/ قسطوں میں اس کا جواب لکھا، جن کو مرتب کر کے ''علی وحسین'' کے نام سے مارچ ۱۹۶۰ء میں شائع کیا جو کتاب ''خلافت معاویہ ویزید'' کے جواب میں تمام مضامین وکتب میں سب سے بہتر مدلل اور صحیح مانی گئی اخبارات ورسائل اور اہل علم نے اس کو واقعی جواب قرار دیا، ''خلافت معاویہ ویزید'' کے پُر زور مبلغ وناشر مولانا عامر عثمانی ''مدیر تجلی'' تھے اور جماعت اسلامی کے عام لوگ اس کو نئی تحقیق قرار دیتے تھے، ان کے علاوہ بھی نیم خواندہ طبقہ اس کا پروپیگنڈا کرتا تھا، ہندو پاکستان میں ہنگامہ برپا تھا۔

دیوان احمد (۱۹۵۸):- نانا مولانا احمد حسین صاحبؒ عربی کے بلند پایہ شاعر تھے، ان کے اشعار کاغذات میں بکھرے ہوئے تھے، ''**رجال السند والهند**'' کی طباعت کے دوران انکو مرتب کر کے شائع کرنے کی تا کہ کسی حد تک یہ ادبی جواہر پارے محفوظ ہو جائیں، اور جیسے تیسے اس کا انتظام کر کے رمضان ۱۳۷۷ھ، اپریل ۱۹۵۸ء میں طبع کرایا، مولانا احمد حسین صاحب، مولانا عبدالعزیز میمنی راجکوٹی اور مولانا ظفرالدین صاحب بہاری تینوں اہل علم نے مولانا شیخ محمد طیب صاحب عرب مکی سے مدرسہ عالیہ رامپور میں عربی ادب کی تعلیم حاصل کی، مولانا احمد حسین صاحب صاحب دیوان شاعر ہوئے، مولانا ظفرالدین صاحب بہاری نے بعد میں مولانا احمد رضا خان بریلوی سے تلمذ حاصل کیا اور حدیث میں ''**صحیح البهاری**'' لکھی، اور مولانا عبدالعزیز میمنی راجکوٹی عربی زبان وادب کے عالمی ادیب وعالم تسلیم کئے گئے، ''کتاب الامالی'' ابوعلی قالی کی شرح لکھی...... کے زائد اشعار جمع کئے، **ابو العلاء معرّی** پر کتاب لکھی، الغرض عالمی شہرت کے مالک تھے، ان تینوں حضرات کے شیخ محمد طیب صاحب عرب کے شرف تلمذ کے بارے میں مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی (کلکتہ) نے راقم کو براہ راست معلومات دی ہے اور اپنے ایک طویل عربی کے قصیدہ میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔

مولانا عبدالعزیز میمنی راجکوٹی (۱۳۷۹ھ):- ۱۳۷۹ھ میں دنیائے ادب وعربیت

کے مشہور عالم ادیب مولانا عبدالعزیز میمنی راجکوٹی سے ملاقات ہوئی، معلوم ہوا کہ صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ شیفر روڈ میں ''عربی اور فارسی'' کے موضوع پر ان کا لکچر ہے، دفتر انقلاب سے قریب ہی یہ اسکول ہے، شام کو چار بجے میں اپنے کام سے فارغ ہو کر سادہ لباس میں لکچر سننے کیلئے گیا، پورا ہال جدید تعلیم یافتہ لوگوں سے پُر تھا، پرنسپل سید شہاب الدین دسنوی نے مجھے ایک میز پر بٹھایا اور خود بھی اسی پر بیٹھے، لکچر ختم ہونے پر لوگ میمنی صاحب سے ملاقات ٹوٹ پڑے، آخر میں دسنوی صاحب نے میرا تعارف کرایا، فوراً انھوں نے کہا کہ میں آپ کی کتاب ''رجال السند والہند'' پڑھی ہے، (جو نئی نئی شائع ہوئی تھی) اور کہا کہ معارف میں آپ کا مقالہ ''دولت سامانیہ سنجان'' بھی پڑھا ہے، (یہ مقالہ معارف میں مارچ تا مئی ۱۹۵۹ء تین قسطوں میں شائع ہوا تھا) ''رجال السند والہند'' کے بعض اشعار کے بارے میں آپ کو بتاؤں گا، یہ کہتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑا اور سب سے یکسو ہو کر بات کرتے ہوئے موٹر پر بٹھایا اور اپنے ساتھ مینارہ مسجد کے عقب میں آفندی صاحب کے یہاں لیوا گئے جہاں وہ مقیم تھے، (آفندی صاحب راشننگ آفیسر تھے) وہ پاکستان سے آئے تھے، کئی دن تک صبح وشام ان کے یہاں آتا جاتا رہا، بڑی محبت اور خورد نوازی سے ملتے تھے، ان میں اہل علم کی شان تھی، تعلّی بھی بہت تھی، کہتے تھے کہ مجھے عربی کے دو لاکھ اشعار یاد ہیں، اپنے حریف مولانا ابو عبداللہ سورتی کا نام لیتے تو اخیؓ کہتے تھے، ہماری طالب علمی کے زمانہ میں جب ان کی شرح ''امالی'' ابو علی قالی مصر سے شائع ہوئی تھی تو مولانا ابو عبداللہ سورتی نے اس پر ''معارف'' میں سخت تنقید کی اور مولانا راجکوٹی نے ''برہان'' میں اس کا جواب لکھا، دونوں ادیبوں کی نوک جھونک کا فیصلہ مولانا اعزاز علی صاحب نے کیا اور معاملہ ختم ہوا باتوں بات میں مولانا نے بتایا کہ ''مقامات حریری'' کا سب سے صحیح نسخہ وہ ہے جو ۱۲۶۳ھ میں لکھنؤ میں فارسی ترجمہ کے ساتھ چھپا ہے، یہ نسخہ میرے پاس موجود ہے، ان کا ارادہ کراچی میں ایک شاندار کتب خانہ قائم کرنے کا تھا، اسی زمانہ میں احمد بھائی مرحوم نے ناسک کے مشہور عالم عبدالفتاح گلشن آبادی کا پورا کتب خانہ خرید لیا تھا جس میں بہت سے مخطوطات تھے، مولانا میمنی بہت سے مخطوطات لے گئے جن میں فتاویٰ مولانا ہاشم تتوی کی جلدیں بھی تھیں، میں نے بھی اس کتب خانہ سے کئی کتابیں حاصل کیں، کئی دنوں تک مولانا میمنی کی مجالس سے علمی وادبی اور تاریخی

فائدے حاصل ہوئے اور ان کو بہت قریب سے دیکھنے اور سننے کا اتفاق ہوا، میں نے اپنے بعض مضامین میں ان کے استفادات سے کام لیا ہے، اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ میرے نانا کے ساتھ مدرسہ عالیہ رام پور میں مولانا شیخ محمد طیب صاحب عرب مکی سے پڑھتے تھے، یہ بات چند سال پہلے معصومی صاحب سے معلوم ہوئی ہے۔

الحاج سیٹھ ابراہیم موتی والا صاحب میمن، دھوراجی کے اہل علم ہیں اور اہل علم کے قدر داں ہیں، ان کا بیان ہے کہ کراچی میں مولانا عبدالعزیز راجکوٹی نے ایک مجلس میں فرمایا کہ ہندوستان میں عربی کے دو عالم و مصنف قابل ذکر ہیں، ایک مولانا ابوالحسن علی ندوی اور دوسرے مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، اس وقت سے میں نے قاضی صاحب سے علمی ربط پیدا کرنا شروع کر دیا، (وہ مجھے اپنے وطن دھوراجی لے گئے تھے)

نارجیل سے نخیل تک (۱۹۶۲ء):۔ ''نارجیل سے نخیل تک'' کے عنوان سے عرب و ہند کے تعلقات پر میرا ایک طویل مقالہ ''معارف'' میں مئی تا اگست ۱۹۶۲ء میں چار قسطوں میں شائع ہوا، اس کی اہمیت وافادیت حکومت ہند نے بھی محسوس کی اور اس کے بعد اس کا عربی ترجمہ کر کے سرکاری سہ ماہی عربی مجلّہ ''ثقافة الهند'' میں شائع کرا کر بہت سے پرچے عرب ممالک کے سفارت خانوں میں بھیجا اور ہندوستان کے عرب ممالک میں ہندی سفارت خانوں کو بھیجا اور تقسیم کرایا، اس کی اہمیت کے پیش نظر سعودی عرب کے مشہور ادیب و محقق اور مصنف و صحافی استاذ عبد القدوس انصاری نے اپنے مجلّہ شہریہ ''المنهل'' جدہ میں دو یا تین قسطوں میں اہتمام سے شائع کیا اور اس پر کچھ تعلیقات بھی کیں، ''ثقافة الهند'' اور ''المنهل'' کے یہ سب پرچے میرے پاس محفوظ ہیں،

نوساری (گجرات) کے گجراتی پرچہ ''قلم'' میں اس کا گجراتی ترجمہ شائع ہوا، احمد آباد سے ایک غیر مسلم اسکالر نے اس کے بارے میں مجھ سے خط و کتابت کی۔

جدہ میں سعودی سفارت خانہ میں دعوت (۱۳۸۵ھ):۔ میں جب ۱۳۸۵ھ (۱۹۶۵) میں دوسری بار حج وزیارت کیلئے گیا تو ہندوستانی سفارت خانہ جدہ نے میری شاندار دعوت کی اور سعودی عرب کے صحافیوں کو مدعو کیا، اس وقت جناب سید شہاب الدین ممبر پارلیمنٹ ہندوستانی

سفارت خانہ میں غالباً فرسٹ سکریٹری تھے، بڑے چاق وچوبند اور فعال آدمی ہیں، اخبارات میں اس دعوت کا اعلان کیا اور رات کو سفارت خانہ کی طرف سے اس کے آفس میں دعوت کی، جس میں سعودی عرب کے ادباء ومصنفین اور صحافی مدعو تھے، ان ہی میں استاذ عبد القدوس انصاری بھی تھے، جنھوں نے اپنے مجلّہ میں میرا مقالہ شائع کرکے اس پر تعلیق کی تھی، اس تقریب میں ان سے پہلی ملاقات ہوئی جو بعد میں مستحکم علمی تعلقات کا باعث بن گئی، میری دو کتابوں پر انھوں نے مقدمہ لکھا، ۷؍رجب ۱۴۰۳ھ کو فوت ہوئے، رحمہٗ اللہ

استقبالیہ میں کھانے کا انتظام مغربی طرز پر کھڑے کھڑے تھا، میں نے جرأت کرکے کہا کہ میں اسلام کے وطن میں نصاریٰ کے طریقہ پر نہیں چلوں گا، یہ کہہ کر اپنے حصہ کا کھانا لے کر دوسری طرف میز کرسی پر بیٹھ گیا، یہ دیکھ کر سب حضرات نے ''واللہ صحیح واللہ صحیح'' کہتے ہوئے میز کرسی پر کھانا کھایا۔

اس زمانہ میں میرے کئی مضامین متعلقہ ہندوعرب مطبوعہ ''معارف'' کا عربی میں ترجمہ ''ثقافة الهند''میں چھپا، ترجمہ مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی کے بھائی مولانا عمید الزماں کیرانوی کرتے تھے، ایک بار انھوں نے اس سلسلہ میں بعض باتیں بھی معلوم کی تھیں، ''ثقافة الهند'' کے مضامین پر معاوضہ ملتا ہے اسی دوران اس کے شریک ادارہ مصر کے صحافی زغبی قاہرہ جاتے ہوئے بمبئی آئے اور میری ان سے ملاقات ہوئی، میرے مضامین کا تذکرہ آیا تو انھوں نے پوچھا کہ معاوضہ ملتا ہے یا نہیں؟ میں نے انکار کیا تو کہا کہ ادارہ کے لوگ اس رقم کو لے کر ہضم کر جاتے ہیں، آپ ان پر مقدمہ کریں، میں نے ان کو لکھا تو جواب دیا کہ ہم نے دارالمصنفین سے اجازت لی ہے، اور مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی کو میں نے لکھا تو انھوں نے جواب دیا کہ مجھ سے کسی نے اجازت نہیں لی ہے، بات آئی گئی ہوئی، سالوں تک ''ثقافة الهند'' میرے نام آتا رہا،

مزید انہماک:۔ میں ''انقلاب'' اور ''البلاغ'' کے علاوہ ''معارف'' ''صدق جدید'' اور ''برہان'' وغیرہ میں مضامین لکھنے کے ساتھ عربی اردو میں تصنیف وتالیف میں ہمہ وقت مصروف رہا کرتا تھا، اسی میں بہت محدود طور پر شہر کی علمی واصلاحی سرگرمیوں میں حصہ لیتا تھا، الغرض اپنے کو

بالکل مصروف کر رکھا تھا، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے ایک مرتبہ بمبئی میں کہا کہ آپ کے انہماک ومصروفیت کو دیکھ کر الفرقان کے لئے مضمون کا تقاضہ کرنے میں ڈر معلوم ہوتا ہے، اس دوران انجمن اسلام ہائی اسکول کی ملازمت کرنی پڑی، ابتداء میں پورا وقت دینا پڑتا تھا جس کی وجہ سے میرے لکھنے پڑھنے میں حرج ہو رہا تھا اور سخت پریشانی تھی کہ میں عربی مدرسہ کا آدمی ہوں، اگر مدرسی کرنی ہو تو کسی مدرسہ میں جانا چاہئے تھا، اسکول وغیرہ کی ملازمت میرے ذوق کے بالکل خلاف تھی، اسکول کے طلبہ کو دینی باتیں سکھانا، دینی قصے سنانا اور دین کی موٹی موٹی باتیں بتانا میرے نزدیک بے جوڑ بات تھی، میں نے دولت کے شہر میں دولت کی طرف نہیں دیکھا، اسکول میں آکر میرا علم ختم ہو رہا ہے، روپیہ مقصود ہوتا تو بڑے بڑے سرمایہ داروں کی پیش کش کو قبول کر لیتا، اس احساس کے بعد میں نے لکھنے پڑھنے میں مزید انہماک پیدا کر لیا، انجمن اسلام ہائی اسکول میں کریمی لائبریری کے نام سے قدیم اردو عربی فارسی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا، اس کو میں نے غنیمت سمجھا اور اس سے کتابیں لاکر استفادہ کرنے لگا، قدیم اردو اخبارات سے مبارکپور اور اعظم گڈھ کے بارے میں معلومات جمع کرنے لگا، گذشتہ صدی میں یہاں کے فسادات وغیرہ کے بارے میں کافی مواد جمع کیا۔

عرب وہند عہد رسالت میں (۱۹۶۴) انجمن اسلام ہائی اسکول کی ملازمت اور اپنی مصروفیات میں میں نے علمی کام کی توجہ زیادہ کردی اسی وقت خیال ہوا کہ عہد رسالت اور ہندوستان کے نئے موضوع پر لکھنا چاہئے، میرے پاس رجال السند والہند کے مسودات تواریخ وجغرافیہ کے اقتباسات ضخیم مقدار میں محفوظ تھے، ان سے کافی مدد ملی، نیز اس موضوع کے متعلق معلومات کرنا شروع کیا اور پہلی قسط ''نارجیل سے نخیل تک'' چار نمبروں میں ۱۹۶۲ء کے معارف میں شائع کیا جو بیحد مقبول ہوا جیسا کہ لکھ چکا ہوں اس کے بعد اس سلسلہ کے مضامین لکھتا رہا جو شائع ہوتے رہے، بعد میں آخری ابواب وصفحات کا اضافہ کر کے عرب وہند عہد رسالت میں مرتب کر لی، سوال اسکی طباعت واشاعت کا تھا، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مختلف تقریبات میں بمبئی آتے جاتے تھے، وہ پہلے ہی میرے حال پر مہربان تھے، میں نے ان سے گذارش کی کہ آپ اس کو ندوۃ المصنفین سے شائع فرمائیں۔ مفتی صاحب نے نہایت انشراح سے اس کو قبول

فرمایا اور فرمایا کہ ایسی عمدہ تاریخی کتاب ندوۃ المصنفین سے ضرور شائع ہوگی چنانچہ میں نے ربیع الثانی ۱۳۸۴ھ (اگست ۱۹۶۴ء) کو مسودہ ان کے حوالہ کیا اور کتاب رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ (جنوری ۱۹۶۵ء) میں تقریباً پانچ مہینہ کے اندر چھپ کر شائع ہوگئی، اور خدا کے فضل وکرم سے اوساط علمیہ میں امید سے زیادہ مقبول ہوئی، ڈاکٹر عبدالعزیز عبدالجلیل عزت عضو مجمع البحوث الاسلامیۃ قاہرہ نے العرب والہند في عہد الرسالۃ کے نام سے اس کا ترجمہ کرکے الہیئۃ المصریۃ العامۃ لکتاب قاہرہ سے شائع کیا، مکتبہ عارفین کراچی نے اس کا عکسی فوٹو شائع کیا، تنظیم فکر ونظر سکھر سندھ نے بھی اس کا فوٹو شائع کیا اور سندھی زبان میں اس کا ترجمہ ''عرب ءِ ہند نبی ؐ جن جی زمانی ھر'' کے نام سے شائع کیا، یعنی یہ کتاب ابتک تین بار چھپ چکی ہے اور عربی اور سندھی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔

پروفیسر میر محمود حسین ایم اے، لیکچرر فارسی عربی، شعبۂ تحقیق اردو، جامعہ میسور نے ۱۴ر جون ۱۹۶۸ء کو اس کتاب کے انگریزی زبان میں ترجمہ کی خواہش کی اور اجازت طلب کی۔ معلوم نہیں انھوں نے یہ کام کیا یا نہیں؟

ڈاکٹر عبدالعزیز عزت مصری:۔ اس دوران بمبئی میں استاذ ڈاکٹر عبدالعزیز عبدالجلیل عزت مصری جامع ازہر کے ایک فاضل مصری جوان حکومت مصر کی طرف سے بمبئی میں عربی تعلیم کیلئے مبعوث ہوکر آئے، ان کو میرے بارے میں قاہرہ ہی میں معلومات تھیں، اور مصری قرّاء جو رمضان میں بمبئی آتے تھے ان سے میرے حالات معلوم ہوئے تھے، انھوں نے قاہرہ میں اچھی خاصی اردو زبان حاصل کرلی تھی، جس طرح ہم لوگ عربی زبان پڑھ کر سب کچھ سمجھ لیتے ہیں مگر بولنے میں وہ بات نہیں ہوتی، بالکل اسی طرح وہ اردو کی کتابیں اخبارات ورسائل سب اچھی طرح پڑھتے اور سمجھتے تھے مگر بولتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مدرسہ کا مولوی عربی بول رہا ہے، انھوں نے مجھ سے ملاقات کی اور اسی وقت سے ہم دونوں میں علمی تعلقات ہوگئے، بعد میں وہ رئیس ہائی اسکول بھیونڈی میں چلے گئے اب اور زیادہ تعلقات ہوگئے، وہ تقریباً تین سال یہاں رہے اور ۱۹۶۵ء میں قاہرہ واپس جانے لگے تو میں نے اپنی تازہ تصنیف ''عرب وہند عہد رسالت میں'' ان کو دے کر عربی میں ترجمہ کرنے کی خواہش ظاہر کی اور انھوں نے بخوشی اس کو منظور کرلیا

اور کچھ ہی مدت کے بعد عربی ترجمہ شائع ہوگیا، ایک ملاقات میں انھوں نے بتایا کہ مجمع البحوث الاسلامیہ میں کئی سو کتابیں قابل اشاعت تھیں، مگر ان میں سے صرف چھ کتاب کو فی الحال منتخب کیا گیا جس میں یہ کتاب بھی تھی، کیونکہ یہ اپنے موضوع پر بالکل نئی کتاب تھی اور اس میں ندرت بھی تھی۔

بعد میں ڈاکٹر عبد العزیز نے کراچی میں رہ کر وہاں کی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، ان کے میرے لڑکوں خالد کمال، سلمان مبشر اور مرحوم بھائی حیات النبی وغیرہ سے ذاتی اور نجی تعلقات ہوگئے تھے، عرب وافریقہ کے سفر میں قاہرہ میں آتے جاتے ان سے ملاقاتیں رہا کرتی تھیں، انھوں نے میری کتاب ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' کا بھی عربی میں ترجمہ کر کے ریاض سے شائع کیا ہے، نیز علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب ''عربوں کی جہاز رانی'' کا ترجمہ ''الملاحة عند العرب'' کے عنوان سے کیا ہے، بہت خلیق، شریف النفس اور علمی آدمی ہیں، میری کتاب ''تدوین وسیر ومغازی'' پر جامع ازہر کے مجلّہ ''الازھر'' میں بہترین تبصرہ کیا ہے، گاہے گاہے خط وکتابت رہتی ہے۔

شیخ صلاح ابو اسمٰعیل اور مصری قرّاء:۔ حکومت مصر کی جانب سے رمضان میں بمبئی میں مصری قرّاء و مجوّدین بھیجے جاتے تھے جو جمعیۃ علماء کے زیر اہتمام بمبئی وغیرہ کی مختلف مساجد میں تراویح کے بعد قرأت کا مظاہرہ کرتے تھے اور خطبہ بھی دیتے تھے، اور میں ان کا ترجمہ کیا کرتا تھا، پورے شہر اور اطراف میں ان کے ساتھ رہتا تھا، ان کی قیام گاہوں (ہوٹلوں) میں جاتا تھا، ان میں ایک جوان ازہری عالم وفاضل شیخ ابو اسمٰعیل تھے، جو زبردست عالم دین، نہایت پابند شرع اور نیک وصالح انسان تھے، ان سے میرے تعلقات خاص طور سے ہوگئے، وہ کئی سال تک آتے جاتے رہے اور میں ان کے ساتھ رہتا تھا، ایک مرتبہ آزاد میدان میں انھوں نے عید کا خطبہ دیا اور میں نے ترجمہ کیا، بعد میں ان سے خط وکتابت نہیں رہی، اور جب عرب وافریقہ کے سفر کے سلسلہ میں پہلی منزل ریاض میں پہونچا تو ایک مصری اخبار میں ان کی تصویر اور ان کا نہایت شاندار دینی مقالہ دیکھا اور یہ اس وقت مصری پارلیمنٹ کے ممبر ہیں، خیال ہوا کہ قاہرہ میں ان سے ملاقات ہوگی وہاں پہونچ کر ان کا پتہ معلوم کیا، مغرب کے بعد ان کے یہاں پہونچے،

خالد کمال ساتھ تھے، اس وقت ان کے یہاں کئی مصری علماء وفضلاء اور اعیان جمع تھے، ایک پکے عالم دین دوسرے پارلیمنٹ کے ممبر، صورت دیکھتے ہی مصریوں کے خاص انداز میں استقبال کیا اور باربار کہتے رہے: أين أراک، أين أراک أين بمبئی و أين القاهرہ ''پھر اپنے احباب سے تعارف کرایا اور خاطر تواضع کی، ان لوگوں میں ہندوستان و پاکستان کا تذکرہ آیا تو کہا کہ ہم لوگوں کا قول ہے: الاسلام فی الهند و المسلمون فی باکستان ''یعنی اسلام تو ہندوستان میں ہے اور مسلمان پاکستان میں ہیں، اس کے بعد سخت اصرار کرکے دوسرے دن رات میں نہویت پُرتکلف دعوت طعام سے نوازا، اور اسلامی اخلاق کے ساتھ مصری اخلاق کا مظاہرہ کرتے رہے، وہ خالص دینی عالم تھے، کہتے تھے کہ میں اپنے حلقہ انتخاب میں ہفتہ میں دودن وعظ کیلئے جاتا ہوں، آج وہاں جانے کی باری ہے، پارلیمنٹ میں میلاد النبی کے بارے میں نہایت تند وتیز تقریر کی تھی، اس کا تذکرہ باربار کرتے تھے اور حکومت پر تنقید کرتے تھے، وہ اخوانی تو نہیں تھے مگر ان کے ذہن ومزاج کے عالم تھے، مصری پارلیمنٹ میں ان کے علم وفضل اور تقویٰ کی وجہ سے بڑی دھاک بیٹھی تھی۔

ادارہ احیاء المعارف، مالیگاؤں (۱۹۶۰ء):- ۱۳۷۹ھ (۱۹۶۰ء) کے حدود میں مالیگاؤں میں ''ادارہ احیاء المعارف'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا، اس سے پہلے مولانا عبد الحمید نعمانیؒ نے معہد ملت کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا، وہ بمبئی میں اکثر آتے تھے اور میرے کمرے میں ''عثمان تاریخ کی روشنی'' نامی کتاب کی کتابت کرا رہے تھے، جو ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی ایک کتاب تھی، اس میں انحراف بھی تھا، اسی زمانہ میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ بمبئی زیادہ آتے جاتے تھے، معہد ملت کے افتتاح کیلئے میرے دوست استاذ اسمٰعیل مدحت استاذ المدرسۃ الکویتیہ بمبئی میری سفارش پر میرے ساتھ گئے، مولانا نعمانی چاہتے تھے کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی معہد ملت میں کچھ وقت دیں اور ایک اسکیم بنائی کہ ایک ادارہ مالیگاؤں میں قائم کرکے عربی کی نادر ونایاب کتب اور مخطوطات کی اشاعت کی جائے، تاکہ مولانا اعظمی وہاں آئیں جائیں، وہ مجھ سے باربار کہتے تھے کہ مولانا اعظمی کو تیار کرو، مولانا اعظمی سے بھی کہتے تھے، جب ان کا اصرار زیادہ ہوا تو مولانا اعظمی نے مجھ سے کہا کہ مالیگاؤں چلو ادارہ قائم کیا جائے،

چنانچہ ہم لوگ مالیگاؤں گئے، اس وقت معہد ملت کے اولیں مدرسین مولانا بشیر احمد صاحب مبارکپوری، مولانا محمد عثمان صاحب مبارکپوری اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی تھے، نیز مقامی اہل علم میں مولانا محمد عثمان، مولانا عبدالقادر، مولانا نعمانی، حاجی یحییٰ زبیر وغیرہ تھے، سب نے اس کیلئے کوشش کی، مالیات فراہم کئے اور عہدہ دار منتخب ہوئے، میں اس سلسلہ میں ایک ہفتہ تک مالیگاؤں میں ٹھہرا رہا اور ۱۳۸۰ھ (۱۹۶۰ء) میں اس ادارہ سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی تعلیق وتصحیح کے ساتھ پہلی کتاب ''إنتقاء'' (اختصار کتاب الترغیب والترہیب للمنذری، لابن حجر، م ۸۵۲ھ) عربی ٹائپ میں شائع کی گئی، اس درمیان مولانا نعمانی وغیرہ نے یہ اسکیم بنائی کہ باہر کے مدرسین کے بجائے مقامی مدرسین رکھے جائیں، اور مبارکپور وغیرہ کے مدرسین الگ کردئے گئے، یہ تجویز علاقائی عصبیت کے ماتحت تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ دوسری جگہ کے لوگ ہمارے یہاں آکر پڑھتے پڑھاتے ہیں، ہم کو چاہئے کہ اپنے لوگوں کو رکھیں، اور مقامی فارغین وعلماء ہی کام سنبھالیں، اس کا اثر دور نزدیک پڑنے لگا اور میں اس کا مخالف ہوگیا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ادارہ سے پہلی کتاب نکلی تو اس میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی، مولانا عبد الحمید نعمانی اور مولانا محمد عثمان صاحب مالیگانوی ہی ادارہ کے سب کچھ تھے، اور ان ہی کی جدوجہد سے یہ ادارہ قائم ہوا تھا، بہر حال اس کے بعد مولانا اعظمی کی تعلیق وتصحیح سے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی کتاب ''الزہد والرقائق'' ۱۳۸۵ھ (۱۹۶۶ء) میں شائع ہوئی، اس کے بعد نہ یہاں سے کوئی کتاب شائع ہوئی اور نہ ادارہ کا پتہ چلا، البتہ اس سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی علمی خدمت کا شہرہ ہوا، اور مجلس علمی ڈابھیل کی طرف سے شائع ہونے والی کتب احادیث کی تعلیق وتصحیح کی خدمت انجام دینے لگے، یہ اس ادارہ کی برکت تھی کہ مولانا اعظمی کا علمی مقام تسلیم کیا گیا ورنہ اس سے پہلے ان کے علم کا فیض ''نصرۃ الحدیث'' الاعلام المرفوعہ، رکعات تراویح اور بعض دیگر مختصر رسائل تک محدود تھا، جو مئو میں رہ کر مولانا کے قلم سے نکلے تھے۔

اہل بمبئی کی پیشکش اور میری بے رغبتی:۔ ''انقلاب'' اور ''البلاغ'' کی وجہ سے میرا تعارف شہرت کی حد تک ہر طبقہ میں ہوگیا، عوام خواص، امیر غریب، قدیم وجدید تعلیم یافتہ اور اہل سیاست سب ہی محبت بلکہ عقیدت کا مظاہرہ کرنے لگے، کیونکہ میں خدمت کے طور پر بے

لوٹ کام کرتا تھا، سیٹھوں اور مالداروں سے دور رہ کر اپنے علمی کاموں میں مصروف رہتا تھا۔

کئی بڑے لوگوں نے خواہش ظاہر کی میں ان کے یہاں آؤں جاؤں یا ان کو اور ان کے بچوں کو ٹیوشن کے طور پر تعلیم دوں، دوسروں سے کہلواتے تھے مگر میں اس کیلئے تیار نہیں ہوتا تھا، حالانکہ پیسہ کمانے کا خوب موقع تھا اور بہت سے مولوی ملا اس طرح کماتے تھے مگر میرا مقصد دولت کمانا نہیں تھا، بلکہ دولت کے شہر میں رہ کر علم دین کی خدمت تھا، البتہ ایک خاندان محمد احمد برادرس (احمد بھائی) سے اس قسم کا تعلق انجمن خدام النبی اور البلاغ کے ذریعہ پیدا ہوا اور ان حضرات نے میری ہر طرح قدر دانی کی اور میرے علمی کام کو آگے بڑھایا، ایک زمانہ میں احمد بھائی مجھ سے بار بار کہتے تھے کہ کوئی چھوٹی سی فیکٹری لگا لیں، فیکٹری ایریا تلاش کریں تا کہ اطمینان وسکون کے ساتھ کام کریں اور معاشی حالت اچھی رہے، ان کے اصرار پر میں بعض جگہ گیا بھی، مگر چونکہ رجحان نہیں تھا اس لئے بیٹھ گیا، حکیم اعظمی صاحب مجھ کو بار بار تاکید کرتے تھے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ اور احمد بھائی کی توجہ سے کوئی کارخانہ یا فیکٹری لگالو۔

بعض احباب خصوصاً ہمارے مخلص دوست قادری صاحب بار بار کہتے تھے کہ میں کمرے کا انتظام کر دیتا ہوں بال بچوں کو یہاں بلالیں مگر میں اس کیلئے تیار نہیں ہوا، کیونکہ بمبئی کی زندگی مجھے بالکل پسند نہیں تھی، میں تیس سال بمبئی میں رہا مگر اپنے کو بمبئی والا نہیں بنایا اور نہ کبھی وہاں مستقل قیام کا خیال ہوا۔

ایک زمانہ میں انجمن خدام النبی، مسافر خانہ، حج کمیٹی بحری جہاز اور ہوائی جہاز سب سے گہرا تعلق رہا اور ان کے ذمہ داروں سے بھی تعلق رہا، یاروں نے حج کی راہ سے خوب خوب کمایا لال پیلے نوٹ کا دھندا، بلیک، اسمگلنگ اور غیر ملکی کرنسی کے ذریعہ خوب کمایا، مگر الحمدللہ کہ میں نے اور میرے بھائی حیات النبی مرحوم نے اس قسم کا کام کبھی نہیں کیا۔

محمد علی زنیل علی رضا جوہریؒ:۔ دنیا کے مشہور احجار کریمہ (قیمتی پتھر) کے تاجر محمد علی زنیل علی رضا جوہریؒ دنیا کے مالدار ترین لوگوں میں سے تھے، پہلی بار حکیم اعظمی کے ساتھ ان کے آفس سیتارام بلڈنگ میں گیا، ان کا مزاج خالص عربی تھا، اور شاہانہ بھی، ان سے بعد میں بہت زیادہ تعلق ہو گیا، وہ بڑے قدردان تھے، لوگ ان سے سلام کرنے کو فخر سمجھتے تھے، جب میں جاتا تو

بہت خیال کرتے تھے، اور خصوصی توجہ سے بات چیت کرتے تھے، مدرسۃ الفلاح کے نام سے مکہ مکرمہ اور جدہ کی طرح بمبئی میں انھوں نے مدرسۃ الفلاح جاری کیا تھا، استاد احمد فرید صاحب کے ذریعہ مجھ سے کہلوایا کہ میں ان کے مدرسہ میں تعلیم دوں اور بچوں کو پڑھاؤں، اس سلطانی پیشکش پر میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے معذوری ظاہر کی، حالانکہ اس تعلق سے میں بڑی دولت کما سکتا تھا، ان کے یہاں کے معمولی معمولی ملازمین لکھ پتی ہو گئے تھے، وہ ان کو علاج کیلئے غیر ممالک بھیجتے تھے۔

شام کے صدر شکری قوالتلی سرکاری دورہ پر ہندوستان آئے تھے، بمبئی آئے تو محمد علی جوہری صاحب نے ان کی شاندار دعوت کا انتظام کیا اور ان کو عربی میں ایڈریس پیش کیا، اس کو لکھنے کیلئے مجھے بلایا اور گیارہ بجے دن سے گیارہ بجے رات تک ایک جملہ کیلئے روکے رکھا، بڑی محبت اور پیار سے روکا جبراً نہیں، بس وہ جملہ ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا، آخر دس بجے رات میں ان کو تسلی ہوئی تو کھانے کیلئے اپنے مکان لے گئے، موٹر میں لے کر چلے دو چار ملازمین ساتھ تھے، راستہ میں اتر کر ایک مشہور ہوٹل سے بریانی وغیرہ لیتے، راستہ میں گاڑی روک کر فروٹ لیتے تھے اور فوراً آس پاس کے پولیس اور عوام ان کو گھیر لیتے تھے، بہرحال کسی طرح گھر پہونچے اور دسترخوان بچھوایا، ساتھ کھانے بیٹھے اور اپنے سامنے سے مختلف قسم کی چیزیں میرے سامنے کرتے رہے، اسی درمیان ان کی بلّی آ گئی تو اس کے کھلانے میں مصروف ہو گئے، بہت دیر تک باتیں کرتے رہے، ان میں یہ بات بھی تھی کہ ہم لوگ خالص عرب ہیں مگر چونکہ جواہرات کی تجارت کے سلسلہ میں ہمارا خاندان ایک مدت تک ایران میں مقیم رہا اس لئے یہ نام مشہور ہوا۔

انھوں نے شاہ سعود کی دعوت کی تھی، شاہ حسین وغیرہ کی بھی دعوت کی تھی، ہر دعوت میں میرے نام دعوت نامہ بھیجا کرتے تھے۔

فلم والوں کی پیشکش:۔ میری شہرت فلمی دنیا تک ہو گئی اور وہ لوگ بھی تعلق پیدا کرنے کی ترکیب سوچتے تھے، ایک مرتبہ دفتر ''انقلاب'' میں فلم والے آئے اور کہا کہ فلاں فلم کی کہانی کا خلاصہ عربی میں کر دیں، پہلے تو میں نے کہا کہ فلم بنیٔ عوام کا مشغلہ ہے اس لئے عربی عامی ہونی چاہئے اور نئی زبان میں اس کا ترجمہ ہونا چاہئے اور میں پرانی عربی جانتا ہوں، اس جواب پر وہ

لوگ چلے گئے، مگر دوسرے دن آکر کہنے لگے کہ پرانی عربی ہی میں ترجمہ کردیں، اس پر میں نے کہا کہ میں نے عربی دین کی خدمت اوراس پر عمل کرنے کیلئے حاصل کی، فواحش ومنکرات پھیلانے کیلئے نہیں سیکھی ہے، اور وہ مایوس ہوکر چلے گئے۔

ایک مرتبہ فلم والے دفتر میں آئے اور کہنے لگے کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں اور شوٹنگ میں پانچ منٹ حاجی ملنگ کے بارے میں تقریر کردیں، میں نے کہا کہ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ہوں، بمبئی اور اطراف کے بزرگوں کے بارے کچھ نہ کچھ معلومات ہین مگران کے بارے میں آج تک کچھ نہیں ملا ہے، میں غلط سلط بات کیسے کہدوں اور پھر فلم کے پردے پر پانچ منٹ کے لئے آکر اپنا سب کچھ کھودوں، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔

اسلم لکھنوی انقلاب میں انگریزی خبروں کے مترجم تھے، باندرہ میں رہتے تھے، انھوں نے ایک فلم ایکٹرس کا جو بوڑھی ہوکر نماز وتلاوت میں رہا کرتی تھی، سلام پہونچایا اوراس کا پیغام دیا کہ قاضی صاحب بہت بڑے عالم ہیں اور بڑے باشعور ہیں، وہ ہر جمعہ کو ہمارے یہاں آکر دینی باتیں بتادیا کریں تو ان کی مہربانی ہوگی، میں نے برجستہ کہا کہ اس سے کہہ دینا کہ اگر تم قاضی صاحب کو اتنا بڑا عالم سمجھتی ہو تو پھر یہ کیوں نہیں سمجھتی کہ ایسا عالم گانے بجانے والی عورت کے پاس آئے گا، جاکر اس سے یہی کہہ دینا،

ایک مرتبہ کیفی اعظمی صاحب مشہور مغنی اور اداکار محمد رفیع کو انجمن ہائی اسکول لے کر آئے اور مجھ سے کہا کہ ان کیلئے قرآن شریف کی ایسی صورتوں اور آیتوں کا ترجمہ کردیجئے جس میں انسانی مساوات اور یکجہتی کا بیان ہوتا کہ یہ صبح کو ریڈیو پراس کی تلاوت کریں اور ترجمہ سنائیں تاکہ مسلمان صبح کو ریڈیو کھولیں تو پہلے قرآن شریف سنیں، میں نے کہا کہ اچھا اب ہم مولویوں کا فریضہ فلم اور ریڈیو والے انجام دیں گے تو ہم لوگ کیا کریں گے؟ اس کو کیفی اعظمی اور محمد رفیع نے مذاق سمجھا، پھر میں نے بتایا کہ تجوید وقرأت ایک مستقل فن ہے، موسیقی اور غناء دوسرا فن ہے، اس لئے پہلے رفیع صاحب باندرہ میں مولانا قاری سید افتخار احمد صاحب کے یہاں قرأت کی مشق کرلیں پھر یہ کام کریں، اس پر وہ لوگ چلے گئے، کچھ دنوں کے بعد قاری سید افتخار احمد صاحب ملے تو انھوں نے کہا کہ کیفی اعظمی اور رفیع میرے پاس آئے تھے اور آپ کی بات نقل کررہے تھے،

میں نے ان کو بتادیا کہ اس چکر میں نہ پڑیں، قاری صاحب سے فلم والے بہت مانوس رہا کرتے تھے، جمعہ کی نماز ان کی امامت مین پڑھتے تھے اوران کا وعظ سنا کرتے تھے۔

دائرۃ المطبوعات والنشر کویت (۱۹۶۰ء):۔ استاذ احمد فرید یمانی مرحوم کے پاس دولت کویت کے سلسلہ دائرۃ المطبوعات والنشر کی پہلی کتاب ''الذخائر والتحف'' آئی، میں نے ان سے مطالعہ کیلئے لیا، انھوں نے میرے شوق کا احترام کرتے ہوئے مجھے ہدیہ کردیا، اس کے بعد ۳۰/اکتوبر ۱۹۶۰ء کو میں نے دائرۃ کے مدیر کو خط لکھ کر اس کی مطبوعات کی خواہش ظاہر کی اور ''الذخائر والتحف'' کا حوالہ دیا، تقریباً چار ماہ کے بعد مجھے جواب دیا اور اب تک کی یہ مطبوعات بحری ڈاک سے روانہ کیں، جو مجھ کو ۱۲/جنوری ۱۹۶۱ء کو وصول ہوئیں، (۱)''الذخائر والتحف'' قاضی رشید (۲) الاصول فی اللغۃ، انباری (۳) العبر فی خبر مَن غبر جلد اول، اس کے بعد خط وکتابت اور کتابوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا بلکہ انھوں نے اس ادارہ کا مجھے علمی مشیر بنالیا، یہ ادارہ وزارۃ الارشادو الانباء کے ماتحت ''التراث العربی'' کے عنوان سے جاری تھا۔

امام ذھبیؒ کی العبر فی خبر مَن غبر کا ایک ذیل خود ذھبی نے لکھا تھا، اوران کے ذیل پر ایک ذیل ۷۴۱ھ سے ۷۶۴ھ تک ابوالمحاسن محمد بن علی بن حسن، شمس الدین حسینی م ۷۶۵ھ نے لکھا تھا، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ عارف حکمت مدینہ منورہ میں تھا جس کو میں نے ۱۹۵۵ء پہلے حج وزیارت کے موقع پر دیکھا تھا اور دائرۃ المطبوعات والنشر کو اس کی اطلاع کی، اس کا ایک نسخہ ترکی مین تھا، دونوں نسخوں کی مدد سے ذھبی اور حسینی کے دونوں کے ذیل الگ کتابی شکل میں وہیں سے شائع ہوئے، دائرۃ سے کتابوں کے آنے کا سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ میں بمبئی کم رہنے لگا اور بعض کتابیں واپس چلی گئیں تو یہ سلسلہ ختم ہوگیا، آخر میں ''تاج العروس'' کی ابتدائی جلدیں آئیں، ان میں بھی بعض میری عدم موجودگی کی وجہ سے بعض حصے واپس چلے گئے۔

امیر کویت عبداللہ السالم الصباح:۔ امیر کویت کی دو بلڈنگیں بمبئی کے مغربی ساحل سمندر پر الصباح کوٹ اور الجابریہ کوٹ تھیں جن میں اس کے حاکم وامیر عبداللہ السالم الصباح آتے رہتے تھے اور قیام کرتے تھے، میں نے استاذ احمد فرید مرحوم کے ساتھ شعبان ۱۳۸۵ھ

(۲۵؍نومبر ۱۹۶۵ء) میں کئی بار ان سے ملاقات کی تھی، وہ بڑے تپاک اور محبت سے ملتے تھے، ایک مرتبہ رجال السند والہند ہدیہ کیا تو دیکھ کر کہا کہ یہ ابن خلکان کے انداز کی کتاب ہے، پھر پوچھا کہ کبھی کویت گئے ہیں یا نہیں؟ میں نے نفی میں جواب دیا اور کہا کہ وہاں کے دائرۃ المطبوعات والنشر سے میرا علمی تعلق ہے اور وہاں کی تمام مطبوعات میرے پاس ہدیۃً آتی ہیں۔

استاذ سعید رمضان اخوانی:۔ ایک مرتبہ اخوان المسلمین کے سرگرم اور فعال رکن ''المسلون'' جنیوا کے اڈیٹر استاذ سعید رمضان بمبئی آئے، اسلامی جم خانہ چوپاٹی پر ان کو عشائیہ دیا گیا جس میں انھوں نے مسئلہ فلسطین کے بارے میں بتایا کہ ابتداء میں ہمارے عرب دیہاتی ڈنڈے مار مار کر یہودیوں کو ارض مقدس سے بھگا سکتے تھے مگر ہمارے حکمرانون نے نہ خود کچھ کیا اور نہ ہم کو کچھ کرنے دیا، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ جمال عبد الناصر اخوان المسلمین کے خاص ممبروں میں سے تھے، اور وہ ہمارے تمام پروگراموں اور تحریکی سرگرمیوں سے واقف تھے، ایک رات وہ اخوان المسلمین کی میٹنگ میں شریک ہوئے اور صبح کو اخوان المسلمین کی گرفتاری اور غارت گری کا سلسلہ جاری کر دیا۔

مصطفیٰ احمد سباعی:۔ اس دوران شام کے مشہور عالم و محقق اور ''السنۃ و مکانتھا فی التشریع الاسلامی'' کے مصنف بمبئی آئے اور انجمن خدام النبی میں ان کا استقبال کیا گیا اور انھوں نے خطبہ دیا، تقریر کی۔

جمال عبد الناصر اور قونصل عام عبد المنعم النجار:۔ الجمہوریہ العربیہ المتحدہ مصر کے صدر جمال عبد الناصر ۱۳۷۹ھ (۱۹۶۰ء) میں ہندوستان کے سرکاری دورے پر آئے اور ۱۲؍شوال ۱۳۷۹ھ، ۹؍اپریل ۱۹۶۰ء کو جمعیۃ علماء صوبہ بمبئی کے وفد کے ساتھ گورنر ہاؤس میں ان سے ملاقات کی، رجال السند والہند اور دیوان احمد پیش کیا، میں اور وہ برابر برابر بیٹھے تھے، باتیں کرتے رہے، اس وقت جمہوریہ عربیہ متحدہ مصر کے قونصل استاذ عبد المنعم النجار تھے جن سے میرا گہرا تعلق تھا، اور مصری قراء کی بمبئی آمد پر میرا ان سے تعاون ان کو معلوم تھا، یوں بھی کبھی کبھی مصری قونصل خانہ میں ان سے ملاقات کیلئے جایا تا تھا، انھوں نے رئیس جمال عبد الناصر کی آمد پر یادگار کے طور پر قرآن کریم مع تفسیر صفوۃ البیان فی معانی القرآن مصنفہ شیخ حسنین مخلوف مفتی الدیار

المصر یہ ہدیہ کی اور شیخ القراء عبدالباسط کی قرأت سے پورا مسجل قرآن دیا، اور بار بار تقاضا کیا کہ اپنے دونوں لڑکوں خالد کمال اور ظفر مسعود میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو میں جامع ازہر میں داخل کرادوں، اس موقع سے فائدہ اٹھائیے، سفارتی سطح کی یہ تجویز بہت وزنی ہے اور فوراً داخلہ ہوجائے گا، مگر میں اس کیلئے تیار نہیں ہوا، کیونکہ جامع ازہر کے بارے میں معلوم تھا کہ وہاں کے تعلیم یافتہ حد سے زیادہ متنور اور آزاد خیال ہوجاتے ہیں، اس وقت کے ازہریوں کا یہی حال تھا، اس کے چند دن کے بعد استاذ عبدالمنعم النجار ہانگ کانگ کے سفیر بن کر چلے گئے۔

مدرسہ کویتیہ اور استاذ مدحت اسمٰعیل:۔ چرچ گیٹ اسٹیشن کے قریب اسی کالج کے سامنے ایک عمارت میں مدرسہ کویتیہ جاری تھا جس میں بمبئی کے عربوں کے بچے بچیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں، ایک مصری استاذ مدحت اسمٰعیل دوسرے محمد ثابت اس کے معلم تھے، مغرب کے وقت باذوق عرب وہاں جمع ہوکر تبادلہ خیالات کرتے تھے اور چائے کا دور چلتا تھا، عربی اخبارات بھی آتے تھے، ایک زمانہ میں میں بھی اکثر مغرب کی نماز وہیں پڑھتا تھا، ۱۹۵۶ء میں اسرائیل، برطانیہ اور فرانس نے نہر سویز پر مل کر حملہ کردیا جس میں ان کی فوجوں کی پسپائی ہوگئی، اس سلسلہ میں مسلمانان بمبئی ایک عظیم الشان جلسہ مستان تالاب پر ہوا، استاذ اور مدحت اسمٰعیل نے عربی میں بڑی ولولہ انگیز تقریر کی، میں نے اس کا ترجمہ اسی انداز میں کیا، وہ چند جملے بول کر خاموش ہوجاتے تھے اور جب میں اس کا ترجمہ کرلیتا تھا تو پھر بولتے تھے، اس رات بمبئی کے عوام نے مدحت اسماعیل اور میرے ساتھ بے پناہ عقیدت اور محبت کا مظاہرہ کیا، عوام وخواص ہم لوگوں پر سلام و مصافحہ کے لئے ٹوٹے پڑتے تھے، اعظم گڈھ والے الگ اپنے علاقے کے عالم پر فخر کرتے تھے، یہ جلسہ بہت ہی جذباتی قسم کا تھا، بمبئی والے یوں بھی وقتی جوش دکھانے میں مشہور ہیں۔

مصر کا مرکز ثقافی بمبئی میں:۔ جمال عبدالناصر کے دورۂ ہندوستان کے بعد بمبئی میں حکومت مصر کی طرف سے ایک مرکز ثقافی جھانسی کیسل میں قائم ہوا، عظیم الشان لائبریری جاری ہوئی، اخبارات ورسائل آنے لگے، اور متعدد مصری عہدیدار اور ملازم رکھے گئے۔ کتابوں کی وجہ سے میں اکثر وہاں جایا کرتا تھا اور تمام عملہ سے اچھا خاصا تعارف ہوگیا تھا۔

مصریوں کا جھگڑا:۔ اس زمانہ میں یمن کی زیدی حکومت اور مصر کی حکومت کے درمیان باہمی تعاون تھا، اس وقت یمن کے زیدی حاکم غالباً امام حمید الدین تھے، انھوں نے ایک طویل قصیدہ اسلامی محاسن ومفاخر کے بارے میں لکھا اور اس میں کچھ سیاسی باتیں بھی جمال عبد الناصر کے نزدیک قابل اعتراض تھیں اور انھوں نے اس بنا پر یمن کی زیدی حکومت سے تعلق ختم کر کے نہایت سخت رویہ اختیار کیا، اس پر میں نے انقلاب میں امام یمن کی طرفداری میں سخت قسم کا نوٹ لکھا جس پر مدرسہ کویتیہ اور مرکز ثقافی کے بعض ارکان میرے خلاف سخت سست باتیں کرنے لگے اور معاملہ شدت اختیار کر گیا، نیز مرکز ثقافی کے ملازمین آپس میں لڑنے لگے اور ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی کرنے لگے، ایک طبقہ نے مجھسے کہا کہ ہم آپ کو مصر بھیجتے ہیں تاکہ آپ وہاں کے ذمہ داروں سے ان جھگڑوں کی صحیح نوعیت بیان کر دیں، مگر میں مصریوں کے باہمی جھگڑے میں نہیں پڑا، نتیجہ ہوا کہ مصریوں کی لڑائی میں ''مرکز ثقافی'' بند ہو گیا اور اسکی تمام کتابیں تتر بتر ہو گئیں، بہت کم واپس جاسکیں۔

قضیۂ تصاویر:۔ اس مرکز میں سیرت نبوی پر ایک کتاب بچوں کے لئے محمد برانق کی بہت مفید اور سہل زبان میں بیس پچیس چھوٹے بڑے اجزاء میں باتصویر تھی، اس میں مغربی تقلید میں جگہ جگہ انبیاء وعلی مرتضیٰ کہ رسول اللہ ﷺ، حضرت زینب اور بعض دوسرے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی قلمی تصویریں تھیں، اور ان کے نیچے ان کے نام تھے، اس زمانہ میں ہندوستان میں رسول اللہ ﷺ کی تصویر پر سخت احتجاج ہوتا تھا، جو غیر مسلم اخبارات دانستہ یا نادانستہ طور پر چھاپتے تھے، میں اس سلسلہ میں کتاب کو لایا اور دیکھ کر سخت اضطراب ہوا کہ اگر غیر مسلم اس کو دیکھ لیں گے تو ان کو دلیل مل جائے اور قبۃ الاسلام قاہرہ اور جامع ازہر سے نکلی ہوئی اس کتاب میں ان لوگوں کی تصویریں ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں اور عالموں کو جوابدہی میں بہرحال دقت ہوگی اور یہ بات ہو یا نہ ہو، اسلام کی تصویر حرام ہے، پھر حضرات انبیاء وصحابہ کی تصویر چھاپنا بڑی جرأت کی بات ہے، اس لئے میں نے انقلاب میں ان تصویروں کی نشاندہی کر کے سخت قسم کا مضمون لکھا اس سے پہلے میری مخالفت میں بعض مصری پیش پیش تھے، یمن کے قضیہ کی وجہ سے، اب ان کو اور بھی طیش آیا اور میرے مضمون کے جواب میں عربی میں مضمون لکھا جس کا ترجمہ میں نے خود کر کے انقلاب

میں شائع کیا اور اس کا جواب الجواب لکھا، بات بہت بڑھ گئی، بعض لوگ مجھے ڈراتے تھے کہ ہندوستان اور مصر کے تعلقات جواہر لال اور جمال عبد الناصر کی حکمت عملی سے نہایت خوشگوار ہیں، ان پر آپ کی تحریر سے برا اثر پڑسکتا ہے اور حکومت ہند آپ کے خلاف کارروائی کرسکتی ہے، آخر استاذ عبد العزیز عزت درمیان میں پڑے اور مصری قونصل خانہ کے قنصل ممدوح عزت نے مجھے بلایا اور بڑے ادب واحترام سے بات چیت کی، اور کہا کہ اپنے اعتراضات مجھے دیں، میں ان کو مجمع البحوث الاسلامیہ کے پاس بھیج کر جواب طلب کروں گا، چنانچہ انھوں نے میرے اعتراضات کا ترجمہ کرا کے قاہرہ بھیجا اور کئی مہینے کے بعد وہاں سے طول طویل جواب عربی اور انگریزی میں آیا، جس میں مختلف قسم کی تاویل کے باوجود یہ اقرار کیا گیا کہ آئندہ ان تصویروں کے نیچے نام نہیں لکھے جائیں گے، میں نے ان کا یہ جواب انقلاب اور البلاغ دونوں میں شائع کر دیا، اور معاملہ رفع دفع ہوا۔

ریاست جنجیرہ کی تاریخ:۔ عالمگیر بادشاہ کے زمانہ میں کوکن کے پہاڑی ساحل پر ریاست جنجیرہ کا قیام ہوا، سلاطین احمد نگر کے ہر عامل یہاں کے دنڈا تاج ہوری کے قلعہ میں رہتے تھے جو ساحل سمندر کے تھوڑی دوری پر ایک بستی کی شکل میں ہے، میں اس میں گیا ہوں، یہ جزیرہ تھا جو مقامی کوکنی زبان میں جنجیرہ ہو گیا، جب شیوا جی نے حملہ کیا تو اندر فوجوں نے مقابلہ کرکے پسپا کر دیا، یہاں کا امیر اور فوج سیدی تھے، یعنی وہ حبشی جو سلاطین گجرات کے زمانہ میں یہاں فوج وغیرہ میں تھے اور آباد ہو گئے تھے، ان کی دو ریاستیں بعد میں ہوئیں، ایک گجرات میں ''سچین''، معمولی سی، اور دوسری جزیرہ حبشاں (جزیرہ، جنجیرہ) تھا، سیدیوں نے اس قلعہ پر قبضہ کرکے عالمگیر کی مدد کی اور اور باقی تین تعلقے یہ تھے، قلابہ، مہسلہ، مروڈ، میں نے اس ریاست کی تاریخ کیلئے کافی مواد جمع کر لیا تھا، بعد میں ایک عزیز عبد الشکور قادری ام، اے نے طلب کیا میں مرتب کروں گا مگر وہ مرتب نہ کرسکے اور نہ مسودات مجھے دے سکے، البتہ رسالہ ''صبح امید'' کے اڈیٹر عبد الحمید بوہرے نے میرا ایک مضمون اپنی کتاب ''تاریخ قوم کوکنی'' میں شامل کیا۔

عبد الحمید بوہرے:۔ عبد الحمید بوہرے ادیب تھے، مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے، دور ہی دیکھ کر پکار اٹھتے ''بیا بیا برادر تو زخاصگان مائی'' (آجاؤ بھائی! تم تو میرے خاص لوگوں میں سے ہو)

کبھی کبھی میں ان کے یہاں جایا کرتا تھا، پنویل کے رہنے والے تھے۔

زاہد شوکت علی:۔ اس زمانہ میں خلافت ھاؤس اور اخبار خلافت پر مولانا شوکت صاحب کے صاحبزادے زاہد صاحب قابض تھے، بڑے باپ کے بڑے بیٹے تھے، حکومت کے ارکان ان کا لحاظ کیا کرتے تھے، مگر کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

روزنامہ ہندوستان کے مدیر و مالک آورز و صاحب رامپوری بھی بڑے خلوص ومحبت سے ملتے تھے، وہ کچھ عربیت سے واقف تھے، اس لئے کبھی کبھی اس کا اظہار کیا کرتے تھے۔

وجد حیدر آبادی:۔ مشہور شاعر علی سکندر وجد حیدر آبادی اورنگ آبادی سے مکتبہ جامعہ میں ملاقات ہوا کرتی تھی، وہ کسی زمانہ میں کلکٹر رہ چکے تھے، عثمانیہ یونیورسٹی میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے شاگرد رہ چکے تھے، اس لئے مولویوں سے تعلق رکھتے تھے، ''اجنتا'' ان کی مشہور نظم ہے سید اشفاق حسین (اکسپریس بلاک) کے یہاں بھی ان سے ملاقات ہوتی تھی۔

سید اشفاق حسین:۔ سید اشفاق حسین صاحب کے بچوں کو میں ہفتہ میں ایک دن تعلیم دیتا تھا ،سید آصف حسین، سید خالد حسین میرے تلامذہ میں ہیں اور خصوصی تعلق رکھتے ہیں، مدرسہ حجازیہ میں تعاون بھی کرتے ہیں۔

مولانا شہاب مہر مالیر کوٹلوی:۔ جناب مولانا شہاب مہر مالیر کوٹلہ کے، بمبئی کے کسی اسکول میں فارسی کے مدرس رہ چکے تھے، غالبًا باقاعدہ عالم نہیں تھے، مدت دراز سے بمبئی میں رہتے تھے اور وہاں کے جدید حلقوں میں کافی شہرت رکھتے تھے، پہلے قادیانی تھے، بمبئی سے کوئی رسالہ بھی جاری کیا تھا، آخر میں غالبًا اہلحدیث ہوگئے تھے اور ان کے ایک آدمی سے معلوم ہوا کہ وہ بہائی فرقہ سے متعلق ہوگئے تھے، آخر وقت تک ہدایت سے محروم رہے، الٹی سیدھی باتیں کرتے تھے، مجھ سے بڑے انشراح سے پیش آتے تھے اور میرے مضامین انقلاب ومعارف وغیرہ میں پڑھتے تھے، جب مولانا عبدالماجد دریابادیؒ میری کتاب پر تبصرہ کرتے تو شہاب صاحب دور ہی سے مبارکباد دیتے اور کہتے تھے کہ مولوی عبدالماجد قلم کے بہت بخیل ہیں، مگر آپ کے بارے میں بہت سخی ہیں، آپ کی فلاں کتاب کی خوب خوب تعریف کی ہے۔

معین الدین حارث جامعی:۔ روزنامہ اجمل کے مدیر و مالک جناب معین الدین حارث

جامعی سوشلسٹ پارٹی میں تھے، متشرع، نماز روزہ کے پابند، آخر میں حج کمیٹی کے چیرمین تھے، دینی جلسوں میں شریک ہوتے تھے، اچھے مقرر تھے اور اصول کے بیحد پابند تھے اس لئے کسی کو ان سے کسی قسم کا فائدہ نہیں ہوسکا اور اپنی دینداری، پابندی اور اصول پرستی کی انتہا کی وجہ سے عوام وخواص میں مشہور تو ہوئے مگر مقبول نہیں ہو سکے، اتنی خشکی بھی اچھی نہیں ہے۔

علامہ احمد شبیلی:۔ علامہ احمد شُبیلی کا نام زمانہ طالب علمی میں مولانا عبد الشکور لکھنوی اور مولانا نثار احمد کانپوری کے مابین بمبئی میں علم غیب کے موضوع پر سنا تھا وہ حکم تھے، بمبئی گیا تو ان سے بار بار ملاقات ہوتی تھی، وہ بعض مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور ''صبح امید'' میں معمولی قصے کہانی لکھا کرتے تھے، وہ سلطان مسقط کے معتمد کی حیثیت سے تھے، اسی علاقہ کے رہنے والے تھے، مگر اردو میں شاعری اور مضمون نگاری کرتے تھے، ان میں زیادہ پڑھے لکھے آدمی شان نہیں تھی، مسلک کے اعتبار سے خارجی ہونا چاہئے تھا، عربی ادب سے بھی زیادہ تعلق نہیں تھا، وہ بمبئی کے علامہ تھے۔

سلطان مسقط سعید تیمور:۔ انگریزوں نے سلطان مسقط سعید تیمور صاحب کو معزول کر کے بمبئی میں رکھا تھا، معمولی سا وظیفہ تھا، سفید شیروانی، پائجامہ کرتہ پہنتے تھے، بعض اوقات استاذ احمد فرید کے یہاں آتے تھے اور وہ سو دوسو روپیہ دیدیا کرتے تھے، میں نے ان سے کہا کہ آپ اردو کیوں نہیں سیکھ لیتے ہیں، تو انھوں نے علامہ احمد شبیلی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ نہیں سکھاتے ہیں، بمبئی میں انتقال کیا، ایک سلطان کو فقیر بنتے میں نے دیکھا ہے، رحم آتا تھا۔

امیر قطر ہندوستان میں:۔ امیر قطر ہندوستان کے سرکاری دورہ پر آئے، بمبئی میں انجمن خدام النبی کے اراکین نے ان کے استقبال میں مسافر خانہ کے سامنے ایک عظیم الشان جلسہ کیا جس میں امیر قطر نے جوابی تقریر کی، میں نے ان کی تقریر کا ترجمہ کیا اور ان کا شکریہ ادا کیا، دوسرے دن ان کی قیامگاہ پر محترم احمد بھائی وغیرہ ملاقات کیلئے گئے، دیر تک بات ہوتی رہی، وہ نادر ونایاب کتابوں کو خریدنا چاہتے تھے، احمد بھائی نے سورۂ یٰسین شریف کا وہ نسخہ پیش کیا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا اس میں موجود ہے، اور اس سے عکس لے کر گزشتہ صدی میں ایک روسی عالم نے بعینہٖ اس کو چھاپا تھا، انھوں نے قیمت معلوم کی تو احمد بھائی نے شاہی حساب

سے اس کی قیمت بتائی اور انھوں نے لینے سے انکار کر دیا تھا، اس سورہ شریف پر میرا مستقل مقالہ معارف میں چھپ چکا ہے، امیر قطر نے غالباً بیس ہزار روپیہ مسافر خانہ کو عطیہ دیا تھا۔

شاہ حسین والی اردن:۔ شاہ حسین والی اردن بمبئی آئے، جناب محمد علی زنیل علی رضا صاحب نے کوشاہی انداز کی دعوت دی، میرے پاس بھی دعوت نامہ بھیجا مگر میں اس میں شریک نہیں ہوا، کیونکہ شاہ حسین کے اعزاز میں انڈ وعرب سوسائٹی کی طرف سے رقص وسرود کا پروگرام ہوا تھا، اس سے مجھے انقباض تھا۔

رضا شاہ پہلوی:۔ اسی طرح شاہ ایران رضا شاہ پہلوی بمبئی آئے، جناب محمد علی زنیل علی رضا صاحب نے ان کی بھی شاندار دعوت کی، اور مجھے بھی دعوت نامہ بھیجا مگر میں اس میں بھی شریک نہیں ہوا، کیونکہ اس کی آمد پر تین دن کیلئے بمبئی میں شراب بندی ختم کر دی گئی تھی۔

شاہ افغانستان:۔ شاہ افغانستان کی آمد پر کیسر باغ میں استقبالی جلسہ ہوا، میں بھی اس میں شریک تھا، وہ مغربی لباس میں معمولی حیثیت کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔

شکری قوا تلی صدر شام:۔ شکری قواتلی صدر شام کا استقبالیہ جلسہ بھی اسی باغ میں ہوا تھا، بمبئی کے گورنر شری پرکاش رائے (بنارس والے) نے تقریر میں کہا کہ ہم آپ کا استقبال ایسے شہر میں کر رہے ہیں جس کا بجٹ آپ کے ملک شام سے زیادہ ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق مدراسی اور مولانا عبدالوہاب بخاری:۔ ایک دن دفتر ''انقلاب'' میں ڈاکٹر عبدالحق مدراسی اور مولانا عبدالوہاب بخاری پرنسپل نیو کالج مدراس تشریف لائے، کسی دینی ادارہ کے لئے مالیات کی فراہمی کے سلسلہ میں نوٹ لکھانا تھا، میں نے لکھا، ان حضرات سے پہلی ملاقات تھی، یہ ۱۹۵۶ء سے پہلے کی بات ہے، اس کے بعد وقتاً فوقتاً ان دونوں حضرات سے ملاقات ہوتی رہی، ڈاکٹر صاحب اکثر بمبئی تشریف لایا کرتے تھے یونیورسٹی کے کام سے، انجمن خدام النبی اور ابنائے مولوی غلام رسول سورتی کے یہاں اکثر ملاقات ہوتی تھی، ۱۹۶۵ء کے سفر حج میں بحری جہاز میں ہفتوں ساتھ رہا، علمی باتیں ہوتی رہیں، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مدراس آؤ میرے کتب خانہ سے استفادہ کرو، جہاز میں میری تقریر ہوتی تھی، یہ حضرات دوسرے مدراسی علماء واعیان کے ساتھ رہا کرتے تھے، دونوں حضرات خورد نوازی اور شفقت سے پیش آتے تھے،

ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے بھی بمبئی میں ملے جنھوں نے ایک انگریز عورت کو مسلمان کرکے اس سے شادی کرلی تھی۔

مولانا محمد یوسف کوکنی عمری مدراسی:۔ مولانا محمد یوسف کوکنی عمری سے بمبئی میں اکثر ملاقات ہوتی تھی، وہ بمبئی یونیورسٹی میں آیا کرتے تھے، بعد میں ان سے بہت تعلق پیدا ہوگیا تھا، مدراس حاضری کے وقت ان کے یہاں بھی حاضری ہوئی، انھوں نے اپنی تصانیف پیش کی، وہ دارالمصنفین اعظم گڈھ میں رہ چکے تھے، یہیں امام ابن تیمیہ نامی کتاب لکھی تھی، جسے مجھے عنایت کیا، ان کو اعظم گڈھ کے ساتھ خاص محبت تھی، بعد میں اس کی انتظامیہ کے رکن تھے، اور کمیٹی میں آیا کرتے تھے، اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ میرے یہاں مبارکپور بھی آئے تھے۔

مولانا عبدالباری حاوی:۔ مولانا عبدالباری حاوی مدراس کے مشہور اہل علم میں سے تھے، ان سے بمبئی ملاقاتیں ہوتی تھیں اور خاص تعلق ہوگیا تھا، عربی کے ادیب وشاعر تھے، حجاز وحج سے خاص تعلق تھا، ان کے صاحبزادے مولوی عبدالباقی سلمہٗ ہیں، مدراس میں ان کے یہاں قیام رہا،

مولانا صبغۃ اللہ بختیاری مدراسی:۔ حج میں جہاز پر مولانا صبغۃ اللہ بختیاری مدراسی سے ملاقات ہوئی، وہ پہلے جماعت اسلامی کے سرگرم رکن تھے بعد میں الگ ہوگئے، علمی اور روحانی عالم ہیں، بڑے دلچسپ مجذوب قسم کے ہیں، ''معہدِ احسانی'' کے نام سے کٹر تا مدراس میں ادارہ قائم کیا ہے، بعد میں ان سے ملاقات ہوتی رہتی ہے، بڑی محبت وخلوص سے بات کرتے ہیں، مجھ کو ''ابوذر غفاری'' سے تشبیہ دیتے ہیں، کہا کرتے تھے کہ مولویوں کے ''ھمز ولمز'' سے اللہ بچائے، ان کے ہم درس وہم عصر احباب ان سے تفریح کرتے تھے۔

(قاضی صاحب کی غیر مطبوعہ خودنوشت سوانح ''کاروانِ حیات'' یہیں پر ختم ہوجاتی ہے، اب آگے کے حالات ہم مطبوعہ خودنوشت سوانح ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' کے تکملہ ''فراغت کے بعد کا علمی سلسلۂ حیات'' سے نقل کررہے ہیں۔ مدیر)

تیس سال سے زائد مدت تک بمبئی میں مستقلاً قیام رہا اور جس شہر میں علامہ شبلی مرحوم ''کنار آب چوپاٹی وگل گشت اپالو'' کی سیر کرکے غزل کہا کرتے تھے، ان کے ایک ہم وطن نے

ایک معمولی سے کمرے میں ''مرکزِ علمی'' کا بورڈ لگا کر تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری و مقالہ نویسی کا دورِ شباب گذارا، میں نے بڑے بڑے عقیدتمندوں کی عقیدت اور بڑی بڑی پیشکش کرنے والوں کی پیشکش کا شکریہ ادا کر کے شہر کی چمک دمک میں کھو جانے کے مقابلہ میں بوریہ نشینی کو ترجیح دی، میرے بہی خواہ اور مخلص بزرگ واحباب اس معاملہ میں مجھے احمق سمجھتے تھے اور میں کم از کم اس بارے میں اپنے کو عقلمند سمجھتا تھا بلکہ اب بھی سمجھتا ہوں۔

بمبئی غریب پرور ہونے کے ساتھ علم کُش شہر ہے، جس کا احساس مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی تھا، اس لئے میں نے دولت و ثروت کے اس ''اندرونِ قعرِ دریا'' میں تیس سال سے زائد ''تختہ بند'' ہونے کے باوجود اپنے دامن علم کو تر نہیں ہونے دیا، اور مختلف قسم کی مصروفیات کے باوجود عرب و ہند کے ابتدائی چار سو سالہ تعلقات پر عربی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھ کر ایک بڑے خلا کو پُر کیا، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ نے ''خلافت عباسیہ اور ہندوستان'' کے پیش لفظ میں تحریر فرمایا کہ ''اس میں شک نہیں کہ قاضی صاحب اس بے آب و گیاہ صحرا میں تنہا چلے، اور جب لوٹے تو باغ و بہار کا ایک پورا قافلہ اپنے ساتھ لائے'' اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں، (اسکے بعد اس دوران شائع شدہ کتابوں کا تذکرہ ہے، ان کا ذکر دوسرے کسی مضمون میں مستقلاً آئے گا، اور بعض کا ذکر تفصیل سے اسی میں آچکا ہے، اس کے آگے قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔)

دینی و علمی اسفار:۔ اپنے کاموں میں انہماک کی وجہ سے اِدھر اُدھر آنے جانے سے بچنے کے باوجود اندرونِ ملک کے مختلف شہر اور مقامات کا بہت سفر ہوا، غیر ملکی سفر کی ابتداء حج و زیارت کے مبارک سفر سے ہوئی، اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پانچ بار حج و زیارت اور عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی، پہلا حج ۱۳۷۵ھ میں، دوسرا حج ۱۳۸۵ھ میں تیسرا حج ۱۳۹۳ھ میں، چوتھا حج ۱۳۹۷ھ میں، اور پانچواں حج ۱۴۰۲ھ میں کیا، اب کے بار امیر الحج بنایا گیا تھا، چوتھے حج ۱۳۹۷ھ (۱۹۷۶ء) کے بعد عزیزم خالد کمال سلمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بلاد عرب وافریقہ کا چھ ماہ تک ذاتی سفر کیا، اور جن مقامات میں گیا وہاں کے اہل علم اور کتب خانوں سے استفادہ کرتا رہا اس سفر میں سعودی عرب میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، جدہ، طائف، الخبر، دمّام، ریاض، اور درعیّہ گیا، دمام سے ریاض تک ریل سے سفر کیا، یہاں سے کویت گئے جو ملک بھی ہے اور شہر بھی، قیام

مرکز دعوت الارشاد میں تھا، امیر کویت کے انتقال کی وجہ سے عام بندی تھی، بعض اہل علم سے ملاقات ہوئی اور بعض کتب خانوں میں جانا ہوا، ادارۂ التراث العربی میں نہیں جاسکا جس کا مین مشیر علمی تھا۔ دودن کے بعد دمشق گئے مگر وہاں کے حکام نے ہوائی اڈہ سے باہر نہیں جانے دیا، اور شام سے مصر کیلئے روانہ ہوگئے، وہاں قاہرہ کے میدان عتبہ میں کرنک ہوٹل میں کئی دن قیام رہا، جامع ازہر اور وہاں کے علماء، اساتذہ اور تلامذہ سے ملاقاتیں رہیں، قاہرہ سے متصل فسطاط اور جیزہ کے علاوہ حلوان اور اسکندریہ بھی جانا ہوا، پورا شہر قاہرہ دار العلم اور دار الکتب معلوم ہوتا تھا، متحف قبطی (قبطی عجائب خانہ) کی کئی منزلہ شاندار عمارت مین فراعنۂ مصر کے مجسمے، ان کے استعمالی سامان اور حنوط کی ہوئی ان کی لاشیں رکھی ہوئی ہیں، اوپر کی منزل میں چودہ فرعونوں کی لاشیں صندوقوں میں قطار سے پڑی ہوئی ہیں جن میں فرعونِ موسیٰ کی لاش بھی ہے، اہرام اور ابوالہول عبرت گاہ ہیں۔ فسطاط کی جامع عمرو بن عاصؓ میں نماز پڑھی، اس کے ایک گوشہ میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا مزار لکڑی کے حظیرے میں ہے، اسی علاقہ میں امام شافعیؒ کا بھی مزار ہے، کشتی میں بیٹھ کر دریائے نیل پار کیا، مصر سے گھانا (مغربی افریقہ) کا سفر ہوا جہاں عزیز مولوی خالد کمال دار الافتاء کی طرف سے مبعوث تھے، اس کے دار الحکومت ''اکرا'' میں کئی ماہ قیام رہا اور وہاں کی بام یونیورسٹی کی لائبریری کے شعبۂ عربی سے خوب خوب استفادہ کیا، امام سمعانیؒ کی کتاب ''الاملاء والاستملاء'' نقل کی، ابن حوقل کی کتاب ''صورالارض'' ابن اخوہ کی کتاب ''معالم القربۃ فی احکام الحسبۃ'' وغیرہ سے اقتباسات نقل کئے، علمائے اندلس کی کئی کتابوں کے عکسی فوٹو کی زیارت کی، مشہور ماہر بحریات ماجد نجدی کی متعدد کتابیں یہاں موجود ہیں، کوماسی، کیپ، کوسٹ، تمالے اور شمالی علاقوں کا ہفتوں تک دورہ کیا، اسی سے متصل ٹوجو (لومی) کی سیاحت کی، واپس قاہرہ آکر رجال السند والہند کی طباعت کا معاملہ دار الانصار سے طے کیا، ہوٹل لوسکی میں کئی دن قیام رہا، طبقات المفسرین داؤدی، کتاب البرہان والعمیان جاحظ، اور بعض دوسری کتابیں خریدیں، قاہرہ میں الاستاذ عبدالمنعم النمر، شیخ صلاح ابو اسمٰعیل مصری اور ڈاکٹر عبد العزیز عزت سے بار بار ملنا جلنا ہوتا تھا، اکثر وقت جامع ازہر کے اداروں اور کتب خانوں میں گذرتا تھا، قاہرہ سے اردن کیلئے روانہ ہوئے، دار السلطنت عمان پہاڑون کے نشیب وفراز

میں آباد ہے، یہاں خندق ابراہیم میں قیام رہا، یہاں سے ملک شام کیلئے کوشش کی مگر ناکامی رہی، حکومت اردن کی اجازت سے بیت المقدس میں حاضری کا ارادہ کیا اور ارضِ محتلہ میں داخل ہوگئے، مگر اسرائیل نے واپس کردیا، اردن یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جات کے اساتذہ سے ملاقات ہوئی، ادارۂ شئون اسلامیہ واوقاف نے اپنی مطبوعات دیں، ایک دن زرقاء جانا ہوا، وہاں کوئی مسجد نظر نہیں آئی اور کئی گرجے دیکھے، اردن میں رومیوں کے قدیم مدرج اور آثار بہت زیادہ ہیں، عجائب خانہ میں اموی خلفاء وامراء کے لباس اور استعمالی ظروف موجود ہیں۔

یہاں سے بذریعہ ٹیکسی سعودی عرب کیلئے روانہ ہوئے، راستہ میں معان، قلعہ کرک وغیرہ آئے، عصر اور مغرب کے درمیان مقامِ حجر سے گذرے جو قومِ ثمود کا مسکن تھا، سلسلہ کوہ دور تک چلا گیا ہے۔

درمیان میں سڑک ہے پہاڑوں میں قومِ ثمود کے مساکن کے آثار نظر آتے تھے، رمالِ متحرکہ جگہ جگہ تودے کی شکل میں تھے، سرشام سعودی عرب کی سرحد حالۃ عمار سے گذرے، تبوک سے دوسری ٹیکسی پر چلے، رات میں مقام العلاء سے گذرے جو بارونق شہر ہے، اس علاقہ کو کتابوں میں ''قریٰ عربیہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے، خیبر سے گذرتے ہوئے مدینہ منورہ پہونچے، دو چار دن قیام کرکے مکہ مکرمہ اور وہاں سے جدّہ آئے، استاد عبدالقدوس انصاری مرحوم مدیر مجلّہ ''المنہل'' نے اپنی جملہ تصانیف ہدیہ میں عنایت کیں، ریاض پہونچ کر فندق التاج الجدید میں دارالافتاء کی طرف سے قیام ہوا، مؤرخ الجزیرہ استاد احمد الجاسر نے دارالیمامہ کی مطبوعات ومنشورات ہدیۃً دیں، دارعبدالعزیز کے مدیر محترم نے اس کی مطبوعات پیش کیں، اور فضیلۃ الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے اپنی تصانیف ومطبوعات کا ایک معتد بہ حصہ عنایت فرمایا، وہاں کے بعض کتب خانوں سے استفادہ کیا۔

ریاض سے کراچی آئے، مکتبہ عارفین جاکر اپنی کتابیں طلب کیں جن کو انھوں نے چھاپا تھا تو دونوں کتاب کا ایک ایک نسخہ دیا جس پر ''حق تصنیف'' لکھا تھا، مجھے یہ دیکھ کر طیش آیا اور اس تحریر کو کٹوایا، دو دن وہاں رہ کر لاہور آئے، مگر میرے دور کا لاہور مجھ کو نہیں ملا، گرمی سخت تھی دوسرے دن دہلی آگئے۔

مارچ ۱۹۸۴ء میں تنظیم فکر ونظر سکھر کی دعوت پر ہندوستان کے ایک علمی وفد کے ساتھ سندھی ادبی میلہ کے اجلاس میں شرکت ہوئی اور جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم صدر پاکستان کی زیر صدارت جلسہ ہوا، جس میں صدرِ محترم کے ہاتھوں سندھ کی روایتی ٹوپی اور تنظیم فکر ونظر کا اعزازی نشان دیا گیا، اور ان کے حکم سے ارکان وفد کو سرکاری مہمان کی حیثیت سے دورہ کرایا گیا، اس سلسلہ میں کراچی، ٹھٹھ، دیبل، لاہور، اسلام آباد، ٹیکسلا، پشاور، بلوچستان، کوئٹہ، لاڑکانہ، موہن جوداڑو (مون جودرو یعنی موت کا ٹیلہ) سکھر، اڑورہ، نواب شاہ اور حیدرآباد وغیرہ کی سیاحت کی، اڑورہ (جس کو عربی تاریخوں میں الُور لکھتے ہیں) کراچی اور ٹھٹھ کے درمیان دیبل دونوں کے کھنڈروں میں حضرت محمد بن قاسمؒ کی مسجد کی جگہ نمایاں تھی دونوں مقام پر دو دو رکعت نماز پڑھی، اس بار بھی لاہور جانے کے باوجود اپنی قیام گاہ اور اخبار ''زمزم'' کا آفس نہ پا سکا۔

۱۴۰۰ھ میں اسلام آباد میں تیسری عالمی قرآن کانفرنس اور سرکاری سیرت کانفرنس میں شرکت ہوئی، دونوں کانفرنس میں جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم شریک تھے، ان سے بار بار ملاقات ہوتی تھی، مرحوم سے جو شخص ایک بار ملتا تھا محسوس کرتا تھا کہ وہ اس سے خاص تعلق رکھتے ہیں، یہ مرحوم کے اخلاق کی خوبی تھی، میں بھی یہی محسوس کرتا تھا، انھوں نے مجھے ایک نہایت قیمتی لیمپ، عمدہ کشمیری مصلیٰ اور ایک حمائل شریف ہدیہ دیا ہے، ان سے خصوصی مجلسوں میں بار بار ملاقات ہوتی رہی،

اگست ۱۹۸۶ء میں تنظیم فکر ونظر سندھ نے میری کتابیں چھاپیں اور ان کے رسمِ اجراء میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مجھے دعوت دی، وزیر اعلیٰ سندھ سید غوث علی شاہ کی صدارت مین تاج محل ہوٹل کراچی میں نہایت شاندار جلسہ ہوا، جس میں پاکستان کے مشہور ماہر قانون جناب خالد ایم اسحاق، پروفیسر سراج منیر مرحوم، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، پروفیسر ذیشان خٹک، چانسلر گومل یونیورسٹی پشاور، ماہر سندھیات ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، پروفیسر ایاز کراچی یونیورسٹی وغیرہ نے ان کتابوں اور اس کے مصنف کے بارے میں اپنے بہترین خیالات کا اظہار کیا، اسی سلسلہ کا دوسرا جلسہ تنظیم فکر ونظر کے صدر مقام سکھر میں ہوا جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت ہوئی

جن اداروں سے تعلق تھا یا اب بھی باقی ہے:۔ جن علمی اداروں سے پہلے تعلق رہا ہے

اوران میں رہ کر مفوضہ خدمت انجام دی ہے، وہ یہ ہیں، معتمد انجمن تعمیرات ادب مُزنگ لاہور، مشیر علمی ادارہ التراث العربی کویت، صدر جمعیۃ علماء مہاراشٹر بمبئی، صدر دینی تعلیمی بورڈ مہاراشٹر، رکن انجمن خدام النبی بمبئی، رکن رویت ہلال کمیٹی جامع مسجد بمبئی، اور فی الحال رکن تاسیسی آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، مشرف شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند، اعزازی رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ، اعزازی مدیر ''برہان'' دہلی، رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم تاج المساجد بھوپال، رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، رکن مجلس شوریٰ جامعہ اشرفیہ نیا بھوجپور (بہار)

حکومت کی قدر شناسی:۔ ۱۵/اگست ۱۹۸۴ء کو صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے عربی زبان اور علمی شغف پر توصیفی سند، کشمیری چادر اور پانچ ہزار روپئے سالانہ تاحیات پیش کش ہوئی، ۱۹۸۸ء سے یہ رقم دس ہزار ہوگئی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نجمِ منور قاضی اطہر مبارکپوری

۱۹۹۶ء

بقلم عبید محمد عثمان صاحب معروفیؒ

۱۴۱۷ھ

مورخ اسلام الحاج مولا نا عبدالحفیظ صاحب قاضی اطہر مبارکپوری، محلّہ حیدر آباد قصبہ مبارکپور ضلع اعظم گڈھ میں ۴؍رجب ۱۳۳۴ھ ۷؍مئی ۱۹۱۶ء بروز یکشنبہ صبح پانچ بجے پیدا ہوئے۔آپ کے نانا مولانا احمد حسین رسولپوری متوفی ۱۳۵۹ھ نے عبدالحفیظ نام رکھا۔مگر قاضی اطہر سے مشہور ہوئے۔اطہر آپ کا تخلص ہے، جوانی میں کچھ دنوں خوب شاعری کی، برجستہ اشعار کہتے تھے، پھر شاعری چھوڑ دی۔قاضی اسلئے کہے جاتے ہیں کہ آپ کے خاندان میں ایک عرصہ تک نیابتِ قضا کا عہدہ قائم رہا۔

خاندان

قاضی اطہر بن الحاج الشیخ محمد حسن متوفی ۱۳۹۸ھ ابن الحاج الشیخ لعل محمد بن الشیخ محمد رجب بن الشیخ محمد رضا بن الشیخ امام بخش بن الشیخ علی الشہیدؒ شیخ علی کے اوپر کا حال نہیں ملتا البتہ شیخ محمد رجب سے شیخ علی شہید تک چار پشت نائب قاضی ہونے کا ثبوت موجود ہے۔ان نائب قاضیوں کا ایک ایک حلقہ متعین ہوتا تھا، اپنے اپنے حلقہ میں اقامت وامامت جمعہ وعیدین، پیش آمدہ وقتی مسائل، نکاح، طلاق، وراثت، اختلاف بین المسلین کے قضایا وغیرہ کی انجام دہی نائب قاضیوں کے ذمہ ہوتی تھی، نائب قاضیوں کو سندیں اور احکامات قاضی القضاۃ کی طرف سے بھیجے جاتے تھے۔

دارالقضاۃ

انگریزوں کے آخری دور میں محکمہ قضاء ایک اعزازی محکمہ تھا۔اس اطراف میں محمد آباد گوہنہ

دارالقضاء تھا، یہاں کے قاضی القضاۃ قاضی محمد سلیم بن محمد عطا جعفری مچھلی شہری متوفی ۱۲۶۶ھ، ربیع الآخر ۱۲۵۰ھ سے سولہ برس تک قاضی رہے، اعظم گڈھ مسجد دلال گھاٹ کے سامنے احاطہ میں ان کی قبر ہے، قاضی محمد سلیم سے پہلے قاضی محمد رؤف اور ان کے بعد قاضی محمد شاہ عالم محمد آباد گوہنہ کے قاضی رہے۔ ان تینوں قاضیوں کا زمانہ، قاضی اطہر صاحب کے جد اعلیٰ شیخ امام بخش کو ملا اور تینوں کی سند قضاء ان کو ملی، راقم الحروف نے قاضی محمد سلیم اور قاضی شاہ عالم کی سندیں قاضی اطہر صاحب کے مکان پر دیکھی ہیں۔ اسی طرح مولانا محمد طاہر صاحب معروفی بھی اپنے حلقہ میں قاضی محمد سلیم کے نائب القاضی تھے، قاضی سلیم کی ایک تحریر بنام مولانا محمد طاہر نائب القاضی ۱۷؍ربیع الآخر ۱۲۵۸ھ کی آپ کے خاندان میں محفوظ ہے۔ شیخ امام بخش نائب القاضی کا مکان راجہ مبارک شاہ کی مسجد سے متصل تھا، اس جامع مسجد کے امام بھی آپ ہی تھے۔

قصبہ مبارکپور

اس قصبہ کا نام پہلے قاسم آباد تھا، راجہ سید حامد شاہ مانک پوری شیخ حسام الدین مانک پوری متوفی ۸۵۳ھ کے خلیفہ تھے اور شاہان شرقیہ کے دور میں جونپور آکر رہنے لگے تھے۔ انھیں کی اولاد میں راجہ مبارک شاہ بن راجہ سید احمد شاہ بن راجہ سید نور شاہ بن راجہ سید حامد شاہ مانک پوریؒ دسویں صدی ہجری شہنشاہ ہمایوں کے دور ۹۳۷ھ تا ۹۶۳ھ میں یہاں آکر قاسم آباد کے کھنڈروں پر اپنے نام سے مبارک پور قصبہ کی نئی تعمیر کی اپنے ہمراہ کڑا مانک پور سے ایک علمی، دینی اور روحانی خانوادہ کو لاکر مبارک پور میں بسایا جو قصبہ اور اطراف میں دینی امور کا معتمد و متولی بنا اور نیابت قضا کے منصب پر نسلاً بعد نسل فائز رہا، اسی علمی خانوادہ کے ایک روشن چراغ قاضی اطہر صاحب مبارکپوری تھے۔ اس خانوادہ کو راجہ مبارک شاہ اپنا جانشین مقرر کر کے کڑا مانک پور چلے گئے وہیں ۲؍شوال ۹۶۵ھ فوت ہوئے۔

(تذکرہ علماء مبارکپور۔ ماہنامہ البلاغ بمبئی شوال ۱۳۸۸ھ)

ننھیال

قاضی جی کی والدہ کا نام حمیدہ بنت مولانا احمد حسین رسولپوریؒ ہے بڑی پابند صوم وصلوٰۃ تھیں، محلّہ کے بچوں کو پڑھاتی تھیں بچوں کو دینی کتابیں پڑھ کر سناتیں۔ قاضی جی کا دینی مزاج

بنانے میں ان کو بڑا دخل تھا، ۱۳۵۲ھ میں فوت ہوئیں، جب قاضی جی اٹھارہ برس کے تھے، آپ کی اسی سالہ نانی رحیمہ بنت حافظ نظام الدین سریانویؒ بڑی عابدہ زاہدہ پابند اوراد و وظائف، پچاس برس تک اپنے مکان کو لوجہ اللہ مدرسہ بنا کر گاؤں بھر کے بچے بچیوں کو قرآن کریم اور کتب دینیہ کی تعلیم دیتی رہیں۔ ۲۶؍رمضان ۱۳۷۸ھ میں فوت ہوئیں۔ انھوں نے بھی قاضی جی کو دودھ پلایا تھا اور انتہائی محبت سے تربیت کی تھی۔ آپ کے نانا حکیم الحاج مولانا احمد حسین بن عبدالرحیم رسولپوریؒ ۱۲۸۸ھ میں پیدا ہوئے۔ جملہ علوم وفنون میں ماہر، عربی ادب کے صاحب دیوان شاعر، اعلیٰ مدرس و مفتی، بہترین مصنف، طبیب حاذق، عمدہ دواساز اور جلد ساز، زہد وتقویٰ کا نمونہ، ہمہ وقت کتب بینی یا کسی دوسرے عمل میں مصروف، ڈھاکہ میں طویل عرصہ تک صدارت تدریس کے منصب پر فائز، ہر ایک خط کے اعلیٰ خطاط وخوشنویس، یتیموں کے مربی، ۲۶؍رجب ۱۳۵۹ھ میں رحلت کی اس وقت قاضی جی پچیس برس کے تھے، آپ نے نانا سے اوران کی کتابوں سے بہت فیض حاصل کیا۔ آپ کے ماموں مولانا محمد یحییٰ بن مولانا احمد حسین رسولپوریؒ ۱۳۲۸ھ میں پیدا ہوئے، راقم کے استاد تھے، عربی ادب کے ماہر اور اچھے شاعر، جامع المنقول والمعقول ذی استعداد عالم، خاندانی طبیب حاذق، علم ہیئت وفلکیات کے امام، صاحب تصنیف وتالیف، مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور، پھر احیاء العلوم مبارکپور کے علیا کے استاد، نہایت سلیقہ شعار، بہترین جلد ساز، مستخرج دائمی اوقات صلوٰۃ، احیاء العلوم ہی میں بمرض سل ۱۱؍صفر ۱۳۸۷ھ کو فوت ہوئے۔ ''مولانا محمد یحییٰ مدرس امجد جامعہ احیاء العلوم مبارکپور'' سے احقر نے تاریخ رحلت برآمد کی ہے، قاضی جی نے اپنے ماموں کی مشفقانہ ومربیانہ توجہات سے بھی بہت استفادہ کیا ہے۔ آپ کے نانا کے بڑے بھائی حکیم الحاج المفتی مولانا عبدالعلیم بن عبدالرحیم متوفی ۱۳۴۱ھ صدر مدرس چشمۂ رحمت غازی پوری، طبیب حاذق، اعلیٰ درجہ کے خطاط، خود اعتماد، زبردست عالم دین، عظیم مصنف، صاحب فتاویٰ، مناظر جلیل۔ آپ کے لڑکے حکیم مفتی مولانا محمد شعیب ۱۳۰۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۸۵ھ میں رحلت کی چشمۂ رحمت غازی پور میں ۴۵؍برس مدرس، صدر مدرس اور مفتی شہر رہے، آپ کے تلامذہ میں مولانا عبیداللہ بلیاوی متوفی ۱۴۰۹ھ معتمد جماعت تبلیغ تھے، دوسرے لڑکے حکیم مولوی عبدالمجید بن مولانا عبدالعلیم متوفی ۱۳۸۳ھ بڑے ذاکر وشاغل تھے۔ تیسرے لڑکے مولانا عبدالباقی ایڈوکیٹ بن مولانا عبدالعلیم اعظم گڈھ

میں وکالت کرتے رہے، ۱۹۴۷ء کے پہلے الیکشن میں ایم، ایل، اے ہوئے، وکالت پر مولویت غالب رہی قاضی جی کو ایسا علمی و دینی نانہال ملا تھا، وہ خود لکھتے ہیں کہ درحقیقت میرا علمی سرمایہ نانہال کی دین ہے اور وہیں سے میں نے یہ دولت پائی ہے۔

تعلیم

قرآن کریم کی ابتدائی تعلیم گھر پر والدین سے پائی پھر مدرسہ احیاء العلوم میں منشی اخلاق احمد متوفی ۱۴۰۴ھ سے ریاضی پڑھی۔ کبوتر بازی کی وجہ سے ناغہ کرنے لگے تو والد محترم نے خوب مارا اور گھسیٹ کر مدرسہ لے گئے پھر باقاعدہ مدرسہ جانے لگے اور ایسا شوق ہوا کہ اردو کتابیں تلاش کر کے جمع کرنے لگے، مولانا نعمت اللہ مبارکپوریؒ متوفی ۱۳۶۲ھ فارسی پڑھی۔ اور نسخ و نستعلیق خطاطی سیکھی، مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب مبارکپوری متوفیٰ ۱۴۰۴ھ سے عربی کی اکثر کتابیں پڑھیں۔ مولانا شکر اللہ صاحب مبارکپوری متوفیٰ ۱۳۶۱ھ سے منطق و فلسفہ کی کئی کتابیں پڑھیں منطق کی بعض کتابیں مولانا بشیر احمد مبارکپوری متوفیٰ ۱۴۰۴ھ سے پڑھیں مولانا محمد عمر صاحب مبارکپوری متوفیٰ ۱۴۱۵ھ سے جلالین وغیرہ پڑھی اور ماموں مولانا محمد یحییٰ رسولپوری متوفیٰ ۱۳۸۷ھ سے عروض وقوانی اور ہیئت کے بعض اسباق پڑھے، نحو میر اور علم الصیغہ پڑھنے کے بعد قوت مطالعہ سے جمعہ کا خطبہ سمجھنے لگے، مقامات حریری پڑھنے کے بعد ایسی نظر پیدا ہوئی کہ درسی و غیر درسی کتابیں سمجھ میں آنے لگیں، آپ شرائطِ دورہ تک تمام کتابیں احیاء العلوم مبارکپور میں پڑھیں، ہمہ وقت درسی و غیر درسی کتب کے مطالعہ میں مصروف رہتے، پڑھنے کے وقت بعض کتابیں طلبہ کو پڑھانے بھی لگے تھے، ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد میں جا کر دورۂ حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔ بخاری شریف، ابوداؤد، ابن ماجہ، مولانا سید فخر الدین احمد صاحب متوفیٰ ۱۳۹۲ھ (۱۹۷۲ء) سے ترمذی مولانا سید محمد میاں صاحب متوفی ۱۳۹۵ھ ۱۹۷۵ء سے اور مسلم شریف مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلیؒ سے پڑھی۔ ۱۳۵۴ھ میں بھی صرف دو ماہ جامعہ قاسمیہ میں آپ رہے، اس وقت مولانا سید محمد میاں صاحب سے دیوان حماسہ باب اول اور مقامات زمخشری پڑھی ان کے خلوص و توجہ نے بڑی حوصلہ مندی اور ہمت افزائی کی۔

شاعری

آپ ایک قادرالکلام شاعر تھے اور برجستہ گو تھے، شاعری میں کوئی استاد نہ تھا، طلب علم ہی کے زمانہ میں آپ کی نظمیں ''الفرقان'' بریلی ۱۳۵۷ھ رسالہ ''قائد'' مرادآباد ۱۳۵۷ھ میں شائع ہونے لگیں، بعد میں لاہور کے اخبار ''زمزم'' اخبار ''مسلمان'' اخبار ''کوثر'' وغیرہ میں بکثرت اشعار چھپے اور یہی بسلسلہ صحافت امرتسر لاہور اور بمبئی لے جانے کے سبب بنے، شاہنامہ کے طرز پر اصحاب صفہ کے نام سے ایک منظوم رسالہ ۲۲۵ اشعار پر مشتمل لکھا جسے ۱۳۵۹ھ میں شباب کمپنی بمبئی نے طبع کرنے کیلئے لیا مگر گم ہوگیا، بعد میں جب حالات نے آپ کو صحافی اور مصنف بنادیا تو شاعری ترک کردی۔

مضمون نگاری

ابتدائی عربی درجہ میں ابھی پڑھ رہے تھے کہ مضمون نگاری شروع کردی، پہلا مضمون بعنوان ''مساوات'' رسالہ ''مومن'' بدایوں ۱۳۵۳ھ میں طبع ہوا۔ احیاء العلوم میں جمعیۃ الطلبہ قائم ہوئی جس کا ماہوار قلمی رسالہ ''الاحیاء'' جاری ہوا، اس کے مدیر آپ بنائے گئے۔ انجمن میں مختلف علوم وفنون کی کتابیں اور علمی وادبی رسائل واخبارات منگائے گئے ان سب کا بالاستیعاب آپ نے مطالعہ کیا، پھر کئی مضامین رسالہ ''پیام تعلیم'' دہلی، اخبار الجمعیۃ دھلی، رسالہ ''مومن'' بدایوں، ہفتہ وار ''العدل'' گوجرانوالہ، پنجاب میں چھپے، پھر مستقلاً رسالہ ''قائد'' مرادآباد میں چھپنے لگے ایک بار مضمون نگار کا نام مولانا قاضی عبدالحفیظ صاحب اطہر مبارکپوری فاضل دیوبند لکھ کر آیا تو آپ نے جواباً لکھا کہ میں ابھی طالب علم ہوں۔ ہدایہ وغیرہ پڑھتا ہوں، بعد میں آپ کے مضامین ملک کے معیاری مجلّات ورسائل ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڈھ ''برھان'' دہلی، ماہنامہ ''دارالعلوم'' دیوبند وغیرہ میں چھپنے لگے یہاں تک کہ بعض رسائل کی مجلس ادارت میں آپ شامل کرلئے گئے، ماہنامہ ''البلاغ'' بمبئی کے عرصہ دراز تک مدیر تحریر رہے اخیر عمر میں آپ کی زیر سرپرستی ماہنامہ ''انوارالعلوم'' جہاناگنج جنوری ۱۹۹۶ء سے جاری ہوا۔

صحافت

صحافت اور اخبار نویسی میں آپ کی عمر کا بیشتر حصہ صرف ہوا۔ اس سلسلہ میں پہلے امرتسر گئے

پھر لاہور جا کر اخبار ''زمزم'' کے کالموں کو مزین کیا، تقسیم ہند کے بعد لاہور چھوڑنا پڑا تو بہرائچ جا کر ''انصار'' میں کام کیا۔ اس کے بعد بمبئی گئے تو اخبار ''انقلاب'' کے کالموں کو سجایا اور ماہنامہ ''البلاغ'' کی ادارت سنبھالی اور اخیر میں شیخ الہند اکیڈمی دیوبند کے نگراں مقرر ہوئے اس اکیڈمی سے آپ کی چند کتابیں شائع ہوئیں۔ صحافت کے دوران کسی نہ کسی درجہ میں تدریسی و تصنیفی مشغلہ بھی جاری رکھا۔

تدریس

ابھی آپ عربی درجات میں پڑھ رہے تھے کہ طلبہ کو بعض کتابوں کا درس دینے لگے، فراغت کو بعد احیاء العلوم مبارکپور میں درس دیا۔ یہیں احقر نے ۱۳۶۶ھ میں آپ سے مقامات حریری پڑھی، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں کچھ دنوں تک استاذ الادب والتاریخ تھے جبکہ وہاں شیخ الحدیث مولانا عبد الجبار صاحب معروفی متوفی ۱۴۰۹ھ اور مولانا اسلام الحق صاحب کوپاگنجی، متوفی ۱۳۹۲ھ بھی مدرس تھے۔ ممبئی میں بھی آپ نے تدریسی خدمات انجام دیں۔ دیوبند میں سال میں چند مرتبہ، دو، دو ہفتہ کیلئے جاتے تھے تو طلبۂ دارالعلوم آپ سے کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے، احقر محرم ۱۴۱۱ھ میں دیوبند گیا تو مہمان خانہ کے ایک کمرہ میں طلبہ کو پڑھاتے ہوئے دیکھا، درس و تدریس میں آپ روحانی سکون پاتے تھے۔ مبارک پور میں الجامعۃ الحجازیہ قائم کیا جس کے بانی و مہتمم آپ ہی تھے۔

وعظ و خطابت

اصلاحی تحریکات، دینی اجلاس، سیاسی اسٹیج اور مدارس اسلامیہ کے جلسوں میں سیر حاصل تقریریں کیا کرتے تھے۔ جلدی جلدی بولتے تھے۔ آواز بھی پست تھی اس لئے بعض الفاظ دب جاتے تھے۔ مگر بیان مؤثر اور دلنشیں ہوتا تھا، تقسیم سے پہلے جمعیۃ العلماء کے اسٹیج سے انگریزوں کے خلاف بہت گرم تقریریں کیا کرتے تھے۔

تصنیف و تالیف

ا۔ تصنیفی و تالیفی کارنامے نے آپ کی شہرت ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ عالم اسلام میں پھیلا دی۔ آپ کے علمی مقام کی بلندیوں کی طرف سر اٹھانے میں بڑے بڑے اہل علم کی ٹوپیاں گر

جاتی ہیں، متعلمی کے دور ہی میں آپ نے پانچ کتابیں لکھیں، فراغت کے چار سال پہلے ۱۳۵۵ھ میں سب سے پہلی کتاب عربی زبان میں قصیدہ بانت سعاد کی شرح **خیر الزادفی شرح بانت سعاد** لکھی، جو غیر مطبوعہ آپ کے کتب خانہ میں ہے۔

۲۔ دوسری کتاب بھی عربی میں **مرآۃ العلم** نامی لکھی جو غیر مطبوعہ موجود ہے۔

۳۔ ائمہ اربعہ کے نام سے ایک مختصر جامع کتاب لکھی جسے شائع کرنے کیلئے سلطان کمپنی ممبئی نے لیا پھر اس کا مالک پاکستان چلا گیا۔ اس کا مسودہ بھی گم ہو گیا۔ بعد میں اسے دوبارہ لکھا جسے شیخ الہند اکیڈمی نے شائع کیا۔

۴۔ صحابیات کے سبق آموز واقعات **الصالحات** کے نام سے مرتب کیا، ملک دین محمد کشمیری بازار لاہور کو چھاپنے کو دیا۔ اسکا مسودہ بھی گم ہو گیا۔

۵۔ اصحاب صفہ کے نام سے ایک منظوم کتاب لکھی، شباب کمپنی ممبئی نے اسے بھی ضائع کر دیا، یہ پانچ کتابیں پڑھنے کے زمانہ میں لکھیں۔

۶۔ **رجال السند والهند** (عربی)

۷۔ **العقد الثمین فی فتوح الهند ومن وردفیها من الصحابة والتابعین** (عربی)

۸۔ شرح وتعلیق **جواهر الاصول فی علم حدیث الرسول** (عربی)

۹۔ **الهند فی عهد العباسین** (عربی)

۱۰۔ عرب و ہند عہد رسالت میں، اس کا عربی میں ترجمہ کر کے **العرب والهند فی عهد الرسالة** کے نام سے مصر کے مشہور عالم عبدالعزیز عبدالجلیل عزت نے شائع کیا۔

۱۱۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ڈاکٹر عبدالعزیز عزت مصری نے اس کا بھی عربی میں ترجمہ کر کے **الحكومات العربية في الهند** کے نام سے طبع کیا ۶، ۷، ۸، ۹ کتابیں بھی مصر میں طبع ہو کر عالم اسلام، اور بلاد یورپ میں پہونچیں۔

۱۲۔ اسلامی ہند کی عظمت رفتہ

۱۳۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۴۔ خلافت بنی امیہ اور ہندوستان

۱۵۔ مآثر و معارف
۱۶۔ تعلیمی و تبلیغی سرگرمیاں عہد سلف میں
۱۷۔ علی و حسین
۱۸۔ اسلامی نظام زندگی
۱۹۔ مسلمان
۲۰۔ طبقات الحجاج
۲۱۔ حج کے بعد
۲۲۔ معارف القرآن
۲۳۔ افادات حسن بصریؒ
۲۴۔ تذکرۂ علماء مبارک پور
۲۵۔ ائمہ اربعہ
۲۶۔ بنات الاسلام
۲۷۔ خیر القرون کی درس گاہیں
۲۸۔ خلافت عباسیہ اور ہندوستان
۲۹۔ تدوین سیر و مغازی
۳۰۔ اسلامی شادی

پاکستان میں

جیسا کہ ابھی ذکر ہوا کہ آپ کی پانچ کتابیں مصر میں طبع ہوئیں۔ اسی طرح پاکستان کے نیم سرکاری ادارہ تنظیم فکر ونظر سندھ نے ۱۹۸۶ء میں آپ کی پانچ کتابیں اعلی پیمانہ پر شائع کر کے ان کی افتتاحی تقریب میں آپ کو بلایا، زیر صدارت وزیر اعلی سندھ عظیم الشان اجلاس ہوا، پاکستان کے بڑے بڑے دانشوروں اور ریسرچ اسکالروں نے آپ کی علمی و تحقیقی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کو ''محسن سندھ'' کے خطاب سے نوازا۔ آپ پاکستان کی علمی و دینی تقریبات میں بار بار شریک ہو چکے ہیں صدر پاکستان نے بھی آپ کی علمی خدمات کا اعتراف تحائف و ہدایا کے ساتھ کیا اس

وقت آپ کی تصنیف ہند و پاک اور ممالک عرب کے تعلقات کے سلسلہ میں مستند مآخذ ہیں جن کے حوالے دیئے جاتے ہیں۔

حکومت ہند کا اعزاز

۱۶/ مارچ ۱۹۸۵ء میں حکومت ہند کی طرف سے صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ نے آپ کی علمی وتاریخی تصانیف پر اعزازی ایوارڈ عطا کیا۔ احقر نے اس کی منظوم تاریخ لکھ کر آپ کے بھیج دی تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم المجید المتین — بہ جشن زیبا قاضی اطہر مبارک پوری

قاضی اطہر تو اک بحر ہے بیکراں ! — تیری خدمات علمی بروں از بیاں
اھل علم وحکومت کو تسلیم ہیں ! — تیری تصنیف وتالیف کی خوبیاں
تیرا موضوع ہندوعرب رابطہ — تو مؤرّخ ہے اسلام کا نوجواں !
ہو مبارک حکومت کا ایوارڈ — تمغۂ علم وعزت کا روشن نشاں
جشن ایوارڈ کا لکھ دے عثمان سنہ — وسعت کلک کا تو ہے سیل رواں

کتب خانہ قاضی

آپ نے لکھا ہے کہ ’’تحصیل علم کی دھن کا یہ حال تھا کہ جامع ازہر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سودا ہر وقت سر میں سمایا رہتا تھا بلکہ بعد میں بھی یہ آرزو باقی رہی مگر میں نے اپنے ذوق وشوق کی بدولت ناکامی کو کامیابی سے یوں بدل دیا کہ اپنے گھر اور مدرسہ کو جامع ازہر، جامع زیتون ، جامع قرطبہ، مدرسہ نظامیہ مدرسہ مستنصریہ بنالیا، ہروقت بغداد و بخارا، اندلس وغرناطہ، اور عالم اسلام کی قدیم مشہور درسگاہیں اور ان کے اساتذہ وتلامذہ کے مناظر سامنے رہتے تھے اور میں ان کے حسنات وبرکات سے مستفیض ہوتا رہتا تھا‘‘ چنانچہ اردو پڑھنے کے وقت سے ہی آپ نے کتابوں کی فراہمی شروع کردی، خود لکھتے ہیں کہ کتابوں کے ذوق وشوق کی وجہ سے بعد میں میرے پاس امہات کتب کا ایک عظیم الشان ذاتی کتب خانہ بن گیا۔ جس میں عربی زبان کی نادر ونایاب مطبوعات و

مخطوطات کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ اب اس کے رکھنے کی جگہ نہیں مل رہی ہے۔اسی کتب خانہ میں بیٹھ کر آپ نے وہ شاہکار تصنیفی کام کیا جو دنیا کے سامنے نمایاں ہے، قلمی کتابوں میں بہت سی کتابیں خود آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔احقر نے آپ کے کتب خانہ کی بعض کتابوں ،طبقات ابن سعد وغیرہ سے استفادہ کیا ہے۔

تنگی وفراخی

آپ کی ابتدائی زندگی نہایت عسرت وتنگی میں گزری،ابھی آپ اٹھارہ برس کے تھے۔کافیہ پڑھ رہے تھے کہ والدہ محترمہ رحلت کر گئیں ،تین بھائی ایک بہن میں بڑے آپ ہی تھے۔کسب معاش میں والدمحترم باہر جانے لگے،بات یہ ہونے لگی کہ آپ کی تعلیم بندکر کے ذریعہ معاش میں آپ کوبھی لگایا جائے مگر آپ نے بڑے عزم واستقلال سے تعلیم بھی جاری رکھی اور خانگی امور بھی خوب جانفشانی سے انجام دیئے ۔کتابوں کی فراہمی کیلئے جلدسازی شروع کردی،تجلید کا سامان پاپیادہ شہر اعظم گڈھ سے لاتے،آمدورفت بارہ میل کی مسافت چند گھنٹوں میں طے کر لیتے ،اس طرح پیسہ جمع کر کے آہستہ آہستہ کتابیں خریدیں،اسی تنگدستی کی وجہ سے تحصیل علم کے لئے باہر نہ جاسکے،دورہ حدیث کے لئے صرف ایک سال ۱۳۵۹ھ میں مرادآباد گئے تو پورے سال میں صرف پچاس روپئے گھر کے خرچ کئے۔اسی عسرت بھری زندگی میں عمر کا بیشتر حصہ گزرا،صحافت واخبارنویسی کوذریعہ معاش بنا کرعلمی وتحقیقی تصنیف وتالیف کرتے رہے، پھر خدا نے فراخی بخشی کئی حج کئے اور قصبہ میں صاحب ثروت وحیثیت شمار ہونے لگے۔

ضعف بصر

بچپن میں آپ آشوب چشم میں مبتلا ہوئے۔نگاہ کمزور ہوگئی، چشمہ لگانے کے عادی ہوگئے۔ کتب بینی نہایت کثرت سے کیا کرتے تھے،کتاب نظر کے بالکل قریب کر کے پڑھتے تھے،آپ کے چشمہ کا پاور بھی بہت زیادہ ہوتا تھا، باوجودان دشواریوں کے لکھنے پڑھنے میں کوئی کمی نہیں کی۔

خوش خلقی وسادگی

آپ ہر شخص سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے ،ہر چھوٹے بڑے سے اس کے مرتبہ کے

مطابق پیش آتے ، وقت ناوقت جب بھی کوئی آپ کے مکان پر جاتا ،فوراً چائے ناشتہ اس کے سامنے پیش کرتے ، اور تاکید کرتے کہ کھانا میرے ساتھ کھائیں ۔ ہمیشہ سادگی کے ساتھ صفائی وستھرائی کا خیال رکھتے ، کتابیں اور ہر ایک سامان نہایت ترتیب اور سلیقہ سے رکھتے ۔

دائرہ ملیہ

آپ نے تصنیف وتالیف کے لئے مبارکپور میں ایک ادارہ بنام دائرہ ملیہ قائم کیا ، اس ادارہ سے آپ کی چند کتابیں شائع ہویں ، ندوۃ المصنفین دہلی اور شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے بھی آپ کی کئی کتابیں شائع کیں ، مصر سے بھی پانچ کتابیں آپ کی طبع ہوئیں ۔ طبقات الحجاج وغیرہ کئی کتابیں بمبئی سے شائع ہوئیں ۔

جمعیۃ علماء

جمعیۃ علماء ہند سے ہمیشہ آپ کا گہرا تعلق رہا ، جمعیۃ علماء مہاراشٹر کے نیز ریاستی دینی تعلیمی بورڈ کے صدر رہے ، اکابر دارالعلوم دیوبند سے ہمیشہ گہرا رابطہ رکھا ۔

مرض الوفات

ناک کے اندر کوئی زخم تھا ۔ اعظم گڈھ میں اس کا آپریشن کرایا ، کافی مقدار میں خون نکلا ، ضعف بہت بڑھ گیا ، بخار آتا جاتا رہا ، علاج جاری تھا ، غالباً جمادی الاخریٰ ۱۴۱۶ھ پھر ۹ رشعبان کو ، اس کے بعد ۲۲ رمحرم ۱۴۱۷ھ کو احقر آپ سے ملنے کے لئے حاضر ہوا ، ہر بار پورے نشاط سے دیر تک باتیں کیں ، الماری سے کئی کتابیں نکال کر دکھائیں ، میں نے عرض کیا کہ اب میں آپ کی سوانح مرتب کروں گا ؟ فرمایا کہ میرے حالات کچھ لکھے ہوئے ہیں ۔ لیکن مصر وغیرہ کے میرے نام عربی میں کئی اہم خطوط ہیں ، ان کو مرتب کرنا ہے ۔ میں جوں ہی کچھ صحتمند ہوا ، ان کو مرتب کرنے کیلئے خط لکھ کر چندروز کے لئے تم کو مبارکپور بلاؤں گا ، میں نے "سیرت الرسول" نامی ایک کتاب مرتب کی ہے ، اس پر تقریظ لکھنے کی درخواست کی ، کتاب دیکھ کر بہت خوش ہوئے ، تقریظ لکھنے کا وعدہ کیا ، میں نے اس کی یاددہانی کا ایک خط لکھا تو اسکے جواب میں ۲۴ ررمضان ۱۴۱۶ھ کو آپ کا مکتوب موصول ہوا ۔

''عزیز گرامی!   السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ!
کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے وعدہ کیا ہے، اس کو کیسے پورا کروں، اسی درمیان میں پرسوں آپ کا خط ملا، افسوس کے ساتھ لکھتا ہوں کہ اب تک میں لکھنے پڑھنے کے لائق نہیں ہوسکا ہوں، اس لئے اب کے بار آپ کی کتاب پر کچھ لکھنے سے معذور ہوں، حالانکہ اس پر کچھ لکھنا سعادت مندی کی بات تھی۔ میری صحت کے لئے دعاء کی درخواست ہے۔

والسلام

قاضی اطہر مبارکپوری

وفات حسرت آیات

یکشنبہ ۲۷ر صفر ۱۴۱۷ھ ۱۴ر جولائی ۱۹۹۶ء کا دن گزار کر شب میں دس بجے جوارِ رحمت میں پہنچے دوسرے روز دوشنبہ کو ۳ر بجے دن میں میں مفتی ابوالقاسم صاحب شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ بنارس ورکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے نماز جنازہ پڑھائی، بنارس، جونپور، اعظم گڈھ، مئو، غازیپور، گورکھپور، وغیرہ کے علماء کرام وفضلاء عظام کے عظیم مجمع میں نماز جنازہ اور تدفین عمل میں آئی۔

☆☆☆☆☆

مکتوبات حجاز (قاضی اطہر مبارکپوریؒ)

مرتب:۔ مولانا اسیر ادروی صاحب

مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ نے چار حج کئے۔ دوسرا حج ۱۹۶۵ء میں کیا "مکتوبات حجاز" کا تعلق اسی سفر حج سے ہے۔ کاغذ کی دو اانچ چوڑی متعدد سلیپوں پر یہ تحریر باریک قلم سے لکھی ہوئی ایک لفافہ میں ملی، روشنائی ہلکی پڑگئی ہے، حروف مٹے مٹے سے ہیں۔ جب ان سلیپوں کو مرتب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ اسی سفر حج کا روزنامچہ ہے۔ زبان بہت سادہ، انداز بیان سلیس، کسی طرح کی عبارت آرائی کی کوشش کہیں نظر نہیں آتی جو کچھ اس سفر میں گزرا اس کو سادہ لفظوں میں لکھتے گئے۔ آخر کا حصہ اس وقت لکھا گیا جب وہ سفر سے بمبئی واپس آگئے تھے۔ پانی کے جہاز سے سفر کرنے کے دوران جو دشواریاں اور مشکلات حجاج کو پیش آتی تھیں اور دوران سفر جس طرح کی مصروفیات ہوتی تھیں اس کی پوری جھلک اس تحریر میں بھی ملتی ہے۔ جن اکابر اہل علم سے انکی ملاقاتیں ہوئیں ان کا بھی ذکر ہے۔ (اسیر ادروی)

مکتوب حجاز (۱)

آج ۱۷/ مارچ ۱۹۶۵ء کا دن میری زندگی کا دوسرا تاریخی دن ہے۔ اب سے دس سال پہلے ۱۹۵۵ء میں پہلی بار حج وزیارت کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے دوسرے حج کی باری ہے۔ اب کے خالد وظفر کی والدہ بھی ساتھ ہے چونکہ درخواست حیص بیص میں تھی اور یکبارگی ۱۰/ مارچ کو جانا یقینی ہوگیا، اس لئے فوراً ایکسپریس ٹیلی گرام دیا۔ جو راستہ ہی میں ڈاک کی نذر ہوگیا اور دوسرا ایکسپریس ٹیلیگرام جو احتیاطاً دیا تھا وہ تیسرے دن مبارکپور پہونچا، اگر یہ بھی نہ پہونچتا تو ہم محکمہ ڈاک کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ ۱۴/ مارچ کو رات میں عزیزم ظفر مسعود اپنی والدہ کو لواکر بمبئی پہونچ گئے، صبح کو مولانا محمد عثمان صاحب مبارکپوری صدر مدرس مدرسہ سراج العلوم دھولیہ بھی ملاقات کے لئے آگئے، بمبئی کے دوسرے چند اصحاب بھی آتے رہے، میں نے دیدہ ودانستہ اخبار انقلاب میں اس کی خبر نہیں دی۔ البتہ ۱۷/ مارچ کے

انقلاب میں مختصر سی خبر ناظرین کی اطلاع کیلئے دیدی، جسے دیکھ کر عزیزی محمد شمیم اور ان کی والدہ محترمہ وغیرہ والدہ ظفر مسعود سے ملاقات کیلئے آئیں نیز بھیمڑی سے محترم مولانا محمد افتخار صاحب اور مولانا محمد عارف صاحب اور الحاج عبدالغنی سیٹھ صاحب اور ان کے گھر کی عورتیں ملاقات کے لئے آئیں ۔ اور دوپہر کا کھانا ساتھ لائے جسے کمرہ کے تمام حاضرین نے دوپہر کو تناول کیا چونکہ آج آخری جہاز مظفری تھا اور ویٹنگ لسٹ کے حجاج آخری وقت تک آتے رہے اس لئے بہت دیر میں روانگی ہوئی اور دو بجے کے قریب ظہر پڑھ کر ہم لوگ گودی آئے، ساتھ مولوی محمد عثمان صاحب، مولوی محمد افتخار صاحب اعظمی اور مولوی محمد عارف صاحب اعظمی ...... مدرسہ مفتاح العلوم بھیمڑی اور ظفر مسعود بھی گودی تک آئے مگر نئی پابندی کی وجہ سے اندر نہ آسکے، جہاز پر محترم الحاج سیٹھ محی الدین صاحب ان کو لیکر ہم دونوں نے تمام قانونی مراحل طے کئے ۔ اور ساڑھے تین بجے شب کو خدا حافظ کہہ کر جہاز پر سوار ہوگئے ۔ سامان پہلے ہی عزیزم جلال الدین اور منور خاں نے ہی سیٹ پر لا کر رکھ دیا تھا، اس لئے کسی قسم کی کوئی الجھن نہیں ہوئی، نیز محترم الحاج محی الدین صاحب منیری اور فون ڈیانی صاحب اور دوسرے احباب کرام نے سب کچھ کرا کر مطمئن کر دیا۔ جہاز پر آنے کے بعد ایک حاجی صاحب جو رانچی بہار کے رہنے والے تھے، پاگل ہوگئے ان کو مجبوراً اتارنا پڑا یہ منظر بڑا اندوہناک تھا کہ ایک شخص حج کیلئے جہاز پر سوار ہو کر اتار دیا جائے اس کی قسمت میں یہ حج نہیں تھا۔ ورنہ جہاز پر سوار ہو کر اترنے کا کوئی سوال نہیں ۔ محبّ محترم منیری صاحب اور گرامی قدر ماسٹر محی الدین صاحب وغیرہ آخر وقت تک جہاز پر ساتھ ساتھ رہے ۔ جہاز چھ بجے شام کو روانہ ہوا، چونکہ یہ اس موسم کا آخری جہاز تھا اس لئے بمبئی والے اپنی قدیم عادت کے مطابق آج بہت زیادہ آگئے تھے اور آخر مین گودی کے اندر آنے کی اجازت مل گئی تھی ۔ اس لئے الوداع کا منظر بڑا دلچسپ رہا۔ نعرۂ تکبیر کی گونج ساحل اور جہاز سے اٹھ رہی تھی اور دیر تک اللہ کی پاکیزگی کا کلمہ دونوں طرف سے بلند ہو رہا تھا، عصر کی نماز جہاز پر سوار ہونے کے بعد پڑھ لی تھی، مغرب کی نماز پڑھ کر کھانا تقسیم ہوا اور عشاء کے بعد چونکہ سب لوگ دن بھر کے تھکے ماندے تھے اس لئے اپنے اپنے بستروں پر پہونچ گئے ۔ اس جہاز میں ہر طبقہ کے اچھے لوگ تھے، علماء میں مولانا ابوالحسن صاحب حیدری غازیپوری، مولانا محمد سعید

صاحب راندیری، مولانا محمد عثمان صاحب جونپوری، مولانا شبیر احمد صاحب جونپوری اوران کے ساتھی علماء مولانا عبدالوھاب صاحب بخاری مدراسی، مولانا حامد صدیقی حیدرآبادی اور حیدرآباد کے کئی مشائخ مسلم یونیورسٹی کے فارسی کے لکچرر جناب مختار علی خانصاحب (مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نواسے) اس طرح اور بھی علماء اور مشائخ، شعرا، پروفیسر، مدرس، آفیسرس اور صاحب حیثیت افراد تھے۔ ۱۸/ مارچ کی صبح کو ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا صبح ہی ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ مسلم یونیورسٹی کے کوئی پروفیسر مجھے رات ہی سے تلاش کر رہے ہیں، میں صبح کو فرسٹ کلاس کی نشست گاہ میں گیا تو وہ صاحب خود ہی پتہ چلا کر اپنے کمرے سے تشریف لائے۔ یہی جناب مختار علی خانصاحب تھے جنھوں نے گذشتہ سال تیرہویں صدی میں ہندوستان کی فارسی تصنیفات پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اور اب مسلم یونیورسٹی میں فارسی کے لکچرار ہیں، صالح جوان ہیں، شکل وصورت سے پکے مسلمان اور افکار وخیالات میں نہایت روشن خیال ہیں اور چہرے بشرے سے خاندانی شرافت، دیانت کا ظہور ہوتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میں بمبئی ہی سے آپ کی تلاش میں تھا کیوں کہ میں نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ میں آپ کے علمی وتحقیقی مقالات وکتب سے کام لیا اوران کے حوالے بھی دیئے ہیں، جب میری کتاب چھپے گی تو آپ دیکھ کو خوش ہوں گے۔ ان کی اس سعادت مندی پر رشک ہوا اوران کے مطالعہ کیلئے میں نے اپنی کتاب ’[عرب وہند عہد رسالت میں‘ دی اس کے بعدان سے باربار ملاقات ہوتی رہتی ہے۔

یوں سمندر بالکل خاموش، جوتے ہوئے کھیت کے مانند ہے مگر آج ہوا تیز رہی جس کی وجہ سے بعض لوگوں کو دوران سر کی شکایت رہی اور بعض معمولی طور سے بیمار بھی پڑے۔ اچھی خاصی ٹھنڈی ہے، ڈیک کلاس کے مسافر اپنی جگہوں پر نہایت آرام سے سوتے ہیں۔ انٹرکام پر حیدرآباد والوں کا قبضہ ہے، مشاعرہ وغیرہ ترتیب دیا جاتا ہے اور مخصوص رنگ کی تقریر کی جاتی ہے،

مکتوب حجاز (۲)

آج ۱۹/ مارچ ہے، افغانستان کی پارلیمنٹ کے ممبر عالی جناب محمد اسلم کریمی بھی اسی جہاز سے سفر کر رہے ہیں، بڑے خلیق سیدھے سادے مسلمان آدمی ہیں اوراس تواضع وفروتنی

سے پیش آتے ہیں کہ ندامت ہوتی ہے، ان کی خواہش پر سب نے حج ومناسک کے چند ضروری مسائل کو فارسی زبان میں بیان کیا جب کہ انھوں نے لکھ لیا وہ اردو نہیں جانتے اس لئے ان سے ساری گفتگو فارسی ہی میں ہوا کرتی ہے، انہوں نے مسلمانان ہند اور اہل بمبئی کو دیکھ کر اپنی بے انتہا مسرت کا اظہار کیا، میں نے ان کو پورے سفر میں اور جدہ وغیرہ میں اپنے ذرائع سے آرام پہونچانے اور ضروری امور میں رہنمائی کرنے کا وعدہ کرلیا ہے جس سے انکو بڑا اطمینان ہے۔ خدا کرے میں ان کی خدمت کرسکوں۔

آج صبح صبح مغل لائن کے اسٹنٹ منیجر عالیجناب .... صاحب محترم موسیٰ قتال صاحب جو امیر الحجاج ہیں اور بعض دوسرے حضرات میری تلاش میں آئے اور کہا آپ ہمارے یہاں آکر حج ومناسک کے مسائل بتائیے اور اپنا وقت اسی طرف گزاریئے۔محترم ہاشم دادا نائب صدر انجمن خدام النبی کے ساتھ جہاز کے اسپتال کے ڈاکٹر جناب زری والا کے کمرہ میں گیا وہ جوان ہونے کے باوجود بہت شریف اور بامروت معلوم ہوتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ سرکاری ملازمت سے وقت نکال کر اس سال حج وزیارت کی سعادت حاصل کریں۔ چونکہ وقت کم ملے گا، اس لئے چند ضروری مسائل دریافت کرنے کی اجازت چاہی، میں نے کتابوں کو دیکھ کر ان کو مسائل بتادیئے، جن کی روشنی میں اگر موقعہ ملا تو وہ اس سال حج وزیارت کا انتظام کریں گے۔

فرسٹ کلاس کے حجاج جو زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ ہیں اور مالدار لوگ ہیں، چاہتے ہیں کہ میں ان کے پاس زیادہ آیا جایا کروں مگر یہ صورت اہل علم کے لئے مناسب نہیں ہے۔اس لئے کتراتا رہتا ہوں، پھر بھی آنا جانا رہتا ہے اور جہاں تک ہوسکتا ہے ان کو مسائل سے واقف کرتا ہوں ویسے کچھ لوگ اسے اعزاز سمجھتے ہیں۔مگر درحقیقت یہ علم دین کی توہین ہے کہ علماء کو بلا کر ان سے مسئلہ پوچھا جائے، یہ دوسری بات ہے کہ اہل علم ان لوگوں کو صحیح مسئلہ بتانے کی خدمت اپنے ذمہ لیں اور ان کی رہنمائی کرکے اپنی ذمہ داری پوری کریں اسی وجہ سے میں بھی گاہے گاہے جاتا رہتا ہوں۔

محترم منیری صاحب نے بار بار تاکید فرمائی تھی کہ تمہارے لئے اونچے درجے کے کھانے

کا انتظام کرا دیا ہے۔ آپ اسے منظور کرلیں، میں نے کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے آپ فرمائیں تو میں اس کا پیسہ ادا کردوں مگر انھوں نے منظور کرنے سے انکار کر دیا، اس کے باوجود میں نے اس سے بچنا چاہا، جہاز کے اسسٹنٹ منیجر نے جہاز میں کہا مگر میں نے انکار کر دیا البتہ جناب مجید کشمیری صاحب (جو جہاز کے مطبخ کے ذمہ دار ہیں) کے بے تکلفانہ اصرار بلکہ پرخلوص جبر کی وجہ سے مجھے مجبور ہونا پڑا، وہ برابر اونچے درجہ کا کھانا دونوں وقت مع چائے اور ناشتہ کے بھجواتے رہتے ہیں۔

۲۰ / مارچ کا دن بھی معمول کے مطابق نہایت اچھا گذرا، پورے جہاز میں سب خیریت ہے، تبلیغی جماعت والے فضائل کے ساتھ بعض اوقات مسائل بھی بیان کر دیتے ہیں اس لئے دوسرے علماء کو جو اونچے قسم کے ہیں ہم سفر ہیں، کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اپنے اصول کے مطابق یا غلطی سے کسی دوسرے عالم کو اس کا موقعہ ہی نہیں دیتے ہیں۔

امیر حجاج موسیٰ قتال صاحب اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ دس بجے دن میں جہاز کے عملہ کے ساتھ گشت لگاتے ہیں۔ پھر بارہ بجے تک اپنے طور پر حجاج کی خبر گیری کرتے ہیں، ویسے زبان خلق سے کون بچ سکتا ہے۔ محترم ہاشم دادا صاحب انجمن خدام النبی کے ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے بڑی تندہی سے حجاج کی خدمت کرتے ہیں اور جب دیکھو کسی نہ کسی کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ ویسے خادم الحجاج کا بیج لگا کر بہت سے لوگ گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔ کھانا مناسب ہوتا ہے مگر بعض لوگ شکایت کرتے رہتے ہیں اور کھانے سے زیادہ کھانے کی شکایت میں لذت پاتے ہیں۔ البتہ اس سلسلہ میں دو باتیں قابل غور ہونی چاہئے۔ دوپہر کو عام طور سے صرف چاول دیا جاتا ہے، اچھا خراب کی بحث سے اٹھ کر صرف چاول دینا ہمارے نزدیک مناسب نہیں ہے۔ صرف چاول کھانا بہت سے لوگوں کی عادت میں نہیں ہے۔ بلکہ یا تو وہ روٹی کے عادی ہیں یا چاول کے ساتھ روٹی کے بھی عادی ہیں۔ اس لئے ایسے لوگوں کو ایک وقت صرف چاول کھانے سے تکلیف ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ صبح کو ناشتہ میں عام طور سے صرف ایک توس سینکا ہوا دیا جاتا ہے۔ یہ ناشتہ بقدر بادام عام حجاج کیلئے بہت ناکافی ہے۔ تیسرے درجے کے حجاج عام طور پر محنت کش اور کام

دھندے والے ہوتے ہیں۔ وہ صبح کو ناشتہ کے نام پر اچھی خاصی غذا کھانے کے عادی ہوتے ہیں۔ان کو روٹی کا ایک ٹکڑا بالکل ناکافی ہے۔ دونوں کھانوں میں جو سخاوت کی جاتی ہے اس کا ایک حصہ بچا کر ناشتہ میں زیادہ دیدیا جائے تو اچھا ہو۔

امیر الحجاج اگر مذہبی امور کی براہ راست معلومات زیادہ نہیں رکھتا تو اسے چاہئے کہ جہاز میں سفر کرنے والے ہر خطہ کے علماء کو جمع کر کے ان سے دینی خدمت لے اور ان کے لئے حلقہ مقرر کرائے۔اسی طرح نماز وغیرہ کے انتظام میں ان سے کام لے، جہاز کا عملہ ملازمین حجاج کے ساتھ نہایت اخلاق سے پیش آتے ہیں۔

مکتوب حجاز (۳)

۲۰ / مارچ افغانستان کے دو حاجیوں کے علاوہ اسی جہاز سے نیپال کے ۴۹ حاجی جا رہے ہیں جن کو پہونچانے کے لئے نیپال پارلیمنٹ کے ایک مسلمان ممبر بمبئی آئے ہوئے تھے، ان میں بعض لوگ اچھے خاصے تعلیم یافتہ ہیں، آج ان سے ملاقات ہوئی تو باتوں بات میں معلوم ہوا کہ نیپال کے مسلمان ادھر دس بارہ سال سے تعلیمی اور اقتصادی وثقافتی معاملات میں ترقی کر رہے ہیں اور کئی مسلمان طالب علم امریکہ، روس، چین اور ہندوستان وغیرہ میں حکومت نیپال کی طرف سے اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں اور حکومت میں ملازم بھی ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نیپال میں قصاب ہندو ہی ہوتے ہیں۔البتہ اب کچھ مسلمان قصاب ہندوستان سے جا کر آباد ہوگئے ہیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں کے غیر مسلم بھینس بھینسا کا گوشت عام طور سے کھاتے ہیں، دسہرے پر مندروں میں لاکر جانور (سوائے بیل گائے کے) ذبح کئے جاتے ہیں۔اس دن بھینس اور بھینسے کا گوشت سڑکوں پر اس طرح بکتا ہے جیسے بھاجی ترکاری کا ٹھیلہ ہوتا ہے۔اور غیر مسلم اپنی اپنی استطاعت بھر خوب خریدتے اور کھاتے ہیں، مسلمانوں کو بھی گائے اور بیل کے علاوہ ہر قسم کے جانور کی قربانی اور ذبیحہ کی اجازت ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں پر یورپ وایشیاء کے مختلف ممالک کے سامان بکثرت وبکفایت آتے ہیں اور سستے بکتے ہیں، نیپال کے مسلمان مجموعی طور سے اقلیت میں ہونے کی وجہ سے پسماندہ ہیں الا کہ اپنے لئے کچھ کرتے ہیں یا کر رہے ہیں۔

۲۱؍ مارچ کو امیر الحجاج جناب قتال صاحب نے جہاز کے کپتان اور افسران کے اعزاز میں ایک ٹی پارٹی دی جس میں تقریباً پچاس ہزار افراد شریک ہوئے۔ ان میں پروفیسر، انجینئر، تاجر، تعلیم یافتہ زیادہ تھے۔ شام کو ساڑھے پانچ بجے یہ تقریب منعقد ہوئی، خورد ونوش کے پہلے قتال صاحب نے کپتان کی خدمت حجاج اور ہر قسم کے تعاون پر اظہار وتشکر کیا اور مختصر سی تقریر میں بتایا کہ موصوف اور ان کے عملہ نے ہمارا پورا تعاون کیا اور اپنی ہر قسم کی خدمت پیش کی۔ اس کے جواب میں کپتان نے بھی تقریر کیا اور ان کی اس قدر دانی اور ہمت افزائی کا شکریہ ادا کیا، نیز امیر الحجاج صاحب نے چند حضرات کی طرف سے مغل لائن کو بمبئی ایک ٹیلی گرام روانہ کیا جس میں جہاز کے عملہ کی خدمات کو سراہا گیا ہے۔ یہ جلسہ بہت خوب تھا جو امیر الحجاج کی طرف سے جہاز کے عملہ وافسران کی خدمات کو سراہنے کیلئے کیا گیا۔

۲۲؍ مارچ کو جہاز عدن میں رکا، کئی دنوں کے بعد خشکی نظر آئی، پہلے ہی سے تیل بردار جہاز نظر آنے لگے، حجاج ذوق وشوق میں ادھر ادھر جانے لگے، دیار پاک کے آثار نظر آنے لگے اور عرب کا ملک شروع ہوگیا، جہاز دن مین ۲؍ بجے عدن کے ساحل سے کچھ دور کھڑا ہوا۔ تیل اور پانی اور دوسری ضروری اشیاء لینی ہیں، ابھی جہاز دور ہی تھا کہ ساحل عدن سے ایک لانچ پر سوار ہوکر وہاں کا افسر آیا اور لکڑی اور اس سے بنی ہوئی معمولی سیڑھی کے ذریعہ جو پہلے سے لٹکا دی گئی تھی نہایت صفائی سے اوپر چڑھ آیا۔

عدن تاریخ کے قدیم زمانہ سے یورپ اور ایشیاء کے درمیان بہت بڑا تجارتی مرکز رہا ہے۔ ہندوستان اور چین کے ساتھ مشرق کے سامان یہاں لائے جاتے تھے اور پھر یہاں سے عرب ہوکر خشکی یا بحری راستہ سے یورپ تک جاتے تھے، اس کے باوجود یہ مقام بہت ہی مختصر بظاہر بے حیثیت اور غیر آباد رہا، مگر انگریزوں نے اس کو ترقی دے کر بڑا اہم مقام بنا دیا ہے، عدن کے کئی نواحی ہیں نواحی شیخ غسان اور عدن گریٹر وغیرہ ساحل سے متصل ہیں۔ عدن بالکل جدید طرز کا شہر ہے جس میں دنیا بھر کی قومیں آباد ہیں۔ برطانوی پالیسی نے اس علاقہ کو بالکل غیر عرب بنانے کی کوشش کی تھی۔ آس پاس کے امراء وشیوخ کو لیکر ایک اتحاد الجنوبی العربی کے نام سے ایک پارلیمنٹ بنائی ہے۔ مگر اب یہ جادو بھی ٹوٹ رہا ہے اور آزادی کی تحریک کا زور ہے

۔ چنانچہ اس وقت عدن میں شدید نگرانی ہے اور جگہ جگہ پولیس کا سخت پہرہ ہے، عدن کے پیچھے پہاڑوں اور صحراؤں میں قدیم قبائل آباد ہیں، قوم عاد اس نواحی میں تھی جس میں شداد نامی بہت بڑا نافرمان ظالم اور صاحب اقتدار گذرا ہے۔ اس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس نے یہاں کے پہاڑوں میں اپنی جنت بنائی تھی ساحل کے قریب انگریزوں نے شداد کی جنت بنادی ہے۔

جہاز رات کے ایک بجے کے بعد وہاں سے نکلا تو یہاں کے شہر اور ساحل کی قسم قسم اور رنگ بہ رنگ کی روشنیاں عجب نظر نواز منظر پیش کر رہی تھیں۔ بہت دیر تک یہ منظر دیدنی تھا۔ دو ایک کشتی والے سامان فروخت کرنے آئے مگر زیادہ کامیاب نہیں رہے۔ کیوں کہ اب ہندوستانی حجاج کے پاس روپیہ پیسہ بہت کم ہوتا ہے۔ ورنہ پہلے یہاں جب جہاز ٹھہرتا تھا تو خوب خرید وفروخت ہوتی تھی،۔ جب جہاز ساحل عدن سے نکل کر کچھ دور گیا تو پھر اسی سیڑھی سے عدن والا افسر بڑی صفائی سے اتر کر ساحل سے آکر جہاز میں لگ جانے والی موٹر کشتی میں بیٹھ گیا۔

عام خیال تھا کہ بحر احمر میں جہاز داخل ہونے کے بعد گرمی زیادہ ہوگی، مگر معاملہ الٹا ہو گیا ، سردی، ہوا اور جہاز کی حرکت زیادہ ہوگئی۔ جو ۲۳ر کی صبح تک باقی رہی، پوری رات تند و تیز ہوا چلتی رہی اور جہاز ہچکولے کھاتا رہا۔ بہت سے حجاج جو اب تک خوش وخرم چلتے پھرتے تھے بستر پر سر رکھنے پر مجبور ہو گئے مگر مجموعی اعتبار سے یہ زیادہ پریشانی نہیں ہے۔

مکتوب حجاز (۴)

۲۳ر مارچ کو جہاز بحر احمر میں چل رہا ہے اور خلاف معمول اس سال اس سمندر میں سردی، ہوا اور موج زیادہ ہے۔ حالانکہ اس میں ہر طرف سکون اور گرمی ہوتی ہے، عورتوں کو عام طور سے دوران سر کی شکایت پیدا ہوگئی ہے، کچھ کمزور دماغ مرد بھی اس میں مبتلا ہیں۔ خالد وظفر کی والدہ آج بستر پر رہی حالانکہ بمبئی سے اب تک کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی تھی۔ اور نہایت صحت مندی کے ساتھ ہر طرف آنا جانا تھا مگر یہ صورت حال وقتی ہے۔ صرف دوران سر ہے۔

رات ایک حاجی صاحب جو پہلی مرتبہ حج کو جا رہے ہیں اور معمر ہیں اپنے ملاقاتی کو اس طرح ہدایت دے رہے تھے جیسے انھوں نے بار بار حج فرمایا ہے اور وہاں کے حالات سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی گفتگو ہدایات لئے ہوئے تھی مگر شکایات سے پر تھیں۔ معلم ایسا کرتے ہیں، یوں

لوٹتے ہیں، قربانی کا جانور پیسہ لے کر نہیں دیتے۔ دلالی کرتے ہیں۔ اور جہاز پر تیسرے درجہ کا کھانا نہایت خراب ملتا ہے۔ اور مغل لائن کمپنی ان سے روپیہ لے کر اچھا کھانا نہیں دیتی۔ میں ایک طرف بیٹھا ہوا ان کی باتیں سن رہا تھا، انھوں نے شاید مجھے دیکھا نہیں تھا۔ اس لئے کہنے لگے کہ ہمارے قریب ہی ایک مولوی صاحب ہیں جن کا کھانا فرسٹ کلاس سے دونوں وقت آتا رہتا ہے۔ اور ناشتہ چائے الگ سے آتا ہے۔ وہ ٹھاٹ سے کھاتے پیتے ہیں۔ اس پر دونوں نے کہا کہ یہ مولوی صاحب مغل لائن اور جہاز والوں سے کھانے کی شکایت کیسے کر سکتے ہیں جبکہ ان کو وہاں سے کھانا مل رہا ہے۔ اس قسم کے لوگ اپنا فائدہ کر کے حجاج کی تکلیف کا باعث بنتے ہیں وغیرہ وغیرہ زبان خلق کو کوئی روک نہیں سکتا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو بدگمانی سے بچالے۔ اس سفر میں میرے لئے بڑی بے سروسامانی رہی بروقت منظوری کی وجہ سے ساتھی بھی نہ مل سکے مگر جناب فتح محمد خانصاحب ضلع گونڈہ والے کا ساتھ رہا جن کی وجہ سے مجھے کافی آرام رہا۔ یہ صاحب بڑی عقیدت سے ہم لوگوں کی خبر گیری کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

ایک تکلیف بڑی شدید یہ رہی کہ حاجی اپنے ہمراہ عام ہندوستانی نوٹ نہیں لاسکتے بلکہ اگر کچھ ملتا ہے تو حج نوٹ کی شکل میں، تاکہ جہاز پر اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ مگر جہاز پر صورت یہ ہے کہ عام ہندوستانی نوٹ لیا نہیں جاتا اور حج نوٹ کیلئے یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ دس روپیہ جمع کر کے آخر تک اس کا سودا خرید کر ختم کر دیں یہ نہیں کہ اسے بھنا کر دو چار روپے کی چائے وغیرہ پی سکیں۔ اس لئے یا تو حج نوٹ ویسا ہی رکھے رہئے، یا پھر اس طرح خرچ کیجئے کہ سب کا سب جہاز کی دکان پر ختم ہو جائے۔ اس وجہ سے سخت پریشانی رہی اور حج نوٹ لینا بالکل بیکار ثابت ہوا حالانکہ حجاج کو ان کے حساب میں اگر دس پانچ روپیہ چاہیں تو عام ہندوستانی نوٹ دینا چاہئے، مغل لائن ہندوستانی کمپنی ہے۔ اس میں غیر ملکی زرمبادلہ کا چلن خلاف اصول ہے بلکہ ایک ہزار کے علاوہ دس پانچ روپیہ جہاز میں خرچ کرنے کے لئے دینا چاہئے کیونکہ یہ رقم باہر نہیں جاتی۔ جس طرح کہ غلہ کپڑے کی رقم ہندوستان میں رہ جاتی ہے اس طرح یہ رقم ہندوستانی جہاز میں رہ جاتی ہے۔ آئندہ اس طرف خصوصی اور فوری توجہ کی ضرورت ہے، حاجی جہاز میں یا تو دس روپیہ خرچ کر دیں یا ایک پیسہ بھی نہ خرچ کریں، یہ طریقہ نہایت پریشان کن اور غلط ہے یا

پھر جہاز میں کسی قسم کی خرید وفروخت کا معمول ختم کردیا جائے۔
۲۴؍ مارچ کی صبح کو ناشتہ کے بعد جہاز کے وقت سے ساڑھے سات بجے میری تقریر جہاز کے انٹر کام سے ہوئی، مائک پر ایک خاص حلقہ کا قبضہ ہے، حالانکہ اور بھی بہت سے اچھے اچھے اہل علم اس جہاز میں چل رہے ہیں مگر ان کی خدمت نہیں حاصل کی جارہی ہے۔ البتہ دو تقریریں مولانا سید عبدالوھاب بخاری اور آج ایک میری تقریر ہوئی۔ چونکہ آج احرام بندھنے والا ہے اس لئے میں احرام کے مسائل پر زور دیا ویسے ہفتہ بھر سے مسائل بیان کئے جاتے تھے اور مسائل پر توجہ کم تھی، اس لئے ضرورت تھی کہ فضائل کے بجائے مسائل بیان کئے جائیں، چونکہ گذشتہ تقریریں ایک خاص طبقہ مشائخ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور زبان ومحاورہ کے لحاظ سے مخصوص رنگ کی تھیں۔ اس لئے میری تقریر میں لوگوں کو نیا پن محسوس ہوا اور زبان کے اعتبار سے بھی تبدیلی محسوس ہوئی۔ پھر بروقت مسائل تھے۔ اس لئے الحمد للہ مجموعی طور سے اچھی رہی اور حجاج سے مسرت آمیز تاثر معلوم ہورہا تھا۔ سطور ہذا کی تحریر کے وقت دنیا میں جہاز کے وقت سے ساڑھے دس کا وقت ہے، ہندوستان میں تو ۱۲ سے زیادہ ہوگیا ہوگا۔ آج سویرے کھانا تقسیم ہورہا تھا اور لوگ کھانے پینے میں مصروف ہیں تاکہ جلد فارغ ہوکر نہانے دھونے اور احرام باندھنے میں لگ جائیں۔ آج شام کو پانچ بجے تک یلملم کا سامنا ہوگا اس سے پہلے احرام بندھ جائے گا۔ میں نے صبح چار بجے ہی اٹھ کر کھاری پانی ہی سے غسل کرلیا ہے کیوں کہ دن میں میٹھے پانی پر بڑی بھیڑ رہے گی حالانکہ فرسٹ کلاس والے متعارف اور قدرداں حضرات بار بار کہہ چکے ہیں کہ آپ دونوں ہمارے یہاں آکر غسل کرلیں مگر وہاں دن میں بھیڑ بھاڑ ہے اس لئے ان کے شکریہ کے ساتھ وہاں نہیں گیا۔

مکتوب حجاز (۵)

جہاز مظفری تقریباً دس گھنٹے تک عدن میں رکا رہا جس کی وجہ سے جدہ دیر میں پہونچا ۲۵؍ مارچ جمعہ کو دس بجے کے قریب جدہ کے سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ اس کی چھوٹی سی گودی پر دونوں طرف دو جہاز لنگر انداز ہیں جن میں سے ایک اسلامی تھا جو ۱۲؍ مارچ کو بمبئی سے چلا تھا قاعدہ سے اسے دوروز پہلے پہونچنا چاہئے تھا، کچھ عدن کے بعد بحر احمر میں تموج کی وجہ سے

لیٹ ہوگیا۔ مظفری جہاز کو گودی خالی ہونے کے انتظار میں ساحل سے دور ٹھہرایا یہاں تک کہ تقریباً تین بجے اسلامی جہاز اپنے حجاج کو اتار کر باہر نکلا تو مظفری داخل ہوا اور چار بجے کے قریب تمام مسافر اترے، معمولی اور مختصر سامان تو خود اپنے ہاتھ میں لیا اور بڑے بڑے سامان جہاز ہی پر چھوڑ دیا تاکہ سعودی عرب کے قلی ان کو اتار کر کسٹم میں پہونچا دیں۔ یہاں کے اصول کے مطابق حجاج اترتے ہی موٹر پر سوار کئے جاتے اور کسٹم ہاؤس سے متصل نقابہ میں پہونچا دیئے جاتے ان کے پیچھے لاری میں ان کے سامان پہونچائے جاتے تھے۔ اس طرح حجاج اور ان کے سامان الگ الگ جاتے تھے، نقابہ میں پاسپورٹ کی جانچ اور معلم کی تعیین ہوگئی ہے۔ اس سے باہر متصل ہی کسٹم ہاؤس ایک وسیع وعریض ہال کی شکل میں ہے جس میں چبوترے بنے ہوئے ہیں۔، انہیں پر حجاج کے سامان اس طرح ایک ساتھ رکھ دیئے گئے کہ نہ حجاج کا پتہ چلتا ہے اور نہ سامان کی خبر لگتی ہے۔ پہلے سے بتایا گیا کہ جہاز کے فلاں نمبر کے درجہ یا ڈیک کا سامان کسٹم ہاؤس کے فلاں حصہ مین رکھا جائے گا تو حاجیوں کو اپنا سامان تلاش کرنے میں مشکل نہ ہوتی۔ مگر ایسا نہ ہوا بلکہ ایک طرف سے موٹریں گودی سے سامان لا دلا دکر یہاں گراتی جاتی تھیں، تمام سامان کسٹم ہاؤس میں بکھرا ہوا تھا، کسی حاجی کا دو سامان ایک جگہ نہیں ہے۔ مزید یہ کہ رات کے آٹھ بجے تک سامان آتے رہے اسی میں حجاج سامان اور کسٹم افسران سب کے سب ایک رنگ میں نظر آنے لگے۔ عرب کے قلی الڑھ قسم کے ہوتے ہیں اور زبان نہیں سمجھتے، غیر حاجی کو اندر جانا ممنوع ہوتا ہے یہ وقت بڑی پریشانی کا ہوتا ہے۔ دس سال پہلے جو پریشانی اس موقع پر ہوتی تھی اس میں ذرا بھی کمی نہیں آئی حالانکہ کسٹم ہاؤس میں کافی تبدیلی ہوئی ہے۔ اگر سعودی حکام اس کی طرف معمولی توجہ کر دیں تو حجاج کو سرزمین حجاز پر اترتے ہی پریشان کن بد نظمی سے نجات مل جائے اور سعودی حکام کو بھی اطمینان حاصل ہو۔

عزیزم مولوی خالد کمال مبارکپوری سلّمہٗ دو دن پہلے جدہ آ گئے تھے بلکہ معلم زین العابدین کالو اور عزیزی مختار احمد جاوید کو بھی میرے آنے کی ٹیلی گرام سے اطلاع دے چکے تھے چونکہ وہ کسٹم آفس سے باہر تھے اس لئے ملاقات نہ ہوسکی۔ عزیزی مختار احمد جاوید سے ملاقات ہوئی جو جدہ میں وکیل حسن نظار کے معتمد ہیں اور اسی حیثیت سے کسٹم ہاؤس کے پاس موجود تھے

۔انھوں نے خالد کمال کو خبروں نیز جامعہ اسلامیہ کے بعض طلبہ سے یہیں ملاقات ہوئی اور اس پریشانی کے ہنگامہ میں بڑا سکون حاصل ہوا۔اسی دوران میں ہندوستانی سفیر محترم مدحت کامل قدوائی صاحب سے ملاقات ہوئی اور بغیر کسی سابقہ تعارف و تعلق کے بڑی خندی پیشانی اور اخلاق سے ملے، انھوں نے رک کر باتیں کیں اور پان پیش کیا پھر رات میں کافی دیر تک مدینۃ الحجاج میں ان سے گفتگو رہی۔ بڑے شریف النفس آدمی معلوم ہوتے ہیں۔اور اپنے فرائض کے ساتھ حجاج کی خدمت حتی الامکان کرتے ہیں، اسی نقابہ میں حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب (فاضل دیوبند) سے ملاقات ہوئی جو ہندوستانی سفارت خانے میں مترجم کی حیثیت سے رہتے ہیں، معارف، البلاغ، ثقافۃ الہند اور میری تصنیفات کے ذریعہ مجھے پہلے سے جانتے تھے اور ملاقات کے متمنی تھے، بڑے تپاک اور اخلاق سے ملے اور اسی نقابہ میں علمی و تحقیقی گفتگو ہونے لگی ''رجال الہند والسند'' اور ''ہند و عرب عہد رسالت میں'' کا تذکرہ آیا اور اس کے بعض مباحث کا عربی ترجمہ جو ثقافۃ الہند'' حکومت ہند کے سرکاری پرچے'' میں چھپا وہ اس کی افادیت واہمیت پر گفتگو کرتے رہے اور بتایا کہ اس کی اہمیت کے پیش نظر حکومت ہند سے مزید پرچے طلب کئے گئے ہیں۔

عصر کی نماز کسٹم ہاؤس میں پڑھی گئی اور چار بجے دن سے لے کر دس بجے رات تک اسی جنجال میں رہے۔خدا کے فضل سے سب سامان مل گئے، مگر نئے بکس کا کچومر اس طرح نکل گیا کہ اس کی صورت نہیں دیکھی جاتی تھی۔ حالانکہ جہاز سے آتے وقت اصلی حالت میں حفاظت سے رکھ دیا تھا مگر جہاز سے کسٹم ہاؤس تک ہی آنے میں اس کا حلیہ بگڑ گیا۔اب رہی سہی کسر مکہ میں پوری ہوگی۔دس بجے رات میں جدہ مدینۃ الحجاج پہونچے جو آفاقیوں سے بھرا ہوا تھا۔اب اس میں زیادہ توسیع اور تعمیر ہوگئی ہے، کمرے نہایت آرام دہ، پانی بہ افراط، پیشاب خانہ اور پاخانہ کا بہترین انتظام ہوگیا ہے، روشنی اور پنکھے بھی ہیں۔ الغرض مدینۃ الحجاج کی عمارتیں بہترین اقامت گاہ بن گئی ہیں۔ یہاں آنے پر بمبئی کے پرانے مخلص رفیق مسٹر عبدالرحیم انصاری صاحب سے ملاقات ہوئی جو پہلے ہندوستانی سفارت خانے سے وابستہ تھے۔اور اب ایک اور ادارہ سے وابستہ ہیں۔الحمد للہ کہ عبدالرحیم انصاری بہت مطمئن ہیں اور اخلاق وشرافت

میں اپنا وہی پرانا معیار قائم کئے ہوئے ہیں۔عزیزی مختار احمد جاوید تو کہنا چاہئے کہ میرے گھر کے ایک فرد ہی ہیں۔انھوں نے بہت آرام پہونچایا۔خالد کمال اور مختار احمد جاوید دونوں ہماری خدمت میں یکساں تھے۔تکلیف اور پریشانی سے بچنے کیلئے جدہ سے مکہ کا بس کا عام کرایہ بھر کر واپس لے کر دوسرے دن تیس ریال پر ٹیکسی کر کے مکہ مکرمہ آئے اور مغرب کی نماز پڑھ کر طواف و سعی کر کے عمرہ ادا کیا۔

مکتوب حجاز (۶)

دن میں شہر جدہ میں جانا ہوا، دس سال پہلے ہی جدہ جدید طرز کا خوبصورت شہر بن چکا تھا اس مدت میں اس کی ترقی کہیں سے کہیں پہونچ گئی، تاریخوں اور سفرناموں میں جدہ کے بارے میں جو پڑھا تھا افسانہ معلوم ہو رہا تھا۔اب اس کی کوئی علامت نظر نہیں آتی، سر بفلک عمارتیں یعنی چوڑی سڑکیں اور غیر ملکی سامان تجارت سے پٹے ہوئے بڑے بڑے بازار اور دکانیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی افسانوی شہر ہے غیر ملکی کمپنیوں کے دفاتر اور شہر کی چہل پہل قابل دید ہے۔اور اس میں خاص بات یہ ہے کہ فٹ پاتھوں اور سڑکوں کے درمیان ہرے بھرے درخت اور پھول پتے ہر طرف نظر آتے ہیں جگہ جگہ پارک ہیں قیمتی موٹریں سنکتی پھرتی ہیں اور لوگوں کے چہروں پر بڑی بے نیازی، اطمینان اور سکون کی لہر دوڑتی ہے، دولت و ثروت کی بہتات کا عالم یہ ہے کہ جس دکان اور سامان کو دیکھئے تو جی چاہتا ہے کہ دیکھتے رہے یہ بات ضرور ہے کہ سارا کھیل غیر ممالک کا مرہون منت ہے اور عربوں کی دولت ایک طرف سے آتی ہے تو دوسری طرف چلی جاتی ہے۔مگر سکون و اطمینان میں یہ تصور ذرا بھی مخل نہیں ہے۔جو ممالک اسی چکر میں ہیں ان میں سے اکثر کا حال نہایت خراب و خستہ رہتا ہے اور وہ ضروریات زندگی تک کو ترستے رہتے ہیں۔تواریخ ورحلات کی کتابوں میں جدہ میں حضرت حوا کے مزار کا تذکرہ ملتا ہے مگر تاریخی اعتبار سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتا ہے۔حضرت آدم وحوا کی تاریخ قرآن وحدیث میں جو کچھ ہے اس کے علاوہ ظن وتخمین کی بات ہے۔بہر حال ہم لوگ بھی حضرت حوا کے مزار کی جگہ گئے جو شہر جدہ کے کنارے ایک گھیرے ہوئے علاقہ میں ہے، دروازہ بند تھا۔باہر نذرانہ یا بخشش وصول کرنیوالے بیٹھے تھے، مصری مرد اور عورتیں باہر سے جھانک

جھانک کر دیکھتے تھے اور نذرانہ پیش کرتے تھے۔

ہمیں محافظ نے دروازہ کے سوراخ سے قریب کی جگہ کی طرف اشارہ کیا کہ اس جگہ حوا کی قبر تھی۔ اب وہاں کوئی علامت نہیں بلکہ میدان ہے، ہم نے ایک نظر ڈالی اور بغیر کچھ نذرانہ دیئے اپنی راہ لی، ترکوں کے دور کو بدنام کیا جاتا ہے کہ وہ ہر متبرک مقام کو محفوظ کر کے نذر و نیاز وصول کراتے تھے اور وہاں کے نگران اس مقام کی فضیلت اور اہمیت بیان کر کے زائرین کو زیارت کراتے اور نذرانے وصول کرتے تھے۔ مگر آج بھی تقریباً یہ عمل جاری ہے۔ ایسے تمام آثار کو ختم کر کے ان کی جگہ پولیس متعین کر دی گئی ہے تاکہ کوئی شرک و کفر نہ کرنے پائے۔ مگر یہ پولیس والے عام طور سے رشوت اور بخشش کے نام پر پیسہ وصول کرتے ہیں اور زیارت کا خصوصی موقعہ دیتے ہیں حتی کہ حجر اسود کے استلام کے لئے بھی اب یہ طریقہ کھلم کھلا جاری ہو گیا ہے۔ ایک دوریال لے کر سروں کو پکڑ پکڑ کر بوسہ دلایا جاتا ہے جبکہ عام لوگوں کے اژدحام کو بے دردی سے ہٹایا جاتا ہے۔

مکہ مکرمہ:۔ دس سال کے بعد مکہ مکرمہ میں داخلہ ہوا تو پورا شہر بدلا ہوا نظر آیا اور یقین نہیں ہوتا تھا کہ یہ وہی مکہ مکرمہ ہے جو وادی غیر ذی زرع کے نام سے موسوم ہے، کئی میل تک شہر پھیل گیا ہے، کئی کئی طبقہ کی شاندار جدید طرز کی عمارتوں کا سلسلہ یعنی چوڑی سڑکوں کا جال چوڑی خوبصورت فٹ پاتھ دو رویہ آمدورفت کا انتظام، جگہ جگہ حسین وجمیل ہرے بھرے پارک، پانی کے فوارے قسم قسم کے پھول پتے، الغرض شہر کا نشیب و فراز اپنے اندر جدت پسندی کا پورا سامان لئے ہوئے ہے مکہ کی آبادی پہاڑیوں پر زیادہ ہے۔ راتوں کو رنگ برنگ کی روشنیاں عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ ان دنوں سارا مکہ انسانوں کیلئے گود بنا ہوا ہے، کئی لاکھ کی اس کی آبادی کے ساتھ ساتھ کئی لاکھ انسان باہر سے آگئے ہیں۔ حالانکہ حکومت نے ترکی، شام، اردن، اور دوسرے قرب و جوار کے ممالک کے موٹروں پر آنے والے حجاج کے لئے شہر کے باہر قیام کا انتظام کیا ہے، جہاں وہ اپنی سیکڑوں، ہزاروں موٹروں پر رہتے ہیں، اور شہر میں نماز و طواف کے لئے آتے ہیں، پھر بھی بھیڑ کا یہ حال ہے کہ ہفتوں تک گلی کوچوں کی تمیز نہیں ہوسکی، ہر مکان اور ہر میدان صحن معلوم ہوتا تھا۔

جدید حرم: ۔حرم محترم کی جدید توسیع وتعمیر کا کام بغیر دیکھے ہوئے صحیح طور سے نہیں سمجھا جا سکتا ، پوری دنیا میں اب کوئی عبادت خانہ اس سے بڑا نہیں رہ گیا ہے، حکومت سعودیہ نے پچاس کروڑ ریال سے زائد صرفہ کرکے اسلامی تاریخ میں اپنا الگ باب ثبت کردیا ہے، عقل ونظر دونوں اس عمارت کو دیکھ کر مبہوت ہو جاتی ہیں۔ پرانے حرم کا اکثر حصہ باقی ہے اس کے بعد سے حرم کی تعمیر ہوئی ہے، کام جاری ہے اس کے بارے میں ارباب دل کا کہنا ہے کہ ترکوں کے قدیم حرم میں جو جاذبیت اور روحانیت نماز میں محسوس ہوتی ہے وہ بات جدید حرم میں نہیں ہے۔حرم کی تیسری منزل پر نماز پڑھتے وقت کعبہ شریف اس کے نیچے معلوم ہونے لگتا ہے جو بجائے خود نامناسب بات ہے۔ چنانچہ راقم الحروف ایک مرتبہ سب سے اوپر کی منزل میں نماز پڑھنے گیا تھا پھر اسکے بعد نہیں گیا۔ بہرحال حرم اور مسلم سلاطین کی تاریخ میں حرمین شریفین کی تعمیر وتوسیع اور تجدید کا یہ کارنامہ صرف حکومت سعودیہ ہی کا حق ہے۔

عمرہ کی ادائیگی: ۔جیسا کہ کہا گیا، ہم لوگ اپنے طور پر شام کو مکہ مکرمہ پہونچے اور مغرب پڑھ کر عمرہ ادا کیا گیا اللہ اکبر! انسانوں کے سمندر میں اپنا گذر بڑا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ دوڈھائی ہزار میل پانی کا سفر طے کرکے نہایت آسانی سے یہاں آگئے تھے۔مگر یہ انسانی سمندر اتھاہ معلوم ہوتا تھا خدا خدا کرکے بیت اللہ شریف کا طواف کیا اور بڑی مشکل سے زمزم شریف پی سکے اور جب مسعیٰ میں پہونچے تو وہاں اس سمندر میں شدید روانی تھی۔ دنیا بھر کے مختلف ممالک کے مسلمان طواف اور سعی میں دوش بدوش مصروف عبادت تھے۔اور بلا کسی تمیز کے تمام چھوٹے بڑے امیر وغریب حاکم ومحکوم اور عالم وجاہل عبدیت وبندگی کے اظہار میں ایک دوسرے پر سبقت لے جا رہے تھے۔ جوں ہی صفا سے سعی شروع کی تو معلوم ہوا کہ پیچھے کا ریلا ہمیں چور چور کر دیگا اس وقت اپنے کو خوب سنبھالا اور دھکا سہہ گئے۔اس کے بعد پھر ایسے شدید جھٹکے سے واسطہ نہیں پڑا، سعی کا پورا وقت بچنے بچانے میں گذرا مگر ان حالات میں نہ تکلیف معلوم ہوتی تھی، نا گواری کا احساس ہوتا، نہ دھکا دینے والے کے خلاف جذبہ پیدا ہوتا تھا بلکہ ایک خاص مزا ملتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ اس طرح لوگ ایک دوسرے پر گرتے رہیں۔ یہ دھکم دھکا بالکل بے اختیار اور اضطراری ہوتا تھا کون کسی کو جان بوجھ کر زحمت میں مبتلا کرتا، اس مقام کی عظمت اور

عبادت کے خلاف سمجھتا تھا۔

مدینہ منورہ کے شب و روز:۔ راقم ۲۳؍ذوقعدہ (۱۳؍اپریل) سے ۲۱؍صفر (۱۱؍جون) تک حج و زیارت کے سفر میں رہا دیار مقدس میں پہلی حاضری ۱۹۵۵ء میں ہوئی تھی اس وقت جذبات واحساسات کا معاملہ کچھ اور تھا اور اب کی بار کچھ اور ہی بات تھی، ہر مقام روشناس، ہر منزل متعارف، ہر معاملہ جانا پہچانا تھا البتہ مکہ مکرمہ میں تعمیری تبدیلیاں بالکل نئی تھیں حرم محترم کی توسیع وتعمیر، نئے طرز کی سربفلک عمارتوں یعنی چوڑی سڑکیں، ہرے بھرے پارک اور فوارے، دور جدید کے تمدن کی فراوانیاں حیرت ناک تھیں حرم شریف کے آس پاس کے علاقے پہچانے نہیں جاتے تھے،عزیزم مولوی خالد کمال مبارک پوری سلمہ اللہ تعالیٰ متعلم جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ مسلسل چار سال سے حجاز مقدس میں رہ کر حج و زیارت کی تمام راہوں سے اور آسانیوں سے واقف ہو گئے ہیں اس لئے انھوں نے اپنے والدین کی خدمت بڑے اچھے انداز میں کی اور دیار مقدس کے یہ تین ماہ بڑی عافیت و آرام سے گذرے۔ ۹؍محرم سے ۱۰؍صفر تک مدینہ منورہ میں قیام نصیب ہوا، سابقہ تعارف وتعلق کے ساتھ ان کی موجودگی نے اس میں بڑی وسعت اور گہرائی پیدا کر دی تھی۔

مکہ مکرمہ میں رابطہ عالم اسلامی کے عہدیداران میں شیخ حسین سراج مدیر عام شیخ عامودی مدیر مجلّہ رابطہ عالم اسلامی اور دوسرے اہل علم سے مسلسل ملاقاتیں اور تبادلہ خیالات کے مواقع کھل کر بے تکلفی کے ساتھ ملے اور تنقید واحتساب کے انداز میں گفتگوئیں رہیں، بار بار رابطہ عالم اسلامی میں آنا جانا ہوا اور اس کے اجلاس میں شرکت ہوئی، اپنے سلسلۂ علمی وروحانی کے مکی مرکز مدرسہ صولتیہ میں بار بار آنا جانا ہوا اور اس کے ارباب کار سے مخلصانہ ملاقاتیں رہیں، مکہ مکرمہ کے علماء و مشائخ خصوصاً شیخ سید علوی مالکی اور الاستاذ عبدالعال عقبادی سے ملنا جلنا رہا، مدینہ منورہ تو کہنا چاہئے کہ بالکل گھر بن گیا تھا شاید ہی کوئی علمی و دینی حلقہ ہو جس میں گذر نہ ہوا ہو، اور مختلف موضوعات پر بات چیت نہ ہوئی ہو جامعہ اسلامیہ کے اساتذہ وشیوخ بڑے خلوص ومحبت سے پیش آئے حضرت شیخ عبدالقادر سیبۃ الحمد استاذ جامعہ محترم ڈاکٹر عنتر، استاذ جامعہ شیخ سعدالدین ملباری مدرس جامعہ اور دوسرے حضرات نہ صرف محبت واخلاص

سے ملتے رہے بلکہ اپنے حسن اخلاق سے بڑے کریمانہ انداز میں پیش آتے رہے مذکورۃ الصدر تین حضرات نے بڑے اعزاز کے ساتھ کھانے پر بلایا اور کئی کئی گھنٹوں تک علمی و دینی مجلسیں رہیں مسجد نبوی میں مغرب کی نماز سے پہلے اور بعدان میں اکثر حضرات کے ساتھ علمی مجلسیں ہوا کرتھیں اسی طرح ہندو پاک کے طلبہ نے اپنے اخلاص اور محبت کا اظہار کیا بڑی عقیدت سے ملتے تھے اور ساتھ بیٹھتے تھے ان میں اکثر نے باصرار انکار کے باوجود کھانے، ناشتے اور چائے کی دعوتیں کیں۔ ان سب میں سنجیدگی شرافت اور ذمہ داری کا احساس بدرجہ اتم موجود ہے اللہ تعالیٰ ان کو اسلام اور علوم اسلام کی سچی تڑپ دے اور مدینہ منورہ کے یہ طالبعلم مدینہ کی برکتوں سے مالا مال ہوں، مکتبہ شیخ الاسلام عارف حکمت کے محترم اراکین اور مکتبہ محمودیہ کے مدیر ذاتی طور سے بڑے خلوص ومحبت سے پیش آتے تھے، مطالعہ، کتب بینی کے کافی اوقات ان بزرگوں سے تبادلۂ خیالات میں گذر جاتے، جامعہ اسلامیہ متعدد بار جانا ہوا، اسباق میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا اس کے مختصر مگر گراں قدر کتب خانے سے استفادہ کا موقعہ ملا، یہاں کے اساتذہ کا طرز تعلیم ہمارے یہاں سے بالکل مختلف ہے، ہمارے یہاں عموماً کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور یہاں پر فنون کی تعلیم دی جاتی ہے، اور کتاب سامنے رکھ کر فن سمجھایا جاتا ہے، اس لئے باشعور طلبہ کیلئے یہ تعلیم بہت ہی مفید ہے، وہ کسی ایک فن کی ایک کتاب پڑھ کر اس فن کو سمجھنے لگتے ہیں اور اس کی حقیقت ان پر منکشف ہوجاتی ہے، اس لئے یہاں کے تعلیمی معیار میں بعض لوگوں کے کلام کرنے کے باوجود بڑی افادیت ہے اس کا صحیح اندازہ درس میں بیٹھنے اور طرز تعلیم پر غور کرنے سے ہوا، واپسی کے موقع پر جدہ میں تین دن قیام رہا اس مدت میں جدہ میں مقیم ہندوستان کے نوجوان، ارباب ذوق کے ساتھ بڑی پر لطف مجلس رہی، جناب عبدالرحیم انصاری (بمبئی) نے بڑے خلوص ومحبت کا اظہار فرمایا اور اپنے حلقہ شعروادب میں بڑے پرتکلف انداز میں پہونچایا۔ ایک رات کھانے کے بعد کئی گھنٹے تک پر لطف علمی وادبی محفل رہی اور آخر میں محترم سید شہاب الدین صاحب فرسٹ سکریٹری ہندوستانی سفارت خانہ جدہ نے اپنے مکان پر نہایت پرتکلف عشائیہ کا انتظام کیا اور سعودی عرب کے جرائد ومجلّات کے ایڈیٹروں، ادیبوں اور مصنفوں کو بھی مدعو کیا یہ تعارفی محفل بہت اہم اور مفید رہی۔ خاص طور سے شیخ حسین سراج، شیخ محمد احمد باشمیل اور سب

سے بڑھ کر الاستاذ عبد القدوس انصاری مدیر مجلۃ المنہل بڑے خلوص ومحبت سے پیش آئے انھوں نے فرمایا کہ وہ بہت پہلے سے ملاقات کے خواہاں تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ مدرسہ العلوم الشرعیہ مدینہ منورہ کے طالب علم رہ چکے ہیں اور حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اوران کے بھائی مولانا سید احمد صاحب سے شرف تلمذ رکھتے تھے اس لئے ان کو اپنے سلسلہ علم کے علماء سے جذباتی تعلق ہے۔ دوسرے راقم کے عربی تاریخی مقالہ "من النار جیل الی النخیل" کو انہوں نے اپنے جریدہ المنہل میں مسلسل چار نمبروں میں شائع کیا تھا۔ اور راقم کی کتاب "رجال السند والھند" پڑھی تھی۔ ان علمی وجوہ سے ان کا جذبہ خلوص بہت ہی نمایاں اور فراواں تھا، وہ تو چاہتے تھے بلکہ اصرار کرتے تھے کہ میں کل ۳؍جون کے آخری جہاز سے نہ جاؤں بلکہ ماہ دو ماہ کے بعد کسی جہاز سے واپس ہوں۔

ان تمام علمی ودینی ملاقاتوں، محفلوں اور گفتگوؤں کی سب سے بڑی وجہ عربی زبان میں بات چیت تھی کئی مشائخ اور علماء نے حیرت سے بار بار دریافت فرمایا کہ عربی زبان آپ نے کہاں سے سیکھی ہے؟ راقم نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ میں پورے طور پر صحیح عربی زبان میں بات چیت نہیں کر رہا ہوں کیونکہ ہمارے یہاں اس کا موقع نہیں ملتا، پھر بھی کچھ کچھ زبان کھل گئی ہے، ہمارے ہندوستانی علماء وفضلاء اگر ذرا سی جرأت دکھا کر اپنی زبان لکھا کریں تو عرب علماء کی محفلوں میں بہت جلد اپنا لوہا منوا سکتے ہیں کیونکہ وہ اہل علم کے بہت قدرداں ہوتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں بڑا سلجھاؤ ہوتا ہے، چنانچہ بعض ہندوستانی علماء عربی میں بات چیت اور تقریر کی وجہ سے کافی مقبولیت حاصل کئے ہوئے ہیں جب کہ ان سے اونچے حضرات اپنی خاموشی کی وجہ سے احساس کمتری میں مبتلا ہیں اور وہاں کے اہل علم سے ملنے جلنے سے کتراتے ہیں۔

xxxxxxxxx

علمی کارنامے

۱۔۔۔قاضی صاحب کے علمی کارناموں کی فہرست

۲۔۔۔قاضی صاحب بحیثیت مورخ ومصنف

۳۔۔۔قدیم ہندوعرب کے روابط

۴۔۔۔مجلّہ ''البلاغ'' اور قاضی اطہر صاحب

۵۔۔۔قاضی اطہر مبارکپوری اور دفاعِ اسلامی

قاضی صاحب کے علمی کارناموں کی مکمل فہرست

قاضی ظفر مسعود ابن قاضی اطہر صاحب مبارکپوریؒ

قاضی صاحب نے جو زبردست علمی و تحقیقی کارنامہ انجام دیا اس کو علمی دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی، یہ قاضی صاحب کے علمی و تحقیقی کارناموں کی مکمل اور جامع فہرست ہے اس میں ان کی تمام اُردو اور عربی تصنیفات کے علاوہ جن زبانوں میں دوسروں نے ان کے ترجمے کئے اور جن اداروں نے اپنے طور پر شائع کیا اور جن مخطوطات کی تصحیح و تحقیق کی ان پر تعلیقات لکھیں یا ان کتابوں کے مسودے حوادث کا شکار ہو گئے اور شائع نہ ہو سکے، ہر ایک کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ یہ فہرست اتنی جامع اور مکمل ہے کہ آئندہ قاضی صاحب کے کارناموں پر تحقیق اور ریسرچ کرنے والوں کیلئے بہترین رہنما ثابت ہوگی، یہ فہرست قاضی صاحب کے صاحبزادے عزیزم قاضی ظفر مسعود سلمہٗ نے تمام کتابوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی ہے۔ ہم ان کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ (اسیر ادروی)

(۲) عرب و ہند عہد رسالت میں (اُردو)

یہ کتاب ۲۰۰ر صفحات پر مشتمل ہے، ۱۹۶۵ء میں اس کا پہلا ایڈیشن ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا، اس کو مصر کے ایک مشہور عالم الدکتور عبدالعزیز عزت عبدالجلیل نے عربی میں ترجمہ کیا اور ۱۹۷۳ء میں الھیئۃ المصر یہ قاہرہ نے اس کو شائع کیا، سندھ (پاکستان) کی تنظیم فکر و نظر نے اس کا سندھی زبان میں ترجمہ کر کے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا، کراچی کے ایک ادارہ مکتبہ عارفین نے اس کا ایڈیشن شائع کیا۔

(۲) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں (اُردو)

یہ کتاب ۳۴۰ر صفحات پر مشتمل ہے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں ندوۃ المصنفین دہلی

نے شائع کیا، اس کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ عارفین کراچی نے شائع کیا، تنظیم فکر ونظر سندھ نے اس کا ایک اور ایڈیشن شائع کیا، مصر کے دکتور عبدالعزیز عزت نے اس کا عربی میں **الحکومات العربیہ فی الھند والسند** کے نام سے کیا اور اس کو اسلام آباد یونیورسٹی پاکستان کے مجلّہ **الدراسات العلمیة** نے قسط وار شائع کیا، پھر مکتبہ آل ید اللہ بکر یہ ریاض نے اس کو کتابی شکل میں شائع کیا۔

(۳) اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ (اُردو)

یہ کتاب ۲۴۳ رصفحات پر مشتمل ہے، ندوۃ المصنفین دہلی نے اس کو ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔

(۴) خلافتِ راشدہ اور ہندوستان (اُردو)

یہ کتاب ۲۸۰ رصفحات پر مشتمل ہے ۱۹۷۲ء میں ندوۃ المصنفین دہلی نے اس کو شائع کیا، بعد میں تنظیم فکر ونظر سندھ نے اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا۔

(۵) خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان (اُردو)

یہ کتاب ۵۵۸ رصفحات پر مشتمل ہے، اس کا پہلا ایڈیشن ندوۃ المصنفین دہلی نے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا، دوبارہ تنظیم فکر ونظر سندھ نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔

(۶) خلافتِ بنوامیّہ اور ہندوستان (اُردو)

یہ کتاب ۶۷۱ رصفحات پر مشتمل ہے، اس کا پہلا ایڈیشن ندوۃ المصنفین دہلی نے ۱۹۷۵ء میں شائع کیا، پھر تنظیم فکر ونظر سندھ اپنے یہاں اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا۔

(۷) دیارِ پورب میں علم اور علماء (اُردو)

یہ کتاب ۴۸۲ رصفحات پر مشتمل ہے، جس میں مشرقی ہندوستان میں علمی سرگرمیوں کا محققانہ تذکرہ ہے، اس کو بھی ندوۃ المصنفین دہلی نے پہلی بار ۱۹۷۹ء میں شائع کیا۔

(۸) تذکرہ علماء مبارکپور (اُردو)

کتاب ۱۹۲ رصفحات پر مشتمل ہے، اس کو دائرہ ملیہ مبارکپور نے ۱۹۷۴ء میں شائع کیا۔

(۹) مآثر ومعارف (اُردو)

یہ کتاب ۲۷۱ صفحات پر مشتمل ہے، اس کو ندوۃ المصنفین دہلی نے ۱۹۷۱ء میں شائع کیا، یہ قاضی صاحب کے پچیس مقالات کا مجموعہ ہے ۔

(۱۰) آثار واخبار (اُردو)

یہ کتاب ۱۵۰ صفحات پر مشتمل ہے، یہ قاضی صاحب کے کچھ مقالات کا مجموعہ ہے، جس کو ندوۃ المصنفین دہلی نے بڑے اہتمام سے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔

(۱۱) تدوینِ سیر ومغازی (اُردو)

یہ کتاب ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ہے، اپنے موضوع پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو علم وتحقیق کا شاہکار ہے، اس کو شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند نے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا۔

(۱۲) خیر القرون کی درس گاہیں (اُردو)

کتاب کا پورا نام ''خیر القرون کی درس گاہیں اوران کا نظام تعلیم وتربیت'' ہے۔ یہ کتاب ۳۹۲ صفحات پر مشتمل ہے، شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے ۱۹۹۵ء میں اسکو شائع کیا۔

(۱۳) ائمۂ اربعہ (اُردو)

کتاب ۲۵۵ صفحات پر مشتمل ہے، جس کو شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے ۱۹۸۹ء میں اہتمام سے طبع کرا کے شائع کیا ہے، اس کا پہلا ایڈیشن مکتبہ تنظیم اہل سنت لاہور نے ۱۹۷۶ء میں شائع کیا تھا۔

(۱۴) بنات اسلام کی علمی ودینی خدمات (اُردو)

یہ کتاب خواتین اسلام کی دینی وعلمی خدمات پر روشنی ڈالتی ہے، اس کو بمبئی کے مشہور مکتبہ شرف الدین الکتبی واولادہٗ نے شائع کیا تھا، دوبارہ اس کو دائرہ ملیہ مبارکپور کی طرف سے بھی شائع کیا گیا۔

(۱۵) اسلامی نظام زندگی (اُردو)

یہ کتاب ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے، اس کو الحاج عبداللہ سمکری ابن حاجی احمد مکی نے رفاہ عام کیلئے اپنی طرف سے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا۔

(۱۶) افاداتِ حسن بصریؒ (اُردو)

یہ ۵۶ ر صفحات کا کتابچہ ہے، جس کو دائرہ ملیہ مبارکپور نے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا۔

(۱۷) مسلمان (اُردو)

یہ بھی ایک کتابچہ ہے، جو ۶۴ ر صفحات پر مشتمل ہے، جس کو جمعیۃ المسلمین جنجیرہ بمبئی نے ۱۹۵۳ء میں شائع کیا تھا۔

(۱۸) الصالحات (اُردو)

یہ بھی ۶۴ ر صفحات کا کتابچہ ہے، جو خاص طور پر خواتین کیلئے لکھا گیا تھا یہ پہلی بار بمبئی سے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا دوبارہ انصار ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر اکیڈمی نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔

(۱۹) تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں (اُردو)

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جو صرف ۳۵ صفحات کا ہے اس کو ۱۹۸۵ء میں مکتبۃ الحق جوگیشوری بمبئی نے شائع کیا تھا دوبارہ شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔

(۲۰) اسلامی شادی (اُردو)

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جو صرف ۳۵ صفحات کا ہے اس کو ۱۹۸۵ء میں مکتبۃ الحق جوگیشوری بمبئی نے شائع کیا تھا دوبارہ شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔

(۲۱) معارف القرآن (اُردو)

یہ ۵۰ صفحات کی کتاب ہے جسکو ایجنسی تاج کمپنی بمبئی نے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا تھا۔

(۲۲) طبقات الحجاج (اُردو)

یہ ۱۹۵ صفحات کی کتاب ہے جس کو انجمن خدام النبی صابو صدیق مسافر خانہ بمبئی نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا تھا۔

(۲۳) علی و حسین (اُردو)

یہ چھوٹے سائز کے ۳۳۶ صفحات پر مشتمل ہے ایک کتاب کی تاریخی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے اس کو ۱۹۶۰ء میں مکتبہ دائرہ ملیہ مبارکپور نے شائع کیا تھا۔

(۲۴) حج کے بعد (اُردو)

یہ مختصر سا رسالہ ہے جو ۴۰ صفحات کا ہے، انجمن خدام النبی بمبئی نے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا تھا،

(۲۵) خواتین اسلام کی علمی ودینی خدمات (اُردو)

یہ کتاب پہلے بنات اسلام کی علمی ودینی خدمات کے نام سے شائع ہو چکی تھی بعد میں کچھ حک واضافہ کے بعد اس کو شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے شائع کیا۔ کتاب میں مزید معلومات کا اضافہ ہے۔

(۲۶) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک (اُردو)

یہ قاضی صاحب کی خودنوشت نہایت مختصر آپ بیتی ہے، پہلے اسکو دائرہ ملیہ مبارکپور نے شائع کیا تھا پھر اسکو مکتبہ صوت القرآن دیوبند نے دوسرا ایڈیشن صاف ستھرا شائع کیا اس کے صفحات ۵۶ ہیں۔

(۲۷) مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر پیشہ میں علم وعلماء (اُردو)

کتاب ۲۲۸ رصفحات پر مشتمل ہے، یہ ایک مقالہ تھا جو ''البلاغ'' کے تعلیمی نمبر کیلئے لکھا گیا تھا، جسے بعد میں قاضی صاحب نے مزید اضافہ کر کے کتابی شکل دی، قاضی صاحب کی وفات کے بعد شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے مئی ۱۹۹۸ء میں اسکو شائع کیا۔

(۲۸) رجال السند والہند الی القرن السابع (عربی)

یہ کتاب عربی زبان میں ہے جو پہلے ۱۹۵۸ء میں ۳۲۸ رصفحات میں محمد احمد میمن برادران بمبئی نے مطبع حجازیہ سے شائع کیا تھا، پھر اس کتاب میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا اور ۱۹۷۸ء میں دارالانصار قاہرہ (مصر) نے دو جلدوں میں ۵۸۸ رصفحات میں شائع کیا، آج وہی ایڈیشن حجاز ومصر اور پاکستان میں دستیاب ہے، پہلا ایڈیشن اب ناپید ہے، اس کتاب کو اہل علم نے بڑی اہمیت دی ہے، یہی کتاب مصر وحجاز میں قاضی صاحب کے تعارف کا باوقار ذریعہ بنی۔

(۲۹) العقد الثمین (عربی)

کتاب کا پورا نام العقد الثمین في فتوح الهند ومن ورد فيها من الصحابة

و التـــابـعـين ہے، یہ پہلی بار ۱۹۶۸ء میں ابناء مولوی محمد بن غلام رسول سورتی بمبئی نے ۳۳۵ صفحات میں شائع کیا تھا، دوسری بار یہی کتاب دارالانصار قاہرہ (مصر) سے ۲۳۱ صفحات میں شائع ہوئی۔

(۳۰) الهند في عهد العباسيين (عربی)

یہ کتاب صرف ۸۷ صفحات پر مشتمل ہے اسکو بھی دارالانصار قاہرہ نے ۱۹۷۹ء میں شائع کیا۔

(۳۱) جواهر الاصول (عربی)

کتاب کا پورا نام جواهر الاصول في علم حديث الرسول ہے۔اس کے مصنف ابو الفيض محمد بن محمد بن علی حنفی فارسی ہیں، یہ کتاب طبع نہیں ہوئی تھی، اس کا مخطوطہ قاضی صاحب کو بعض ذرائع سے دستیاب ہوا تو آپ نے اس مخطوطہ کی تصحیح اور تحقیق کی اور بہت مفید تعلیقات لکھیں، اس کا پہلا ایڈیشن شرف الدين الكتبي و اولادهٔ بمبئی نے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا تھا جو ۱۶۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن الدار السّلفیہ بمبئی نے شایع کیا، جب یہ کتاب حجاز پہونچی تو اس کا ایک خوبصورت ایڈیشن مکتبہ علمیہ مدینہ منورہ نے اہتمام سے شائع کیا اور حجاز میں عام کیا۔

(۳۲) تاريخ اسماء الثقات (عربی)

یہ کتاب ابن شاہین بغدادی کی تصنیف ہے اور طبع نہیں ہوئی تھی، اس کا ایک مخطوطہ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے میں تھا جس سے قاضی صاحب نے نقل لی تھی، استاذی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن محدث الاعظمی نے دیکھا تو قاضی صاحب سے مانگ لیا پھر دوبارہ نقل کر کے اس کی تصحیح و تحقیق کی اور اس پر تعلیقات لکھیں۔ ۱۹۸۶ء میں شرف الدین الکتبی واولادہٗ بمبئی نے اس کو شائع کر دیا، یہ کتاب ۲۳۵ صفحات پر مشتمل ہے، اس کی ابتدا میں قاضی صاحب نے ایک پر مغز مقدمہ لکھا، شاید محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی تحقیق فرمائی ہے اور شاید ابھی تک کتاب طبع نہیں ہوئی ہے۔

(۳۳) دیوان احمد (عربی)

یہ قاضی صاحب کے جد مادری مولانا احمد حسین صاحب رسولپوری کی عربی نظموں کا مجموعہ ہے جس کو مرتب و مدون کر کے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا ہے۔

(۳۴) مئے طہور (اُردو) غیر مطبوعہ

قاضی صاحب کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ جسے مئے طہور کے نام سے مرتب کر کے اس پر مقدمہ لکھ چکے تھے مگر پریس کو نہیں دے سکے۔[(کتاب مولانا سلمان مبشر صاحب کی سعی وکاوش اور مولانا قمر الزماں صاحب کی ترتیب وتقدیم کے ساتھ خوبصورت طباعت کے ساتھ فرید بک ڈپو دہلی سے شائع ہوگئی ہے، اور اس وقت اس کا ایڈیشن ختم ہے۔ مولانا قمر الزماں صاحب نے اس پر بڑا فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے جو لائق مطالعہ ہے) (ضیاء الحق خیر آبادی)

(۳۵) قاضی اطہر مبارکپوری کے سفرنامے (اُردو)

البلاغ میں قاضی صاحب نے جو سفرنامے لکھے تھے، میں نے اسے مرتب کر کے کتابی شکل میں اگست ۲۰۰۵ء میں شائع کیا۔ (ضیاء الحق خیر آبادی)

(۳۶) ہند وسندھ کی قدیم شخصیات (اُردو)

یہ رجال السند والہند کا ترجمہ ہے جو مولانا عبد الرشید بستوی نے کیا ہے، یہ ترجمہ ایک عرصہ سے منتظر اشاعت پڑا تھا، میں نے اپنے دوست راشد شیخ (کراچی) سے اس کا ذکر کیا، ان کی کوششوں سے یہ کتاب پہلے کراچی سے شائع ہوئی، پھر یہ مکتبہ الحق ممبئی نے اسے ہندوستان میں شائع کیا۔] (ضیاء الحق خیر آبادی)

اس کے علاوہ ''سیرت رسول خود حضور کی زبانی'' کے عنوان سے مواد جمع کر رہے تھے، اموی خلفاء وامراء اور تدوین حدیث کے موضوع پر بھی معلومات جمع کر رہے تھے، یہ تمام مسودے نامکمل ہیں قاضی صاحب نے قیام لاہور کے زمانہ میں منتخب التفاسیر کے نام سے ایک ضخیم کتاب مرتب کر کے دانش بکڈپو لاہور کو دی تھی، مذکورہ دونوں کتابیں تقسیم ملک کی نذر ہو گئیں۔ (بشکریہ مجلّہ ''ترجمان الاسلام'' بنارس ''قاضی اطہر نمبر'')

قدیم ہندوعرب کے روابط وتعلقات کے ایک دیدہ ومؤرخ

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری

مولانا نورالحسن راشد صاحب کاندھلوی مدظلہٗ
مدیر مجلّہ ''احوال وآثار'' کاندھلہ ضلع مظفرنگر (یوپی)

پندرہویں صدی ہجری کا آغاز ہندوستانی مسلمانوں کے لئے خوش آئند اور پرمسرت ثابت نہیں ہوا اس صدی کے ابتدا ہی سے ایسے حالات وواقعات پیش آتے چلے گئے جن میں سے ہر ایک کی دکھن اور چبھن لمبے عرصے تک باقی رہے گی ان حوادث وآفات کی ایک بڑی المنا کی یہ ہے کہ ہندوستان برگزیدہ اکابر ومشائخ علماء ومحدثین، فقہا، مصنفین ومحققین اور مؤرخین ومفکرین کے سب سے اہم اور صف اول کے حضرات کے دنیا سے ایک کے بعد ایک کے سفر نے یہاں کے دینی علمی فکری تحقیقی تصنیفی دنیا کو سونا اور دینی علمی محفلوں کو ویران وبے رونق کر دیا کس کس کا نام لیا جائے خاصی لمبی فہرست ہے۔

یہ تأسف اور گہرا ہوا جاتا ہے اور اس غم کی المنا کی کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ رخصت ہونے والوں میں سے ہر ایک اس عہد کا فرد فرید اور اپنے موضوع کا آخری باکمال شخص تھا ایسا کہ ان کے رخصت ہونے کے بعد ایسی بھاری بھرکم شخصیت تو کجا ان کے آس پاس کے اور دوسری صف کے افراد بھی نظر نہیں آتے۔ ایسے ہی منتخب اور مایہ ناز افراد میں سے ایک اہم نام، نامور مؤرخ ومحقق اور عالم **مولانا ابوالمعالی قاضی عبدالحفیظ صاحب اطہرؔ مبارک پوری** کا ہے **رحمۃ اللہ علیہ**۔

قاضی صاحب ان اکابرین ومشاہدین کی صف کی ایک ایسی ممتاز شخصیت تھے جو علمی موضوعات کے نادر انتخاب، اپنی تصانیف ومؤلفات کے موضوع کی جامعیت نیز تحقیق ومطالعہ، وسعت نظر اور نادر معلومات ونتائج اخذ کرنے میں اپنے معاصرین میں بھی بے نظیر تھے۔

قاضی صاحب نے ہندوعرب کے تعلقات کو اپنا خاص موضوع بنایا اور اپنی تصانیف کے

ذریعہ اس کے ایسے پہلو دریافت کئے اور ایسے نئے نئے گوشے تلاش کئے کہ اچھے اچھے اہل نظر بھی حیران وششدر رہ گئے ،عرب اور ان کے تعلقات پر کوئی بڑا علمی سامان دستیاب نہیں تھا اس عنوان کو سب سے پہلے علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے مطالعہ وتصنیف کا موضوع بنایا اور قاضی صاحب نے اس کو اس بلندی تک پہونچایا کہ اس میں بڑا اضافہ آسان نہیں ہے۔

قاضی صاحب سراپا عملی شخصیت تھے اور ہمیشہ انہی موضوعات ومباحث کی اہم علمی کتابوں کی تلاش وجستجو اور ان کے مطالعہ میں غرق رہتے تھے کم لوگ ایسے ہونگے جو علمی انہماک میں قاضی صاحب کے برابر ہوں ۔قاضی صاحب نے چالیس سال سے زیادہ عرصہ تصنیف وتالیف علوم اسلامیہ کی خدمت اور تاریخ کی حنابندی میں بسر کیا۔

قاضی صاحب نے اپنی علمی اور عملی زندگی کا ایک بڑا حصہ تیس سال بمبئی میں گذارا، بمبئی ایسا ظالم شہر ہے جو اچھے اچھے اہل علم کو مسحور کر لیتا ہے اور وہ بمبئی کی رعنائیوں کے اس طرح اسیر ہو جاتے ہیں کہ اپنی علمی صلاحیتوں اور کام کو بالکل بھول جاتے ہیں مگر قاضی صاحب نے تقریباً تیس سال کا عرصہ ایک چھوٹے سے کمرہ میں گذار دیا اور بمبئی شہر کا کوئی اثر اپنے اوپر نہیں آنے دیا وہیں سے اہم علمی تصانیف کے علاوہ ماہنامہ البلاغ کی ادارت متعدد علمی کاموں کی سرپرستی اور ایک اخبار میں برسوں تک مسلسل کام لکھنے کا مشکل کام اس تسلسل اور یکسوئی کے ساتھ انجام دیا کہ حیرت ہوتی ہے ۔پورے مہاراشٹر خصوصاً بمبئی شہر میں کم اردو داں ہوں گے جو قاضی صاحب سے واقف نہ ہوں ،قاضی صاحب خود فرماتے تھے کہ میں بازاروں سے گذرتا تو انگلیوں سے میری طرف اشارہ ہوتے تھے مگر اس غیر معمولی شہرت نے قاضی صاحب کے درویشانہ مزاج اور سادگی اور علمی مصروفیات پر کوئی اثر نہیں ڈالا ان کا کمرہ تھا کتابیں اور علمی مصروفیات ،بمبئی کی گلیوں میں روپیہ کی کس طرح ریل پیل ہے اور دولت کا دریا کس طرح بہہ رہا ہے انہیں اس سے کچھ سروکار نہ تھا رسالہ البلاغ کی علمی شہرت خصوصاً روزنامہ انقلاب کے کاموں کی وجہ سے بمبئی کے تاجروں کا بھی ایک بڑا طبقہ ان سے واقف تھا کئی ایک نے قاضی صاحب کو مالی تعاون کی پیش کش کی اور بعض اچھی خاصی رقم لے کر خود ان کے کمرہ پر حاضر ہوئے اور چاہا کہ قاضی صاحب اپنا بڑا علمی ادارہ قائم کریں مگر قاضی صاحب کی درویشانہ مزاج نے قبول نہ کیا اور اسی شان سے

اپنا کام کرتے رہے۔

طویل مسلسل گہرے مطالعہ باریک بینی اور دقت نظر سے اخذ و اقتباس اور برسوں کے طویل مطالعہ کے بعد اس کے نتائج کو خاص ترتیب اور وسیع پس منظر کے ساتھ پیش کرنا قاضی صاحب کا ایسا امتیاز ہے جو قاضی صاحب کو ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کے ممتاز محقق اور دیدہ ور مصنفین کی صف میں شامل کرتا ہے۔ قاضی صاحب اگر چہ مدرسہ شاہی مرادآباد کے فاضل تھے لیکن ان کا علمی طریقہ کار علامہ شبلی اور علامہ سید سلیمان ندوی کی نمائندگی کرتا ہے: وہی عزت وہی عظمت وہی شانِ دلآویزی۔

موضوعات کے انتخاب، مطالعہ اور تحقیق کے نہج اور تصانیف ومضامین کی جامعیت ہر ایک میں وہی انداز جھلکتا ہے ۱۹۴۷ کے بعد ہندو پاکستان کے بلند پایہ مصنفین اور ایسے صاحب نظر محققین کی فہرست میں جن میں سے ہر ایک کا کام ایک بڑے ادارہ کے کام کے برابر ہے، قاضی صاحب کا نام بھی بلا تکلف لیا جا سکتا ہے۔

قاضی صاحب مؤرخانہ مزاج وسعت مطالعہ حسن انتخاب اور عمدہ ترتیب وتہذیب کے ساتھ قلم اٹھاتے ہیں اور متعلقہ موضوع کے تمام پہلوؤں کو واضح کرتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ درجہ بدرجہ تمام عنوانات اور پہلو صاف ہوتے چلے جاتے ہیں قاضی صاحب نے ''کا تا اور لے دوڑی'' کو کبھی پسند نہیں کیا، قاضی صاحب کا بنیادی اصول جو ان کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ''یک در گیر اور محکم گیر'' کا ہے، قاضی صاحب نے غالباً اپنی علمی زندگی کے آغاز پر ہندوستان اور عربوں کے باہمی روابط وتعلقات اور ان کے متعلقہ گوشوں کو اپنے مطالعہ اور تحریر کے لئے خاص موضوع کے طور پر چن لیا تھا اور تمام زندگی اسی کی تلاش وتحقیق میں لگے رہے۔ اگر چہ قاضی صاحب نے اور موضوعات پر بھی لکھا ہے مگر اساسی موضوع یہی عرب اور ہند کے تعلقات کا موضوع ہے قاضی صاحب کی غالباً سب سے بڑی پہلی تالیف اور قابل ذکر خدمت تفسیر قرآن پر تھی جن میں سات اہم اور ممتاز تفسیروں کا انتخاب پیش کیا گیا تھا اور اسی مناسبت سے اس کا نام منتخب التفاسیر رکھا تھا، قاضی صاحب نے کتاب لاہور قیام کے زمانہ میں لکھی اور اسی دور میں سیر صحابیات اور علمائے اسلام کی خونی داستان، پر وقیع کتابیں لکھیں مگر

افسوس کہ یہ تینوں اشاعت سے محروم رہیں لاہور سے واپسی کے بعد قاضی صاحب نے بمبئی کو اپنا مسکن بنایا اور وہاں ایک چھوٹے کمرہ میں بیٹھ کر ایسے بڑے بڑے کام انجام دیئے جو بڑے بڑے ادارے بھی مشکل سے کر سکتے ہیں۔

ذکر آ چکا ہے کہ قاضی صاحب نے ہندوعرب کے تعلقات کو اپنی علمی موضوع کے طور منتخب کر لیا تھا۔ قاضی صاحب نے اس موضوع پر ترتیب وار کتابین پیش کرنی شروع کیں اور تن تنہا اس موضوع پر ایک انسائیکلو پیڈیا مرتب کر دیا جو درج کتابوں پر مشتمل ہے: عرب و ہند عہد رسالت میں، خلافت راشدہ اور ہندوستان وخلافت بنی امیہ اور ہندوستان وخلافت عباسیہ اور ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں اور اسی موضوع پر عربی میں بھی تین کتابیں لکھیں۔

مذکورہ بالا تصانیف میں سے ایک کتاب کے پڑھنے سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مصنف نے اسکے مواد فراہم کرنے میں کس قدر کی برسہا برس کے مسلسل مطالعہ کے بعد ضروری معلومات فراہم کیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔

آخری کتاب اوپر کی تمام کتابوں کا گویا ضمیمہ اور تکملہ اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو عرب کے سیاسی وثقافتی تعلقات نے دونوں ملکوں کو کیسے کیسے فائدے پہونچائے اور عرب کی وادیوں سے اٹھنے والے علمائے کرام اور محدثین نے ہندوستان کی علمی فضاؤں کو کیسی آب وتاب اور زندگی بخشی عربوں کی آمد سے اس خطہ کی علم نا آشنا فضائیں کس طرح معمور اور مخمور ہو گئیں تھیں۔ اور جب ذہن ہندی نطق اعرابی سے آشنا ہوا تو اس نے علم وکمال کی دنیا میں کیسے کیسے آباد کئے اور ان کی محنت اور برکت سے علوم دینیہ اسلامیہ اور تاریخ وادب کے چمن میں کیسی بہار آئی اور فضا ئیں کس طرح مشک بار اور عنبر بیز ہو گئیں تھیں۔ قاضی صاحب کی علمی تحقیقات سے یہ دلچسپ حقیقت سامنے آئی جس سے ہندو پاکستان کے قارئین کو خوشی ہوتی ہے کہ چند ہندنزاد علماء، ائمہ محدثین عالم اسلام کے نامور علماء اور بڑے اساتذہ فن کے مربی اور استاد تھے اور عالم اسلام کی علمی ترقی اور علوم اسلامیہ پر کتابوں کے اہم ذخیرے میں ہندوسندھ کے علماء کا نہایت وقیع اور ناقابل فراموش حصہ ہے۔

قاضی صاحب اس مقصد کے لئے ایسی کتابوں کا شاید حرفا حرفا مطالعہ کیا ہے جن میں سے

اکثر دو تین جلدوں سے پندرہ بیس جلدوں تک کی ضخامت کی ہیں ان میں کئی ایسی بھی ہیں کہ ان کی ایک جلد کو بھی پورے اہتمام سے پڑھ لینا اچھا خاصہ کام ہے مگر قاضی صاحب کے ذوق علم صبر وضبط اور یکسوئی کے مزاج نے اس ہفت خواں اور مشکل مرحلہ کو اس طرح طے کیا کہ شاید قاضی صاحب کے قریب رہنے والے کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا ہوگا کہ وہ ایسے علمی اور بڑے کام میں مشغول ہیں۔

عرب و ہند کے تعلقات قاضی صاحب کا عزیز ترین موضوع تھا لیکن قاضی صاحب دو سرے موضوعات ومضامین سے بھی بے تعلق نہیں تھے قاضی صاحب کی تصانیف میں سے خیر القرون کی درسگاہیں ان کی نظام تعلیم وتربیت اور تدوین وسیر مغازی قابل ذکر ہیں۔ یہاں قاضی صاحب کی ایک اہم دریافت ابن شاہین کی تاریخ الثقات کی تصحیح وتعلیق کا تذکرہ بھی ضروری ہے اس کا ایک قلمی نسخہ جو ۱۱۱۳ کا لکھا ہوا تھا قاضی صاحب کی نظر سے گذرا قاضی صاحب نے اس نسخہ کو علمی طریقہ پر مرتب کیا، رجال ومتن کی تصحیح کی اور اس پر ضروری حاشیہ اور ائمہ فن رجال کی تصانیف سے تحقیق وتنقید کی یہ کتاب ۱۴۰۶ میں بمبئی سے شائع ہوئی۔ قاضی صاحب نے اصول حدیث کے ایک معروف متن جواہر الاصول کو دو خطی نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ہے جس میں سے ایک نسخہ جو رجب ۱۲۱۲ (   ) کا مکتوبہ ہے اور قاضی صاحب کے ذاتی ذخیرہ میں محفوظ ہے۔ قاضی صاحب کی رائے یہ تھی کہ یہ نسخہ ہندوستان کے ایک مشہور عالم اور شیخ مرشد حضرت شاہ قاضی ثناءاللہ پانی پتی کے خلیفہ اور جانشین حضرت شاہ غلام علی دہلوی (وفات ۱۲۴۰) کے دست مبارک کا لکھا ہوا ہے (۱) دوسرا نسخہ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں تھا جس پر تاریخ کتابت تھی نہ کاتب کا نام قاضی صاحب نے ان دونوں نسخوں کی مدد سے جواہر الاصول کو مرتب کیا اس پر ضروری حاشیہ اور تعلیقات تحریر فرمائیں مقابلہ اور تصحیح کا کام صرف تیرہ دن میں مکمل ہوگیا تھا۔ حالانکہ رمضان میں اور معمولات بھی خاصے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں جس سے قاضی صاحب کی قوت کار کا علم ہوتا ہے اور یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کے وقت میں برکت تھی اس کا ایک اور اندازہ قاضی صاحب کی مرتبہ کتاب تاریخ اسماء الثقات لابن الشاہین سے بھی ہورہا ہے، جس کی تحقیق وتعلیق کا عمل ۱۴ رجب ۱۴۰۲ کو شروع ہوا تھا اور تیس رمضان المبارک کو ہوگیا۔

مصروفیات کے اس ہجوم میں قاضی صاحب نے اپنے علاقہ اور وطن کو کبھی فراموش نہیں کیا اور علمی موضوعات کے ساتھ پورب اور مشرقی یوپی کے آخری اضلاع کے علماء اور اہل کمال کے احوال وسوانح کی تحقیق اوران کے علمی آثار کی جستجو کرتے رہے مولانا نے پورب کے اکابر علماء پر اعلی درجہ کے تحقیقی مضامین لکھے جن کا ایک عمدہ مجموعہ دیار پورب میں علم اور علماء کے نام سے ( ) شائع ہو چکا ہے اس موضوع کے مولانا کے چند اور مضامین بھی ہیں جو اس مجموعہ میں شامل نہیں، ضرورت ہے کہ ان سب کو مرتب کرکے اس کتاب کے دوسرے حصہ کے طور پر شائع کیا جائے قاضی صاحب نے اس موضوع پر عام سے خاص کی طرف سفر کیا اس سلسلہ کی قاضی صاحب کی دوسری تالیف تذکرہ علماء مبارک پور ہے جس طرح اور موضوعات کی تصانیف کا گو تکملہ عربی میں پیش کیا گیا ہے۔

اسی موضوع کا تکملہ بھی اسی انداز پر ہوا ہے قاضی صاحب نے اپنے نانا ممتاز عالم اور عربی کے صاحب ذوق شاعر مولانا احمد حسن مبارک پوری کا عربی کلام جمع کیا اور اس کو مرتب کر کے شائع کیا دینی علمی ادبی موضوعات چھوٹی بڑی کتابیں اور مضامین لکھتے رہتے تھے سب مضامین کو موضوعات کی ترتیب سے یکجا کر کے شائع کر دیا جائے تو وہ ضائع ہونے سے محفوظ رہیں گی اور ان سے ہمیشہ استفادہ ہوتا رہے گا۔

قاضی صاحب کی صرف یہی ایک مصروفیت نہیں تھی قاضی صاحب تقریبا بیس سال تن تنہا ایک علمی پرچہ البلاغ نکالتے رہے جن لوگوں کو علمی رسالہ نکالنے کا کچھ بھی تجربہ ہے وہی جانتے ہیں کہ یہ کیسا مشکل کام ہے خصوصا جب کہ ادارت سے لیکر مضامین تک اور مضامین سے اشاعت تک کی ذمہ داری ایک ہی شخص پر ہو صرف یہی ایک کام شب وروز کی مصروفیت کے لئے کافی ہے مگر قاضی صاحب کا ذوق بلند اور نشیمنوں کی طرف بھی مائل پرواز رہتا تھا۔ قاضی صاحب کی اور بھی علمی مصروفیات تھیں۔

قاضی صاحب روز نامہ انقلاب کیلئے ہفتہ وار کالم بھی پابندی سے لکھتے تھے۔ ہندو پاکستان کے ممتاز ترین علمی رسائل کے لئے وقیع مضامین لکھتے تھے جس میں سے بعض مضامین غیر معمولی اہمیت کے ہوتے تھے ایسے کہ ان کو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب

جیسے اساطین علم بھی توجہ سے پڑھتے اوران پراپنی رائے، استدراک، ضمیمہ اور تکملے لکھتے تھے۔(۱)

قاضی صاحب شعروسخن کا بھی عمدہ ذوق رکھتے تھے قاضی صاحب کا تخلص اسی ذوق سخن کی یادگار تھا۔ قاضی صاحب نے تعلیم کے بعد معاش کیلئے غالبًا پہلا سفر امرتسر کا کیا تھا۔ یہ زمانہ لاہور کے علمی شباب کا تھا علم وفن شعروادب اور تحریر وصحافت کے بڑے بڑے شہ سوار اور علمی، ادبی دنیا کے متعدد بلند پایہ ادیب، شاعر اور مصنف لاہور میں قیام فرماتے جس کی بدولت لاہور میں علمی، ادبی رونقیں شباب پر تھیں، اور ہر طرف یہی چرچے اور تذکرے رہتے تھے جس کی وجہ سے غیر منقسم ہندوستان کے اچھے اچھے باذوق نوجوان لاہور میں جمع ہو گئے تھے اسی وقت قاضی صاحب بھی لاہور پہونچے، قاضی صاحب کی علمی صلاحیت اور تحریر وتالیف کا جوہر بھی اسی علمی آبشار سے فیض یاب ہوا۔

لاہور کے اس وقت کے ایک مشہور اخبار زمزم نے قرآن پاک کی عمدہ تفسیروں کا ایک انتخاب مرتب کرانے کا ارادہ کیا اور اس خدمت کیلئے قاضی صاحب کو لاہور آنے کی دعوت دی، قاضی صاحب نے اسے قبول کرلیا اور لاہور پہونچ گئے۔ لاہور کے قیام نے قاضی صاحب کی زندگی پر خاصا گہرا اثر ڈالا، قاضی صاحب جو اعلیٰ درجہ کی علمی صلاحیت اور زبان وادب کا عمدہ ذوق رکھتے تھے لاہور کی علمی محفلوں اور شعروادب کے حلقوں سے خوب فائدہ اٹھایا۔

اس زمانہ میں لاہور کے علمی افق پر جونام بہت آب وتاب سے روشن تھے اور پورے ملک

---

(۱) مثلاً قاضی رشید ابن زبیر کی اہم تصنیف الذخائر والتحف علامہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے مقدمہ اور تعلیق کے ساتھ شائع ہوئی۔ قاضی صاحب نے اس پر مفصل تبصرہ لکھا جو ماہنامہ معارف اعظم گڈھ کے دو شماروں اپریل ومئی ۱۹۶۰ء میں چھپا۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنے مقدمہ میں یہ لکھا تھا کہ کتاب کے مصنف کا حال مجھے کسی کتاب میں نہیں ملا مگر کتاب کی اندرونی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پانچویں صدی ہجری کے عالم تھے۔ قاضی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں جو معارف اعظم گڈھ دسمبر ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا، یہ لکھا کہ قاضی رشید ابن زبیر کا تفصیلی ذکر ابن خلکان کے یہاں موجود ہے۔ قاضی صاحب کی اس صراحت کا حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب نے اپنے ایک مضمون میں مفصل جائزہ لیا اور اس میں قاضی صاحب سے جو فروگذاشت ہوگئی تھی اس کی وضاحت کی اور ثابت کیا کہ قاضی صاحب کی اطلاع صحیح نہیں ہے۔ حضرت مولانا کا یہ مضمون معارف اعظم گڈھ فروری ۱۹۶۱ء میں چھپا تھا اس طرح کے ایک دو مضامین اور بھی ہیں۔

میں ان کا غلغلہ اور چرچا تھا ان میں احسان دانش (۱) کا نام بھی بہت نمایاں تھا۔ قاضی صاحب کے احسان دانش سے واقفیت و روابط ہوئے جو جلد ہی دوستی اور شاگردی میں تبدیل ہو کر اور گہرے ہو گئے تھے شعر وسخن میں قاضی صاحب احسان دانش کے باقاعدہ شاگرد ہو گئے تھے، تلمذ واستفادہ کا یہ سلسلہ برسوں تک جاری رہا۔ قاضی صاحب کی احسان دانش صاحب کے ساتھ مستقل مجلسیں جمتیں۔ اور شعر وسخن کا دور چلتا تھا اور فنی، ادبی، نکات پر گفتگو ہوتی، قاضی صاحب کا اکثر شام چار بجے احسان دانش کے یہاں جانے کا معمول تھا، وہاں سے عشاء کے بعد واپسی ہوتی اور کبھی کبھی رات میں بھی احسان صاحب کے پاس ٹھہرتے اور رات دیر گئے تک شعر وسخن کا چرچا رہتا۔ احسان دانش نے اپنی آپ بیتی میں ایک سے زائد مقامات پر قاضی صاحب کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ قاضی اطہر مبارکپوری فن شعر میں میرے شاگرد ہیں۔ (جہانِ دانش، آپ بیتی احسان دانش ص:۳۷۹، ج: اول)

احسان دانش اس کے بھی معترف تھے کہ میرے مطالعات کیلئے اعلیٰ عمدہ کتابوں کی فراہمی میں قاضی صاحب کا بھی خاص حصہ ہے جو میرے لئے اچھی کتابوں کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ (جہانِ دانش، ج:۱، ص:۴۶۷)

احسان دانش نے جو بہت سے کام کئے اور منصوبے بنوائے ان میں سے ایک منصوبہ ایک معیاری تصنیفی ادارے کے قیام کا بھی تھا جس کیلئے احسان دانش نے قاضی صاحب سے علماء اسلام کی خونی داستانیں نام کی کتاب بھی لکھوائی تھی۔ احسان صاحب نے لکھا ہے کہ اس کا کتابت شدہ نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ (جہانِ دانش، ج:۱، ص:۴۶۷)

قاضی صاحب کے جناب احسان دانش سے آخر تک روابط اور مسلسل خط وکتابت رہی، معلوم ہوا کہ قاضی صاحب کے نام　　(حوالہ بالا)

(۱) احسان علی بن قاضی دانش علی کا آبائی وطن تو باغپت تھا لیکن احسان دانش کی والدہ کاندھلہ ضلع مظفرنگر یوپی کی تھیں۔ کاندھلہ میں احسان کی ولادت ہوئی یہیں چار درجہ تک تعلیم حاصل کی۔ یہیں ابتدائی ملازمتیں اور مزدوری کی اور یہیں ان کی شاعری کے بال و پر نکلے۔ بعد میں تلاش معاش میں لاہور چلے گئے وہیں وفات ہوئی۔

قاضی صاحب بحیثیت مؤرخ ومصنف

مولانا ظفر احمد صدیقی، ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

فاضل اجل وعالم بے بدل حضرت مولانا **قاضی ابو المعالی عبد الحفیظ اطہر** مبارک پوری (۱۳۳۴ھ۔۱۴۱۷ھ/۱۹۱۶ء۔۱۹۹۶ء) ایمان اور عمل صالح کی جامعیت علمی وتصنیفی مشاغل اور سادہ متواضع سیرت وشخصیت کے لحاظ سے بلاشبہ سلف صالحین کی نظیر تھے۔ دیار پورب، خطۂ اعظم گڈھ اور سرزمین مبارک پوران پر جس قدر بھی فخر کریں کم ہے۔ تاریخ وطبقات اور سیر وتراجم کے مختلف گوشوں پر ان کی گراں قدر تصانیف ومقالات کیف وکمیت ہر دولحاظ سے عالم اسلام کے کتب خانہ میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ نامساعد حالات، ناسازگار ماحول، اور بے سروسامانی کے باوجود انہوں نے جو بلند پایہ علمی کارنامے انجام دئے ہیں وہ تحقیقی وتصنیفی اداروں کے ان ارکان اور بڑے بڑے مراکز علمی کے ان وابستہ گان کے لئے تازیانۂ عبرت ہیں جو وادی غیر ذی زرع'' کی عملی تفسیر ہیں، یعنی ایک مدت سے ان کا قلم خشک اور کشت زار علم ویراں ہے۔

باوجود یک جہاں ہنگامہ، پیدائی نہیں

قاضی صاحب کے علمی کارناموں کی تعیین قدر اور تجزیہ وتبصرے کے لئے وسیع علم، غائر مطالعہ اور کم از کم ایک مکمل کتاب کی وسعت درکار ہے اس ناچیز کی بے بصری و، ہیچ مدانی کا حال یہ ہے کہ وہ موصوف کے بہت سے مراجع و مآخذ کا صورت آشنا بھی نہیں۔ ایسی صورت میں قاضی صاحب کی فتوحات علمیہ کے بارے میں لب کشائی، تحسین ناشناس، کے مرادف ہوگی، اس لئے پیش نظر مضمون کو ان کی ایک خوردسال عقیدت کیش کی جانب سے محض ایک طالب علمانہ خراج عقیدت تصور کیا جائے۔

قاضی صاحب کی تمام حیثیتوں میں سب سے نمایاں حیثیت اسلامی ہند کے ابتدائی مؤرخ کی ہے ابتدائی عہد سے مراد آغاز اسلام سے لیکر خاتمہ بنوعباس تک کا دور ہے واقعہ یہ ہے کہ اسلامی

ہند کے اس دور کی تاریخ پر صدیوں سے تاریکی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ قدیم عرب مؤرخین میں سے بیشتر نے سندھ و ہند کے علاقہ جات اور یہاں ابتدائی فتوحات اور ثقافتی روابط کو چنداں قابل اعتنا تصور نہیں کیا اور اگر بعض لوگوں نے خال خال اس طرف توجہ بھی کی بھی تو ان کی کتابیں دستبرد زمانہ کی نذر ہو گئیں۔ جہاں تک ہندی مؤرخ کا تعلق ہے تو ان کی تمام تر تحریریں عہد غزنوی یا زمانۂ مابعد سے متعلق ہیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ یہ لوگ اسلامی ہند کے ابتدائی ادوار کی تاریخ سے چنداں واقفیت ہی نہیں رکھتے تھے۔ یہاں قاضی صاحب کی ہمت اور حوصلہ کی داد دینی چاہئے کہ انہوں نے اپنے علمی جد و جہد اور تگ و تاز کا میدان اسی عہد کی تاریخ کو قرار دیا اور پھر اس بے آب و گیاہ صحرا میں اپنے سفر کو برابر جاری رکھا۔

یہاں تک کہ متعلقہ عہد کی مکمل تاریخ جدید معیار و مذاق کے مطابق مرتب ہو گئی، جس میں جنگی مہمات و فتوحات کی تفصیلات بھی ہیں اور ملکی و تمدنی احوال و کوائف کی جزئیات بھی۔ اس کے علاوہ علمی و تہذیبی سرگرمیوں کا جائزہ بھی ہے۔

قاضی صاحب کو ادب اور لغت کے علاوہ تاریخ و طبقات اور سیر و تراجم کی کتابوں کے مطالعہ کا ذوق اور ان سے شغف زمانۂ طالب علمی سے ہی تھا چنانچہ تاریخ و طبقات سے متعلق متعدد اہم مراجع کا مطالعہ دوران طالب علمی ہی کر چکے تھے۔ مثلاً

الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب لابن عبد البر — دلائل النبوۃ لابی نعیم الاصفہانی
وفیات الاعیان لابن خلکان — کتاب الملل والنحل للشہرستانی
سیرۃ ابن ہشام — وفاء الوفاء للسمہودی
تہذیب التہذیب لابن حجر — الاخبار الطوال لابی حنیفۃ الدینوری
طبقات الامم لابن صاعد الاندلسی — الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ لابن حجر
فتوح البلدان لابی الحسن البلاذری — الفہرست لابن ندیم
زاد المعاد فی ہدی خیر العباد لابن القیم — تذکرۃ الحفاظ للذہبی
کتاب الخراج للقاضی ابی یوسف — الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ
کتاب المعارف لابن قتیبہ

ان کتابوں کے مطالعے اوران سے شغف وانہماک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتداء ہی سے قاضی صاحب موصوف میں ان کتابوں سے اخذ واقتباس کا سلیقہ پیدا ہوگیا اور انھوں نے دور طالب علمی ہی میں عربی میں ایک کتاب ''مرأۃ العلم'' کے نام سے مرتب کی، جس میں علمائے سلف اور مختلف ائمہ علم وفن کے واقعات جمع کئے۔ اسی طرح ائمہ اربعہ کے نام سے اردو میں ایک کتاب قسط وار مضامین کی شکل میں شائع کی۔

حسن اتفاق سے قاضی صاحب کو شوال ۱۳۶۷ھ سے شعبان ۱۳۶۸ھ (۱۹۴۸) تک جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں بحیثیت مدرس قیام کا موقع ملا۔ یہاں کا کتب خانہ مختلف علوم وفنون کی امہات کتب سے مالا مال تھا۔ قاضی صاحب نے اس سے پورا پورا استفادہ کیا اور یہیں انھوں نے سندھ وہند سے متعلق اپنی پہلی معرکۃ الآراء تصنیف ''رجال السند والهند'' کی داغ بیل ڈالی اور پھر وہ تقریباً دس سال تک برابر اس کی ترتیب وتہذیب میں مصروف رہے۔ چنانچہ اس کا پہلا ایڈیشن ذی الحجہ ۱۳۷۷ھ/جون ۱۹۵۸ء میں منظر عام پر آیا۔

قاضی صاحب نے اس کتاب میں عہد رسالت سے لے کر ساتویں صدی ہجری تک کے ان تمام علماء ومحدثین، رواۃ، فقہاء، مشائخ، ادباء، شعراء، متکلمین، فلاسفہ اور مختلف پیشوں سے متعلق اشخاص کا ذکر کیا ہے، جن کا مولد ومنشأ سندھ وہند تھا۔ اسی طرح ان لوگوں کے تراجم بھی قلم بند کئے جن کی ولادت ونشو ونما کہیں اور ہوئی لیکن ان کے آباء واجداد خطۂ سندھ وہند سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ کتاب ۳۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اور عربی زبان میں ہے۔ لیکن اس میں قاضی صاحب کی اپنی عبارتیں کم ہیں۔ اس کی تصریح انھوں نے مقدمۂ کتاب میں بھی کر دی ہے لیکن جہاں کہیں اور جتنا کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ صاف ستھری اور شستہ عربی میں لکھا ہے۔ کہیں بھی عجمیت یا عجز بیان کا احساس نہیں ہوتا۔ دراصل قاضی صاحب نے یہ کتاب قدماء کے طرز پر لکھی ہے اور شروع سے اخیر تک ان کا انداز برقرار رکھا ہے۔

اس کتاب کی اصل قدر وقیمت موضوع کے ساتھ کامل انصاف اور تراجم کے احاطہ و استیعاب میں پنہاں ہے۔ مصنف نے اپنے دائرہ کار میں داخل اشخاص واعلام کے تراجم فراہم

کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔اس سلسلے میں مصنف موصوف کی سعی وجستجو اور تلاش وتفحص کا اندازہ لگانا ہوتو رجال السند والھند کا موازنہ مولانا عبدالحی حسنی کی معرکہ آراء تصنیف ''نزھۃ الخواطر'' کی ابتدائی جلدوں سے کرنا چاہئے۔اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ نزھۃ الخواطر''ہندوستانی علماء کے تراجم پرنہایت بلند پایہ کتاب ہےاوراس کے مصنف کوفضل تقدم بھی حاصل ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ اعتراف بھی کرنا چاہئے کہ مراجع وماخذ کی قلت اور بعض دیگر وجوہ کی بناپراس میں ابتدائی چارصدیوں کے ہندوستانی علماء کے تراجم خاطرخواہ نہیں آسکتے ہیں۔کم ترک الاول للآخر کے بمصداق قاضی صاحب نے رجال السندوالھند کے ذریعے اس کمی کی تلافی کردی ہے۔اس سلسلے میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی علیہ الرحمہ کے یہ دو جملے سنداورشہادت کا درجہ رکھتے ہیں:

''حضرت العلامہ قاضی ابوالمعالی اطہر مبارکپوری کی تصنیف ''رجال السندوالھند'' کے مطالعہ سے مستفید ومحظوظ ہوا۔اللہ تعالیٰ موصوف کوجزائے خیرعطافرمائے۔آپ نے ہندوسندھ کے مایۂ فخر وامتیازمگرتاریخی مظلوم گروہ کے تراجم وتذکرہ کوایک منظّم صورت میں پیش کرکےایک بڑے خلاکو پورافرمایا:'' (مکتوب بنام قاضی صاحب)

اس کتاب کی اہمیت کا ایک پہلواوربھی ہےاوروہ یہ کہ اس نے قاضی صاحب کے آئندہ علمی سفرکارخ اوراس کی منزلیں طے کیں۔اس کی قدرےتوضیح یہ ہے کہ''رجال السندوالھند'' کی ترتیب وتدوین کے دوران موصوف نے حدیث، رجال، سیرت مغازی، تاریخ طبقات، تذکرہ وتراجم، جغرافیہ، لغت، شعروادب، اوربعض دیگرعلوم وفنون کی سو سے زائدامہات کتب کا بار بارمطالعہ کیا اوراکثر و بیشتر کو بالاستیعاب پڑھا، بلکہ یوں کہئے کہ حتی الامکان پوری طرح کھنگال ڈالا۔اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ اپنے موضوع اوراس کے متعلقات پر پوری طرح حاوی ہوگئے اوراسلامی ہند کے ابتدائی چارسوسالہ عہد کی تاریخ کا اجمالی خاکہ ان کے ذہن میں مرتب ہوگیا جن میں وہ برابررنگ آمیزی وگل گاری کرتے اوراسے خوب سے خوب تر بناتے رہے۔

''رجال السندوالھند'' کے بعد قاضی صاحب نے اپنی فکرونظر کا مرکز ومحور''عہد رسالت میں عرب وہند'' کوقرار دیا اورابتداء میں دارالمصنفین اعظم گڈھ کے علمی وتحقیقی ترجمان ماہنامہ

معارف میں اس کے مختلف ابواب شائع کرائے بعدۂ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے اپنے موقر ادارے ندوۃ المصنفین دہلی کی جانب سے اسے کتابی شکل میں شائع کیا۔اس کام کی تکمیل رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ تک ہوچکی تھی ،لیکن اشاعت رمضان ۱۳۸۴ھ رجنوری ۱۹۶۵ء میں عمل میں آئی ،چونکہ دارالمصنفین اور ندوۃ المصنفین دونوں ہی ملک کے اہم ترین علمی و تصنیفی ادارے تھے اور قاضی صاحب یہ تصنیف ان دونوں اداروں کے توسط سے منظر عام پر آئی تھی پھر موضوع کی ندرت اور مصنف کا حزم واحتیاط نیز تحقیقی انداز اس پر مستزاد تھا۔اس لئے کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور علمی حلقوں میں اسے قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

''رجال السند والھند'' کے برخلاف قاضی صاحب نے یہ کتاب اردو زبان میں لکھی،اس لئے ان کے علم کا فیضان عام اور قدر شناسوں کا حلقہ بھی وسیع ہوا، پھر مصنف کو ایک معتمد علیہ ناشر اور ناشر کو ایک بلند پایہ مصنف ہاتھ آیا،اس لئے آئندہ کی تصنیفی سرگرمیوں کے لئے راہیں ہموار ہوئیں۔چنانچہ قاضی صاحب کی اگلی کتاب ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی ،ان دو اردو کتابوں کی اشاعت کے بعد وہ پھر عربی کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے وسیع تر مطالعہ نیز متعلقہ مآخذ ومراجع پر کامل دسترس کے نتیجے میں ،محض ایک سال کی قلیل مدت میں ''القعد الثمین فی فتوح الھند ومن ورد فیھا من الصحابة والتابعین'' کے نام سے ایک جامع کتاب مرتب کردی۔اس کا سال اشاعت ۱۹۶۸ء ہے اس دوران انھوں نے اسلامی ہند کے ابتدائی ادوار کی بعض اہم شخصیات قابل ذکر مراجع و مآخذ اور بعض دیگر امور سے متعلق تحقیقی مقالات کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔چنانچہ اس سلسلے کے آٹھ منتخب مقالات کا مجموعہ ''اسلامی ہند کی عظمت رفتہ'' کے عنوان سے ۱۹۶۹ء میں اشاعت پذیر ہوا۔اس کے بعد موصوف کی تین کتابیں ''خلافت راشدہ اور ہندوستان'' خلافت بنوامیہ اور ہندوستان'' اور'' خلافت عباسیہ اور ہندوستان'' بالترتیب ۱۹۷۲،۱۹۷۵،۱۹۸۲ء میں شائع ہوئیں۔اس طرح انھوں نے اسلامی ہند کے ابتدائی ادوار کی تاریخ نگاری کا منصوبہ نہایت حسن وخوبی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہونچادیا۔

اہل علم واقف ہیں کہ اردو میں جدید طرز کی تاریخ نگاری کے بانی علامہ شبلی نعمانی ہیں، انھوں نے یوروپین مصنفین کے انداز پر المامون (۱۸۸۹ء) اور پھر الفاروق (۱۸۹۸ء) مرتب

کی، پھر انہیں کے طرز پر مولوی عبدالرزاق کانپوری نے اپنی تاریخی کتابیں لکھیں، جن میں البرامکہ (۱۸۹۷ء) کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ پھر مولانا سید سلیمان ندوی اور دیگر رفقائے دارالمصنفین نے جدید تاریخ نگاری کی اس روایت کو مزید فروغ واستحکام بخشا۔ قاضی صاحب ان کتابوں سے ناواقف نہ تھے، بلکہ جیسا کہ انھوں نے اپنی خودنوشت میں تصریح کی ہے، وہ دور طالب علمی ہی میں دارالمصنفین کی بیشتر کتابوں کا مطالعہ کر چکے تھے، اس لئے یقین ہے کہ ایک صاحب بصیرت اور باشعور قاری کی طرح اپنے پیش رو مصنفین کے اسلوب نگارش اور انداز تحریر سے وہ متاثر اور فیض یاب بھی ہوئے ہوں گے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے کسی خاص مصنف یا کسی خاص تصنیف کو سامنے رکھ کر اس کا چربہ اتارنے کی کوشش ہرگز نہیں کی، بلکہ موضوع اور مواد اور ہیئت واسلوب ہر دو لحاظ سے شعوری طور پر اپنی راہ الگ نکالنے کی سعی بلیغ کی اور اس باب میں خود اپنے ذوق اور مطالعے کو اپنا ہادی اور رہنما بنایا۔ بقول میر تقی میرؔ

دلیل اس بیاباں میں دل ہی ہے اپنا نہ خضر و نہ بلدیاں، نہ رہبر نہ ہادی

اس بیان کی صداقت کا اندازہ لگانے کیلئے مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی محققانہ اور گراں مایہ تصنیف ''صدیق اکبرؓ'' کا مطالعہ علامہ شبلی کی ''الفاروق'' کو سامنے رکھ کر کرنا چاہئے۔ اگرچہ مولانا اکبرآبادی نے ''الفاروق'' اور اس کے مصنف کا کہیں حوالہ نہیں دیا ہے۔ لیکن پھر بھی صاف محسوس ہوتا ہے کہ ''صدیق اکبرؓ'' الفاروق کا مثنیٰ ہے۔ اس کے برخلاف قاضی صاحب کی کسی کتاب پر کسی سابق مصنف کی مماثلت کا گمان نہیں گذرتا۔ یہی نہیں بلکہ بحیثیت مورخ ومصنف انھوں نے متعدد خصائص وامتیازات بھی قائم کئے ہیں جنہیں اجمال واختصار کے ساتھ ہم آئندہ صفحات میں پیش کرتے ہیں۔

(الف): جس عہد اور جس طرز کی تاریخ نگاری کا انھوں نے بیڑہ اٹھایا اور اسے پایۂ تکمیل تک پہونچایا ہے، اس باب میں وہ سباق غایات ہیں۔ اب تک ان کے انجام دیئے ہوئے کارناموں کے کسی پہلو پر کوئی اضافہ تو درکنار، پچھلے چالیس برسوں میں کسی نے ان سے ہم عناں ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔ دراصل قاضی صاحب کے حدود مملکت میں داخل ہونے کیلئے ان صدہا کتابوں کے جنگلوں سے گذرنا، بلکہ اس میں ایک مدت مدید بسر کرنا

ضروری ہے۔ جن میں موصوف نے اپنے مراجع و مآخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بنیادی شرط کا ہی پورا کرنا نہایت دشوار گذار ہے۔ اس لئے اگلے مراحل کی نوبت ہی نہیں آپاتی۔

سر بسر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کسے کہ تیری تمنا کرے کوئی (غالب)

(ب) قاضی صاحب کی یہ خوبی بھی قابل ذکر ہے کہ وہ کسی خاص نظریے کے اثبات یا اس کی نفی کیلئے نہ مطالعہ کرتے ہیں نہ لکھتے ہیں۔ اس بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ کسی ذہنی تحفظ یا پیش بندی کے بغیر کھلے ذہن اور کھلی طبیعت کے ساتھ کتابوں کا مطالعہ کرتے اور پھر حاصل مطالعہ کو پیش کر دیتے ہیں۔ اس لئے نہ تو خود کسی مغالطے میں مبتلا ہوتے ہیں اور نہ اپنے قاری کو اپنے مخصوص نظریات وافکار کی زنجیروں میں جکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قاضی صاحب کے اس وصف خاص کی داد صحیح معنوں میں وہ لوگ دے سکتے ہیں جنھوں نے مستشرقین یا ان کے تربیت یافتگان کی کتابیں پڑھی ہوں اور پھر ان کی خباثتوں اور ریشہ دوانیوں کا اندازہ لگایا ہو کہ کس طرح یہ لوگ اپنی ہر بات بظاہر معقول و مدلل طریقے سے کہتے اور حوالوں کے انبار لگا دیتے ہیں، لیکن وہ تصویر کا صرف ایک رخ بلکہ بسا اوقات اس کا مسخ شدہ روپ ہوتا ہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے بعض نیک نیت اور مخلص مصنفین نے بھی بعض صالح مقاصد کے حصول کیلئے یہی غلط طریق کار اختیار کیا ہے۔ حالانکہ مقاصد کے صلاح کے ساتھ ساتھ طریق کار کی درستگی کا لحاظ رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ بصورت دیگر اول الذکر گروہ کی طرح ثانی الذکر جماعت کی تحریروں پر بھی پوری طرح اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

قاضی صاحب کی تمام تصانیف اس قسم کی بے اعتدالیوں سے پاک وصاف ہیں ان کے یہاں ہر بڑے سے بڑے مصنف کی طرح تسامحات اور فروگذاشتوں کا امکان تو ہے، لیکن دیدہ و دانستہ حقائق پر پردہ ڈالنے یا اسے کسی خاص رخ یا زاویے سے پیش کرنے کا رجحان ہرگز نہیں پایا جاتا۔ اس کا سب سے برا فائدہ یہ ہے کہ ہم قاضی صاحب کے

حوالوں پر پوری طرح اعتماد اور نتائج سے بالکلیہ اتفاق کر سکتے ہیں ۔ بلا شبہہ یہ قاضی صاحب کا بڑا اکتساب ہے۔

(ج) گذشتہ صدی میں یورپ سے بہت سے مذموم نعروں کی طرح وطنیت وقومیت کے بے بنیاد راگ بھی الاپے گئے اور مشرقی اقوام وممالک نے حسب معمول ان پر بھی آمنــا وصدقنا کہا اور پھر انہیں وطنی وقومی عصبیتوں کی بنیادوں پر ان اقوام وممالک نے ازسرنو اپنی تاریخیں بھی مرتب کیں، یہاں تک کہ ایک زمانے میں خود مصر سے نــحـن ابـنـاء الـفـراعنة کا نعرہ بلند کیا گیا۔ دوسری طرف ہمارے برادران وطن بھی وطنیت وقومیت کے مغربی عقیدوں پر ہی ایمان رکھتے اور اسی نقطۂ نظر سے اپنے ملک کی تاریخ لکھنا اور پڑھنا پسند کرتے ہیں۔

قاضی صاحب نے اس قسم کی ہر افراط وتفریط سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنی محبت ووفاداری کا اصل مرکز ومحور اسلام اور شارع اسلام کی ذات والا صفات کو قرار دیا ہے اور وطن، ابنائے وطن اور اشیائے وطن سے تعلق ومحبت کو اسی مرکز سے وابستہ کر رکھا ہے۔

نقطہ پرکار حق مرد خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم وطلسم ومجاز (اقبالؔ)

یہ کیفیت یوں تو قاضی صاحب کی تمام تحریروں میں موجود ہے لیکن اس کی خاص جلوہ گری دیکھنی ہو تو عرب وہند عہد رسالت میں، ''خلافت راشدہ اور ہندوستان'' اور ''اسلامی ہند کی عظمت رفتہ'' کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

(د) اردو میں جدید تاریخ نگاری کے زمانۂ رواج سے لے کر اب تک یہ طریقہ چلا آتا ہے کہ ہمارے مورخین ومصنفین اپنی تلاش وجستجو کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے قدماء کی طرز نگارش کے عیوب بیان کرتے ہیں، قلت مواد کا رونا روتے ہیں، پھر ان پر بے خبری وبے بصری کا الزام بھی عائد کر دیتے ہیں، لطف یہ کہ اس تمام نوحہ وماتم کے بعد انہیں قدماء کی کتابوں سے اخذ واقتباس کرتے ہیں۔ ان کی عبارتیں نقل کرتے ہیں اور موقع بہ موقع ان کے حوالے دیتے چلے جاتے ہیں

قاضی صاحب نہ صرف یہ کہ اس ابتلائے عام سے محفوظ ہیں بلکہ انھوں نے متاخرین کی غلط فہمیوں کا ازالہ اور قدماء کا بہترین دفاع بھی کیا ہے۔ چنانچہ خلافت راشدہ اور ہندوستان کے آغاز میں لکھتے ہیں:

مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے اسلامی، دینی، ملی، سیاسی، تمدنی، علمی، فکری، ادبی، لسانی، اجتماعی اور انفرادی پہلوؤں میں سے ہر ایک پر الگ الگ تصانیف کے انبار لگائے ہیں......مثلاً غزوات وفتوحات کے موضوع پر صرف رزم کی داستانیں مرتب کیں، اس میں علمی وفکری تاریخ کو نہیں ملایا اور تہذیب وتمدن کے مباحث پر جو کتابیں تصنیف کیں، ان میں صرف تہذیبی وتمدنی حالات درج کئے......

قدماء کے اس عام طرز تاریخ نویسی کی وجہ سے بعض لوگوں کیطرف سے شکوہ ہونے لگا کہ ہماری تاریخوں میں غزوات وفتوحات اور حکومت امارت کی تفصیلات تو نہایت شرح وبسط سے پائی جاتی ہیں مگر تمدنی، فکری، علمی، معاشی، معاشرتی باتیں اور مقامی ووقتی احوال نہیں ملتے ہیں۔ حالانکہ اس شکوے کی وجہ ان موضوعات کی مستقل تصانیف سے کوتاہ نظری اور صرف سیر ومغازی کی کتابوں ہی میں سب کچھ تلاش کرنے کی سعی ناکام اور ذوق خام ہے......

اگر کوئی مورخ چاہے تو کسی ایک ملک یا علاقے کی اسلامی تاریخ کے ہر پہلو کو ان کتابوں سے چھان بین کر کے نمایاں کرے۔ غزوات وفتوحات کیلئے سیر ومغازی کا مطالعہ کرے، دینی وعلمی رجال کے لئے طبقات وتذکرہ کی کتابیں پڑھے۔ نظام حکومت کیلئے خراج واموال اور قوانین کا کتب خانہ کھنگالے۔ عام حالات کیلئے ادب ومحاضرات اور متعلقہ کتابوں کی ورق گردانی کرے اور ان سے اخذ واقتباس کر کے جامع اور مستوعب تاریخ مرتب کرے'' (ص:۱۷، ۱۸، ۱۹)

مندرجہ بالا اقتباس سے تاریخ نویسی کے باب میں قاضی صاحب کے طرز اور طریق کار کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ کس طرح وہ مختلف النوع موضوعات کی کتابوں کی چھان بین کر کے اپنے کام کی جزئیات تلاش کرتے اور پھر انہیں مناسب ترتیب وتہذیب کے ساتھ پیش کر کے ایک

جامع تاریخ تیار کردیتے تھے۔

(ہ) قاضی صاحب کے بیانات قیاس آرائی اور ظن وتخمین پر مبنی نہیں ہوتے وہ اپنی ہر بات حوالوں کی روشنی میں اور مدلل طور پر کہتے ہیں۔اسکے ساتھ ہی روایات کے جمع واستیعاب کی بھی کوشش کرتے ہیں۔اب اگر بعض روایات کمزور اور منکر نظر آتی ہیں تو ان کے ضعف ونکارت کی تصریح کردیتے ہیں۔روایات واختلاف وتعارض کی نشان دہی کرتے ہوئے اس کے اسباب بھی بیان کردیتے ہیں۔اس سلسلے کی دومثالیں ان کے معرکہ آرامقالے''فاتح ہند حضرت محمد بن قاسم ثقفی'' سے پیش کی جاتی ہیں۔محمد بن قاسم اور حجاج بن یوسف کے مابین عزیزداری کی نوعیت سے بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

حضرت محمد بن قاسم،حجاج بن یوسف کے حقیقی چچازاد بھائی تونہیں ہیں البتہ خاندان اور رشتہ میں چچازاد بھائی ضرور لگتے ہیں لیکن یہ جومشہور ہے کہ وہ حجاج بن یوسف کے داداد بھی ہیں اورحجاج کی بیٹی ان سے بیاہی تھی،اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے،صرف چچ نامہ میں اس کا ذکر افسانوی انداز میں پایا جاتا ہے،اس میں ہے کہ محمد بن قاسم پسرعم او بود،وداماد نیز بود،پھرایک حکایت درج ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن حجاج نے خوش ہوکر محمد بن قاسم سے کہا کہ تم مجھ سے اپنی کوئی حاجت طلب کرو،محمد بن قاسم نے کہا کہ آپ مجھے کسی مقام کا امیر و حاکم بنا کر اپنی صاحبزادی سے میری شادی کردیں۔یہ سن کر حجاج نے خفگی میں محمد بن قاسم کے سر پر چھڑی ماردی،جس کی وجہ سے ان کا عمامہ گر گیا پھر حجاج نے وہی بات کہی اور محمد بن قاسم نے اپنی بات دہرائی اور جب تیسری بار یہ گفتگو ہوئی تو حجاج نے کہا کہ اچھا میں اس شرط پر تم سے اپنی بیٹی کی شادی کرتا ہوں کہ تم لشکر لے کر فارس یا ہندوستان جاؤ اوراس کو فتح کر کے نظم وضبط قائم کرو اور مال غنیمت بھیجو۔حجاج بن یوسف کے رعب وداب اور محمد بن قاسم کی ذات سے یہ بات بالکل بعید از قیاس ہے۔پھرانساب وتذکرہ اور تاریخ کی کتابوں میں حجاج بن یوسف کی بیٹی سے محمد بن قاسم کے نکاح کا واقعہ نہیں ملتا بلکہ حجاج کی اولاد میں اس کی کسی بڑی لڑکی کا ذکر تک نہیں ہے ابن قتیبہ نے حجاج کی اولاد میں یہ نام دیئے ہیں (۱) محمد (۲) ابان (۳) عبدالملک (۴) ولید اور (۵) جاریہ (ایک بچی) اور ابن حزم نے انکے یہ نام لکھے ہیں (۱) محمد (۲) عبدالملک (۳) ابان (۴) سلیمان

،اس میں ولید کے بجائے سلیمان ہے اور کسی بچی کا نام بھی نہیں ہے۔(اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ ص:۹۷)

مذکورہ بالا اقتباس سے قاضی صاحب کی عالمانہ ومحققانہ طرز تاریخ نویسی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔موصوف نے اسی انداز کی محققانہ بحث ہندوستان میں امارت کے وقت محمد بن قاسم کی عمر سے متعلق بھی کی ہے۔اور دلائل کی روشنی میں اس مشہور عام قول کی تردید کردی ہے۔کہ ہندوستان کی امارت وفتوحات کے وقت ان کی عمر صرف سترہ سال کی تھی۔پھر یہ بتایا کہ دراصل ان کی یہ عمر فارس کی امارت کے وقت تھی، پوری بحث اصل کتاب میں پڑھنے اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ہم یہاں صرف اس کا ایک مختصر سا اقتباس نقل کرنا چاہتے ہیں۔موصوف لکھتے ہیں۔

ہمارے مؤرخوں کے قول کو مان کر محمد بن قاسم کی عمر ۹۲ھ یا ۹۳ھ میں فتح ہندوستان کے وقت صرف سترہ سال تسلیم کر لی جائے تو ۸۳ھ میں جب کہ وہ فارس کے امیر بنائے گئے۔ان کی عمر چھ سات سال ماننی پڑے گی، جو ایک مضحکہ خیز بات ہوگی۔اس عمر میں کسی بچے کو ملک کی ولایت اور غزوات کی امارت تو دور کی بات ہے گھر کی کوئی معمولی سی ذمہ داری بھی نہیں دی جاتی ہے۔(اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ص:۱۰۷)

گذشتہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا اس سے اسلامی ہند کے ابتدائی ادوار کی تاریخ سے متعلق قاضی صاحب کے کارناموں نیز بحثیت مؤرخ ومصنف ان کے خصائص وامتیازات کا کسی قدر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قاضی کی دوسری اہم حیثیت دیار پورب یعنی اودھ، الہ آباد، جون پور، بنارس، اعظم گڈھ، غازی پور اور ان کے اطراف وجوانب کے علماء وفضلاء کے تذکرہ نگار اور یہاں کی علمی سرگرمیوں کے تاریخ نگار کی ہے،

گمان غالب ہے کہ تاریخ بغداد، تاریخ جرجان وغیرہ کے مطالعے نیز کتابوں میں تاریخ دمشق، تاریخ نیشاپور، وغیرہ کے حوالے دیکھ کر قاضی صاحب کے دل میں اپنے وطن مبارک پور کی تاریخ اور یہاں کے علماء کے احوال قلمبند کرنے کا داعیہ پیدا ہوا بہر حال ان کی خود نوشت سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۴۸ء میں قیام بہرائچ کے دوران تذکرہ علمائے مبارک پور کے لئے انھوں نے ابتدائی معلومات جمع کی تھیں۔غالبًا بعد میں موصوف نے اس دائرے کو مزید وسعت دے دی

۔چنانچہ ان کے مسودات ایک بیاض پر ''تذکرہ مشاہیر اعظم گڈھ ومبارک پور'' درج ہے۔لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی ہند کے متعلق تصانیف میں انہاک و مشغولیت نیز خاطر خواہ اور حسب منشا مواد فراہم نہ ہونے کے سبب مبارک پور اور اعظم گڈھ سے متعلق کسی مستقل کتاب کی اشاعت ان کے لئے ممکن نہ ہوسکی۔اس لئے انہوں نے دیار پورب کے مشاہیر سے متعلق رسائل ومجلّات میں الگ الگ مقالات لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔

ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ''تذکرہ علمائے مبارک پور'' مرتب ہوگیا۔اور ۱۹۷۴ء میں اس کی اشاعت عمل میں آئی،اس کے بعد متذکرہ بالا مقالات کا مجموعہ ''دیار پورب میں علم اور علماء'' کے نام سے ۱۹۷۹ء میں منظر عام پر آیا۔قاضی صاحب نے اس مجموعے کے آغاز میں ''دیار پورب کے چار علمی ادوار'' کے عنوان سے اس خطے کی سات سو سالہ علمی تاریخ بالاجمال بیان کردی ہے۔سو صفحات پر مشتمل یہ مضمون درحقیقت پوری کتاب کی جان ہے۔اس کے مطالعے سے قاضی صاحب کے مؤرخانہ ذہن کی زرخیزی اور گہرائی وگیرائی کا پورا پورا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس مجموعے میں جن مشاہیر اہل علم کے احوال وآثار سے بحث کی گئی ہے ان کے نام بالترتیب یہ ہیں (۱) قاضی شہاب الدین دولت آبادی (۲) راجہ سید حامد شاہ مانک پوری (۳) میر علی عاشقان سرائمیری (۴) ملا محمود جونپوری (۵) مولانا حافظ امان اللہ بنارسی (۶) مولانا شیخ غلام نقشبند گھوسوی (۷) مولانا شاہ ابولغوث گرم دیوان بھیروی (۸) مولوی حسن علی ماہلی

اس کتاب کی اشاعت کے بعد بھی قاضی صاحب نے اس دیار سے متعلق اپنے مضامین ومقالات کا سلسلہ جاری رکھا چنانچہ اس سلسلہ کے بعض مقالات کے عنوانات درج ذیل ہیں:
(۱) خانوادہ علمائے رسول پور (۲) خانوادہ علمائے سریاں (۳) مولوی حسن علی اور چند دیگر ماہلی علماء (۴) مشائخ جین پور (۵) خانوادہ مشائخ بھیرہ ولوہرا ومبارکپور (۶) مشائخ سارین (۷) دیار اعظم گڈھ کے چند غیر معروف مشائخ

ہندوستانی علماء وفضلاء کی حیات وخدمات کی طرف عموماً اور دیار پورب کے مشاہیر کے احوال وآثار کی جانب خصوصاً سب سے پہلے میر غلام علی آزاد بلگرامی نے توجہ فرمائی اور اپنی عربی تصنیف سبحۃ المرجان نیز فارسی تصنیف مآثر الکرام میں اس سلسلے کی بنیادی معلومات فراہم کیں۔

اس کے بعد مولانا عبدالحی حسنی نے نزھۃ الخواطر میں عام علمائے ہند کے تراجم کے ساتھ ساتھ خطۂ پورب کے علماء کے احوال بھی قلم بند فرمائے اس کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی کے مقدمے میں اعظم گڈھ کی تاریخ کے ساتھ ساتھ یہاں کے مشہور قصبات اور ان سے متعلق مشہور شخصیتوں کے مختصر حالات بھی تحریر فرمائے اس کے علاوہ خطہ پورب کی علمی سرگرمیوں اور ترقیات کے چار ادوار قائم کرتے ہوئے ہر دور کے مشاہیر، ارباب فضل وکمال کا مختصر تعارف بھی کرایا۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ قاضی صاحب نے دیار پورب کے چار علمی ادوار کا خاکہ حیات شبلی کے مذکورہ بالا مقدمہ سے حاصل کیا پھر اس میں آب ورنگ بھرنے کیلئے مقدمہ کے علاوہ سبحۃ المرجان مآثر الکرام اور نزھۃ الخواطر سے بھی مدد لی، لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ موصوف نے اپنے پیش روؤں کی کتابوں سے نقل واقتباس کے بجائے پچاس کے قریب قلمی ومطبوعہ کتابوں سے مراجعت کرکے سابقہ معلومات پر بیش بہا اضافے فرمائے۔ اس کے علاوہ مشہور علمی ودینی خانوادوں کے تذکروں میں ان کے اساتذہ وتلامذہ اور معاصرین ومتعلقین کو بھی سمیٹ لیا جس سے پورے دیار اور پورے دور کی علمی سرگرمیوں کی تصویر سامنے آجاتی ہے، مزید براں بہت سی ایسی شخصیتوں ورخانوادوں کے تعارف کی خدمت بھی انجام دی جو ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو چکے تھے۔

یہ گفتگو دیار پورب میں علم اور علماء اور دیگر مضامین ومقالات کے حوالے سے تھی جہاں تک تذکرہ علمائے مبارکپور کا تعلق ہے تو وہ سراسر ان کی کدوکاوش اور تلاش وجستجو کا ثمرہ ہے (اس کی کسی قدر تفصیل خود مقدمہ کتاب میں موجود ہے) اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مقدمہ حیات شبلی میں مبارکپور کے بارے میں صرف یہ دو جملے ملتے ہیں۔

محمد آباد کے قریب مبارکپور نام کا بڑا قصبہ ہے جو پرانے زمانے سے پارچہ بافی کا مرکز ہے، اور جہاں پچھلے زمانے میں چند نامور علماء پیدا ہوئے ہیں۔ص:۵۷

واضح رہے قاضی صاحب کا تذکرہ علماء مبارکپور ۲۹۲ صفحات کو محیط ہے، یہاں اس امر کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا کہ قاضی صاحب کی تحریروں اور گفتگوؤں سے بعض خوردسال معاصرین

اور احباب کو بھی اپنے دیار کے علماء وفضلاء پر کام کرنے کا حوصلہ ملا۔ اس ضمن میں تذکرہ علماء اعظم گڑھ مصنفہ مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند اور تذکرۂ علماء بنارس مصنفہ مولانا وسیم احمد بنارسی استاذ جامعہ اسلامیہ بنارس کے نام بطور مثال کے پیش کئے جاسکتے ہیں۔

قاضی صاحب کی تمام تصانیف اگر چہ مستقل تذکرے اور تجزیہ وتبصرے کی متقاضی ہیں، لیکن ایک مضمون کے محدود صفحات اس حق کی ادائیگی سے قاصر ہیں تاہم یہاں ان کی ایک اہم کتاب تدوین سیر ومغازی کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

یہ کتاب شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند کی جانب سے ۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰ء میں اشاعت پذیر ہوئی اس کی ضخامت ۳۲۰ صفحات ہے۔ قاضی صاحب میں اس کتاب کے لکھنے کا داعیہ مشہور جرمن مستشرق پروفیسر جوزف ہاردیز کی کتاب پڑھ کر پیدا ہوا اصل کتاب جرمن میں تھی اس کا عربی ترجمہ حسین نصار نے **المغازی الاولیٰ ومولفوھا** کے نام سے کیا۔ عربی سے اس کتاب کو پروفیسر نثار احمد فاروق نے اردو میں منتقل کیا اور اس کا نام سیرت نبوی کی ابتدائی کتابیں اور ان کے مولفین رکھا۔ قاضی صاحب کے سامنے ہاردیز کی کتاب کا یہی اردو ترجمہ تھا۔ موصوف نے راقم الحروف کو یہ اردو ترجمہ مطالعہ کیلئے عنایت کیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا تھا کہ میرا ابھی ارادہ اس موضوع پر کچھ کام کرنے کا ہے۔ یہ موضوع قاضی صاحب کے سابقہ دونوں موضوعات اسلامی ہند کی ابتدائی تاریخ اور دیار پورب میں علم اور علماء سے مختلف تھا، گویا ان کے رہرو قلم کو ایک نئے دیار کی سیاحت کیلئے کمر ہمت باندھنی تھی، اس لئے ساز وبرگ سے آراستہ ہونے میں انہیں خاصا وقت لگا۔ چنانچہ مقدمۂ کتاب میں انھوں نے تصریح کی ہے کہ اس کی تحریر وتسوید میں آٹھ سال کی مدت صرف ہوئی۔ بعض موانع اور مشغولیات سے قطع نظر زیادہ وقت صرف ہونے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ قاضی صاحب رواروی اور عجلت پسندی کے کام کے عادی نہ تھے، وہ دراصل اپنے موضوع کے اصول وفروع پر حاوی ہوئے بغیر قلم اٹھانا پسند نہیں فرماتے تھے، اس سے ان کی عالی حوصلگی اور بلند نظری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شہرت کے بام عروج پر پہونچنے کے بعد بھی انھوں نے ثانوی مآخذ کے استعمال اور ثانوی درجہ کے کام کو پسند نہیں کیا۔

اردو میں سیرت ومغازی کی ابتدائی تاریخ اس کے رواۃ اور مصنفین پر سب سے پہلے

علامہ شبلی نے مقدمہ سیرۃ النبی پر قلم اٹھایا تھا اور ممکنہ حد تک استیعاب واحاطہ کی کوشش کی تھی نقش اول ہونے کے باوجود ان کی یہ تحریر اب بھی قابل مطالعہ اور لائق استفادہ ہے نومبر ۱۹۸۹ء میں مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی نے دوحہ قطر کی تیسری عالمی سیرت کانفرنس میں متعلقہ موضوع پر عربی میں اپنا مقالہ پیش کیا تھا۔اس کا اردو ترجمہ جون ۱۹۸۱ء کے ماہنامہ معارف اعظم گڈھ میں ڈاکٹر نعیم صدیقی کے قلم سے شائع ہوا۔ یہ مقالہ بہت قیمتی ہے نیز متعدد جدید اور مفید معلومات پر مشتمل ہے لیکن اس کا وہ حصہ جو سیرت ومغازی کی تاریخ سے متعلق ہے اس میں علامہ شبلی کی معلومات پر کوئی اہم اضافہ نظر نہیں آتا۔ پروفیسر ہاردیز کی کتاب کا ذکر بھی اوپر آچکا ہے۔

ان سب کے بعد اگر قاضی صاحب کی تدوین سیر ومغازی کا مطالعہ کیا جائے تو کتاب کی قدر و قیمت ظاہر ہوگی اور مصنف کے جوہر نظروں میں آجائیں گے۔حقیقت یہ ہے کہ یہاں بھی قاضی صاحب نے چبائے ہوئے لقموں کو چبانے کے بجائے جدید ومفید معلومات اور مضامین نو کے انبار لگا دیئے ہیں۔ ہمارے محدود علم کے مطابق اردو بلکہ عربی میں بھی اپنے موضوع پر اب تک کی یہ سب سے بہتر اور منفرد کتاب ہے۔

اس مضمون کو قاضی صاحب کے دو قابل قدر بلکہ قابل تقلید اوصاف کے ذکر پر ختم کیا جاتا ہے۔عام طور پر طبیعتیں کسی خاص موضوع پر کچھ دنوں تک کام کرنے کے بعد ادھر سے اچاٹ ہو جاتی ہیں۔خاص طور پر اس صورت میں جب کہ وہ کام کسی درجہ میں پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے لیکن قاضی صاحب میں ایسی استقامت طبع تھی کہ ایک موضوع پر کام کرتے ہوئے وہ اکتاتے نہ تھے یہی نہیں بلکہ وہ پلٹ پلٹ کر اس کی طرف رجوع ہوتے رہتے تھے۔اس سلسلے کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں رجال السند والہند (طبع اول) میں مصنف نے ان لوگوں کے تراجم قلمبند نہیں کئے تھے جو باہر سے اس ملک میں آئے اور پھر یہیں کے ہوگئے یا ایک طویل مدت تک یہاں قیام پذیر رہے۔چنانچہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مقدمۂ کتاب میں انھوں نے لکھا تھا۔

ولم نذكر الذين جاء و ا الى الهند وتأهلوا وتوطنوا فيها ومن حقوقهم علينا ان نذكرهم ايضاً وهم كثيرون ولعل الله يحدث بعد ذلك امراً ۔

اس پر حضرت مولانا محمد شفیع عثمانیؒ نے اپنی تقریظ میں یہ کلمات تحریر فرمائے تھے۔

اللہ تعالیٰ مصنف علام کو توفیق مزید عطا فرمائیں کہ اپنے وعدے کے مطابق ان رجال کا تذکرہ بھی جمع فرمادے جو اگر چہ ہندوسند میں پیدا نہیں ہوئے مگر ان کا طویل قیام استفادے یا افادے کی صورت میں ان ملکوں میں رہا۔

حضرت مفتی صاحب کی یہ دعا قبول ہوئی اور مصنف نے آئندہ اس کمی کی تلافی کر دی، چنانچہ ۱۳۹۸ھ میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن جب دارالانصار قاہرہ سے شائع ہوا تو یہ اس پہلو سے بھی مکمل تھا۔ قاضی صاحب نے دوبارہ اس کتاب پر کتنی محنت کی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ طبع اول کے وقت اس کی ضخامت ۳۲۸ صفحات تھی جو طبع ثانی کے وقت ۵۸۸ صفحات ہوگئی۔

یہی کیفیت ان کی مایۂ ناز تصنیف خیر القرون کی درسگاہیں اوران کا نظام تعلیم وتربیت کی بھی ہے۔ قاضی صاحب نے اولاً اس موضوع پر دو مضامین ''اسلامی تعلیم کا مرکز دارارقم'' اور ''مدارس اسلامیہ کے ارتقائی ادوار'' کے عنوان سے البلاغ بمبئی میں لکھے اس کے بعد ایک مختصر کتاب ''تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں'' کے نام سے لکھی۔ آخیر میں اس سلسلے کو مزید وسعت دیتے ہوئے خیر القرون کی درسگاہیں اوران کا نظام تعلیم وتربیت مرتب کردی۔

اسی طرح بہت پہلے ایک مضمون ہر طبقے اور ہر پیشے میں علم اور علماء کے عنوان سے البلاغ بمبئی کیلئے لکھا جو ان کے مجموعہ مقالات ''مآثر معارف'' میں بھی شامل ہے۔ عام طور پر اہل علم نے بہت پسند کیا اور متعدد اہم شخصیتوں نے اسے مزید وسعت دینے کی درخواست کی چنانچہ اخیر عمر میں قاضی صاحب نے پھر اس طرف توجہ کی اور تقریباً تین سو صفحات کی ایک جامع تصنیف مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر پیشے میں علم اور علماء کے نام سے تیار کردی۔ یہ قاضی صاحب کی آخری تصنیف ہے جس کا مقدمہ غالباً انھوں نے مرض وفات کے دوران لکھا ہے۔ ابھی اشاعت کیلئے کہیں بھیج نہ سکے تھے کہ ان کا پیمانۂ عمر لبریز ہوگیا۔ ؎ ساقی! سلام لے میرا پیمانہ بھر گیا

قاضی صاحب کا دوسرا وصف خاص یہ تھا کہ وہ سچے اہل علم کی طرح تنقید واستدراک سے گھبراتے نہ تھے بلکہ خندہ روئی وکشادہ جبینی کے ساتھ اس کا استقبال کرتے تھے۔ اس کی بھی دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

قاضی رشید بن زبیر غسانی کی تصنیف کتاب الذخائر والتحف کے مصنف کی تعیین کے سلسلے میں قاضی صاحب اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہوا۔ سبب اختلاف یہ تھا کہ ''رشید'' بیٹے، باپ اور دادا تینوں کے نام کا جز و تھا۔ قاضی صاحب کا خیال تھا کہ یہ پوتے کی تصنیف ہے اور ڈاکٹر صاحب کی رائے تھی کہ دادا کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور امور بھی متنازعہ فیہ تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کے مکتوب اور قاضی صاحب کے مضمون کی اشاعت ماہنامہ معارف اعظم گڈھ دسمبر ۱۹۶۰ء میں ایک ساتھ ہوئی اس پر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی علیہ الرحمہ نے ایک مضمون بطور محاکمہ تحریر فرمایا جو رسالہ مذکور میں فروری ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا جس میں مولانا نے تعیین مصنف کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی رائے سے اور بعض دیگر نقد و استدراک کے بارے میں قاضی صاحب کے خیالات سے اتفاق کا اظہار فرمایا، مزید برآں موضوع زیر بحث سے متعلق متعدد اہم امور کا انکشاف بھی فرمایا۔

قابل ذکر امر یہ ہے کہ قاضی صاحب نے مآثر و معارف میں اپنے مضمون کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا الاعظمی کے نقد اور محاکمہ کو بھی جوں کا توں شائع کیا اور اس سلسلہ میں کسی قسم کی رنجش یا تنگ دلی کے مظاہرہ سے گریز کیا۔

اسی طرح ملا محمود جونپوری پر قاضی صاحب کے مقالے کی اشاعت (معارف اعظم گڈھ مئی رجون رجولائی ۱۹۷۳ء) کے بعد جناب شبیر احمد خاں غوری اور جناب حافظ غلام مرتضیٰ نے استدراکات لکھے (بالترتیب معارف اعظم گڈھ اکتوبر رنومبر ردسمبر ۱۹۷۳ء و مارچ ۱۹۷۴ء) جن میں قاضی صاحب پر کوئی نقد و اعتراض تو نہ تھا لیکن ان کی فراہم کردہ معلومات پر بعض اضافے ضرور تھے۔

قاضی صاحب نے یہاں بھی فراخدلی کا مظاہرہ کیا اور دیار پورب میں علم اور علماء میں ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے مضمون کے ساتھ دونوں استدراکات بھی شائع کئے۔

گذشتہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا یہ قاضی صاحب کی تصنیفی خدمات اور علمی کمالات کی ایک ہلکی سی جھلک ہے۔ ابھی ان پر بہت کچھ اور مختلف زاویوں سے لکھنے کی نہ صرف گنجائش بلکہ ضرورت ہے۔ ع: گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں

ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است (بشکریہ ''ترجمان الاسلام'' بنارس)

مجلّہ البلاغ اور قاضی اطہر صاحب کی خدمات

مولانا مسعود سعید الاعظمی۔ نائب مدیر مجلّہ المآثر، مئو

انجمن خدام النبی بمبئی کی ایک مشہور تنظیم تھی۔ ہندوستانی عازمین حج اور ان کی رہنمائی اور تعاون اس کے اہم مقاصد تھے، حجاج کرام کی خدمت اور سہولیات کی فراہمی کے سلسلے میں اس کی جہود ومساعی بہت مبارک اور تاریخ خوب روشن رہی ہے۔ حج کے متعلق معلومات افزا اور پر مغز رسائل وکتابچے شائع کرنا، دینی وعلمی مواد فراہم کرنا، حجاج کی ضروری اور صحیح رہنمائی کرنا اس انجمن کے دائرہ کار میں شامل تھا۔ الحاج سیٹھ احمد غریب صاحب اس انجمن کے روح رواں اور عہدہ کے لحاظ سے اس کے معتمد وامیر تھے، سیٹھ صاحب ایک نیک اور شریف انسان تھے بہت علم دوست، مخیّر اور قوم کے مخلص خادم تھے، وہ بمبئی کے ایک بڑے سرمایہ دار اور طبیعت کے لحاظ سے بہت دیندار تھے۔ ان کی سیادت اور سرکردگی مین انجمن خدام النبی نے ناقابل فراموش کارنامے انجام دیئے۔ اس کے یادگار کارناموں میں سے ایک ماہنامہ "البلاغ" کا اجرا تھا۔ البلاغ کی ادارتی تحریر جو "شذرات" کے عنوان سے شائع ہوتی تھی۔ ایک عرصہ تک جناب احمد غریب کے قلم سے زیب قرطاس ہوا کرتی تھی (۱)

ماہنامہ "البلاغ" کا اجراء ۱۳۷۳ھ مطابق ۱۹۵۴ء میں عمل میں آیا اس کا پہلا شمارہ شوال رجون میں منصۂ شہود پر آیا، اس وقت اس کے مدیر مسئول جناب محی الدین منیری صاحب تھے، البلاغ کو یہ شرف حاصل رہا کہ اس کے صفحات پر شروع ہی سے نہایت بیش قیمت دینی و فکری اور علمی وتحقیقی مضامین اشاعت پذیر ہوتے رہے، اس کے پہلے ہی شمارے میں محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب

(۱) الحاج سیٹھ احمد غریب صاحب نے ۶ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۴ جولائی ۱۹۶۷ء کو پچپن سال کی عمر میں کراچی میں وفات پائی۔ (البلاغ ج: ۱۷ش: ۵)

قاسمی نور اللہ مرقدہما جیسے اہل علم کے مضامین شامل اشاعت تھے۔ حضرت محدث جلیل رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین ''البلاغ'' کے بہت سے شماروں میں شائع ہوئے بلکہ ان کے کئی رسالے اور کتابچے بھی اس میں قسط وار شائع ہوئے۔

البلاغ کے حلقۂ تحریر میں جو حضرات نمایاں حیثیت کے حامل ہیں، ان میں ایک مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوریؒ ہیں، قاضی صاحب کا شمار ''البلاغ'' کے اہم معاونین میں کیا جاسکتا ہے، بحیثیت قلم کار و مضمون نگار وہ اس کی بزم میں شروع ہی سے شریک نظر آتے ہیں، وہ اس ادارتی بورڈ کے ایک ممتاز رکن رہے ہیں، جلد: ۱ ش: نمبر ۷۔۸ کے ''افکار و مطالعات'' کے کالم میں حامد الانصاری غازی صاحب لکھتے ہیں: ''البلاغ کے ادارہ میں مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کا وجود علمی قدر و قیمت رکھتا ہے'' قاضی صاحب اس کی مجلس ادارت کے رکن تو شروع سے رہے ہیں لیکن اس کی جلد ۲ کے شمارہ نمبر ۹ سے ان کا نام مدیر تحریر کی حیثیت سے نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

قاضی صاحب نے ''البلاغ'' کیلئے نہایت بیش قیمت علمی و فکری مضامین زیب قرطاس فرمائے، تاریخ اور انڈ وعرب کلچر قاضی صاحب کا خاص میدان تھا، اور اس میں ان کے افکار و آراء کو نگاہ اعتبار سے دیکھا جاتا تھا، فن تاریخ پر قاضی صاحب کے اختصاص کی جھلک البلاغ میں شائع ہونے والے ان کے اکثر مضامین میں بھی نظر آتی ہے۔ چنانچہ جلد اول کے پہلے ہی شمارے میں ان کا جو مضمون شائع ہوا ہے اسکا عنوان یہ ہے ''کعبۃ اللہ کی وحدت و مرکزیت کے ڈاکو، قرامطہ کی خونخواری و سفاکی کی دردناک داستان'' قاضی صاحب نے اپنے اس مضمون کا آغاز اس سے کیا ہے کہ کعبہ مقدسہ کی نہ صرف دیار عرب بلکہ عرب سے باہر کی دنیا میں کس قدر حرمت و عزت تھی، اس کے بعد انھوں نے کعبۃ اللہ کے خلاف بدنیتی اور بدطینتی کا مظاہرہ کرنے اور اس کی حرمت کو پامال کرنے والے بعض شقی ازلی افراد کی طرف ہلکا اشارہ کر کے قرامطہ کے سیاہ اور رسوائے زمانہ کارناموں کو تفصیل سے تحریر فرمایا ہے۔ اس میں امام قطب الدین نہروالی گجراتی مفتی مکہ مکرمہ علیہ الرحمہ کی کتاب ''علم الأعلام بأعلام بيت الله الحرام'' کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

''عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کے زمانہ میں ''۳۱۷ھ'' ملحدین کے ایک گروہ کا ظہور ہوا جسے قرامطہ کہا جاتا ہے۔ اس فرقہ کے اعتقادات نہایت فاسد تھے۔ اور کفر کی حد تک پہونچے ہوئے

تھے، یہ گروہ بظاہر اپنے کو مسلمان کہتا تھا، مگر مسلمانوں کا خون حلال سمجھتا تھا، یہ گروہ حضرت محمد بن حنفیہ ؒ کو جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں۔ اپنا امام گردانتا تھا اور ان کے بارے میں اعتقاد رکھتا تھا کہ وہ ''رضوی'' پہاڑ میں چھپے ہوئے ہوئے ہیں، اور دنیا میں دوبارہ ظہور کریں گے۔ یہ لوگ تمام مسلمانوں کو گمراہ سمجھتے تھے، ان کے سردار جس نے سب سے پہلے اس قسم کی خباثت ظاہر کی وہ ابوطاہر قرمطی ہے، اس نے مقام ہجر میں ایک گھر ''دارالہجرۃ'' کے نام سے تعمیر کیا اور کعبہ سے حج کو منتقل کر کے وہاں لے جانا چاہا، اس نے اپنے گروہ کے ذریعہ بے شمار مسلمانوں کو قتل کیا اور مومنوں کا خون بہایا، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس کے زمانہ میں حج کی راہ مسدود ہوگئی اس کی اور اس کی جماعت کی قوت اس قدر بڑھ گئی کہ حجاج کے قافلے بند ہوگئے، اس نے بے شمار قافلوں کو لوٹا اور قتل و غارت کو عام کیا، پھر قرامطہ ملعونہ کی طاقت کے ۳۱۷ھ آخر میں نہایت خوفناک رنگ میں ظاہر ہوئی۔'' ص:۳۲

اس کے بعد قاضی صاحب نے بیت اللہ کی بے حرمتی، مسجد حرام کے اندر خونریزی، مکہ مکرمہ کے اندر قتل و غارت، جس کو ابوطاہر نے کئی روز تک روا رکھا تفصیل سے ذکر کیا ہے حتیٰ کہ اس بدبخت نے حجر اسود کو اس کی جگہ سے نکال کر لے گیا اور ہجر میں اس نے جو دارالھجرہ بنایا تھا وہاں اس کو نصب کیا، اور ۲۰۵ سال سے زیادہ تک اس کے قبضے میں رہا، یہاں تک کہ اللہ رب العزت نے اس گروہ کا نام و نشان ہی اس روئے زمین سے مٹادیا۔

البلاغ کے دوسرے شمارے میں (ذیقعدہ ۱۳۷۳ھ جولائی ۱۹۵۴) قاضی صاحب کا مضمون ''فقہ اہل سنت کی ابتدائی تاریخ'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، قاضی صاحب اپنے اس مضمون کا آغاز ان الفاظ میں فرماتے ہیں ''رسول اللہ ﷺ کی زندگی مبارک میں شریعت کا دارومدار وحی الٰہی کے تازہ ارشادات تھے، چاہے وہ ارشادات کتاب اللہ (قرآن) کی صورت میں ہوں، چاہے سنت رسول اللہ ﷺ (حدیث) کی صورت میں ہوں، مسائل میں رسول اللہ ﷺ کی رائے عالی کے ساتھ ممتاز صحابہ کرام، اس کے بعد ''چاروں امام'' اور ''دوسرے فقہاء اور ان کی فقہ'' کو موضوع بحث بنایا ہے، اور خاتمہ تک پہنچنے سے پہلے ''ائمہ اربعہ کے اصول'' کے تحت چاروں ائمہ کے اصول پر گفتگو کی ہے۔ اس عنوان کے تحت قاضی صاحب نے ایک بڑی

بیش قیمت بات لکھی ہے کہ ''ان چاروں کے اندر جو باہمی اختلافات پائے جاتے ہیں، وہ بالکل قدرتی ہیں، کیونکہ چاروں نے احکام کی تحقیق کی ہے اور ظاہر ہے کہ ان سب کی تحقیق اور فہم میں کچھ نہ کچھ اختلاف واقع ہوگا، نیز چاروں ائمہ نے اپنے اپنے اصول فقہ جن کی روشنی میں وہ قرآن و حدیث سے احکام دینیہ کا استخراج کرتے ہیں، الگ الگ مقرر کئے ہیں، اسی لئے چاروں مذاہب میں تھوڑا تھوڑا فرق ہوگیا''

اسی میں آگے یہ بتایا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے اصول یہ ہیں کہ وہ مسائل کا حل پہلے قرآن میں تلاش کرتے ہیں جب اس میں مسئلے کا حل نہیں ملتا تو احادیث شریفہ سے رجوع کرتے ہیں، جب حدیث رسول میں بھی حل نہیں پاتے تو آثار صحابہ کو انتخاب کرتے ہیں اس کے بعد اجتہاد اور قیاس سے کام لیتے ہیں۔ امام مالکؒ پہلے دونوں اصول کے ساتھ تعامل اہل مدینہ کو بھی بہت اہمیت دیتے ہیں بلکہ بعض اوقات اس تعامل کی وجہ سے حدیث کو چھوڑ دیتے ہیں۔

ان اصول کے علاوہ ان حضرات کے یہاں ایک چیز اور پائی جاتی ہے۔ جس میں کسی مسئلے میں قیاس کے خلاف عمل کیا جاتا ہے، حنفیہ اس کو ''استحسان'' کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور تقریباً یہی چیز امام مالک کے نزدیک ''استصلاح'' اور امام شافعی کے نزدیک ''استدلال'' کے عنوان سے پائی جاتی ہے۔

اس مقالے کے تجزیہ میں ہم نے قدرے تفصیل سے کام لیا ہے، تاکہ قارئین کو یہ اندازہ ہو سکے کہ قاضی صاحب کے مضامین کتنے پرمغز اور علمی و تحقیقی ہوا کرتے تھے اور قاضی صاحب کے ان مضامین کی خاص بات یہ ہوتی تھی کہ ایسے اہم اور نازک مباحث کو نہایت سادہ اور سہل زبان میں سپرد قلم فرمایا کرتے تھے۔

البلاغ کے اسی شمارے (جلد ۱ شمارہ ۲) میں قاضی صاحب کا ایک اور مضمون ''اللہ کا ایک بندہ اللہ کے گھر میں'' کے عنوان سے چھپا ہے جس میں محمد بن جبیر اندلسی کے سفرنامہ سے نصف شعبان کی ایک خیر و برکت والی رات کا تذکرہ کیا ہے جس میں محمد بن حنفیہ جبیر مکہ مکرمہ میں موجود تھے اور اس رات کے احوال کا مشاہدہ کیا۔

ذی الحجہ و اگست کے شمارے میں ''سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ'' کے عنوان سے

قاضی صاحب کا مضمون شامل اشاعت ہے۔ یہ مضمون صفحہ ۲۸ سے صفحہ ۳۳ تک چھ صفحات پر مشتمل ہے۔ حضرت جنید بغدادی (متوفی ۲۹۷) صاحب نسبت وطریقت بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کے بڑے عالم اور عظیم محدث وفقیہ تھے۔ شریعت وطریقت ہر دو کے اندر آپ کا رتبہ نہایت بلند تھا، آپ کا اسم گرامی جنید، والد کا نام محمد، کنیت ابوالقاسم اور لقب سید الطائفہ تھا، قاضی صاحب نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ''آپ کے والد ماجد شیشے کی چیزوں کی تجارت کرتے تھے اسی لئے ان کوز جاج اور قواریری بھی کہتے ہیں'' اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا آبائی وطن فارس کا شہر نہاوند تھا مگر آپ کی پیدائش عراق میں ہوئی اور وہیں پر آپ کی پرورش بھی ہوئی۔ قاضی صاحب نے ان کے فضل وکمال پر مختلف اہل علم کی کتابوں سے بالخصوص شیخ عبدالوھاب شعرانی کی ''طبقات الکبریٰ'' اور ابن خلکان کی تاریخ سے بہت سے اقتباسات نقل کئے ہیں، منجملہ ان کے علامہ ابن خلکان کا یہ قول بھی ہے وحج علی قدمیه ثلاثین حجة۔ کہ حضرت جنید نے پیدل چل کر تن تنہا ۳۰ حج کئے ہیں۔ ان عبارتوں کے علاوہ قاضی صاحب نے حضرت سید الطائفہ کے بہت سے اقوال زریں بھی نقل کئے ہیں۔

حضرت جنید بغدادی شریعت وطریقت دونوں کے جامع تھے، چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے: مذهبنا هذا مقيد بالأصول بالكتاب و السنة، یعنی ہمارا یہ مسلک کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے اصول کے ساتھ مقید ہے۔

ان کی نسبت قاضی صاحب نے ابن خلکان کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے ''موت کے وقت آپ نے پورا قرآن ختم فرمایا، اور جب دوبارہ شروع کیا تو سورہ بقرہ کی ستر آیتیں پڑھنے پائے تھے کہ قفس عنصری سے روح مبارک پرواز کرگئی۔''

محرم ۱۳۷۴ھ مطابق ستمبر ۱۹۵۴ء کے شمارے میں شامل قاضی صاحب کا مضمون نہایت بیش قیمت اور قابل قدر ہے اس کا عنوان ہے ''فقہ اہل سنت کی ترویج واشاعت'' اہل سنت کے چاروں مذاہب یعنی حنفی، مالکی، شافعی، اور حنبلی مسلک سے متعلق اس میں بہت سی نادر معلومات جمع کر دی گئی ہیں، اس مضمون میں قاضی صاحب نے ''مذہب حنفی'' ''مذہب مالکی'' وغیرہ کے الگ ذیلی عنوانوں سے ہر مسلک کے آغاز، اس کے پھیلاؤ اور ترویج واشاعت اور کن خطوں اور

علاقوں میں کس کو زیادہ رواج حاصل ہوا، اور بالخصوص چوتھی صدی ہجری تک عالم اسلام کے کس خطے میں کس مسلک و مذہب کی عددی حیثیت کیا تھی، اس پر مختصر مگر جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے، پھر ایک عنوان ''موجودہ زمانہ میں یہ مذاہب'' قائم کر کے تمام دنیا کے ممالک میں ان مذاہب کا اوسط کیا ہے، اس کا ایک سرسری خاکہ پیش کیا ہے جو کہ بہت مفید اور کارآمد ہے، اس سلسلے میں نہ صرف عالم اسلام بلکہ مغربی ممالک کے اندر حتیٰ کہ امریکہ اور برازیل میں پائے جانے والے ان مذاہب کا تخمینہ لگایا ہے۔

قاضی صاحب کی طبیعت میں بہت ندرت تھی اور اسی کا اثر تھا کہ وہ نادر عنوانات کا بھی انتخاب کرتے تھے یا عام عنوانات کو بھی اٹھاتے تو ان کے اندر ندرت آمیز معلومات کا ذخیرہ جمع کر دیتے، اس پر مستزاد یہ کہ خالص علمی و تحقیقی باتوں کو ایسے عام فہم، سادہ، سلیس اور رواں دواں زبان میں سپرد قلم فرماتے کہ کہیں کوئی الجھاؤ نہ ہوتا، قاضی صاحب خالص علم و تحقیق کی دنیا کے آدمی تھے اور اس دنیا میں ان کی جولانیٔ فکر و طبع کو اپنے لئے موضوع تلاش کرنے میں پریشانی نہ ہوئی۔

صفر ۱۳۷۴ھ اکتوبر ۱۹۵۴ء کے ''البلاغ'' کے لئے انھوں نے جو موضوع اختیار کیا ہے اس کی سرخی ہے ''اسلام کا ابتدائی نظام تعلیم'' یہ بظاہر ایک سیدھا اور سادہ سا عنوان ہے، لیکن اس کو برتنے کیلئے ان کو کتنی تلاش و جستجو اور ورق گردانی کرنی پڑی ہوگی۔ اس کا اندازہ اس مضمون کے ذیلی عنوانات سے کیا جا سکتا ہے۔ اس مضمون میں قاضی صاحب نے عہد رسالت سے چوتھی صدی ہجری تک کے نظام تعلیم کا خاکہ پیش کیا ہے اور ''عربی علاقوں کے علمی معاہد'' کے ذیلی عنوان کے تحت ماقبل اسلام کے عرب کی علمی و تعلیمی حالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی ہے اس کے بعد زمانۂ نبوت کے جو دو عہد ہیں، ایک مکی اور دوسرا مدنی، ان دونوں عہدوں کی علمی و تعلیمی سرگرمیوں کا نہایت بصیرت افروز اور معلومات افزا، حدیث و تاریخ کے حوالوں سے، اعداد و شمار پیش کیا ہے ذیل میں مذکور ذیلی عنوانات سے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے'' مکہ میں علمی معاہد'' کے بعد یہ عنوانات آتے ہیں ''مدرسہ صحن ابی بکر'' ''مدرسہ دار ارقم'' ''مدرسہ بیت فاطمہ بنت خطاب'' ''مدرسہ ارض حبشہ'' ''مدرسہ شعب ابی طالب'' یہ تو وہ مقامات یا مراکز تھے، جہاں مکی دور میں دینی تعلیم کے انتظام کا ثبوت حدیث و سیر کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس کے

بعد'' مکہ کے باہر تعلیم کے انتظامات'' کے تحت پہلے'' مدینہ میں قرآن کی تعلیم'' کو لیا ہے، اور مدرسہ مسجد بنی زریق'''' مدرسہ مسجد بنی بیاضہ'''' مدرسہ مسجد قبا'' اور'' جامعہ صفہ'' کے انتظامات کا تذکرہ کیا ہے، آگے قاضی صاحب نے'' دیگر مکاتب و مدارس'' کے ایک عنوان میں لکھا ہے کہ:'' علامہ سمہودی نے **وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ** میں تقریباً چالیس ایسی مساجد کا تذکرہ کیا ہے جو زمانۂ رسالت میں موجود تھیں، اور ان میں نماز و تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔'' اس کے بعد مساجد و مکاتب میں مختلف علوم وفنون کے درس و تدریس کا جو بے مثال نظام قائم ہوا ہے اس کو ذکر کیا ہے۔ اپنے اس مضمون میں قاضی صاحب نے ان مراکز و معاہد کے تذکروں پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ ان موضوعات پر بھی ضوفشانی فرمائی ہے:'' معلمین کی اجرت کا معاملہ'' بچوں کی سزائیں'' وغیرہ۔

'' البلاغ'' کا ایک بہت خاص اور اہم کالم'' افکار و مطالعات'' کے عنوان سے ہوا کرتا تھا، یہ عنوان'' البلاغ'' کو دیگر معاصر پرچوں سے ممتاز کرتا تھا۔ ابتداء میں اس کالم کے لئے قاضی صاحب کے علاوہ مشہور صحافی جناب مولانا حامد الانصاری غازی بھی خامہ فرسائی فرمایا کرتے تھے۔ یہ کالم اکثر شماروں کی زینت ہوا کرتا تھا، لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ کوئی شمارہ اس سے خالی نہ ہو، چنانچہ اس عنوان سے پہلی تحریر جلد ا شمارہ ۴ میں پائی جاتی ہے جو حامد الانصاری صاحب کی کاوش قلم کا نتیجہ ہے، اسی طرح شمارہ نمبر ۵ اور ۷۔۸۔۹ کے'' افکار و مطالعات'' بھی حامد صاحب کے قلم سے ہیں، شمارہ نمبر ۶ کا یہ کالم قاضی صاحب کے قلم سے ہے، اور قاضی صاحب نے جس موضوع کو اپنے فکر و مطالعہ کیلئے انتخاب کیا ہے، وہ یورپ کے ایک شہر پولینڈ میں'' انٹرنیشنل اکیڈمی آف سائنس اینڈ میٹرس'' کے نام سے قائم ہونے والا ایک مرکز ثقافت اسلامیہ ہے، یہ ادارہ اسلامی علوم وفنون اور کلچر و ثقافت کے فروغ کے لئے ایسے خانماں برباد اور بے وطن حوصلہ مندوں کی طرف سے قائم کیا گیا تھا۔ جنھوں نے ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد اپنے مذہب و ثقافت کو بچانے کیلئے ترک وطن کر کے مختلف ملکوں میں پناہ لے لی تھی، اس میں بہت سے لوگ روس کے اس علاقے کے تھے جو عہد اسلامی میں'' ماوراء النہر'' کے نام سے مشہور و معروف تھا، جہاں ایسے ایسے فرزندان مذہب وملت اٹھے اور ایسی دینی و علمی خدمات انجام دیں جس سے ان

کے نام کو تاریخ عالم میں دوام حاصل ہوگیا۔ ان کی یہ مذہبی غیرت ان کی نسل و ذریت میں بھی رہی، اور ترک وطن کے بعد جس جگہ سکونت اختیار کی دین کی جوت جگانے کی کوشش کی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اندر دین و مذہب کے سلسلے میں جو سرد مہری اور غفلت روز افزوں ہے۔ اسلامی علوم و فنون کی طرف سے جو بے توجہی اور بے اعتنائی پائی جاتی ہے، اس ضمن میں قاضی صاحب اس پر اظہار افسوس کئے بغیر نہیں رہ سکے اور امت مسلمہ کی صفوں میں آپسی اختلاف اور شقاق و منافرت کی وجہ سے روز بروز انحطاط پیدا ہوتا جا رہا ہے اس کا بھی جائزہ لیا ہے۔

''البلاغ'' نے بعض مواقع پر بہت نمایاں اور اہم کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے اور علم و فکر کی دنیا میں نہایت بیش قیمت اور قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ اس کی ان ہی خدمات میں ''تعلیمی نمبر'' بھی ہے جو پہلی جلد کا ساتواں، آٹھواں اور نواں شمارہ ہے اور ربیع الآخر، جمادی الاولیٰ والاخریٰ کے مہینوں سے متعلق ہے اس شمارہ کی ضخامت ۴۳۲ صفحات کی ہے۔ اور اس میں ہندوستان کے مایۂ ناز اہل علم و قلم کے مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ اس میں مختلف ایجوکیشنل بورڈ تعلیمی تنظیمیں اور مدارس و مراکز کے علاوہ متعدد مایۂ اہل علم و فن کے سوانحی خاکے بھی شائع کئے گئے ہیں۔ اس شمارے میں قاضی صاحب کے متعدد مضامین جلوہ گر نظر آتے ہیں، پہلا مضمون صفحہ ۳۲ سے ۵۰ تک ۱۸ صفحات پر ''مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر پیشہ میں علم اور علماء'' کے عنوان سے، اپنے اس مضمون میں انھوں نے مختلف ذیلی عنوان، مثلاً ''چرواہوں میں علم'' ''کسانوں میں علم'' ''کارخانہ داروں میں علم'' بار بردار مزدوروں میں علم'' جوتا بنانے والوں میں علم:: اور اسی طرح مختلف پیشہ سے وابستہ افراد کے اندر علم و علماء کے پائے جانے کا کتب تاریخ کے حوالوں سے ایک نہایت وقیع ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔

اسی شمارے میں قاضی صاحب کا ایک اہم مضمون ''استشراق اور مستشرقین کے عنوان سے ہے، اس عنوان کے ماتحت قاضی صاحب نے ''یورپ میں اسلامی علوم و فنون کی مختصر تاریخ'' حوالۂ قلم کی ہے اور یورپ میں مسلمانوں کے داخلے اور اندلس (اسپین) پر مسلمانوں کے تسلط کے بعد اس کے مردہ جسم میں ایک نئی روح جو پیدا ہوئی ہے اور اس کے نتیجے میں علم و فن اور تہذیب و ثقافت کی جولانگاہ میں ترقی کے جو مدارج طے کئے ہیں ان کا سرسری جائزہ لیا ہے۔ اسی شمارے

میں صفحہ ۳۸۵ اور ۴۰۸ پر علی الترتیب ''مدرسۃ الاصلاح سرائے میر'' اور ''جامعہ اسلامیہ ڈابھیل'' کی تاریخ اور تعارف بھی قاضی صاحب کی کاوش قلم کا رہین منت ہے۔

شعبان ۱۳۷۴ھ/اپریل ۱۹۵۵ء کے ''البلاغ'' میں ۲۲ صفحات پر مشتمل قاضی صاحب کا ایک مضمون بعنوان ''علمائے اسلام کے القاب وخطابات'' شائع ہوا ہے، اس مضمون میں جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے۔ اہل علم کیلئے استعمال کئے جانیوالے القاب وخطابات مثلاً ''عالم''، ''مقری''، ''قاری''، ''معلم''، ''مکتب''، ''مودب''، ''استاذ''، ''مولوی''، ''مولانا'' اور اس طرح کے پچاسوں مفرد اور مرکب القاب پر لغوی، لسانی اور تاریخی حیثیت سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ مضمون بہت معلومات افزا اور نہایت مفید ہے۔

۸۔۹۔۱۰ جنوری ۱۹۵۵ء مطابق ۱۴۔۱۵۔۱۶۔ جمادی الاولی ۱۳۷۴ھ کو بمبئی میں آل انڈیا دینی وتعلیمی کنونشن کا انعقاد ہوا تھا، اس کنونشن میں ہندوستان کے چوٹی کے اہل علم وفکر نے شرکت کی، اور دینی مدارس، عصری درسگاہوں کے علماء واساتذہ اور سیاسی وسماجی شخصیتوں اور مختلف مکتب خیال کے نمائندہ افراد پہلو بہ پہلو شریک ہوئے اور قوم وملت کے بہت سارے مسائل پر غور وفکر کی خدمت انجام دی۔

''البلاغ'' کے تعلیمی نمبر کے اجرا کا محرک بھی یہی کنونشن تھا، رمضان المبارک ۱۳۷۴ھ کے ''افکار ومطالعات'' میں قاضی صاحب نے اس کنونشن کی کامیابی اور اس کے اچھے اثرات کا جائزہ لیا ہے اور نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند اور خاص طور سے پڑوسی ملک پاکستان کی دینی وتعلیمی فضا پر اس کا جو اثر پڑا ہے اس کا تذکرہ کیا ہے اس کے علاوہ ہندوستان کے دیگر ملی وسیاسی مسائل اور روس کے اندر مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے مسائل ومشکلات پر نظر ڈالی ہے۔

سطور بالا میں ''البلاغ'' کے ایک سال کے تمام شماروں میں قاضی صاحب کے شائع ہونے والے ہر مضمون پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، ان سطروں سے ''البلاغ'' کے ساتھ قاضی صاحب کی وابستگی، ان کے قابل قدر علمی وقلمی وفکری تعاون اور اس کی ادارت تحریر میں ان کے نمایاں مقام وحیثیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اگر یہ عرض کیا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ اس رسالہ کے معیار کو بلند کرنے، اس کو طبقۂ علماء اور حلقہ اہل علم میں مقبولیت

عطا کرنے، اور معاصر رسائل میں نمایاں اور ممتاز مقام تک پہونچانے میں نہایت اہم اور موثر رول قاضی صاحب کی قلمی کاوشوں اور علمی تحریروں کا بھی تھا۔ یہ رسالہ جب تک جلوہ آرائی کرتا رہا، اہل علم اور ارباب فکر وبصیرت سے داد تحسین وصول کرتا رہا۔

قاضی صاحب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ان کا ذہن وقلم بیک وقت دو طرح کے موضوع پر گہر باری کرتا تھا، ہم نے اوپر یہ عرض کیا ہے کہ ''افکار ومطالعات'' اس رسالہ کا ایک مستقل اور بیش قیمت کالم تھا۔ اس کالم میں شروع میں زیادہ تر حامد الانصاری غازی صاحب اپنی جولانئ فکر ونظر دکھایا کرتے تھے لیکن دوسری جلد کے شروع ہی سے اس کالم میں مستقل طور پر قاضی صاحب جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ ''افکار ومطالعات'' میں اصلاحی، سیاسی اور سماجی ومعاشرتی مسائل زیر بحث ومطالعہ رہا کرتے تھے اور اسکے ذریعہ امت کی اصلاح اس کے اندر احساس ذمہ داری اور دینی وقومی بیداری لانے کی کوشش کی جاتی تھی، اور دوسری طرح کے مضامین بیشتر علمی و تحقیقی ہوا کرتے تھے جو اہل علم کے علمی وتحقیقی ذوق کی آبیاری کرتے تھے اور ان کو فکری اور روحانی غذا فراہم کرتے تھے۔

قاضی صاحب اعلیٰ درجہ کے محقق ومصنف اور مضمون نگار ہونے کے ساتھ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے اور ان کا کلام لفظی اور معنوی محاسن کا مجموعہ ہوا کرتا تھا۔ ''البلاغ'' کے صفحات ان کے منظوم کلام سے کیوں محروم رہتے؟ اس کے بہت سے شمارے ان کے اشعار اور نظموں سے بھی مزین نظر آتے ہیں۔

دوسری جلد کے پہلے شمارے میں جو شوال ۱۳۷۰ھ کے مہینہ کا شمارہ ہے۔ ائمہ اربعہ میں سے ایک حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت امام علیہ الرحمہ کی زندگی پر لکھنے کیلئے ضخیم کتاب درکار ہوتی ہے، اور علماء اسلام نے ان کی سیرت وکردار پر بہت کچھ لکھا بھی ہے۔ قاضی صاحب نے اپنے مضمون میں دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی سعی فرمائی ہے۔

جلد ثانی کے دوسرے شمارے میں قاضی صاحب کا ایک بیش قیمت علمی اور تاریخی مضمون ''اسلام اور چین کے قدیم تعلقات۔ سلیمان تاجر اور ابوزید سیرافی کے بیان کی روشنی میں'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، یہ تحریر عرب وچین کے قدیم تعلقات پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی

ہے۔اس مضمون کے آغاز میں قاضی صاحب نے یہ تمہید تحریر فرمائی ہے:

''عربوں اور چینیوں کے قدیم معاشی تعلقات کی تاریخ بہت اہم ہے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ قدیم عرب اور قدیم چین کے باہمی تعلقات اس قدر وسیع اور دوررس نتائج کے حامل ہیں کہ دنیا کی قدیم سے قدیم متمدن قوموں کے درمیان باوجود زمانی اور مکانی قربت کے اس نوعیت کے تعلقات پیدا نہیں ہو سکتے۔''

قاضی صاحب اس کے معاً بعد ارقام فرماتے ہیں:

''دور جاہلیت میں یہ تعلقات سراسر معاشی اور تجارتی تھے مگر جب اسلام کی آمد ہوئی تو عرب تاجروں نے اپنے سامان تجارت کے ساتھ چین میں دین و ایمان کی سوداگری بھی شروع کی اور چینیوں کے بازار میں عربی سامان کے ساتھ اپنی دوکانوں پر اسلامی اعمال وعقائد کو بھی رکھا ،نتیجہ یہ ہوا کہ بہت ہی مختصر مدت میں چین کی بستیوں میں اسلامی زندگی کو مقبولیت حاصل ہوگئی''

سلیمان تاجر اور ابوزید سیرفی جس کے سفر ناموں کی روشنی میں قاضی صاحب نے اپنا یہ مضمون تیار کیا ہے،اس کی حیثیت اور اہمیت کیا ہے؟ اس پر قاضی صاحب نے خود یوں روشنی ڈالی ہے:

''سلیمان تاجر بہت بڑے مسلمان تاجر و سیاح ہیں ، انھوں نے بلاد ہندوستان اور بلاد چین کا سفر کر کے ۲۳۷ھ میں اپنا مختصر سا سفر نامہ مرتب کیا ،اس سفر نامہ میں اختصار کے ساتھ نہایت ہی اہم معلومات درج ہیں۔

ابوزید سیرافی نے اسی سفر نامہ کو سامنے رکھ کر اپنا سفر نامہ مرتب کیا ہے اور اسی کی بنیاد پر اپنی معلومات کو بھی جمع کیا ہے۔

ابوزید سیرافی نے تقریباً ۲۶۴ھ میں ہندوستان اور چین کا سفر کیا اور یہاں کے حالات اپنے سفر نامہ میں درج کئے اگر چہ یہ سفر نامہ بہت مختصر ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ اس میں ہے سراسر مغز ہے اور اس میں پوست کا نام ونشان تک نہیں''

مضمون کے صفحہ ۲۸ کی آخری سطر کے ذیلی عنوان میں اور صفحہ ۲۹ کی پندرہویں سطر کی عبارت میں لفظ ''بج'' کتابت کی غلطی سے ''حج'' ہو گیا ہے،عبارت موہم ہونے کی وجہ سے اس پر تنبہ ضروری ہے۔

ان دونوں سفرناموں کے بارے میں قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ پیرس کے شاہی پریس میں ۱۸۱۱ء میں چھپا تھا اور خود قاضی صاحب کے بقول اس مطبوعہ نسخے کی نقل سے انھوں نے استفادہ کیا تھا۔

ماہ محرم ۱۳۷۵ھ کے شمارے میں قاضی صاحب کا ایک مضمون ''مکتوبات امام احمد'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس میں امام ربانی حضرت امام احمد علیہ الرحمہ کے تحریر فرمودہ دو مکتوب درج ہیں، پہلا مکتوب علم حدیث کے ایک بڑے عالم اور امام بخاری جیسے ائمہ حدیث کے شیخ و استاذ مسدد بن مسرہد کے نام تحریر ہے اس میں اسلام کے بنیادی اصول و تعلیمات اور بعض اہم اختلافی مسائل پر ضوفشانی کی ہے۔ دوسرا مکتوب خلیفہ متوکل علی اللہ کے نام ہے جس کا مرکزی موضوع قرآن کریم ہے، چونکہ متوکل علی اللہ کی مساعی مشکورہ نے فتنۂ خلق قرآن جیسی آفتوں سے امت کو نجات دی تھی اس لئے قرآن کریم کے بارے میں متوکل کا سوال کرنا اور امام احمد کا اس پر بالتفصیل جواب دینا ایک فطری بات تھی۔ یہ دونوں مکتوب البلاغ کے گیارہ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔

اسی شمارے میں ''اسلامی دنیا کی تحریکات اور ہندوستان کا موقف'' کے عنوان سے تین صفحے کے ایک مضمون میں گذشتہ دو تین صدی میں عالم اسلام میں برپا ہونے والی متعدد تحریکوں اور ان کے اثرات پر سرسری نگاہ ڈالی ہے۔

اور اسی شمارے میں ''مکہ میں ہندوستان کے علمی خانوادے'' کے عنوان پر بلد حرام کے اندر اقامت پذیر ہندوستان کے متعدد خانوادوں اور ان کی دینی و علمی خدمات کا تذکرہ ہے۔

صفر ۷۵ھ کے شمارے میں مکتوبات امام احمد بن حنبل ہی کی دوسری قسط شائع ہوئی ہے جس میں خلیفہ متوکل کے علاوہ اور بھی متعدد حضرات کے نام مکاتیب درج ہیں، قاضی صاحب نے ان مکتوبات کو چیونٹی کے دانوں کی طرح چن چن کر جمع کیا ہے۔

ربیع الاول ۷۵ھ کے شمارے میں ''افکار و مطالعات'' کے علاوہ ''کفر و اسلام پر ایک عبرت آموز حکایت'' بھی شامل اشاعت ہے۔ عمرو بن مرہ اپنے زمانہ کے ایک بلند پایہ عالم و محدث تھے۔ ایک شخص ان کی خدمت میں اپنے کچھ اشکالات لے کر حاضر ہوا، یہی اشکالات

سوال وجواب کی شکل میں ذکر کئے گئے ہیں۔

البلاغ کے بعض مخصوص نمبرات اس کو دیگر معاصر رسائل میں نہایت اہم اور امتیازی مقام عطا کرتے ہیں، دسمبر ۱۹۵۵ء میں شاہ سعود نے ہندوستان کا دورہ کیا، یہ کسی سعودی شہنشاہ کا ہندوستان کا پہلا دورہ تھا۔ اسی مناسبت سے البلاغ نے ربیع الثانی و جمادی الاول ۱۳۷۵ھ/دسمبر، جنوری ۵۶۔۱۹۵۵ء کا ملک سعود نمبر شائع کیا، اس خاص نمبر کی ضخامت ۱۲۴ صفحات ہے، جس میں عربی اور اردو دونوں زبانوں میں مضامین اشاعت پذیر ہیں، اس میں قاضی صاحب کے ''افکار ومطالعات'' کے علاوہ ان کے قلم سے ''ملک معظم کے تین خطبے'' اور مملکت سعودیہ کے مرکزی شہر'' چھپے ہیں۔

جلد نمبر۲ شمارہ نمبر۹ بابت جمادی الثانیہ ۱۳۷۵ھ کے شمارے سے ایک اہم بات یہ نظر آتی ہے کہ ''البلاغ'' کے اندرونی ٹائٹل پر قاضی صاحب کا نام بحیثیت ''مدیر تحریر'' نظر آتا ہے، اسی شمارے کیلئے انھوں نے ''امام سرخسی اور اصول سرخسی'' کے عنوان پر مضمون تحریر فرما کر اہل علم اور فقہ وفتاویٰ سے دلچسپی رکھنے والے اہل نظر کیلئے قابل قدر مواد جمع کیا ہے۔

''البلاغ'' کی ادارتی تحریر ''شذرات'' کے عنوان سے ہوا کرتی تھی، مگر اس کے دوسرے مستقل کالم ''افکار ومطالعات'' کو بھی ایک منفرد قسم کا اداریہ ہی سمجھنا چاہئے، اس میں قاضی صاحب کی نظر بیک وقت متعدد مسائل پر مرکوز رہتی تھی۔ اور چند صفحے میں مختلف امور پر اپنے نقطہ نظر کی توضیح فرماتے تھے۔ رجب ۷۵ھ کے شمارے میں نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ آدھے صفحے میں فتنۂ انکار حدیث، اس کے پس منظر اور اس پس منظر میں کارفرما ذہنیت کو ارقام فرمایا ہے۔ اسی شمارے میں ''جانور اور اسلامی تعلیمات'' تحریر کر کے جانوروں کے متعلق اسلام کی تعلیمات اور احکام ومسائل کی تشریح فرمائی ہے جس سے مذہب اسلام کی ہمہ جہتی اور ہمہ گیری نیز اس کی رحمت ومروت کا اندازہ ہوتا۔ اسی شمارے میں قاضی صاحب کا ایک اور مضمون ''دار ارقم بن ابی ارقم! مکہ میں اسلامی ثقافت کا سب سے بڑا مرکز'' اس تحریر کا محرک یہ ہے کہ اس وقت کی سعودی حکومت نے حرم مکہ کی جب جدید تعمیر وتوسیع کی تو دار ارقم کو ثقافت اسلامیہ کا مرکز بنانے کا اعلان کیا۔

دار ارقم کیا ہے؟ قاضی صاحب نے اپنے مضمون میں اسلام کے اولین ایام میں اسلام اور

مسلمانوں کی بے بسی، وطن میں رہتے ہوئے ان کی غریب الوطنی کا پراثر نقشہ کھینچنے کے بعد دارارقم (ارقم بن ابی ارقم کا گھر، جو کوہ صفا کے ایک جانب واقع تھا) میں آنحضرت ﷺ کی پناہ گزینی کو بتفصیل بیان کیا ہے دارارقم کی اہمیت وعظمت کیلئے یہی کافی ہے کہ اس کو اسلامی تاریخ میں پہلے ''دارالاسلام'' بننے کا شرف حاصل ہے۔جس کو سینٹر بنا کر دین اسلام کی تعلیم وتبلیغ کی بیش بہا خدمت انجام دی گئی ہے۔دارارقم ایک طویل مضمون تھا جس کی دوسری قسط شعبان کے شمارے میں شائع کر کے یہ مضمون پورا کیا گیا۔

شعبان ۱۳۷۵ھ کے شمارے سے قاضی صاحب نے ایک سلسلہ''**طبقات الحجاج**'' کے عنوان سے شروع کیا، اس سلسلے کے آغاز کی تحریک حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ کی کتاب **الدرر الکامنة فی أعیان المائة الثامنة** کے مطالعہ کے بعد قاضی صاحب کے قلب وذہن میں پیدا ہوئی تھی، یہاں اس بات کی طرف اشارہ کر دینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ اسی موضوع پر بعد میں محدث جلیل حضرت علامہ اعظمی علیہ الرحمہ نے دو جلدوں میں اعیان الحجاج کے نام سے کتاب تالیف فرمائی تھی۔جس میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے لے کر اپنے زمانہ تک کے اساتذہ اور مشائخ کے واقعات حج کو قلمبند فرمایا تھا۔

رمضان المبارک کے افکار ومطالعات میں قاضی صاحب نے ایک بڑے نازک اور چبھتے ہوئے مسئلے پر اپنی قلمی کاوش کا مظاہرہ کیا ہے، انھوں نے دینی امور اور مذہبی مسائل میں مبالغہ آمیز حد تک جمود اور قدامت پسندی، اور دوسری طرف روشن خیالی اور تجدد پسندی پر تنقید کی ہے اور ان دونوں انتہاؤں کے درمیان بیچ کی صورت نکالنے پر زور صرف کیا ہے،اس کے بعد انھوں نے ایک مصری اور ازہری عالم کی اس ہرزہ سرائی کو ذکر کر کے کہ جدید حالات کے تقاضوں کے مطابق اسلام کے بعد مسائل کو بھی بدل دینا چاہئے، تحریر فرمایا ہے:

''اس قسم کے کچھ لوگ ہندوستان میں بھی پائے جاتے ہیں جو جدید تعلیم پانے کے بعد مذہبی معاملات میں کچھ شد بد رکھنے لگے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی نئی فکر کے مطابق اسلامی مسائل میں سوچا جائے اور ان ہی کے معیار پر عمل کیا جائے۔

عام طور سے ایسے لوگ دین کی روح سے ناواقف ہوتے ہیں اور اپنی روشن خیالی کے

باوجود جدید حالات سے مرعوب ہوتے ہیں اور ان کا مقابلہ کرنے کے بجائے خود دین کے مقابلہ پر آجاتے ہیں مگر وہ سمجھتے ہیں کہ ہم جدید وقدیم قدروں کے درمیان بیچ کی کڑی بن رہے ہیں اور ہمارے کارنامے مذہب اور عوام دونوں کیلئے قابل قدر ہیں۔''

قاضی صاحب نے یہ بات بہت پتے کی لکھی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کے قدیم اور ثابت شدہ مسائل کے اندر جب بھی عقلی گھوڑے دوڑا کر بیچ کی صورت نکالی جائے گی تو مرعوبیت آڑے آئے گی اور اس کی صورت وہی ہوگی جو انھوں نے ذکر کی ہے۔

گذشتہ صفحات میں ''البلاغ'' کی دو جلدوں کے ہر شمارے میں قاضی صاحب کے تقریباً ہر مضمون پر اجمال واختصار کے ساتھ کچھ لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پورے ''البلاغ'' کا جائزہ لینا نہ یہاں مقصود ہے اور نہ اس کی گنجائش جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے بہت حد تک قاضی صاحب کے جہد واخلاص اور ان کی خدمات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اس سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ ''البلاغ'' کو بلند معیار عطا کرنے، اس کو اہل علم میں مقبول بنانے اور دیگر معاصر رسائل میں اس کو ممتاز اور منفرد مقام عطا کرنے میں قاضی صاحب کی کاوشوں کا کتنا دخل تھا۔ البتہ ذیل میں ہم اس کی کچھ اور خاص خاص چیزوں کو ذکر کرنے کی کوشش کریں گے۔

شوال ۱۳۷۷ھ رمئی ۱۹۵۸ء کے شمارے سے ''البلاغ'' کے صفحات پر ایک اور خاص بات وجود پذیر ہوتی دکھائی دیتی ہے، یہاں سے ایک نیا سلسلہ ''مطالعات وتعلیقات'' کے عنوان سے نظر آتا ہے۔ یہ کالم ''افکار ومطالعات'' سے اس لحاظ سے قدرے مختلف ہوتا ہے کہ اس کے مضامین زیادہ علمی وتحقیقی اور تفصیلی ہوتی ہیں۔ اس میں قاضی صاحب کی زیادہ تر باتیں مدلل اور حوالہ جات سے مزین ہوتی ہیں۔ چند شماروں تک تو یہ دونوں کالم ساتھ ساتھ چلتے رہے، لیکن اکتوبر ۱۹۵۸ء سے ''مطالعات وتعلیقات'' باقی رہا اور ''افکار ومطالعات'' ختم ہوگیا۔

آگے چل کر ''شذرات'' نگاری کی خدمت بھی قاضی صاحب ہی کو انجام دینی پڑی ہے، ہمارے علم کے مطابق سب سے پہلے ''شذرات'' شوال ۱۳۸۵ھ رفروری ۱۹۶۶ء جلد ۱۵ شمارہ ۱۰ کے اندر صفحۂ قرطاس پر قاضی صاحب نے بکھیرے ہیں۔ اس کے بعد بیشتر بلکہ تقریباً تمام شماروں میں یہ ادارتی تحریر قاضی صاحب ہی کے قلم سے نظر آتی ہے۔

’’قاضی اطہر مبارکپوری اور دفاع اسلامی‘‘

مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی، استاذ مدرسہ منبع العلوم خیرآباد ،مئو

قاضی صاحبؒ علم کے کس بلند مقام پر فائز تھے زیر نظر مضمون میں یہ نہیں بیان کیا جائے گا یہ کام تو اہل نظر کا ہے۔ اس مضمون میں قاضی صاحبؒ کی ان علمی، تحقیقی نگارشات، مقالات اور مضامین کے اقتباسات پیش کئے جائیں گے، جو اسلامی تعلیمات پر ناروا حملوں کے دفاع میں قاضی صاحبؒ کے قلم تحقیق رقم سے زینت قرطاس ہوئے۔ بلاشبہہ ہمارے لئے رہنما بھی ہیں اور گراں قدر ورثہ بھی۔ ان اقتباسات کو پڑھنے کے بعد قارئین از خود قاضی صاحبؒ کے علم، ان کی بصیرت، دقت نظر، وسعت نظر، اور نکتہ رسی کے مقام کو متعین کرلیں گے۔

تاہم حدیث رسول ﷺ ’’اذکروا محاسن موتاکم‘‘ کے پیش نظر قاضی صاحبؒ کے بارے میں چند بنیادی باتوں کا بیان کردینا ہمارے لئے حدیث پر عمل کی سعادت اور افادیت کا باعث ہوگا۔

قاضی صاحبؒ ایک مورخ تھے تاریخ اسلام ان کا خاص موضوع تھا اور دنیا انہیں اسی حیثیت سی جانتی پہچانتی بھی تھی۔ انھوں نے کتابوں کی کتنی ورق گردانی کی، کتنا پڑھا اور مطالعہ کیا یہ بات تو ان کا سوانح نگار بیان کرے گا۔ مگر ان کے علمی ترکے کو دیکھ کر بقول شخصے کہنا پڑتا ہے کہ:

کتابوں کا مطالعہ آسان ہے مگر کسی خاص موضوع وعنوان کے لئے مفید موضوع، مواد مہیا کا کرنا ہر شخص کا کام نہیں، اس کے لئے فکر سلیم، نگاہ عمیق اور وجدان صحیح درکار ہے۔ رطب ویابس کو جمع کردینا بہت سہل ہے، یہ کام ہر آدمی کرسکتا ہے۔ لیکن کتابوں سے کارآمد مسالے اور مواد کا انتخاب واقتباس دشوار کام ہے۔ دریا اور تالاب سے پانی ہر شخص لے سکتا ہے۔ لیکن پانی کی ایک ایک بوند کو مقطر کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں اس کے لئے فن کارانہ مہارت کی ضرورت ہے۔

یہ صحیح ہے کہ حضرت قاضی صاحبؒ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا عبدالماجد دریادی کی طرح انشاء پرداز نہیں تھے۔ آپ کے یہاں قلم کی شوخیوں اور رنگینیوں کے بجائے سنجیدگی کی فراوانی اور حقائق کی درافشانی ہے۔

یہ بھی صحیح ہے کہ تاریخ کا موضوع کچھ خشک اور سنجیدہ ہے مگر قاضی صاحبؒ کے یہاں ایسی سنجیدگی نہیں پائی جاتی کہ پڑھنے والا اکتاہٹ محسوس کرے۔ قاضی صاحبؒ کی سنجیدگی بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ عبارت کی تمام تر سادگی کے باوجود آپ کی تصنیفات، مقالات اور مضامین پڑھنا شروع کیجئے تو رکھتے رکھتے دسیوں صفحات پڑھ ڈالے جاتے ہیں۔ کتاب رکھنے کے بعد تھکن اور دماغی بوجھ کے بجائے طبیعت میں ایک طرح کا نشاط اور کیف محسوس ہوتا ہے کیوں کہ دامن دماغ تاریخی لعل وجواہر سے مرصع نظر آتا ہے۔

مغربیت، تجدد پسندی، لادینی اور آزادروی کی راہ سے اسلامی تعلیمات پر انواع واقسام کے ناروا، اوچھے، رکیک اور گھناؤنے حملے کئے گئے ہیں۔ لیکن ان حملوں میں سب سے خطرناک، ہوشربا اور حوصلہ شکن حملہ انکار حدیث کا فتنہ ہے۔ یہ فتنہ کوئی نیا نہیں، یہ فتنہ تو قرن اول ہی میں جنم لے چکا تھا، انقلابات زمانہ کے ساتھ ساتھ نئے نئے انداز میں اس کے نئے نئے پر پُرزے نکلتے گئے۔

موقع اور موضوع کی مناسبت سے قارئین کی معلومات میں اضافے کے پیش نظر انکار حدیث کی ابتداء بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اپنی تالیف ''تدوین حدیث'' میں لکھتے ہیں۔

''خوارج نے کتاب کو مانا اور سنت سے انحراف کیا.......... جو کچھ پہلے ہوا وہ آج بھی ہو رہا ہے سرسید کے زمانے سے احادیث کا فن ناآشنایان فن کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے''..................
ان بدعتوں اور گمراہوں نے مستشرقین یورپ کے سفیہانہ اعتراضات کو جو فن حدیث پر انھوں نے کئے ہیں اپنا کر سرے سے اس فن کی بیخ کنی کی شروع کر دی۔ انہیں سے سن کر کہا جاتا ہے کہ حدیثیں تو حضور انور ﷺ کے ڈھائی سو برس بعد قلم بند ہوئیں ان کا کیا اعتبار (تدوین حدیث ص: ج، ح)

فتنۂ انکار حدیث کے سلسلے میں محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی نور اللہ مرقدہ اپنی معرکۃ الآراء اور بے بدل تصنیف ''نصرۃ الحدیث'' میں ارقام فرماتے ہیں۔

''ہندوستان میں انکار حدیث کی بدعت بظاہر تو عبداللہ چکڑالوی (پنجاب) نے ایجاد کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ چکڑالوی سے بہت پہلے اس فتنہ کا بیج نیچری فرقہ نے بویا تھا۔عبداللہ چکڑالوی نے آکر اس شجرۂ ملعونہ کی آبیاری کی اور اسی کے ہاتھوں وہ بڑھا، اور پھولا پھلا، اس لئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس فتنہ کا بانی وہی ہے، نیز نیچری فرقہ اپنے اس عقیدہ کا صاف لفظوں میں اور زیادہ گھناؤنے انداز میں اظہار نہیں کرتا تھا۔ چکڑالوی نے بے حجاج ہوکر اپنے کفریات کی اشاعت کی۔ اور حد سے زیادہ ایمان سوز و اسلام کش پیرایۂ بیان اختیار کیا۔ اس لئے انکار حدیث کی لعنت اسی کی طرف منسوب کی گئی۔

''انکار حدیث کا محرک و سبب'' عنوان کے تحت حضرت محدث الاعظمی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں۔

''بہر حال اس فتنہ کا بانی جو بھی ہو اس کا اصلی محرک تو جیسا کہ میں ''نصرۃ الحدیث'' میں بتا چکا ہوں، لادینی اور آزادروی ہے، مگر اپنی لادینی پر پردہ ڈالنے کے لئے انکار حدیث کے عقیدہ میں زبردستی معقولیت پیدا کرنے کیلئے منکرین حدیث کہا اور لکھا کرتے ہیں کہ ''حدیثیں آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد دوسو برس معرض تحریر میں آئی ہیں۔ (نصرۃ الحدیث ص:۲،۳)

خود قاضی صاحبؒ اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

''یہ بات بالکل بے بنیاد ہے کہ احادیث نبویہ پہلی صدی کے بعد مرتب و مدون کی گئی ہیں اور اس سے پہلے کتابی شکل میں نہیں تھیں۔ یہود و نصاریٰ اور مستشرقین کا یہ پروپیگنڈہ کہ حدیثیں بہت بعد میں جمع کی گئیں اور ابتدائی دور میں ان کی نقل و کتابت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، اسلام دشمنی کا بدترین مظاہرہ ہے۔ ماہنامہ معارف ج:۱۴۴،ص:۲۴۶ عدد۴، اکتوبر ۸۹ء)

موجودہ دور میں انکار حدیث کا آغاز مستشرقین یورپ کی طرف سے ہوا اس لئے قاضی صاحبؒ مستشرقین کی اسلام دشمنی واضح کرنے کے لئے ''استشراق میں مذہبی اور سیاسی رجحان'' عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں۔

''ابتداء میں اہل یورپ کو اسلامیات اور مشرقیات سے دلچسپی خالص علمی اور فکری انداز میں تھی اور انھوں نے اسی انداز سے ان کو سیکھا اور سکھایا اور ان سے استفادہ کیا مگر بعد میں مذہبی (یعنی مسیحی مذہبی) طبقہ نے اسلام، پیغمبر اسلام (ﷺ) اور مسلمانوں کی عداوت میں ان علوم سے کام لینا شروع کیا اس سلسلے میں پادریوں نے نہایت مکروہ کارنامہ چھوڑا جسے خود یورپ کا باخبر طبقہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے تنگ نظر اور جاہل مذہبی پیشواؤں کے ایسے علمی کارناموں پر شرم محسوس کرتا ہے۔ اس دور میں اسلامیات اور مشرقیات سے متعلق جو کتاب بھی مذہبی حلقے سے سامنے آئی اس میں کھلے طور سے یہ خرابی پائی جاتی ہے۔ (مآثر و معارف ص:۲۹۶)

زیر نظر مضمون میں محققین کی تحریروں سے ہم واضح کر چکے ہیں کہ اسلامی تعلیمات پر سب سے زبردست حملہ احادیث نبویہ کو غیر مستند قرار دینا اور دنیا والوں کو یہ باور کرانا ہے کہ حدیثیں حضور انور ﷺ کے دو ڈھائی سو برس بعد لکھی گئیں اس لئے ان کا کیا اعتبار؟

اس اعتراض کے جواب میں حضرت قاضی صاحبؒ نے پوری جگر کاوی، دلسوزی اور عرق ریزی کے ساتھ اس بات کی تحقیق بہم پہونچائی ہے کہ احادیث کی جمع و تدوین کا سرمایہ خود آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ میں وجود میں آچکا تھا۔ چنانچہ قاضی صاحبؒ اپنے مقالہ ''تدوین حدیث کے چار ادوار'' کے ذیلی عنوان ''عہد رسالت کے چند تحریری سرمائے'' کے تحت رقم طراز ہیں:

''اس طرح عہد رسالت میں انفرادی طور پر احادیث کی کتابت کا رواج ہو گیا تھا اور صحابہ اپنے طور پر ان کو جمع کرنے لگے تھے۔ (مآثر و معاف ص:۱۸)

یہ جمع احادیث کا کام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین خود آنحضرت ﷺ کے حکم سے کرتے تھے جیسا کہ مذکورہ اقتباس کے چند سطروں کے بعد قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''خود عبداللہ بن عمرو کا بیان ہے کہ میں جس قدر احادیث سن لیتا تھا ان کو لکھ لیا کرتا تھا ایک مرتبہ اہل قریش نے مجھے یہ کہہ کر روکا کہ رسول اللہ ﷺ بشر ہیں بہت سی باتیں غصے میں کہہ دیتے ہوں گے اس لئے تم حدیثیں نہ لکھو، میں ان کے اس کہنے پر رک گیا۔ مگر جب رسول اللہ

ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تم ان کو لکھ لیا کرو اس زبان سے کسی حالت میں ناحق بات نہیں نکل سکتی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ تیار ہو گیا جس کا نام انھوں نے ''الصادقہ'' رکھا۔ دیگر صحابہ بھی احادیث کو براہ راست رسول اللہ ﷺ سے سن کر لکھا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو کا بیان ہے کہ ''نحن حول رسول اللہ نکتب'' یعنی ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے اردگرد بیٹھ کر حدیثیں لکھا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ متعدد صحابہ آپ سے حدیثیں لکھا کرتے تھے۔

حضرت رافع بن خدیج نے بھی رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تھا کہ اجازت ہو تو ہم آپ ﷺ کی حدیث لکھ لیا کریں۔ آپ نے فرمایا کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ایک انصاری صحابی نے عرض کیا تھا کہ مجھ کو حدیث یاد نہیں رہتی آپ نے فرمایا لکھ لیا کرو۔ عہد رسالت میں احادیث کے یہ انفرادی مجموعے اور دربار نبوی کے احکام و فرامین جو باہر روانہ کئے جاتے تھے تدوین حدیث کے نقش اول تھے اور ان کی بنیادوں پر بعد کے ادوار میں کام ہوا۔ (حوالہ سابق ص: ۱۸۔۱۹)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ اپنے صحیفہ ''الصادقہ'' کی کتنی قدر و عزت فرماتے تھے اور اسے اپنی زندگی کا کتنا گرانقدر اور بیش بہا سرمایہ سمجھتے تھے اس کا اندازہ قاضی صاحبؒ کی سطور ذیل سے کیا جا سکتا ہے۔

''حضرت عبداللہ بن عمروؓ زندگی بھر صحیفہ ''**الصادقه**'' کو دل و جان سے عزیز رکھتے تھے اور کسی کو ہاتھ لگانے نہیں دیتے تھے، مشہور تابعی مجاہدؒ کا بیان ہے کہ میں نے عبداللہ بن عمرو کے پاس ایک صحیفہ دیکھا اور اس کو چھونے لگا تو انھوں نے کہا خبردار! اے بنی مخزوم کے غلام! میں نے کہا آپ تو مجھے کسی چیز سے نہیں روکتے اس سے کیوں روک رہے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ:

''**هذه الصادقة فيها ما سمعته من رسول الله ﷺ ليس بيني و بينه فيها احد** (ماہنامہ معارف اکتوبر ۸۹ء دار المصنفین اعظم گڑھ بحوالہ المحدث الفاصل ص: ۳۶۷) یہ صادقہ ہے اس میں وہ حدیثیں ہیں جن کو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے اور ان میں میرے اور آپ ﷺ کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔

مجاہدؒ نے عبداللہ بن عمرو کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

ما آسیٰ علی شئی علی الصادقة ، والصادقة صحیفة استاذنت فیها النبی ﷺ ان اکتب فیها ما اسمع منه فاذن لی ۔ الصادقہ کے علاوہ مجھے کسی اور چیز کی پرواہ نہیں ہے الصادقہ ایسا صحیفہ ہے جس کے بارے میں میں نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت چاہی کہ جو کچھ آپ ﷺ سے سنوں اس میں لکھ لوں، اور آپ نے مجھے اجازت مرحمت فرمائی تھی۔

اسی صحیفہ ''الصادقہ'' کے بارے میں حضرت قاضی صاحبؒ مزید اپنی تحقیقی کدوکاوش درج ذیل الفاظ میں پیش فرمارہے ہیں:

''یہ صحیفہ حضرت عبداللہ بن عمرو کے خاندان میں موجود تھا اور جب احادیث کی روایت میں اخبرنا وحدثنا کی باری آئی تو ان کے پڑپوتے عمرو بن شعیب نے اس کی روایت کی، وہ تابعی عالم ہیں، مستقل سکونت مکہ مکرمہ میں تھی طائف بھی جایا کرتے تھے ان کی روایات زیادہ تر اپنے والد سے ہیں۔ (ماہنامہ معارف اکتوبر ۸۹ء ص:۲۵۲)

قاضی صاحبؒ کے تبحر فی العلم کا اندازہ معارف میں شائع شدہ اسی مضمون کی اگلی سطروں میں ہوتا ہے جہاں حضرت قاضی صاحبؒ احادیث کی اقسام ''مرسل'' اور ''وجادہ'' کی تشریح فرماتے ہیں اور اسی کے ساتھ عمرو بن شعیب کی روایت پر اہل علم نے جو اعتراضات کئے ہیں ان کا شافی جواب بھی نقل کرتے ہیں ،۔ یہ باتیں اس بات کا بین اور واضح ثبوت ہیں کہ قاضی صاحبؒ کو تاریخ اسلام کے ساتھ ساتھ علم حدیث میں بھی درک حاصل تھا۔

مقالہ ''تدوین حدیث کے چار ادوار'' میں حضرت قاضی صاحبؒ نے عہد رسالت کے پانچ مدونات حدیث کا تذکرہ کیا ہے جن کے نام یہ ہیں:

''الصادقہ'' کتاب عمرو بن حزم، کتاب الصدقہ، صحیفہ علی، خطبہ فتح مکہ''

مذکورہ ہر صحیفۂ حدیث کا تعارف قاضی صاحبؒ کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

الصادقہ کے بارے میں تو آپ اوپر کی سطروں میں پڑھ چکے ہیں۔ اب کتاب عمرو بن حزم کے بارے میں ملاحظہ فرمائیں:

کتاب عمرو بن حزم :۔ رسول اللہ ﷺ نے فرائض وسنن اور دیت کے مسائل پر مشتمل ایک

تحریر لکھوا کر عمرو بن حزم صحابی کے ساتھ اہل یمن کے پاس بھیجی تھی اس نوشتہ کے جستہ جستہ ٹکڑے احادیث وسیر کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ مستدرک حاکم میں اس کتاب کی ۶۳ حدیثیں منقول ہیں۔ اس کے علاوہ ایک نوشتہ رسول اللہ ﷺ نے اہل یمن کے نام روانہ فرمایا تھا جس کی حدیثیں مصنف ابن ابی شیبہ میں امام شعبیؒ سے مروی ہیں۔

کتاب الصدقہ :۔ رسول اللہ ﷺ نے حیات طیبہ کے آخر میں باہر کے عاملوں کے لئے ایک مجموعہ کتاب الصدقہ کے عنوان سے مرتب کرایا تھا جس میں جانوروں کی زکوٰۃ سے متعلق احادیث درج تھیں لیکن اس کی روانگی سے پہلے ہی آپ کا وصال ہو گیا، اور حضرت ابوبکر صدیق کے دور خلافت میں اس پر عمل درآمد ہوا۔

صحیفہ علی : ۔حضرت علیؓ کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں دیت قصاص اور قیدیوں کی رہائی کے مسائل درج تھے، نیز اس میں مختلف احکام کی احادیث درج تھیں جو کتب احادیث میں مناسب مقام پر موجود ہیں۔

خطبۂ فتح مکہ :۔ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ایک طویل خطبہ ارشاد فرمایا تھا، جب آپ ﷺ خطبہ سے فارغ ہوئے تو ایک صحابی ابوشاہ یمنیؓ نے اٹھ کر درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھے لکھ کر عنایت ہو چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: اکتبوا لابی شاہ ،یعنی یہ خطبہ ابوشاہ کے لئے لکھ دو، یہ خطبہ بھی احادیث میں موجود ہے۔ (مآثر ومعارف ص:۲۰)

اوپر عبداللہ بن عمرو کے جس صحیفۂ حدیث کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کے علاوہ بھی حضرت عبداللہ بن عمرو کے پاس احادیث کا بہت زیادہ سرمایہ اور ذخیرہ موجود تھا جس کو بوقت ضرورت وہ کام میں لاتے تھے، وہ اس ذخیرے اور مکتوبے کو ایک صندوق میں بند کر کے بحفاظت رکھتے تھے، اس بات کی بھی تحقیق حضرت قاضی صاحبؒ کے ذریعہ ہم تک پہونچی ہے۔

چنانچہ اپنے ایک مقالہ شائع شدہ معارف میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''ابوقبیل راوی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن عمرو سے پوچھا گیا کہ قسطنطنیہ اور رومیہ شہروں میں کون شہر سب سے پہلے فتح ہوگا تو انھوں نے اسی صندوق سے ایک کتاب نکال کر بتایا کہ پہلے مدینۂ ہرقل فتح ہوگا۔

"فدعا عبدالله بن عمرو بصندوق له حلق فاخرج كتابا فجعل يقرء" (ماہنامہ معارف اکتوبر ۸۹ بحوالہ مصنف ابی شیبہ ج:۵ ص:۳۲۹) عبداللہ بن عمرو نے ایک صندوق منگائی جس میں کڑے لگے ہوئے تھے اور اس میں سے ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگے۔

جن صحابہ کے صحائف احادیث ونسخہ جات احادیث کا تذکرہ اب تک قارئین نے ملاحظہ فرمایا ہے ان کے علاوہ مزید سات صحابہ کرام کے صحائف احادیث کا تذکرہ قاضی صاحب نے معارف کے دوسرے شمارے میں فرمایا ہے، انہیں بھی یہاں نقل کیا جاتا ہے تاکہ قارئین قاضی صاحبؒ کی جستجو تتبع اور محنت شاقہ کے اندازے کے ساتھ ساتھ یہ بھی جان لیں کہ منکرین حدیث کا اعتراض (احادیث کی تدوین دوسو برس بعد ہوئی) کس قدر لغو، لایعنی اور حقائق سے بعید تر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی احادیث کے صحیفے اور نسخے :۔ حضرت عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما مکثرین صحابہ میں سے ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ سے بہت زیادہ احادیث روایت کی ہیں۔ ان کے اصحاب وتلامیذ نے ان کی روایات کو کتابوں اور نسخوں کی شکل میں جمع کیا ہے جن میں نسخۂ نافع زیادہ مشہور ہے۔ خطیب بغدادی نے اس کا تذکرہ یوں کیا ہے:

ونسخة اخرىٰ عند ابى اليمان عن شعيب ايضاً عن نافع بن عمر (معارف نومبر ۸۹ء بحوالہ الکفایہ ص؛۲۱۴) اور ایک نسخہ اور ابوالیمان کے پاس شعیب کی روایت سے تھا جس کو انھوں نے نافع عن ابن عمر سے روایت کیا تھا۔

عبداللہ بن عباسؓ کی احادیث کے صحیفے اور نسخے :۔ حبر الامت ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی عمر وفات نبوی کے وقت دس یا تیرہ سال تھی ....حضرت عبداللہ بن عباسؓ اپنی دینی معلومات اور احادیث کو لکھ لیا کرتے تھے، ان کے پاس ایسے صحف ونسخ کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا، عبیداللہ بن علی بن ابورافع کا بیان ہے کہ: كان ابن عباس ياتى ابا رافع فيقول ما صنع رسول الله ﷺ يوم كذا، ومع ابن عباس من كان يكتب ما يقول (معارف نومبر ۸۹ء بحوالہ الاصابہ ج:۲ ص: ۹۱۔۹۲) ابن عباس (میرے دادا) ابورافع کے پاس آکر ان سے معلوم کرتے کہ رسول اللہ ﷺ

نے فلاں دن کیا کام کیا؟ اور ان کے ساتھ آدمی رہتا تھا جو لکھ لیا کرتا تھا۔

قاضی صاحبؒ مزید تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت ابن عباس نے اپنی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ ایک بیان کے مطابق ان کے پاس ایک اونٹ کے بار برابر کتابیں تھیں جن کو بعد میں ان کے غلام کریب بن ابو مسلم نے مشہور امام مغازی موسیٰ بن عقبہ کے یہاں رکھا تھا ان کا بیان ہے:

وضع عندنا کریب حمل بعیر من کتب ابن عباس (معارف نومبر ۸۹ء بحوالہ تہذیب التہذیب ج:۸ص:۴۳۳) کریب نے ہمارے پاس ابن عباس کی کتابوں سے ایک اونٹ کے بار برابر کتابیں رکھی تھیں۔

عبداللہ بن مسعودؓ کی احادیث کا صحیفہ :۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ السابقون الاولون میں ہیں جو صاحب الہجرتین بھی ہیں۔ غزوۂ بدر اور اس کے بعد تمام غزوات میں شریک رہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کے خادم خاص اور صاحب النعل والوسادہ ہیں۔ ان سے بہت زیادہ احادیث مروی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو دینی تعلیم کے لئے کوفہ بھیجا تو اہل کوفہ کو لکھا کہ میں نے ابن مسعودؓ کو تمہارے پاس بھیج کر اپنے اوپر تم لوگوں کو ترجیح دی ہے، تم ان سے علم حاصل کرو، ان کے بڑے مناقب اور فضائل ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ کے پاس ان احادیث کا ایک نسخہ کتاب کی صورت میں تھا جس کو انھوں نے خود لکھا تھا، ان کے پوتے معن بن عبدالرحمٰن کا بیان ہے۔

عن معن قال : اخرج الی عبدالرحمن بن عبدالله بن مسعود کتاباً وحلف لی انه خط ابیه بیده (حوالہ بالا بحوالہ جامع بیان العلم ج:۱ص:۷۲) میرے والد عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود نے میرے سامنے ایک کتاب نکالی اور قسم کھا کر کہا کہ یہ ان کے والد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ کی احادیث کے نسخے :۔ حضرت عقیل کے پوتے عبداللہ بن محمد اور حضرت حسین کے پوتے ابوجعفر محمد الباقر دونوں حضرت جابرؓ سے احادیث لکھتے تھے۔

حضرت عاصم بن عمر بن قتادہ کے پاس حضرت جابر کی احادیث کا ایک صحیفہ تھا جس کی تصدیق امام شعبی نے کی یہ نسخہ انھوں نے حضرت جابر سے سن کر لکھا تھا۔

حضرت جابرؓ کے تلامذہ میں ابوسفیان، طلحہ بن نافع قرشی کے پاس بھی ان کی احادیث کا ایک صحیفہ تھا جس کی وہ روایت کرتے تھے۔

بصرہ کے اہل علم کے پاس حضرت جابر کا یہ صحیفہ تھا جسکو حسن بصریؒ نے ان سے لے کر روایت کیا (معارف نومبر ۸۹ء میں مذکورہ بالا تینوں روایتیں تہذیب المحدث الفاصل، الکفایہ کے حوالے سے منقول ہیں)

انس بن مالک کی احادیث کے صحیفے اور نسخے:۔ حضرت انسؓ نے رسول اللہ ﷺ کی احادیث کو صحیفے کی شکل میں جمع کر کے آپ ﷺ کو سنا دیا تھا اور بعد میں اس کی روایت کرتے تھے۔ اس صحیفہ کے علاوہ بھی حضرت انسؓ اپنے معاصر صحابہ سے کوئی حدیث سنتے تھے اور اس میں ندرت ہوتی تو لکھ لیا کرتے تھے۔ محمود بن ربیع بیان کرتے ہیں:

لما حدث عتبان بن مالک قال انسؓ فاعجبنی الحدیث فقلت له اکتبه ؟ قال : اکتبه (حوالہ سابق بحوالہ المحدث الفاصل) ایک مرتبہ عتبان بن مالک نے حدیث بیان کی تو حضرت انس نے کہا کہ مجھے اچھی لگی اور میں نے عتبان سے کہا میں اس کو لکھ لوں؟ انھوں نے کہا لکھ لو۔

عتبان بن مالک بن عمرو انصاری سلمی رضی اللہ عنہ اصحاب بدر سے ہیں۔ رسول اللہ نے ان کے اور حضرت عمرؓ کے درمیان ...... مواخاہ فرمائی تھی ان سے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے۔

حضرت انسؓ کی احادیث کے بارے میں تاریخ کبیر سے قاضی صاحبؒ نے نقل فرمایا ہے: "**کنا اذا اکثرنا علی انس القی الینا سجلا فقال هذه احادیث کتبتها عن النبی ﷺ ثم عرضتها علیه**" (حوالہ بالا بحوالہ تاریخ کبیر)

جب ہم حضرت انس سے زیادہ حدیث کے لئے اصرار کرتے تو ہمارے سامنے تھیلا ڈال دیتے تھے اور کہتے تھے ان احادیث کو میں نے رسول اللہ ﷺ سے لکھا ہے، پھر ان کو آپ ﷺ کے سامنے پیش کیا ہے۔

حضرت معاذ بن جبل کی احادیث کے صحیفے اور نسخے:۔ حضرت معاذ بن جبل

رضی اللہ عنہ جماعت صحابہ میں حلال وحرام کے سب سے بڑے عالم تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو یمن کا امیر بنایا تھا اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد وہاں سے واپس آئے بعد میں مستقل قیام ملک کے شہر حمص میں تھا، ابومسلم خولانی کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ حمص کی مسجد میں گیا جہاں تقریباً تیس عمر رسیدہ صحابہ موجود تھے ان میں ایک خوبصورت نوجوان بیٹھا تھا۔ اور جب یہ حضرات کسی مسئلہ میں بحث کرتے تو اسی نوجوان کی طرف رجوع ہوتے تھے مجھے بتایا گیا کہ یہ معاذ بن جبل ہیں۔ ابو بحریہ کا بیان ہے کہ میں حمص کی مسجد میں گیا وہاں ایک خوبصورت جوان تھا لوگ اسکے گرد حلقہ لگائے بیٹھے تھے جب وہ جوان بات کرتا تو گویا اس کے منہ سے نور اور موتی جھڑتا تھا لوگوں نے بتایا کہ یہ معاذ بن جبل ہیں۔

حضرت معاذ بن جبل کے کئی تلامذہ نے ان مرویات واحادیث کو صحیفہ اور نسخہ کی شکل میں جمع کیا تھا اور وہ ان کی روایت کرتے تھے۔ ابن عائذ کا بیان ہے:

وجدنا فی نسخة عن معاذ بن جبل ان النبی ﷺ نھیٰ ان یدخل علی المغیبات (حوالہ سابق بحوالہ المحدث الفاصل) ہم نے ایک نسخہ میں جو معاذ بن جبل سے مروی ہے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی عورتوں کے پاس تنہا رہنے سے منع فرمایا ہے جن کے شوہر غائب ہوں۔

حضرت سمرہ بن جندب کی احادیث کا نسخہ: ۔حضرت سمرہؓ بعد میں بصرہ میں آباد ہوگئے تھے انھوں نے اپنے صاحبزادوں، سلیمان اور سعد کے لئے احادیث وآثار کا ایک بڑا مجموعہ تیار کیا تھا جس کے متعلق محمد بن سیرین کا قول ہے۔ **فی رسالة سمرة الی بنیه علم کثیر** ۔سمرہ کے رسالہ میں جوان کے دونوں لڑکوں کے نام ہے، بہت زیادہ علم ہے۔

اس رسالہ یا نسخہ کی روایت حضرت سمرہ کے خاندان میں نسلاً بعد نسل ہوتی رہی ہے۔ چنانچہ ان سے ان کے بیٹے سلیمان نے اور سلیمان سے ان کے بیٹے اور علی بن ربیعہ والبی نے کی۔ (حوالہ بالا تہذیب التہذیب)

قارئین کرام نے اب تک قاضی صاحبؒ کے ان مضامین ومقالات کے اقتباسات کو ملاحظہ فرمایا جنہیں قاضی صاحبؒ نے محض اس لئے قلم بند فرمایا تاکہ مستشرقین نام نہاد اور موجودہ

اصطلاح میں روشن خیال مسلمانوں کے اعتراض کی لغویت اظہر من الشمس ہو جائے۔
اب ہم قاضی صاحبؒ کے ایسے مضامین کے اقتباسات پیش کریں گے جو انھوں نے مسلمانوں کے سنجیدہ اور باوقار طبقہ کی غلط فہمی کے ازالہ میں قلم بند فرمایا ہے۔ قاضی صاحبؒ ان مقالات کو تحریر نہ فرماتے مگر ان کی نگاہ دوربین نے تاڑ لیا تھا کہ اس غلط فہمی کے نتیجے میں اسلامی تعلیم مساوات کی دھجیاں بکھر رہی ہیں اور ضابطۂ خداوندی ''ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم'' کی گویا تضحیک ہو رہی ہے۔
اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عجمی ذہنیت اور نسلی تفاخر نے جب اسلامی مساوات کے منور چہرہ کو داغدار کرنا چاہا، علم دین کو مخصوص طبقے کی میراث قرار دیا گیا اور خاص کر نساجی یعنی بنائی کا پیشہ کرنیوالوں کے ساتھ طعن وتشنیع اور تضحیک واستہزاء کا رویہ اختیار کیا گیا تو قاضی صاحبؒ کی دینی رگ حمیت پھڑک اٹھی، واشگاف انداز میں تاریخی شواہد کے ساتھ اپنی تحقیقات دنیا کے سامنے پیش کر کے واضح کر دیا کہ علم دین نہ تو کسی مخصوص طبقہ خاندان اور نسب کے ساتھ خاص ہے۔ نہ ہی کسی پیشے کو اپنانے اور برتنے والے کو پیشے کیوجہ سے کوئی برتری اور بالادستی حاصل ہے۔ اگر برتری کا حامل کوئی ہو سکتا ہے تو عمل کی وجہ سے ہو سکتا ہے قرآن وحدیث میں ایک سے زائد مقامات پر اسی کی صراحت کی گئی ہے چنانچہ حدیث کی کتابوں میں حضرت ابوذرؓ کا واقعہ ذکر کیا گیا کہ ایک بار انھوں نے غلام سے جھگڑتے ہوئے غصہ میں کہہ دیا ''او حبشن کے بچے'' نبی کریم ﷺ نے فرمایا بس بس کسی بیضاء (سفید پوست والی) کے فرزند کو کسی سودا (سیاہ پوست والی) کے بچے پر کوئی فضیلت نہیں، فضیلت تو عمل سے ہے۔ نسلی برتری کا گن گانے والوں کی غلط فہمی دور کرنے کیلئے قاضی صاحبؒ نے اپنی تحقیقی کاوش سے دو قسم کے مقالوں کو تحریر فرمایا: ایک مقالہ میں تاریخی شہادتوں سے واضح فرمایا کہ بیس قسم کے پیشے اختیار کرنیوالوں میں دینی علوم وفنون زمانۂ ماضی میں پائے جاتے تھے اور یہ بات بیس ہی قسم کے پیشوں میں محدود نہیں بلکہ تلاش وجستجو سے مزید معلومات فراہم ہو سکتی ہیں۔ قاضی صاحب کے مقالے کا عنوان ہے ''ہر طبقہ اور ہر پیشہ میں علم وعلماء''
مذکورہ عنوان کے ذیلی عنوانات ہیں۔

(۱) چرواہوں میں علم وعلماء (۲) کسانوں میں علم وعلماء (۳)، دست کاروں میں علم وعلماء (۴) پارچہ بافوں میں علم وعلماء (۵) پارچہ فروشوں میں علم وعلماء (۶) درزیوں میں علم وعلماء (۷) دھوبیوں میں علم وعلماء (۸) موچیوں میں علم وعلماء (۹) روغن سازوں مین علم وعلماء، (۱۰) قصابوں میں علم وعلماء (۱۱) حلوائیوں میں علم وعلماء، (۱۲) آٹا پیسنے والوں میں علم وعلماء (۱۳) صابون سازوں اور صابون فروشوں میں علم و علماء (۱۴) صیقل گروں میں علم وعلماء (۱۵) شیشہ گروں میں علم وعلماء (۱۶) لوہاروں میں علم وعلماء (۱۷) بڑھئیوں میں علم وعلماء (۱۸) لکڑ ہاروں میں علم و علماء، (۱۹) شکاریوں میں علم وعلماء (۲۰) مزدوروں میں علم وعلماء

مختلف پیشوں اور طبقوں کے علماء وصلحاء کی مختصر فہرست قاضی صاحب نے پیش کرنے کے بعد بڑی دلسوزی اور دل ریشی کے ساتھ چند سطریں قلمبند فرمائی ہیں۔ قارئین کے لئے قاضی صاحبؒ کی یہ سطریں سبق آموز بھی ہیں اور گرانقدر بھی ملاحظہ فرمائیں۔

''مسلمانوں کے مختلف طبقوں اور پیشوں میں سے ان چند علماء کے حالات مثال کے طور پر پیش کئے گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں میں علم کا رواج ہوا تو انھوں نے کس ذوق وشوق سے علم حاصل کیا اور اس میں ان کے کام دھندے اور پیشے حارج نہیں ہوئے۔ پھر مسلمانوں نے ہر پیشے اور ہر طبقے کے علماء وفضلاء کو سر پر بٹھایا اور ان کی امامت وسیادت میں علم دین کی منزلیں طے کیں جو لوگ بعض طبقوں اور پیشوں کے بارے میں غلط خیالات رکھتے ہیں اور تنگ نظری کا ثبوت دیتے ہیں وہ غور کریں کہ وہ کس طبقہ اور پیشہ کو معیوب قرار دیکر ان علمائے کرام پر حرف گیری کر رہے ہیں۔ کونسا پیشہ ہے جسے علماء اسلام نے اختیار نہیں کیا اور کون سا طبقہ ہے جس میں فوج درفوج ائمہ دین پیدا نہیں ہوئے (مآثر ومعارف ص:۱۴۸، بحوالہ کتاب الانساب ورق ۱۷۴)

دوسرا مقالہ اس موضوع پر تحریر فرمایا کہ نسا جی بحیثیت پیشے کے کوئی حقیر وذلیل پیشہ نہیں، نہ ہی فضل وکمال اور ذلت وادبار کا معیار پیشے ہیں۔ کوئی بھی انصاف پسند بتائے کہ اگر کسی حجام اور نائی میں شرافت، انسانیت اور دینداری کسی سید اور شیخ زادے سے بڑھ کر ہو تو کیا اس شرافت و دینداری کے باوجود اس حجام کو معاشرے اور سماج کا متعفن عضو محض اس لئے قرار دیا جائے گا کہ وہ حجام ہے بال کاٹنے کا پیشہ کرتا ہے۔ حاشا وکلا۔ دارالعلوم مئو کی طالب علمی کے زمانے میں ہم

نے خود دیکھا ہے کہ فجر بعد ایک مہتر سڑک پر میونسپلٹی کی طرف سے جھاڑو دے رہے ہیں اور حافظ قرآن ہونے کی وجہ سے مسلسل قرآن مجید کی تلاوت بھی کئے جا رہے ہیں، کون کہے گا کہ صادق ومصدوق زبان رسالت ترجمان ﷺ نے قرآن پڑھنے والوں کے جو فضائل ومناقب بیان فرمائے ہیں اور جو بشارتیں ان کے بارے میں سنائی گئی ہیں، یہ سیاہ فام کالے رنگ کا جھاڑو دینے والا قرآن خواں حلال خوران فضائل سے اس لئے محروم رہے گا کہ وہ حلال خور ہے، سڑک پر جھاڑو دینے کا کام کرتا ہے متذکرہ مقالے میں قاضی صاحبؒ نے بڑی وضاحت اور تحقیق کدوکاوش سے اس بات کا ثبوت بہم پہونچایا ہے کہ نساجی کا پیشہ اپنانیوالوں کی تحسین وقدر افزائی خود زبان رسالت ﷺ سے ثابت شدہ ایک حقیقت ہے، نیز اس پیشہ کا قدیم ترین اور مشہور مرکز یمن ہے اور انصار مدینہ جو اصلاً ونسلاً یمنی ہیں خود ان کے اندر یہ پیشہ موجود تھا۔ قبیلۂ انصار کے لوگ اس پیشہ کو یمن سے مدینہ شریف میں لائے، پھر مدینہ کے اطراف واکناف میں یہ صنعت پھیلی، پھلی پھولی اور پروان چڑھی، اس موضوع پر قاضی صاحبؒ کی تحقیقات سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام بنارس میں شائع ہوئیں۔ قاضی صاحب کی تحقیق انیق طبقات ابن سعد کے حوالہ سے پیش خدمت ہے۔

''ایک قول کے مطابق سیل عرم کا حادثہ حضرت عیسیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان یعنی فترت کے زمانہ میں پیش آیا جس کی وجہ سے یمن کے قبائل شمال کی طرف منتقل ہو گئے انہیں میں مدینہ کا جداعلیٰ عمرو مزیقیاء عامر ماء السماء بھی تھا، اس کی خوش پوشی کا یہ حال تھا کہ روزآنہ ایک قیمتی حلہ (جوڑا) پہن کر پھاڑ دیتا تھا اس لئے کو مزیقیا کہتے تھے وہ یمن سے نکل کر مقام جلبیہ اور ذی وقار کے درمیان آباد ہوا، بعد میں جب اس کی اولاد میں کثرت ہوئی تو مختلف علاقوں میں پھیل گئی اس کے دو پوتے اوس بن ثعلبہ اور خزرج بن ثعلبہ مدینہ میں آباد ہو گئے، وہ اپنے ساتھ غزل ونسج کی صنعت یمن سے لائے اور اسکو ترقی دی حتیٰ کی بادیہ نشین اعراب نے اس میں حصہ لیا اور وہ اعلیٰ قسم کے کپڑے تیار کرنے لگے جیسا کہ کاتب وحی حضرت زید بن ثابت انصاری نجاریؓ کی والدہ نوار بنت مالک انصاریہ نجاریہ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ حوالے میں قاضی صاحب نے طبقات ابن سعد کے الفاظ نقل کئے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے (مجلّہ سہ ماہی ترجمان الاسلام

اکتوبر نومبر دسمبر ۹۳ء)

زید بن ثابتؓ کی والدہ فرماتی ہیں:

''زید بن ثابت کی پیدائش سے پہلے جبکہ وہ حمل میں تھے میں نے کعبہ پر اعرابیوں کی بنی ہوئی بوٹی دار، ریشمی سبز وزرد چادریں، رومال کے مصلے اور کپڑے اور بالوں سے بنے ہوئے لمبے لمبے ٹکڑے دیکھے۔

قبیلہ بنونجار کے لوگ مسجد نبوی کے آس پاس آباد تھے، ان کے یہاں پارچہ بافی اور بنائی کا اعلیٰ اور عمدہ قسم کا کام ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ خاص طور سے قبیلہ بنونجار میں اپنے کپڑے بنواتے تھے اور ان کے یہاں تشریف لے جاتے تھے، امام سمعانیؒ نے کتاب الاملاء والاستملاء میں روایت کی ہے کہ:

''رسول اللہ ﷺ کے دو کپڑے بنی نجار میں بنے جاتے تھے اور آپ ان کے یہاں جاکر کہتے تھے کہ ان کو جلدی تیار کرو تاکہ ہم انہیں زیب تن کر کے لوگوں کے پاس جائیں''

قبیلۂ بنونجار کی شرافت کیلئے یہ کافی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انصار کے قبیلوں میں سب سے بہتر قبیلہ قبیلۂ بنونجار کو قرار دیا چنانچہ حدیث کے الفاظ ہیں۔

(خیر دیار الانصار دور بنی النجار) (انصار کے گھروں میں بنونجار کے گھر سب سے بہتر ہیں (تذکرۃ النساجین بحوالہ ترمذی شریف بروایت اسید ساعدی، مولفہ خاتم المحدثین محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ)

انصار کے علاوہ مہاجرین میں بھی پارچہ بافی کا رواج تھا اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے یہاں بنائی کے کارخانے اور کرگھیں تھیں ایک موقع پر حضرت عمرؓ نے ایک بستی کا تذکرہ فرمایا جس کے بارے میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنی کتاب ''تدوین حدیث'' میں ارقام فرمایا ہے کہ اس بستی میں حضرت عمرؓ کی نگرانی میں کپڑے بننے کی کارگاہیں تھیں سخ نامی گاؤں میں حضرت ابوبکر کا کارخانہ تھا (سخ: جہاں حضرت ابوبکر کا کارخانہ اور مکان تھا۔ جزیرۃ العرب ص ۲۰۸، ۲۵۶)

دور خلافت راشدہ میں جب مدینہ منورہ میں خوش حالی اور فارغ البالی آئی خوش خوراکی اور خوش پوشاکی کا دور آیا تو مدینہ منورہ میں ریشمی کپڑے تیار ہونے لگے۔ حضرت قاضیؒ نے طبقا

ت بن سعد کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ

''امام مالک کے تلمیذ خاص ابو یحییٰ بن معن بن دینار مدنی مدینہ میں ریشم کا کاروبار کرتے تھے ریشم خریدتے تھے ان کے یہاں بننے والے نوکر چاکر تھے ریشم خرید کر ان کو دے دیا کرتے تھے''

قارئین اندازہ کریں کہ قاضیؒ نے اسلامیات کے ذخیروں سے کیسے کیسے قیمتی موتیوں کو چن کر اکٹھا کر دیا ہے جو اہل علم و دانش کے لئے نایاب و کم خواب کی حیثیت رکھتے ہیں سچ ہے۔ع

یہ مرتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا۔

﴿تاثرات ومشاہدات﴾

قاضی اطہر مبارکپوریؒ فکر وفن

''مجنوں چلا گیا ہے تو جنگل اداس ہے''

حضرت مولانا افضال الحق صاحب جوہر قاسمی اعظمی،
مہتمم مدرسہ دارالعلوم، رسولپور، گورکھپور

آدمی کیسے بنتا ہے؟ اور کون بناتا ہے؟ مجھے کچھ معلوم نہیں، ہاں جب بن کر سامنے آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فلاں استاذ نے یا فلاں ماں باپ نے یا آبائی خانوادے نے یا ماحول نے بنادیا ہے۔ لیکن میرا سوال اپنی جگہ ہے کہ ماحول وہی خاندان وہی ماں باپ وہی ہوتے ہیں، مگر دوسرا بھائی اس طرح نہیں بنتا، آخر کیوں نہیں بنتا اگر ماحول اور خاندان ہی بناتا ہے آدمی اور فنکار؟

تخلیق:۔ صحیح بات یہ ہے کہ شخصیت وہ پہاڑی چشمہ ہے جو زمین پر گرتا ہے تو ہر نشیب وفراز اسے راستہ دیتا چلا جاتا ہے اور جتنے پودے یا درخت اس کے راستے میں حائل ہونا چاہتے ہیں انھیں بھی جھک کر سلام کرنا پڑتا ہے اور وہ ہنستا کھیلتا چلا جاتا ہے، اور اپنے پورے سفر میں جگہ جگہ اسے سہارے ملتے رہتے ہیں اور اسے آگے بڑھاتے رہتے ہیں۔

آپ دیکھئے بندول میں پیدا ہونے والے لڑکے پر کسی کو شبہہ بھی ہوسکتا تھا کہ یہ بچہ شبلی جیسا قد آور، مورخ، ادیب، شاعر، اور **دارالمصنفین** کا بانی ہوگا لیکن وہ ہوا اور اس طرح اپنی شخصیت کا پرچم اڑاتا چلا گیا، کہ پھر علی گڈھ اور ندوۃ العلماء بھی اس کا راستہ نہ روک سکے، رحمہٗ اللہ

جب قدرت کسی شخصیت کو اپنی نگرانی میں اس کی منزل تک پہونچاتی ہے، تو ان ہی خوش نصیب لوگوں میں مبارکپور میں پیدا ہونے والا وہ بچہ بھی تھا جو ۱۹۱۶ء میں اسی طرح پیدا ہوا تھا جس طرح دوسرے دولاکھ بچے دنیا میں اسی دن پیدا ہوئے تھے، لیکن کوئی قاضی اطہر نہیں بنا، اور جو بنا وہ اپنی سوجھ بوجھ اپنی انفرادیت اور بے پناہ جدوجہد اپنے ساتھ لایا تھا، اسلئے احیاء العلوم سے مدرسہ شاہی مرادآباد تک سیکڑوں طلبہ اس کے ساتھ تھے مگر کوئی نہ اس کے ساتھ چل سکا نہ اسے

اسے پیچھے کر سکا، وہ یکہ وتنہا اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا گیا، غربت نے اس کا راستہ ضرور روکا مگر پھٹی ہوئی چادر میں سردیاں کاٹ کر وقت گذار لے گیا جب دنیا کے سامنے آیا تو اس کے ہاتھ میں ''رجال السند والہند'' جیسی نادرۂ روزگار کتاب تھی، جس میں عہد رسالت اور اس کے بعد کے ان رجال کار کا تذکرہ تھا جو برصغیر میں پلے بڑھے تھے، اور آج تک کسی نے ان کا چہرہ کھول کر نہیں دیکھا تھا کہ تم کون ہو کہاں کے ہو مگر اس بندہ خدا نے تن تنہا پوری تاریخ مدون کر دی......! تاریخ عالم میں بالکل نیا عنوان ہے اور عرب و ہند کے تعلقات کا بہترین ترجمان ہے،

(۲)

مولانا نامی:۔ نامی صاحب سے میری پہلی ملاقات مدرسہ نور العلوم بہرائچ میں اس وقت ہوئی جب میں ۱۹۴۴ء میں وہاں درجہ علیا کا مدرس تھا اور ۱۹۴۶ء کا ہنگامہ خیز الیکشن گذر چکا تھا اسی میں نور العلوم کے بانی اور ناظم تعلیمات مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی تھے اور صدر مدرس حضرت مولانا حمید الدین صاحب قدس سرہٗ العزیز تھے، مولانا نامی نے جمعیۃ علماء ہند کے ٹکٹ پر اودھ وآگرہ کے متحدہ صوبے سے ممبری کا الیکشن لڑنا طے کر لیا تو قیصر گنج سے بڑی دھوم دھام سے کامیاب ہوئے تھے۔ جبکہ لیگ کے مقابلہ میں پورے صوبے میں چند ہی آدمی کامیاب ہوئے تھے، اس الیکشن کے بعد مولانا کو کانگریس سرکار میں پنتھ جی نے پارلیمنٹری سکریٹری منتخب کر لیا اور نامی صاحب سمپورنا نند جی کے ساتھ لگا دئے گئے جو تھے تو کانگریس کے ممبر مگر انھیں ہندو مہا سبھا کا صدر ہونا چاہئے تھا، کیونکہ برہمن تھے اور تنگ نظر۔

''انصار'' اخبار:۔ مولانا نامی نے اس دور میں ہمت کر کے ''انصار'' ہفتہ وار اخبار نکالا اور اس کے لئے مولانا عبد الحفیظ بلیاوی کو رسڑا اور قاضی اطہر صاحب کو مبارکپور سے لاکر بٹھا دیا اس وقت مولانا بلیاوی ''مصباح اللغات'' مرتب کر رہے تھے، اس لئے جب ان کے کمرے میں جایئے وہ ہوتے تھے ایک معمولی چارپائی ہوتی تھی اور کتاب کے مسودات، مجھ کو جب معلوم ہوا کہ قائد مرادآباد کے قلم کار قاضی اطہر صاحب آرہے ہیں تو نام سے ادھیڑ عمر کے محسوس ہوتے تھے لیکن جا کر دیکھا تو وہ جوان نہیں نوجوان نکلے، مجھ سے کچھ عمر زیادہ تھی مگر جثہ میں کمزور تھے چہرہ سنجیدہ، ذہن چلبلا، مزاج میں شرافت، بات میں وزن، اٹھنے بیٹھنے میں بے تکلف اور دوست تھے

، مجھ جیسے کم آمیز آدمی کو اچھے لگے، بہت اچھے۔ وہ ناظر پورہ میں رہنے لگے اور میں نور العلوم بشیر گنج میں، مگر فاصلہ زیادہ نہیں تھا اور ہوتا بھی تو کم ہو جاتا اس لئے ملاقاتیں خوب رہتیں، میں نے سہ روزہ ''مدینہ'' بجنور میں ابوسعید بزمی صاحب کے زمانے میں دو تین مضامین لکھے تھے اور وہ چھپے بھی تھے، اس کے بعد انصار کیلئے بھی کچھ لکھنے لگا قاضی صاحب از راہ کرم چھاپنے لگے، پریس مولانا نامی کے بڑے بھائی مولانا احسان صاحب کا تھا اسلئے کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا، انصار چلتا اور خوب چلتا۔

فرقہ پرستی:۔ چند مہینوں کے بعد مولانا نامی پر فرقہ پرستی کا الزام لگا کہ وہ ہندؤں کو مسلمان کرتے ہیں، کیونکہ جامع مسجد بہرائچ میں جمعہ کے بعد کسی نے خواہش کی تھی اور غالباً مولانا نے اسے کلمہ توحید پڑھادیا تھا...... یہ خبر اخباروں میں آئی اور اچھل گئی۔ حتیٰ کہ اتر پردیش محکمہ تعلیم کیلئے ایک مسئلہ بن گئی تو سمپورنا نند جی مہاراج نے مولانا کو ان کی ممبری پر واپس کر دیا۔ تو چند مہینہ کے بعد مولانا کی صوبائی سرگرمیاں کم ہو گئیں، آخر انصار بے چارہ گم ہو گیا تو قاضی اطہر صاحب بھی اس کی تلاش میں کہیں چلے گئے۔ ؎ روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

اس طرح ۱۹۴۸ء (رجب ۱۳۶۷ھ) میرا اور ان کا ساتھ چھوٹ گیا مگر یاد نہیں گئی۔

(۳)

بات صاف کہنا اگر جرم ہے تو اس کی سزا مجھے بہت کاٹنی پڑی ہے، نور العلوم میں مفتاح القرآن ایک اچھی کتاب ہے مگر مولانا نامی اسے بطور تحریک چلانا چاہتے تھے اور نور العلوم ان کے ساتھ نہیں دوڑ سکتا تھا، اس پر ایک مجلس غور کر رہی تھی میں نے کہہ دیا کہ بطور تحریک تو یہ نہیں چل سکتی یہ بات اتنی گستاخ تھی کہ مولانا نامیؒ نے مجھے برخاست کر دیا، اس کی خبر مجھے مولانا نور محمد ٹانڈویؒ سے ٹانڈہ میں ملی تھی۔ حضرت شیخؒ (مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ) کی درگاہ میں ہم سب حاضر تھے تو مولانا سید حمید الدین صاحبؒ نے مجھے گونڈہ بھیج دیا۔ گونڈہ سے میں بمبئی گیا تو معلوم ہوا کہ قاضی اطہر صاحب یہیں قیام پذیر ہیں۔ ایک صاحب کو لے کر ملنے گیا جو جمعیۃ علماء بمبئی کا کام کرتے تھے، معین الدین صاحب اعظمی! میں ان کے ساتھ دوسری یا تیسری منزل میں ایک غار میں گھسا، معلوم نہیں اصحاب کہف کا تھا یا امام غائب کا، آگے چل کر روشنی نظر آئی دیکھا تو قاضی

صاحب تھے چٹائی تھی کتابیں تھیں اور قلم چل رہا تھا...... میں ہوں اور گوشۂ تنہائی ہے۔

ملاقات اچانک ہوگئی تھی اس لئے بہت خوش ہوئے خوب ملے اور خوب ہنسے اور خوب باتیں کرتے رہے، کہاں، کیسے، کب، کیا جیسے سوالات اور جوابات سے دل بہل گیا۔ اور جلدی چلا آیا کیونکہ ان کی مشغولیت کا وقت تھا۔

یہ کمرہ قاضی صاحب کی افتادِ طبع کے مطابق تھا، بمبئی کے شور ہنگامے سے کالے کوسوں دور، زندگی کی آؤ بھگت سے بے گانہ، لوگوں کی عام دلچسپیوں سے بالکل ناآشنا وہ کمرہ بمبئی میں ضرور تھا مگر بمبئی اس کے اندر نہیں تھی، کسی طرف سے نہیں تھی، خلوت در انجمن اسی کا نام ہے۔

اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

یہ جگہ اگر دوسروں کو دی جائے تو مفت نہیں لے سکتے، مگر قاضی صاحب کو اگر یہ جگہ نہ ملتی تو ایک سال بھی بمبئی میں نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ زندگی اور جوانی کے بہترین سال انھوں نے اسی غار میں گزار دئے، اور بہت مطمئن ہو کر گزارے، یہیں جم کر بیٹھے اور ''رجال السند والہند'' لاکر دنیا کو دی۔

غم مجھ کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

(۴)

شخصیت:۔ قاضی صاحب کو قدرت نے نوازا تو خوب نوازا، سادگی دیدی تو مصنوعی حسن سے بیزار کردیا۔ عقل عطا کی تو مالداروں سے بے نیازی بخش دی، دین دیا تو دنیا داروں کا پیوند نہیں لگایا، علم دیا تو تجارت کے گُر نہیں سکھائے، انفرادیت کا جوہر عطا کیا تو کبر وغرور کی گرد اس پر نہیں جمنے دی۔ اسلئے انھوں نے گمنامی کے احاطے میں اپنی کٹیا بنائی اور اس کے صحن میں کنواں کھود کر پانی نکالا اس سے ایک باغ کا باغ سیراب کردیا۔ پھر اس پھلواری کے نظارہ کیلئے لوگوں کو دعوت دی تو عرب وعجم کے علماء وفضلاء، ادیب ودانشور دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس بوریہ نشین نے اتنا عظیم کام کر ڈالا کہ قالین نشیں اکیڈمیاں آج تک نہیں کرسکیں، آج بھی ''رجال السند والہند'' دیکھئے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے، صدر پاکستان ضیاء الحق مرحوم نے دیکھا اور سنا تو قاضی صاحب کو دیکھتے رہ گئے پھر وہاں سندھ میں ان کی بڑی پذیرائی ہوئی کہ انھوں نے باپ دادوں کے نام

روشن کردئے۔اسی لئے کسی نے کہا تھا کہ ایک فقیرِ بے نوا نے نئی نسل اور پرانی نسلوں کے درمیان ایک پُل باندھ دیا۔احسان دانش نے ایسے ہی لوگوں کو آواز دی ہے۔ ؎

میرے شہ پاروں کی کھائیں گے قسم اہلِ ادب
میں نے سیارے تراشے ہیں چراغِ شام سے

مگر قاضی صاحب بھی عجیب آدمی تھے،تاریخ اسلام کی ایسی وادی میں گئے جہاں کوئی نہیں گیا تھا پھر وہاں ایسے چار چاند لگا کر واپس آئے کہ دوسرا وہاں پانچواں چاند نہیں لگا سکے گا۔

مضت الدهور وماأتين بمثلهٖ　　ولقد أتىٰ فعجزن عن نظرائهٖ

(زمانے گذر گئے اور اس کا مثل نہ لا سکے اور جب وہ آ گیا تو اس کی نظیر لانے سے عاجز رہ گئے)

(۵)

قاضی جی کی مسیحائی:۔ تاریخ ایک خشک موضوع ہے جو بالکل بے نمک کا سالن ہے،مگر قاضی صاحب کی بلند فطرت نے اسی پہاڑ پر اپنا آشیانہ بنایا پھر کھائیوں میں اترے،پتھروں کو چیر کر،سنگلاخ زمینوں کو روند کر ہزاروں ہزار صفحات کے اندر سے ایسے ایسے بزرگوں کو پہچان لائے جن کے خاندان والے بھی انھیں بھلا چکے تھے یعنی مردوں کو زندہ کر دیا مسیحا نے۔

قاضی صاحب کی انفرادیت کا سب سے بڑا عنصر ان کی مہم جوئی،ان کی ژرف نگاہی اور بے پناہ محنت تھی،ان تینوں عناصر نے ان کو خلوت پسند اور خاموش کر دیا تھا اس لئے وہ اصحاب کہف کے غار میں چھپ کر رہے لیکن سوتے نہیں جاگتے رہے اور اپنی حوصلہ مندی سے وہ کارنامے انجام دیتے رہے جن کیلئے قدرت نے انھیں تراشا تھا اس لئے جس طرح مولانا آزادؒ اپنی نثر اس کے اسلوب اور آہنگ کے خالق اور خاتم دونوں تھے،اسی طرح قاضی صاحب اپنے فن کے موجد تھے اور اب مشکل معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مرد قلندر اس میدانِ تیہ کو طے کر سکے گا۔

؎ تمہارے قد کا کوئی دوسرا نہیں ملتا

(۶)

تفننِ طبع:۔ قاضی صاحب کے مزاج میں ظرافت بھی تھی اور خوب تھی اور اسی ظرافت نے ان کے موضوع کے روکھے پن میں بھی ان کی شگفتگی قائم رکھی،ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند کے بزرگ

ساتھی مولانا عبدالباری قاسمیؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کا اتفاق ہوا تو قاضی صاحب مبارکپور میں تشریف رکھتے تھے اور اپنا دانشکدہ بنانے کی سوچ رہے تھے، لڑکے کام کے مل گئے تھے اسلئے خدا کا شکرادا کرنا چاہتے تھے۔ **لئن شکرتم لازیدنکم** ، میں نے قاضی صاحب کو چھیڑ دیا کہ قاضی صاحب آپ کی منشی پالٹی (میونسپلٹی بورڈ) کیسا مافق ہے، نہ سڑک ٹھیک ٹھاک، نہ صفائی ستھرائی، آپ لوگ اس میں کیسا رہتا ہے۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ قاضی صاحب پر بمبئی سوار ہوگئی، لگے وہاں کی کھڑی زبان میں بولی بولنے اور میرے کو تیرے کو سناتے چلے گئے، اس سے معلوم ہوا کہ وہ بمبئی میں رہے تو صرف کوہ قاف اور محلوں میں نہیں رہے بلکہ انقلاب کا کالم نویس وہاں کی سڑکوں پر گلیوں میں اور محلوں میں آتا جاتا تھا، اسلئے بمبئی سے خوب واقف تھا اس کے لب ولہجہ اور اتار چڑھاؤ کو ابھی تک نہ بھول سکا تھا اگر چہ بمبئی چھوڑے ہوئے مدت ہوچکی تھی۔

(۷)

اکیڈمی کا موضوع:- میں نے ایک مرتبہ پوچھا کہ قاضی صاحب آپ شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیوبند کے سربراہ ہیں یہ بتایئے اس اکیڈمی کا موضوع کیا ہے؟ برجستہ بولے کہ یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم بس ایک دفتر ہے دو ایک آدمی وابستہ ہیں اور دارالعلوم اسے چلا رہا ہے ویسے نہ کسی کو ذوق ہے نہ دلچسپی نہ فکر۔ میں نے عرض کیا کہ جن لوگوں پر دارالعلوم کو نشاۃ ثانیہ کا بھوت سوار تھا وہ چاہتے تھے کہ دارالعلوم کی تاریخ، اکابر دارالعلوم کی تاریخ، اکابر دارالعلوم کے علوم وفنون اور ان کے کارناموں سے دنیا کو روشناس کرایا جائے۔ یہ تھا ان کا موضوع، کہنے لگے اس وقت اس کا کوئی مقصد نہیں ہے مگر ادارہ ہے چل رہا ہے میرا بھی تعلق واجبی ہے کیونکہ کام کا ماحول نہیں ہے۔

الدیوبندیہ:- اب کی حج سے واپسی ہوئی تو ہم لوگ ''الدیوبندیہ'' عربوں کا تحفہ لیکر آئے تھے، یہ کتاب نہیں ہے سلفیان عرب کی عدالت ہے اس میں ایک طرف دیوبندیوں کی دو تین پشتیں کھڑی ہیں، دوسری طرف ندوہ اور تبلیغ والے بھی کھڑے ہیں اور تیسری طرف وہابیان نجد، سلفیان عرب اور غیر مقلدین ہندو پاک، دربار لگائے تشریف فرما ہیں۔ ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم لوگ صوفیاء کے قائل ہیں۔ تصوف کو حق کہتے ہیں اولیاء کی کرامتوں کو مانتے ہیں، توسل کو مانتے ہیں، خدا کے اجلاس علی العرش کو نہیں مانتے، استواء علی العرش کو مانتے ہیں۔

دوسرا جرم یہ ہے کہ ہم لوگ اشاعرہ اور ماتریدیہ کو علم کلام کا رہنما مانتے ہیں حالانکہ وہ کافر تھے، مشرک تھے، سلفیان حرم کی لغت میں ان جرائم کی سزا یہ سنائی گئی ہے کہ کافر ہیں مشرک ہیں زندیق اور ابوجہل ہیں، خارج از ملت ہیں۔ یہ کس کا فتویٰ ہے، سلفیان حرم کا، وہابیان نجد کے مذہب جدید کا۔

شیخ الہند اکیڈمی:- یہ کتاب ہم لائے تھے تو خیال تھا کہ شیخ الہند اکیڈمی اس کا جواب دے گی اور پوچھے گی کہ تم کون ہو فتویٰ دینے والے؟ اور تمھیں کیا حق ہے کہ کسی کے دلائل سنے بغیر صرف ایک دو جملے پر قضا علی الغائب کرنے کا، مگر افسوس کہ حضرت قاضی صاحب سے ملاقات نہیں کر سکا، جب تک وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ پھر تو شیخ الہند اکیڈمی کو مخاطب کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا، کون سنتا ہے فغان درویش۔ ورنہ اگر قاضی صاحب کتاب دیکھ لیتے تو ان کا خون گرم ہو جاتا اور وہ اس کے جواب کا ضرور انتظام کرتے کیونکہ قاضی صاحب بڑے غیور، بڑے اکابر شناس اور مسلک اہل حق کے لئے بڑے جانثار تھے۔

ایک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

گدڑی میں لال:- جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ترقی کے لئے مال ضروری ہے، خوشحالی اور اطمینان ضروری ہے، ان کے لئے قاضی صاحب کی زندگی بہترین جواب ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی اس کی رفتار اور اس کے پھیلاؤ کو چند اوراق میں سمیٹ دیا ہے اسے آپ پڑھئے اور دیکھئے کہ اگر کسی کو ہمت ہے تو ع مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

انھوں نے شاعری شروع کی تو پورا مبارکپور ان کے نغموں سے گونج اٹھا، پھر صحافت میں آئے تو قائد مراد آباد، زمزم لاہور، انصار بہرائچ، البلاغ بمبئی، انقلاب بمبئی اور معارف وغیرہ بڑے فخر سے ان کے مقالے چھاپتے تھے اور ان کی ادارت میں خوب چھپتے تھے۔ حتیٰ کہ انقلاب بمبئی میں آج بھی روزانہ جو ترجمہ اور معارف چھپتے ہیں وہ اس قدر اہم اور شگفتہ ہیں کہ ان کی وفات کے بعد بھی لوگ اسے تازہ تحریر سمجھ کر پڑھتے ہیں کیونکہ ادب عالیہ حال و ماضی کا پابند نہیں ہوتا۔ جیسے ابوالکلام اور شبلی کی تحریر پڑھئے، چھاپئے اور نقل کیجئے تو اس کی شگفتگی تازگی اور تأثرات میں فرق نہیں محسوس ہوتا، غالب اور میر کے اشعار ایک صدی کے بعد بھی آج کے اشعار معلوم ہوتے ہیں۔

قاضی صاحب نے صحافت کے ساتھ تصنیف وتالیف کو موضوعِ حیات بنایا تو نئے نئے گوشے تلاش کر کے اپنی اولوالعزمی اور انفرادیت سے اس کو بھی ایک نمونہ کی چیز بنا کر رخصت ہوئے۔ اور یہ سب کن حالات میں کیا ہے اسے ان کے سوانحی خاکے میں پڑھئے اور دیکھئے کہ انھوں نے پریشاں حالی کے باوجود غربت کی پروانہیں کی، کام کی پروا کرتے رہے اس لئے ان کی زبان پر حرف شکایت نہیں آیا۔ کیونکہ کام کیلئے دل ودماغ تیار ہوں تو حالات کے زیروزبر سے بے پرواہو کر آدمی اس طرح گذر جاتا ہے جیسے قاضی اطہر صاحب مسکراتے ہوئے گذر گئے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے فتوحات نصیب فرمائیں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

☆☆☆☆☆

بقیہ ص:۲۵۹ کا

میں بالکل نہیں تھے، بڑی مشکل سے ایک سال باہر رہنا نصیب ہوا، اس کے باوجود حوصلہ کی بلندی اور تحصیل علم کی دھن کا یہ حال تھا کہ جامع ازہر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سودا ہر وقت سر میں سمایا رہتا تھا بلکہ بعد میں بھی یہ آرزو باقی رہی مگر میں نے اپنے ذوق وشوق کی بدولت ناکامی کو کامیابی سے یوں بدل دیا کہ اپنے گھر اور مدرسہ کو جامع ازہر، جامع زیتون، جامع قرطبہ، مدرسہ نظامیہ، مدرسہ مستنصریہ بنالیا، اور وطن میں ہی رہ کر خدا کے فضل وکرم، اساتذہ کی شفقت ومحبت اور اپنی محنت وعزیمت سے بہت کچھ حاصل کیا، اس دور میں مجھ پر عجیب سرمستی اور شوریدگی چھائی رہتی تھی، ہر وقت بغداد وبخارا، اندلس وغرناطہ، اور عالم اسلام کی قدیم مشہور درسگاہیں اور ان کے اساتذہ وتلامذہ کے مناظر سامنے رہتے تھے اور میں ان کے حسنات وبرکات سے مستفیض ہوتا رہتا تھا۔

طالب علم میں محنت اور کوشش کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ اور ذوق وشوق ہو تو چھوٹی جگہ رہ کر بڑا ہوسکتا ہے، اور اگر یہ باتیں نہ ہوں تو بڑی جگہ رہ کر چھوٹا ہی رہے گا''

حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے قاضی صاحب کی لغزشوں اور خطاؤں کو معاف کریں، اور ان کی خدمات کو قبول فرمائیں، اور انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائیں۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

☆☆☆☆☆

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری علیہ الرحمہ
نقوش وتأثرات

مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی

قاضی اطہر صاحب کی وفات ہوگئی۔ علماء وصلحاء کے ایک جم غفیر نے ان کی نماز جنازہ پڑھی۔ ان کیلئے دعائے مغفرت کی پھر ان کو قبر میں اتارا۔ جو ایک مومن کیلئے جنت میں پہونچنے کا پہلا دروازہ ہے، ان کا جسد عنصری بستر خاک پر زمین کی چادر اوڑھ کر سو گیا، اور ان کی روح؟! کیا عجب کہ حق تعالیٰ کی مہربانیوں نے، اس کے استقبال کیلئے، ان لوگوں کی روحوں کو بھیج دیا ہو، جنھیں زمانے نے بھلا دیا تھا۔ مدتوں کے بعد قاضی جی نے انھیں یاد کیا، وہ ماضی کی اندھیری وادیوں میں گم ہو گئے تھے، قاضی جی نے ان کا پتہ ڈھونڈ نکالا۔ تاریخ ان کے حق میں گونگی ہو رہی تھی، قاضی جی نے اسے زبان عطا کی، ان میں صحابہ بھی ہیں، تابعین بھی ہیں، تبع تابعین بھی ہیں، امراء وسلاطین بھی ہیں، مشائخ وصالحین بھی ہیں، غزاۃ ومجاہدین بھی ہیں، فقہاء ومحدثین بھی ہیں۔ لیکن یہ سب گمنام ہو چکے تھے، انھیں پہچاننے والا کوئی نہ تھا، ان کے جسم زمین میں مدفون تھے اور ان کے ناموں اور کارناموں کے پُرزے پُرزے بکھر کر تاریخ کے بوسیدہ اوراق میں دب گئے تھے، قاضی جی نے ان بوسیدہ اوراق کو جمع کیا، جہاں جہاں ان ناموں کی خوشبو ملی، وہاں وہاں پہونچے، ان کے کارناموں کو دبی دبائی تاریخ سے نکالا اور انھیں روشنی میں لائے، عرب وہند کے تعلقات دور قدیم سے ہیں، اجمالاً اتنا سب جانتے ہیں، لیکن ان کی تفصیلات کیا ہیں؟ ہندوستان سے عرب کون پہونچا، عرب سے ہندوستان کون لوگ آئے! تعلقات کس کس نوعیت کے رہے؟ ان کے اثرات ایک دوسرے پر کیا کیا مرتب ہوئے، اس کی عہد بعہد تفصیلی داستان قاضی جی نے اللہ جانے کہاں کہاں سے اکٹھا کی؟ کس طرح انھوں نے تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کی جستجو کی، پھر انھیں کس جانکاہی سے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست کیا، عہد رسالت سے عہد بنو عباس تک کتنے گمشدہ اوراق تھے، جنھیں انھوں نے ڈھونڈھا، انھیں پڑھا، پھر انھیں مرتب

کیا، تاریخ کا تسلسل جو ٹوٹ ٹوٹ جارہا تھا، اسے کیسے کیسے جوڑا؟ سچ پوچھئے تو انھوں نے کئی صدیوں کو زندہ کیا، ناموروں کا تو سب نام لیتے ہیں، لیکن جو بے نام ونشان ہو چکے تھے، قاضی صاحب ان کی تلاش میں نکلے، اور بقول مرحوم مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نوراللہ مرقدہٗ:

''قاضی صاحب اس بے آب وگیاہ صحراء میں تنہا چلے، اور جب لوٹے تو باغ وبہار کا پورا قافلہ اپنے ساتھ لائے''

تو جن بزرگوں کو انھوں نے علم وتحقیق کی روشنی میں پایا، اوران کے ناموں کو انھوں نے زندہ کیا۔ خدائے مہربان کے لطف وکرم سے امید تو یہی ہے کہ ان بزرگوں نے بڑھ کر قاضی جی کا استقبال کیا ہوگا۔ ان کے مرحبا اور خوش آمدید سے قاضی صاحب جھوم اٹھے ہوں گے کہ دنیا میں جو خون جگر جلایا تھا۔ مغز دماغ کو پگھلایا تھا، جوانی ہی میں آنکھوں کی روشنی بڑی حد تک کھوئی تھی اور زندگی کے تعیش کو ٹھکرایا تھا آج اس کا ''اجر غیر ممنون'' مل رہا ہے، جن ناموں کو انھوں نے تلاش کیا تھا، آج ان شخصیتوں کے درمیان رضوان خداوندی سے نہال ہورہے ہوں گے، یااللہ آپ کے فضل سے ہم یہی امید رکھتے ہیں، بیشک آپ ہی امیدوں اور آرزؤں کے ملجاو ماویٰ ہیں۔

قاضی جی ابھی کل تک ہمارے درمیان میں تھے، اپنی علمی وتحقیقی شخصیت کے ساتھ اپنے باغ وبہار وجود کے ساتھ! وہ بڑے تھے، بہت بڑے تھے، مگر اپنے چھوٹوں سے بہت محبت کرتے تھے، انھیں شفقت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، انھیں پڑھنے لکھنے کی تاکید کرتے تھے، جب وہ تھے، تو انھیں ڈھونڈھنا نہیں پڑتا تھا، وہ بڑی آسانی سے مل جاتے تھے، جب چاہتے تھے، ان سے ملاقات ہوجاتی، جو پوچھنا ہوتا ان سے پوچھ لیتے، اور وہ بڑی سادگی اور بے تکلفی سے بتادیتے، وہ اپنے گھر میں دستیاب تھے، وہ جلسوں اور مجمعوں میں دستیاب تھے، انھیں ہم لوگ تشریف لانے کی زحمت دیتے تو بڑی بشاشت سے قبول کرتے، اور بغیر کسی عذر اور بغیر کسی شرط کے آتے، ان کا مل جانا ہم چھوٹوں کیلئے کتنا آسان تھا۔ لیکن اب ان کی تلاش ہورہی ہے، تو بھی نہیں ملتے، ان کی کتابیں ملتی ہیں۔ ان کے مقالات ومضامین ملتے ہیں۔ ان کی یاد ملتی ہے، لیکن خود قاضی صاحب کہاں ہیں؟ وہ تو ان روحانیوں میں پہونچ گئے ہیں، جن کی تلاش میں وہ ماضی کے اندھیروں میں علم وجستجو کی شمع جلا کر نکلے تھے، شمع تو اب بھی روشن ہے، لیکن شمع کا روشن کرنے والا انھیں روحانیوں میں شامل ہو گیا۔

نہیں! میں انھیں اپنے حافظے میں تلاش کرر ہا ہوں۔ اپنے ذہن ودماغ میں ڈھونڈتا ہوں،

انسان کا وجود ناسوتی یا وجود خارجی ختم ہوجاتا ہے، لیکن اس کا وہ وجود جو ذہنوں میں سمایا ہوا ہوتا ہے وہ باقی رہتا ہے۔ جب تک وہ ذہن ودماغ میں موجود ہے، اس کے پردوں پر جگمگاتا ہوا وہ وجود باقی ہے۔ قاضی اطہر صاحب میرے ذہن ودماغ میں موجود ہیں، جب سے ذہن کو شعور وآگہی حاصل ہوئی، میں انھیں جانتا ہوں، قاضی صاحب سے شناسائی اتنی ہی پرانی ہے، جتنی اپنے شعور وادراک سے!

قاضی جی اس وقت بمبئی رہتے تھے، وہ ہمارے علاقے کے رہنے والے تھے، مبارکپور ہمارے گاؤں سے کل ۹ رکلومیٹر کے فاصلے پر ہے، یہ فاصلہ ہی کیا ہے؟ تاہم اس فاصلے کو بھی باہمی قرابت داریوں نے باقی ہی کب رہنے دیا ہے؟ پس قاضی صاحب گویا ہمارے گھرانے ہی کے ایک فرد تھے، میرا شعور جب بیدار ہونا شروع ہوا تو اپنے اطراف میں اپنے گاؤں میں، جن لوگوں کا نام بار بار سننے میں آیا، ان میں ایک نام قاضی جی کا بھی تھا۔ اور یہ نام بطور خاص اسلئے بھی آتا تھا کہ کچھ ہی مدت پہلے گاؤں میں کسی مسجد کیلئے چندے کا زور وشور تھا، اس وقت چندے کا یہ طور بن گیا تھا کہ اس کیلئے ولولہ انگیز ترغیبی نظمیں لکھی جاتیں اور کچھ لوگ انھیں خوش الحانی سے پڑھتے، جس کے گھر چندہ ہوتا، اس کا نام بھی اس نظم میں آتا، کافی مجمع ساتھ ہوتا، اس طرح رقم کی فراہمی میں بڑی آسانی ہوتی۔

بعض اوقات نظم پڑھنے والے پارٹیوں میں تقسیم ہوجاتے، اس طرح مسابقہ کی ایک صورت ہوجاتی، یہ پارٹیاں اپنے اپنے پسندیدہ شعراء سے رابطہ رکھتیں، اور ہر روز تازہ نظمیں لکھوا کر پیش کرتیں، ہمارے یہاں بھی دو پارٹیاں ہوگئی تھیں، ایک پاٹی استاذ محترم حضرت مولانا محمد عثمان صاحب ساحر مبارکپوریؒ اور حضرت مولانا قاضی اطہر صاحبؒ سے رابطہ رکھتی، اور دوسری پارٹی مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی املویؒ سے تعلق رکھتی، میرے والد صاحب اس وقت شاعری کرتے تھے، مولانا آزاد رحمانی کے ساتھ والد صاحب کی بھی نظمیں ہوا کرتی تھیں، اس تقریب سے بار بار قاضی جی کا ذکر گھر میں آتا تھا۔ واقفیت کی بنیاد تو یہیں سے پڑی۔

پھر جب حروف شناسی کا وقت آیا اور مجھے ہر لکھی ہوئی چیز کے پڑھنے کا جنون طاری ہوا، تو گھر میں موجود میں کاغذات اور کتابوں کو ہمہ وقت الٹتا پلٹتا رہتا، اس وقت ایک چھوٹا سا رسالہ ''افادات حسن بصری'' کے نام سے ملا۔ یہ قاضی جی کی پہلی تحریر تھی جسے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، میں نے اپنی بساط بھر اسے بار بار پڑھا، حضرت حسن بصریؒ سے تو عقیدت ہوئی ہی، قاضی جی بھی دل میں گھر کر گئے۔ اس وقت قاضی جی بمبئی سے ماہنامہ ''البلاغ'' نکالا کرتے تھے، والد صاحب

اس کے خریدار تھے، اس میں ان کا مضمون ''مطالعات وتعلیقات'' کے عنوان سے پابندی سے شائع ہوا کرتا تھا، اس میں قاضی جی اپنا حاصل مطالعہ اور اس کے نتائج بڑے دلآویز انداز سے لکھا کرتے تھے، ''البلاغ'' کا مجھے شدت سے انتظار رہتا، اور ہاتھ میں آتے ہی، پہلے وہی مضمون پڑھتا۔

اسی دوران قاضی صاحب کی عربی تصنیف ''رجال السند والھند'' چھپ کر آئی۔ والد صاحب حالانکہ عربی تعلیم پائے ہوئے نہیں تھے، لیکن قاضی جی کے نام کی وجہ سے، اس کتاب کو گھر لائے، نئی چھپی ہوئی کتاب! میں دیکھتے ہی فریفتہ ہو گیا، میں اس وقت مکتب میں پڑھتا تھا، عربی کیا سمجھتا، مگر دیر دیر تک اس کتاب کو ہاتھ میں لئے الٹتا پلٹتا رہتا، قاضی جی کے نام کو غور سے دیکھا کرتا، اسی وقت میں نے والد صاحب سے پوچھا تھا کہ قاضی کیا چیز ہے؟ اور کیا ان کا نام صرف اطہر ہے؟ یہ سوال اسلئے کیا تھا کہ ہمارے عرف میں اس طرح کے ناموں کے اول و آخر میں محمد یا احمد لگا ہوا ہوتا ہے، والد صاحب نے بتایا کہ ان کا نام عبدالحفیظ ہے، اطہر ان کا تخلص ہے، لیکن یہ تخلص اتنا مشہور ہوا کہ لوگ نام کو بھول گئے۔ بعد میں قاضی جی نے شاعری چھوڑ بھی دی تھی، مگر تخلص نے اصل نام کی جگہ لے لی۔

بیچارے حسرتؔ موہانی کا نام فضل الحسن تھا، مگر وہ حسرت کے نام سے ایسا مشہور ہوئے کہ انھیں خود کہنا پڑا:

عشق نے جب سے کہا حسرت مجھے　　　　کوئی کہتا ہی نہیں فضل الحسن

کچھ یہی حال قاضی صاحب کا ہوا۔ مبارکپوری بھی گویا نام کا جز بن گیا تھا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ آدمی جب بڑا اور مشہور ہو جاتا ہے، تو اس کے نام کے ساتھ اس کا وطن بھی شہرت پا جاتا ہے۔

عربی کی اس کتاب نے قاضی جی کی عظمت میرے دل میں کئی گنا بڑھا دی، یہ کتاب اتنی مدت تک عقیدت کے ساتھ میرے ہاتھ میں رہی کہ اب تک اس کا سراپا میری آنکھوں میں بسا ہوا ہے۔

۱۹۶۴ء (۱۳۸۴ھ) میں مجھے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں پہونچا دیا گیا۔ چند ماہ گزرے تھے کہ مدرسہ میں ایک صاحب نظر آئے۔ قدرے پستہ قامت، رنگ سانولا، ہلکے بادامی رنگ کی شیروانی زیب تن اور اسی کپڑے کی کشتی نما ٹوپی سر پر، گلے میں ہلکے تولیہ جیسا رومال، آنکھوں پر موٹے شیشوں کا چشمہ، بدن خوب معطر، فضا میں خوشبو بکھیرتے ہوئے تیزی سے چلے آرہے ہیں، انھیں دیکھ کر ایک طرف سے ناظم مدرسہ مولانا عبدالباری صاحبؒ اٹھ رہے ہین، دوسری طرف سے کچھ اساتذہ اور طلبہ بھی ان کی طرف لپکے جارہے ہیں، وہ ہر ایک کو مسکرا کر سلام کر رہے ہیں، یا سلام

کا جواب دے رہے ہیں، مصافحہ کررہے ہیں، خیریت پوچھ رہے ہیں، میری عمر اس وقت ۱۳؍سال سے کچھ متجاوز تھی، بچوں میں میرا شمار تھا میں نے ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ بتایا کہ قاضی اطہر صاحب ہیں۔ میرے ذہن میں ''افادات حسن بصری'' ''البلاغ'' اور ''رجال السند والہند'' کے صفحات جگمگانے لگے، میں نے دیکھا کہ اتنی بڑی شخصیت ہونے کے باوجود کسی کو ان سے ملنے میں جھجھک نہیں محسوس ہوتی اور نہ ان کو کسی سے سلام اور مصافحہ کرنے میں کوئی تکلف ہوتا، میں ڈرا سہما تھا۔ ذرا ہمت ہوئی تو میں بھی آگے بڑھا، اور مصافحہ کرنے کیلئے ہاتھ بڑھایا، قاضی صاحب نے بڑے التفات سے جواب دیا اور ہاتھ کی پوری گرفت کے ساتھ مصافحہ کیا اور فرمایا **یغفر اللہ لنا ولکم**، مجھ سے کہا کہ تم بھی کہو، پھر پوچھا مزاج شریف؟ میں نے آہستہ سے کوئی جواب دیا، فرمایا کہو الحمد للہ پھر دیکھتا ہوں کہ جو بھی طالب علم ان سے ملتا ہے اس کو یہی کلمات تلقین کرتے ہیں، اس کی خیریت دریافت کرتے ہیں، اور اس کے لئے ازراہ تفنن مختلف الفاظ استعمال کرتے ہیں، کسی سے کہتے ہیں مزاج شریف! کسی سے پوچھتے ہیں مزاج معلیٰ! کسی سے فرماتے ہیں مزاج مبارک! گفتگو ذرا جلدی جلدی کرتے ہیں، باتوں باتوں میں آداب ملاقات سکھاتے جاتے ہیں، سلام خوب کرتے ہیں، بات کرکے ہٹتے ہیں، تو سلام کرکے ہٹتے ہیں، کچھ دور جاکر کوئی بات یاد آتی ہے اور پلٹ کر آتے ہیں تو پہلے پورا سلام کرتے ہیں، تب جو بات کہنی ہے، کہتے ہیں، وہ طالب علموں کو سلام کا عادی بناتے تھے، ان سے ملاقات کے بعد پہلا سبق یہی حاصل ہوا۔

بمبئی سے وطن تشریف لاتے تھے تو ایک ماہ یا اس سے زیادہ قیام کرتے تھے، اس دوران اگر سفر نہ ہوتا، تو روزانہ ایک دو دفعہ مدرسہ میں ضرور تشریف لاتے، حضرت مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب علیہ الرحمہ ان کے استاذ تھے، ان کی خدمت میں بڑے احترام سے حاضر ہوتے، بمبئی سے ان کے لئے کوئی ہدیہ لاتے، اکثر عمدہ قسم کا قلم لاتے، مفتی صاحب بہت خوش ہوتے۔

ایک بار ان کے آنے پر مفتی صاحب نے بعض اساتذہ اور طلبہ کو اپنے کمرے میں بلالیا، غالبًا قاضی صاحب اس وقت حج کے سفر سے لوٹے تھے، ساتھ میں ان کے بڑے صاحبزادے مولانا خالد کمال بھی تھے، وہ اس وقت مدینہ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے، اساتذہ میں کیا باتیں ہوئیں، صف نعال میں بیٹھنے والا طالب علم کیا جان سکتا ہے لیکن دیکھا کہ قاضی صاحب کھڑے ہوکر خطبہ پڑھ رہے ہیں، اس کے بعد کچھ فرمانے لگے، قاضی جی کی آواز بلند نہ تھی، ذرا تیز رفتاری سے بولتے تھے،

اسلیئے بہت غور سے کان لگانا پڑتا تھا، وہ طلبہ کو خطاب کر رہے تھے کہ عربی لکھنا اور بولنا سیکھو، اب دنیا کے مختلف ممالک کے تعلقات بڑھ رہے ہیں، دنیا سمٹتی جارہی ہے عالم عرب قریب آتا جارہا ہے، ہمارے مدارس میں عربی زبان دین کو سمجھنے کیلیئے اور پڑھانے کے لائق بننے کے لئے ضرور حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن لکھنے اور بولنے کی مزاولت نہیں ہوتی، اس کی کوشش کرو۔ قاضی صاحب میں ظرافت بھی تھی، وہ رودادِ سفر سنا رہے تھے، اسی میں انھوں نے موجودہ عربی انداز گفتگو کو بھی ذکر کیا۔ پہلی مرتبہ انھیں کی زبان سے سننے میں آیا کہ اہل عرب نے تکلم میں زبان کو اس حد تک بدل دیا ہے کہ انھیں أقول لک کہنا ہوتا ہے، تو أگل لک کہتے ہیں، اور یہ سنایا کہ بعض قبائل ''کاف'' کا تکلم ''چ'' سے کرتے ہیں، حرم میں متعدد لوگوں کو سنا کہ وہ لبیک کہنے کے بجائے لبیچ اللھم لبیچ کہتے ہیں، ہم لوگ اس پر خوب ہنستے تھے، مولانا خالد کمال نے سنایا کہ عربی بولنے کی مشق نہیں ہوتی ہے، تو کیسی کیسی مضحکہ خیز غلطیاں ہوتی ہیں، اس کا نمونہ وہاں ظاہر ہوا۔ مولانا مودودی مدینہ یونیورسٹی تشریف لے گئے، ان کی کتابوں کے عربی ترجمے اس وقت ہو چکے تھے، اور ان کی شہرت پھیل رہی تھی، بعض عرب طلبہ ان سے ملنے آئے، تو کسی نے ان سے پوچھ دیا کہ شیخ آپ کب تشریف لائے، تو انھیں کہنا تھا کہ جئتُ أمس، میں کل آیا، تو فرماتے ہیں کہ جئتُ غداً، غداً آنے والے کل کو کہتے ہیں، طلبہ بے ساختہ مسکرا پڑے، یہ دونوں حضرات زور دے رہے تھے کہ عربی بولنے اور لکھنے کی مشق کرو

میرے دل میں یہ بات جم گئی، چنانچہ میں نے اس کیلیئے باقاعدہ کوشش کرنی چاہی، مگر مدرسہ میں اس وقت جو ماحول تھا اس میں اس کوشش کے آگے بڑھنے اور اس کے نشو ونما پانے کے سامان نہ تھے، میرے جی میں بار بار یہ بات آئی کہ میں ان سے استفادہ کروں، مگر میں اتنا چھوٹا اور حقیر تھا کہ جی کی بات جی میں ہی رہ گئی۔ نہ کبھی ان سے کہنے کی ہمت ہوئی اور نہ کسی اور سے! میں نے اپنے طور پر محنت کی ٹھان لی۔ عربی سوم کا سال جس میں کافیہ قدوری وغیرہ کتابیں ہوتی ہیں، تو یونہی سوچتے سوچتے گزر گیا۔ اس کے بعد دوسرے سال مقامات حریری درس میں تھی، اس سال عربیت کا سودا دل میں پورے طور پر سما چکا تھا۔ قاضی صاحب بمبئی سے تشریف لائے، تو میں ہمت کر کے ان کے گھر پہونچ گیا، اور ان سے اپنے شوق کا اظہار کیا۔ قاضی صاحب بہت خوش ہوئے، انھوں نے بہت حوصلہ افزائی کی، بڑی بشاشت سے فرمایا کہ فجر کے بعد مقامات حریری لے کر آجاؤ، میں اسے

خاص طور سے پڑھادوں گا، ایک ماہ کے قریب ان کا قیام تھا، میں ہر روز فجر کی نماز کے بعد کتاب لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا، کتاب کا کچھ حصہ میں مدرسہ میں پڑھ چکا تھا۔ مگر انھوں نے ابتداء سے پڑھانا شروع کیا، اور بالکل نئے انداز سے، وہ ایک لفظ کا معنیٰ بتاتے، پھر اس کے مترادفات بتاتے، ان مترادفات میں اگر کوئی لطیف اور دقیق فرق ہوتا، تو اسے ذکر کرتے پھر اس لفظ کے اصول وفروع بیان کرتے، اس سے الفاظ کی جتنی شاخیں نکلتیں وہ بتاتے، ان کا محل استعمال بتاتے، جہاں جہاں معنیٰ میں تبدیلی ہوتی، اسے ذکر کرتے، اس کے اضداد کو بتاتے، غرض اس لفظ کی پوری نسل اور اس کے متعلقات کو تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے، ہر ایک کا مفہوم سمجھاتے، محل استعمال بتاتے، آدھ گھنٹہ میں بمشکل دو سطر سبق ہوتا، میرا حافظہ بحمد اللہ اچھا تھا، اور مناسبت بھی خوب تھی، ان کا لفظ لفظ یاد ہو جاتا، کم وبیش ایک ماہ سبق کا یہ سلسلہ چلا، اس کا ایک بڑا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ نئے انداز سے مطالعہ کرنے کا سلیقہ آ گیا۔ میں نے عربی لغات کی آٹھ، دس کتابیں قدیم وجدید جمع کرلیں، اور ایک ایک لفظ کو ہر ہر لغت میں مفصل دیکھتا، اس طرح الفاظ وتعبیرات کا ایک بڑا ذخیرہ میرے ذہن میں محفوظ ہو گیا۔

قاضی صاحب کے اس ایک ماہ کے درس نے اور ان کی علمی گفتگو نے علم وتحقیق کی کئی نئی راہیں دکھائیں، ذہن ودماغ میں وسعت پیدا ہوئی، اگر میں انھیں راہوں پر چلتا رہتا، تو شاید عربی زبان کے ماہروں میں میرا بھی شمار ہو جاتا، اور علمی تحقیقات کی دنیا میں پچھلی صفوں میں شاید میری بھی جگہ نکل آتی، مگر میں تو دوسری ہی راہ پر نکل گیا، اب میں نرا مدرس ہوں، یا کچھ تھوڑا بہت وعظ کہہ لیتا ہوں، اور باقی کچھ یاد نہ رہا۔

میرے اس تلمذ نے مجھے قاضی صاحب سے قریب کردیا۔ دوسرے سال جب وہ تشریف لائے تو کچھ پڑھنے کی نوبت تو نہ آئی، مگر گاہے گاہے، ان کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتا تھا۔

قاضی صاحب کتابوں کے بڑے عاشق تھے، بڑے اہتمام اور حفاظت سے کتابیں رکھتے، ہر کتاب کی جلد پر بانسی کاغذ چڑھا ہوا ہوتا، انھیں بند الماریوں میں محفوظ رکھتے، جن میں ہمیشہ قفل لگا رہتا، مشہور تھا کہ وہ اپنی کتابیں نہ کسی کو مطالعہ کیلئے لے جانے دیتے، نہ کسی کو چھونے دیتے، واقعی اگر کوئی کتابوں کی حفاظت کرنا چاہے، تو اس کے لئے یہ طریقہ اختیار کرنا، ناگزیر ہے، ورنہ کتابیں بڑی آسانی سے سرقہ (چوری) ہو جاتی ہیں، اور کتنے ستم ظریف شاید اسے گناہ بھی نہیں سمجھتے،

بہر حال قاضی صاحب اپنی کتابوں کی بڑی حفاظت کرتے تھے، وہ کبھی کبھی بتاتے تھے کہ انھوں نے کس محنت ومشقت کے ساتھ غربت وافلاس کے دور میں ایک ایک پیسہ جوڑ کر یہ سرمایہ جمع کیا ہے، انھوں نے اس کی داستان اپنی خودنوشت آپ بیتی ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' میں تحریر فرمادی ہے، کچھ تو ان کا فطری ذوق تھا اور کچھ یہ محنت ومشقت کی کمائی تھی، جان سے بڑھ کر کتابوں کی حفاظت کرتے تھے۔ بعض اہل علم ان کی کتابوں سے استفادہ کرنے آتے، تو انھیں وہیں بیٹھ کر مطالعہ کی اجازت ہوتی، اس کمرے سے باہر کتاب لے جانے کی گنجائش ہرگز نہ ہوتی۔

مجھے جب ذرا قرب ہوا، اور قاضی صاحب نے میرے شوق مطالعہ کو دیکھا، تو بعض کتابیں ازخود الماری سے نکال کر عطا فرماتے، بعض اہم کتابوں کی نشاندہی کرتے، تو انھیں مدرسہ کے کتب خانے سے نکال کر پڑھتا، فقہ اللغہ ثعالبی کی، اور کتاب الاضداد ابن بشار انباری کی، اسی زمانے میں، انھوں نے مطالعہ کیلئے عطا فرمائی تھی، اس کے علاوہ بہت سے عربی جرائد ومجلّات، جو ان کے یہاں بکثرت آیا کرتے تھے، اور بعض کتابیں، جن کے نسخے ان کے یہاں زائد تھے، انھوں نے عطا فرمائے۔ اس وقت طلبہ کی انجمن جمعیة الطلبہ کا کتب خانہ میرے انتظام میں تھا، وہ رسائل اور وہ کتابیں میں نے اس کتب خانہ میں داخل کردی تھیں، کتابوں کے سلسلے میں قاضی صاحب کو جتنا سخت اور کھرا لوگوں نے مشہور کررکھا تھا، مجھے اس سے سابقہ نہیں پڑا، ویسے میں اس سلسلہ میں محتاط ہی رہتا تھا، یوں بھی مجھے سوال کرنے میں حجاب بہت ہے، انتظار ہی کرتا رہتا ہوں، قاضی صاحب نے کتابوں کے سلسلے میں جو مہربانی فرمائی، ازخود فرمائی، میں نے شاید کبھی کوئی کتاب ان سے مانگی نہیں، طبیعت کا اب بھی یہی رنگ ہے۔

مبارکپور سے میں دارالعلوم دیوبند چلا گیا، اس کے بعد قاضی صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ عرصہ تک بند رہا، چار پانچ سال کے بعد جب میں غازیپور مدرسہ دینیہ میں بصیغۂ مدرسی پہونچا تو پھر اس سلسلہ کی تجدید ہوئی، قاضی صاحب اسی شفقت وعنایت سے پیش آتے رہے، پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ بمبئی ترک کرکے مستقلاً مبارکپور میں مقیم ہوگئے، تو اطراف ونواح کے جلسوں، اور مدرسوں میں بار بار ملاقات کے مواقع ملے، خود مدرسہ دینیہ میں جب کوئی جلسہ یا تقریب ہوتی تو قاضی صاحب ضرور بلائے جاتے، ان کی کرم نوازی کی ایک مثال یاد آرہی ہے۔

ایک بار خیرآباد میں جلسہ تھا، صدارت حضرت قاضی صاحب کی طے تھی، قاضی صاحب وعدہ

کے نہایت پابند تھے، جب کسی بات کا وعدہ کر لیتے، تو اسے ضرور پورا کرتے، عین جلسہ کے دن ان کی طبیعت کچھ ناساز ہوئی، مگر تشریف لائے، جلسہ کے اسٹیج پر بھی آئے اور آتے ہی اعلان کر دیا کہ میرے بجائے اس جلسہ کے صدر عزیزم مولوی اعجاز احمد ہوں گے، میں معذرت کرنی چاہی، تو فرمایا کہ چھوٹوں کو چاہئے کہ بڑوں کے سامنے کام کرنا سیکھ لیں۔

وعدہ کی پابندی کا ذکر آیا، تو یہ بھی عرض کر دوں کہ وہ خطوط کے جواب بھی پابندی سے دیتے تھے، ایسا کبھی تجربہ نہیں ہوا کہ، انھوں نے خط کا جواب نہ دیا ہو، ایک دن فرمانے لگے کی مولوی خط کا جواب دینے میں کوتاہ ہوتا ہے، لیکن خط کا جواب بھی اخلاقی ذمہ داری ہے، جیسے سلام کا جواب دینا ضروری ہے، کوئی مخاطب ہو تو اس کی بات سننا اور اس کا مناسب جواب دینا اخلاقی فریضہ ہے، اسی طرح خطوط کے جواب تحریر کرنا بھی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور میں طلبہ نے اپنی انجمن کا جلسہ طے کیا، اس کی صدارت کیلئے کسی عالم کو بلانا زیر غور تھا۔ میری تجویز پر بچوں نے قاضی صاحب کو دعوت دینی طے کی، ایک طالب علم دعوت نامہ لے کر ان کے گھر گیا، قاضی صاحب طلبہ سے بہت خوش رہتے تھے، دعوت قبول کی جلسے کے دن تشریف لائے، صدارت فرمائی، طلبہ کی تقریریں سنیں، ان کی جرأت گفتار، بے ساختہ انداز تقریر، تنوع موضوعات اور ان کے حسن انتظام سے بہت متاثر ہوئے، کھل کر بچوں کی اور مدرسہ کے اساتذہ کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ میں نے عرض کیا کہ مدرسہ کے حق میں چند کلمات تحریر فرمادیں، فرمایا ضرور لکھوں گا، مگر گھر پر جا کر اطمینان سے لکھ کر ڈاک سے بھیج دوں گا، میں نے عرض کیا کہ ڈاک کا لفافہ پتہ لکھ کر آپ کے بیگ میں ڈال دوں، فرمایا نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں لکھ کر بھیج دوں گا، مجھے اندیشہ تھا کہ گھر جا کر دوسری علمی مشغولیتوں میں کہیں ذہول نہ ہو جائے، لیکن مزید کچھ عرض کرنا گستاخی سمجھا، اسلئے خاموش رہا، مگر شاید دس دن نہیں گزرے تھے کہ قاضی صاحب کی تحریر ڈاک سے آپہونچی، قاضی صاحب محقق عالم تھے، معائنہ کی تحریریں عموماً سرسری اور رسمی ہوتی ہیں، لیکن قاضی جی نے اس غیر علمی مضمون کو علم و تحقیق کے گل بوٹوں سے مزین کر دیا ہے۔

قاضی صاحب کو ان کا علم بڑا مستحضر تھا، اک ذرا چھیڑ یئے، پھر دیکھئے کہ سطح سمندر جو ساکن تھی، اچانک اس میں کیسا تموج پیدا ہوتا ہے، شیخوپور میں تشریف فرما تھے، کسی نے اس علاقے کی تاریخ کے متعلق کچھ سوال کر دیا، پھر جو قاضی صاحب نے معلومات کے موتی بکھیرنے شروع کئے، تو

سننے والوں کو حیرت ہوگئی، میں نے عرض کیا کہ آپ نے گویا ہر جگہ کی ایک ایک اینٹ الٹ کر دیکھی ہے، اور اس سلسلے میں معلومات کا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے۔

قاضی صاحب حقیقی معنوں میں صاحب تحقیق تھے، وہ بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اور اپنے کام کی باتیں چن لیا کرتے تھے، وہ فن کی بنیادی کتابوں پر نگاہ رکھتے تھے، کثرت مطالعہ اور ذوق تحقیق نے ان میں ایسا ملکہ پیدا کر دیا تھا کہ کارآمد اور زائد باتیں خود بخود ممتاز ہوتی چلی جاتیں۔ ان کی کتابیں پڑھئے تو ان کی دیدہ ریزی، اور کدوکاوش نیز وسعتِ مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے، وہ ایسی جگہوں سے اپنے مطلب کی بات اخذ کرتے ہیں، جہاں تک عام ذہنوں کی رسائی نہیں ہوتی۔ قاضی صاحب کی آخری تصنیف ''خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظام تعلیم و تربیت'' ہے اصل کتاب ۳۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی تصنیف کے لئے تقریباً سو کتابوں سے کام لیا گیا ہے، اور کوئی کتاب کمتر درجے کی نہیں ہے سب اعلیٰ سطح کی کتابیں ہیں، قاضی صاحب نے علم و تحقیق کا ایک معیار قائم کیا، اور اس سے نیچے کبھی نہیں اترے، سہولت پسندی کا ان کے یہاں گزر نہ تھا، کم درجے کے حوالے پر وہ راضی نہ ہوتے تھے، اس لئے ان کی کتابیں، خود مرجع و مصدر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

قاضی صاحب نے اپنی زندگی کا آغاز طلب علم سے کیا، اور اس کا اختتام بھی اسی پر ہوا، پوری زندگی طلب علم میں مصروف رہے اور ساتھ ہی نشر علم میں بھی لگے رہے، انتقال سے ایک آدھ روز پہلے ان کی مختصر تصنیف ''خواتین اسلام'' پریس سے آئی تھی، وہ طالب علموں کو اس کی ترغیب بھی دیتے رہتے تھے، اور اسی جذبہ سے انھوں نے اپنی طالب علمانہ زندگی کی داستان ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' میں جمع کی ہے، کہ ایک معمولی بچہ ناسازگار ماحول اور ناخوشگوار حالات میں گھرا ہوا تھا، مگر اپنی غیر معمولی محنت و مشقت کی بدولت وہ نہ صرف کامیاب و بامراد نکلا، بلکہ دوسروں کے لئے مشعل راہ بن گیا۔

قاضی جی کی ہمیشہ یہ خواہش رہا کرتی تھی کہ علماء کی نئی نسل پڑھنے لکھنے اور علم و تحقیق میں لگی رہے، کسی کے بارے میں انھیں معلوم ہوتا کہ اس نے کوئی تحقیقی یا تصنیفی کام کیا ہے، یا کسی ایسے کام کا اس کا ارادہ ہے، تو اس کی بہت حوصلہ افزائی فرماتے مشورے دیتے، اس کے پیچھے اس کی تعریفیں کرتے، میرے دوستوں میں مولانا عبدالرب صاحب اعظمی، جو قصبہ جہاناگنج کے رہنے والے ہیں، قاضی صاحب کو اس قصبہ سے خاص تعلق تھا، یہاں اکثر تشریف لایا کرتے تھے، وہ برابر مولانا عبد

الرب صاحب کو کچھ لکھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

میں نے تعلیم سے رسمی فراغت کے بعد تدریس کے میدان میں قدم رکھا، تو اس کیلئے بالکل یکسو ہو گیا، تصنیف و تالیف اور تحریر و انشاء سے مجھے نہ پہلے کوئی مناسبت تھی نہ اب ہے، اس لئے اس کی طرف نہ کبھی التفات ہوا، اور نہ کبھی اس کا قصد کیا، بارہ چودہ سال تک بجز ایک دو رسالوں کے اور کچھ نہیں لکھا، اس کے بعد کسی تقاضے کے تحت کبھی کبھی کچھ لکھنا پڑا، قاضی صاحب ملتے تو ضرور پوچھتے کہ کچھ لکھ رہے ہو یا نہیں؟ میں عذر کرتا کہ تدریس کی مشغولیت میں لکھنے کا موقع نہیں ملتا، وہ تدریس کی تحسین کرتے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرماتے کہ ابھی جوان ہو، یہی محنت کا زمانہ ہے، دونوں کاموں کو جمع کر سکتے ہو، بڑھاپے میں کچھ نہ ہو سکے گا، تدریس کے ساتھ کچھ نہ کچھ تصنیف کا بھی سلسلہ رکھو۔

قصبہ بھتری ضلع غازی پور میں جمعیۃ علماء کی ایک کانفرنس تھی، اس میں قاضی صاحب تشریف لائے تھے، میرے ساتھ ایک ذی استعداد نوجوان عالم بھی تھے، جو مدرسہ دینیہ میں اس وقت مدرس تھے، قاضی صاحب سے ان کا تعارف ہوا، وہ ایک دن قاضی صاحب کے ساتھ رہے، انھوں نے اندازہ کرلیا کہ یہ عالم باصلاحیت ہیں، کسی وقت ان کو دیکھا کہ وہ ذکر بالجہر میں مشغول ہیں، قاضی صاحب نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ زمانہ علم میں پختگی پیدا کرنے اور مطالعہ میں انہماک کا ہے، ان سے کہو کہ تحقیق و مطالعہ کا اہتمام کریں، انھوں نے ذکر کی نفی نہیں کی، لیکن ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ اس انہماک میں کہیں علم سے نہ رہ جائیں۔

ایک بار مجھ سے انھوں نے اپنے ذوق و مزاج کے مطابق، لیکن ذرا زور دے کر پوچھا کہ آج کل کچھ لکھ رہے ہو؟ میں قاضی صاحب کی مہربانیوں کی وجہ سے کچھ گستاخ سا ہو گیا تھا، اس کے جواب میں، میں نے ایسی بات کہہ دی، جو مجھے نہیں کہنی چاہئے تھی، اب بھی سوچتا ہوں، تو ضمیر ملامت کرتا ہے، میں نے بے تکلفی میں کہہ دیا کہ جی لکھ رہا ہوں، پوچھا کہ کیا؟ میں نے عرض کیا کہ خطوط! اس وقت میں طلبا کی تعلیم و تربیت سے متعلق بکثرت خطوط لکھا کرتا تھا، بعض طلبہ کچھ اشکالات لکھ لکھ کر بھیجتے تھے، ان کے جواب خاصے مفصل دیا کرتا تھا، وہی بات پیش نظر تھی اور میں نے کہہ دی، ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا، فرمایا یہ کیا چیز ہے؟ میں یہی پوچھتا ہوں؟ کوئی علمی و تصنیفی کام کرو، محنت سے بچنے کے لئے یہ سب حیلے بہانے ہیں، پھر دیر تک سمجھاتے رہے، میں

بہت شرمندہ ہوا اس کے بعد پھر کبھی میں نے ایسی بے تکلفی کی گفتگو قاضی صاحب سے نہیں کی۔

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی نور اللہ مرقدہٗ سے قاضی صاحب کے بہت گہرے روابط تھے، ان کے متعلق جتنے معلومات قاضی صاحب کو حاصل تھے، کم لوگوں کو حاصل رہے ہوں گے۔ حضرت کے انتقال سے، وہ بہت متاثر ہوئے تھے، حضرت کی وفات کے ایک سال کے بعد جب صاحبزادۂ محترم مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہٗ نے ان کی یادگار میں مجلّہ المآثر جاری کیا، اور اس کا تحریری کام میرے سپرد کیا، اور اس میں میرے مضامین مسلسل آنے لگے تو قاضی صاحب کو بہت خوشی حاصل ہوئی، وہ اس کا اظہار بھی کیا کرتے تھے، ایک تو یہ کہ حضرت کے علوم ومعارف کی خدمت کے لئے ایک سہ ماہی علمی وتحقیقی مجلّہ حضرت ہی کے مدرسہ سے جاری ہوا۔ انھیں خوشی تھی کہ اس طرح حضرت محدث اعظمی کے علوم اور ان کی کتابیں زندہ رہیں گی، دوسرے اس کی خوشی تھی کہ ان کا یہ ادنیٰ تلمیذ اب ایسی راہ پر لگ گیا ہے، جس میں طوعاً نہ سہی کرہاً ہی قلم ہاتھ میں لینا پڑے گا، اس کے بعد جب بھی ملاقات ہوتی خوشی کا اظہار فرماتے، اور میرے احباب سے بھی میرے مضامین اور میرے قلم کی تحسین فرمایا کرتے۔

میں نے حضرت اقدس محدث جلیل کے حالات زندگی لکھنے کا ذکر کیا، تو فرمایا کہ لکھو اور اس سلسلے میں جتنی مدد مجھ سے ہوسکے گی میں کروں گا۔ میں بھی جانتا تھا کہ حضرت اقدس کے سلسلے میں معلومات کا سب سے بڑا ذخیرہ اب قاضی صاحب ہی کے پاس ہے، ایک مجلس میں کچھ باتیں میں نے دریافت کیں، تو بڑے اطمینان سے مفصل طور پر حالات بتائے، اور فرمایا کہ جب لکھو گے، تو بہت سی جگہوں پر ضرورت محسوس کروگے، اس وقت پوچھتے رہوگے، تو بتاتا رہوں گا۔

اب افسوس ہورہا ہے، تدریس کی مشغولیت تو خیر ایک کارآمد اور ضروری مشغولیت ہے، لیکن اس کے علاوہ بعض لایعنی مشاغل میرے اوپر مسلط ہوگئے ہیں، اور کچھ یہ بھی ہوا کہ پچھلا سال زیادہ تر علالت کی نذر ہوگیا۔ پورا ایک سال بیت گیا، اور میں اس سلسلے میں ان سے استفادہ نہ کرسکا، اب کیا عرض کروں کہ کیسا جی مسوستا ہے، معلومات کا خزانہ زیر زمین دفن ہوگیا۔

اسی مجلس میں، میں نے عرض کیا کہ آپ کے نام حضرت اقدس کے بہت خطوط ہوں گے۔ انھیں اجازت دیں تو المآثر میں شائع کردیا جائے۔ انھوں نے فرمایا کہ خطوط کافی تعداد میں ہیں، کچھ میرے نام اور کچھ مولوی خالد کمال کے نام۔ پھر انھوں نے سب نکالے، ان کے نام ستّر کے

قریب خطوط تھے، اور پندرہ بیس مولانا خالد کمال کے نام! انھوں نے سب میرے حوالے کردیئے، میں نے اس کی ایک قسط مرتب کی، اور ان سے عرض کیا کہ بعض خطوط میں بعض اشخاص کے تعارف اور بعض اشارات کی توضیح کی ضرورت ہے، یہ بات میں نے اس وقت عرض کی تھی جب وہ بہت بیمار تھے۔ اور اعظم گڈھ کے ایک نرسنگ ہوم میں زیر علاج تھے، فرمایا کہ گھر پر آجانا، میں لکھوادوں گا، میں تو نہ جاسکا، اپنے ایک عزیز طالب علم کو بھیج دیا، وہ اس پر حواشی لکھ کر لے آئے۔ انھوں نے کہلوایا کہ جس شمارہ میں یہ خطوط چھپیں مجھے ضرور بھیجنا، لیکن کیا پتہ تھا کہ جس شمارہ میں مکاتیب کی پہلی قسط شائع ہوگی، اسی میں ان کی وفات کی اطلاع بھی چھپے گی۔

شعبان ۱۴۱۶ھ میں میرے بہت عزیز قریب دوست مولانا عبدالرب صاحب اعظمی سے ایک ماہانہ رسالہ نکالنے کی گفتگو آئی، یہ بات ہم لوگوں کے درمیان چار پانچ ماہ قبل بھی آئی تھی۔ مگر اس کے بعد خاموشی ہوگئی تھی، شعبان میں پھر اس کا ذکر آیا، اور بات طے ہوگئی کہ ایک دینی اور عام فہم رسالہ جامعہ عربیہ انوار العلوم جہانا گنج کی طرف سے نکالا جائے، ہم دونوں ٹھہرے ناتجربہ کار! خیال ہوا کہ کسی اپنے بڑے کی رہنمائی حاصل ہوجائے، تو کام آسان ہوجائے، اب ہم لوگوں کیلئے مرکز نگاہ صرف قاضی اطہر صاحب کی ذات گرامی تھی، وہ خوش بھی ہوں گے، حوصلہ افزائی بھی کریں گے، مضامین ومقالات بھی عنایت فرمائیں گے، اس طرح رسالہ کا ایک معیار ووقار قائم ہوجائے گا، اور اہل علم حضرات متوجہ ہوں گے، چنانچہ یہ درخواست قاضی جی کی خدمت میں پیش کی گئی، وہ اس منصوبے سے خوش تو بہت ہوئے، اور تعاون کا وعدہ بھی فرمالیا، لیکن غالباً انھیں تردد تھا کہ ماہانہ رسالہ کو ہر وقت مضامین کی ضرورت ہے، قاضی صاحب کے بقول ماہنامہ کا پیٹ بھرنا بڑا اہم کام ہے۔ لیکن انھوں نے تردد کا اظہار زیادہ اہمیت سے نہیں کیا کہ کہیں ہم لوگوں کی طبیعت ٹوٹ نہ جائے، وہ ہمیشہ اپنے چھوٹوں کا دل بڑھایا کرتے تھے۔ ان کی منظوری حاصل کرلی، تو رمضان شریف میں مولانا عبدالرب صاحب کی مسلسل محنت اور کاوش سے اس کا پہلا شمارہ منظر عام پر آگیا۔ قاضی صاحب نے اس کا معیار، اس کی کتابت وطباعت سب کو پسند کیا، تاہم انھیں تردد باقی رہا، وہ بار بار تاکید کیا کرتے تھے کہ مضمون نگاروں کو تیار کرو ان سے مضامین لکھواؤ، ہم لوگوں کو اطمینان تھا کہ بحمد اللہ ہمارے دوستوں میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ، جو معیاری مضامین لکھ سکتے ہیں، جب کئی شمارے نکل چکے، تب قاضی صاحب کا تردد، دور ہوگیا انھوں نے اپنے مضامین بھی عنایت فرمائے،

جو ماہنامہ انوار العلوم کے کئی شماروں میں شائع ہوئے۔ بعد میں وہ بار بار خوشی اور اطمینان کا اظہار فرماتے رہے کہ اب انشاءاللہ پرچہ جاری رہ سکے گا۔اس سلسلے میں وہ مفید مشورے دیتے ،رسالہ کو پا کر خوش ہوتے ،اسے پڑھتے ، دعائیں دیتے ،انھوں نے کبھی کوئی لفظ ایسا نہیں کہا جس سے ہم لوگوں کی حوصلہ شکنی ہوتی۔

۶/ماہ تک ان کی سرپرستی میں یہ رسالہ شائع ہوا،ساتویں ماہ جولائی کا رسالہ تیار تھا،صرف پریس میں جانا باقی تھا کہ قاضی صاحب سفر آخرت پر روانہ ہوگئے،اور رسالہ کی پیشانی پر جہاں حضرت قاضی صاحب کا نام جگمگایا کرتا تھا،اندھیرا چھا گیا،اور کتابت شدہ اداریہ کو ہٹا کر قاضی صاحب کا ماتم کرنا پڑا۔

قاضی صاحب کی بینائی کمزور تھی ، میں نے جب سے انھیں دیکھا،ان کی آنکھوں پر ہمیشہ تیز پاور کا موٹے شیشے والا چشمہ ہوتا تھا،اوراس پر بھی لکھنا پڑھنا ہوتا تو آنکھ کے بالکل قریب لے جا کر پڑھتے ،ہم لوگ دیکھتے تو بڑا ترس آتا،مگر وہ اسی طرح ہمیشہ کام میں لگے رہتے۔

قاضی صاحب کی عام صحت اچھی رہی،اخیر میں بیمار رہنے لگے تھے،عمر بھی بہت ہوگئی تھی،اسّی سے متجاوز تھے،گھٹنوں میں درد رہتا تھا،کھانسی بھی آیا کرتی تھی، پھرناک سے خون رسنے لگا تھا،اس کا علاج آپریشن تھا،مگر وہ آپریشن کیلئے تیار نہ تھے،فرماتے تھے کہ آپریشن کرنے کے لئے بے ہوش کیا جاتا ہے،کیا معلوم اسی حالت میں موت آجائے،اور عین وقت پر کلمہ پڑھنے کا بھی موقع نہ ملے،وہ ہومیو پیتھ علاج کراتے رہے،ان کے صاحبزادے حاجی ظفر مسعود صاحب آپریشن کیلئے اصرار کرتے مگر وہ انکار کر دیتے ، میں نے عرض کیا کہ آپریشن کرا لیجئے،اس سے جلد نجات ہوجائے گی،تو شفقت کے لہجے میں خفا ہونے لگے،لیکن بالآ کر اعظم گڈھ میں آپریشن کرایا،اور بحمداللہ اس سے افاقہ ہوگیا۔

پھر کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ اعظم گڈھ کے ایک نرسنگ ہوم میں بیمار ہو کر آگئے ہیں،ہم کئی دوستوں کا قافلہ ان کو دیکھنے کے لئے پہنچا،قاضی صاحب سو رہے تھے،حاجی ظفر مسعود صاحب نے جگایا،تو جس طرح وہ اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے اسے دیکھ کر دل گھبرا گیا،ضعف ونقاہت کی وجہ سے صورت پہچانی نہیں جارہی تھی بڑی مشکل سے بیٹھے ہم لوگ اصرار کرتے رہے کہ آپ لیٹے رہیں،مگر نہ مانے ، بیٹھنے کے بعد باتیں کر رہے تھے،تو الفاظ صاف سمجھ میں نہیں آرہے تھے،منہ خشک تھا،تھوک نہیں بن رہا تھا،معلوم ہوا کہ اعضاء رئیسہ سب متاثر ہیں،تھوڑی دیر کے بعد بشاش ہوگئے ،

ان پر بیماری کی کوئی گھبراہٹ نہیں تھی، تھوڑی دیر گزری تھی کہ ان کے منہ سے علم وتحقیق کے موتی بکھر نے لگے، محسوس نہیں ہورہا تھا کہ ہم کسی انتہائی کمزورو نحیف مریض سے گفتگو کررہے ہیں۔

دوسرے روز قاضی صاحب گھر چلے گئے، کچھ دنوں کے بعد گھر پر حاضری ہوئی، تو کمزوری اور گھٹنوں کے درد کی شکایت کررہے تھے، لیکن لہجہ شکوہ کا نہ تھا، شکر کا تھا، فرمارہے تھے کہ میری جتنی عمر ہوگئی ہے، اس کے لحاظ سے اچھا ہوں، اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر فرمانے لگے کہ اس نے مجھے بہت ڈھویا ہے، اب تھک گیا ہے، آخر کتنا ڈھوئے گا۔ اسی طرح باتیں کرتے رہے، کیا معلوم تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہوگی۔ شاید اس پر دو ایک ماہ گزرا ہوگا، میں مئو ''المآثر'' کے دفتر میں تھا کہ اطلاع آئی کہ قاضی صاحب نہیں رہے، دل ڈوبنے لگا، بعد نماز ظہر جنازہ کی نماز تھی، مبارکپور اور مضافات کے علاوہ بھیرہ ولید پور، خیرآباد، جہانا گنج، پورہ معروف، بہور، شیخوپور، بلریا گنج، بنارس اور غازی پور سے علماء وصلحاء اور عوام کا جم غفیر جمع ہوگیا تھا، مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی نے نماز جنازہ پڑھائی، اور اس خاکسار نے ایک بڑے مجمع میں تعزیتی کلمات کہے، صدمے کی وجہ سے دل اور زبان کا ربط ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔

قاضی صاحب کی زندگی طالب علموں کے لئے مثالی زندگی تھی، اس سے بہت سا سبق سیکھا جاسکتا ہے، ان کی آپ بیتی ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' طالب علموں کو اور نوجوان علماء کو بہت غور سے پڑھنی چاہئے، وہ اس کے آغاز میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

> خوداعتمادی اور خودسازی کی یہ طویل داستان ان عزیز طلبہ کی تشجیع وتشویق اور ہمت افزائی کے لئے لکھی گئی ہے، جو بہترین ذہن ودماغ لے کر دارالعلوموں اور جامعات کی لق ودق اور شاندار عمارتوں میں جاتے ہیں تاکہ وہاں کے بہترین تعلیمی وتربیتی نظام کے ماتحت لائق وفائق اساتذہ کی توجہ سے علم حاصل کریں.......... مگر عام طور پر ان کو اپنے مقصد میں ناکام ہونے کے ساتھ نالائقی اور بدنامی کی سند ملتی ہے.......... ایسے طالب علموں کو ہم جیسے چھوٹے مدرسوں کے طلبہ سے سبق لے کر اپنے بلند مقاصد میں کامیابی کی جدوجہد کرنی چاہئے، میں نے اپنی طالب علمی کی یہ کہانی خودستائی اور خودنمائی کے لئے نہیں لکھی ہے۔ عزیز طلبہ اس تحریر کو اس نقطۂ نظر سے نہ پڑھیں بلکہ اس کو پڑھ کر آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کریں۔

ان کا یہ ارشاد بار بار پڑھنے اور لوحِ دل پر نقش کرنے کے لائق ہے۔

''میرے محدود وسائل اور مخصوص حالات قرب وجوار کے بڑے مدرسوں میں جانے کے حق

بقیہ ص: ۲۴۴ پر

قاضی صاحب کی
زندگی کی بعض جھلکیاں

جناب صدیق احمد صاحب خلدآباد، اورنگ آباد

یہ مضمون نہیں ایک مکتوب ہے، جو حضرت قاضی صاحبؒ کی وفات کے بعد، ان کے صاحبزادے قاضی ظفر مسعود صاحب کو لکھا گیا ہے، لکھنے والے کون ہیں؟ ان کو تعارف خود یہ خط کرادے گا، قاضی صاحب کی خلوت وجلوت کے رازداں، ان کے بے تکلف دوست۔ ان کے اس خط سے قاضی صاحب کے مزاج وطبیعت اور ان کی زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ [ادارہ]

نورچشم قاضی مسعود سلمہ، بہت بہت دعائیں

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے!

والد محترم کے انتقال کی خبر بذریعہ اخبار ہوئی، بیٹا مسعود! والد محترم ہمارے بڑے قریبی ساتھی تھے، بمبئی میں ۱۹۵۰ء سے مولانا عبدالرحمٰن قمر کے ذریعہ تعلقات ہوئے تھے، قاضی صاحب کی محبت، خلوص، پیار، تعلیمی اور اخلاقی تربیت کا ایک حصہ جو ہماری زندگی میں آج موجود ہے، یہی تمام باتیں ذریعہ معاش میں بھی اور دنیاداری میں بھی معاون ومددگار بنی ہوئی ہیں۔

مولانا کی علمی مجلس میں صرف میں ہی ایک اَن پڑھ تھا، جس کو وہ اپنے قریب رکھے ہوئے تھے، مسعود میاں! تم نے ان کی بمبئی کی وہ زندگی نہیں دیکھی، جو ۶۰، ۱۹۵۶ء تک جنجیرا اسٹریٹ کے روم میں گزری، بیٹا! مہینوں دال پکتی تھی اور ایسی کہ تم ہم، تمہارے ہمارے بچے، اسے دال نہیں دال

کا ڈھووَن ہی سمجھیں گے، آج کل بھٹیار خانے کی روٹی جو لانے کے بعد جلد ہی نہ کھائی جائے تو آدھے گھنٹہ میں ربر کی طرح ہوجایا کرتی تھی کہ بس کھینچ کھینچ کر توڑو۔ کپڑے ہاتھ سے دھونے کے بعد، استری تو شروع شروع میں نہیں ہوتی تھی، لیکن بعد میں واشنگ میں دھلائے جاتے تھے، شدید گرمی، پسینے میں شرابور، اس حالت میں اپنی لکھائی پڑھائی میں مصروف، کبھی کبھی ان کی اس حالت کو دیکھ کر کہ مارکین کی بنی بنڈی تر ہوچکی ہے پسینہ سے، میں کہتا کہ مولوی صاحب! ایک پنکھا لگوا لیجئے، تو بڑے پیار میں ڈانٹ کر کہیں کہ "اے صدیقوا! میں بنسواڑی میں سونے والا غریب آدمی ہوں، یہ سب مجھے نہیں چاہئے"۔

ایک دو مہینہ نہیں، سال دو سال نہیں، برسوں کرافورڈ مارکیٹ سے مدن پورہ تقریباً تین میل جانا اور تین میل آنا، بمبئی کی طوفانی بارش میں بھی اسی طرح آیا جایا کرتے تھے، کبھی بھی بس میں، ٹیکسی میں نہیں بیٹھے، میری بہن کا مکان ناگپاڑے پر ہے، راستہ میں ٹیکسی روک کر دیکھ لینے کے بعد کہ مولوی صاحب خراماں خراماں چلے جارہے ہیں، آواز دے کر کہ چلئے مولوی صاحب! بیٹھ جائیے، مگر صاف انکار کہ آج تم بٹھالو گے اور کل اور ہمیشہ کا کیا ہوگا؟ کبھی کبھار بڑی مشکل سے بیٹھ جایا کرتے تھے، وہ بھی بڑی منتوں اور خوشامدوں سے، لیکن یہ کس لئے مسعود! منی آرڈر کرنے کے لیے کہ زیادہ سے زیادہ پیسے گھر بھیجے جاسکیں کہ بچوں کو تکلیف نہ ہو، میں اور مولانا قمر معلم کے دفتر میں کام کرتے تھے، ہم لوگوں کا کھانا وہیں پکا کرتا تھا، مولوی صاحب کو قمر صاحب سے بڑی محبت تھی، انجمن خدام النبی کا دفتر بھی نزدیک ہی تھا، مولانا اپنا وقت اس دفتر میں بھی بلا ناغہ دیا کرتے تھے؛ کیوں کہ حاجیوں کی سہولت کے لیے جو مسنون دعاؤں کے چھوٹے چھوٹے پاکٹ سائز کتابچے مولانا کی زیر نگرانی تیار کئے جاتے تھے، منیری صاحب برائے نام تھے وہاں، تو مولانا صاحب مسافر خانہ دفتر خدام النبی آتے وقت یا جاتے وقت ضرور ہمارے وہاں آتے، مگر کھانے میں ہمارا ساتھ کبھی نہ دیتے، ایک دو بار نہیں پچاسوں بار آپ کہہ لیجئے کہ مولوی صاحب! آجائیے، تھوڑا ہی لے لیجئے، ایک دو لقمہ ہی لیجئے، مگر اس بندۂ خدا نے جب نہ کہہ دیا تو نہ ہی رہی، ان کی ہاں نہ ہوسکی۔ اگر صرف میٹھے کے لیے اصرار کیا تو بھی ان کی وہی ضد، اور ڈانٹ کر خاموش کردینے والی ہمیشہ کی عادت۔ مولوی صاحب کے ہمیشہ انکار پر موقع کی تلاش تھی کہ کبھی پوچھ لوں کہ آخر کبھی تو ہماری بات مان لیں

اور کھانا کھالیا کریں، ہمارے ساتھ ایک خاص بات تھی مسعود! کہ جب دعوت دی جائے تو برابر آتے وقت سے پندرہ منٹ پہلے آتے، کبھی بھی دوسری بار یاد دلانے کا موقع نہیں دیا انھوں نے، اتفاق سے جنجیکر میں ایک روز مل گئے، تو میں نے پوچھ ہی لیا کہ مولوی صاحب! کیا بات ہے کہ آپ کھانے پر ہمارے ساتھ نہیں بیٹھتے؟ انھوں نے کہا کہ کسی کے دسترخوان پر بے تکلف ہوکر بیٹھنا اچھی بات نہیں ہے، پھر دوسری بات یہ کہ تم میرے اپنے ہو، اس لیے بتادیتا ہوں کہ مبارکپور میں میرے بچے تو ایسا نہیں کھاتے ہوں گے اور میں یہاں کھایا کروں۔ مسعود! یہ بات سن کر بڑا تعجب ہوا کہ اپنے گھر کا، اپنے بچوں کا اس قدر خیال، اور کھاتے پیتے اچھا برا ہر وقت بچے ذہن میں موجود، مسعود! اس گھڑی سے آج تک یہ جملہ ذہن نشین ہے اور اسی پر عمل ہے جو مولوی صاحب کرتے رہے۔

اس زمانہ میں ہمارے گھر بدعت کا دور دورہ تھا، ساری نذر و نیاز بڑی دھوم دھام سے ہوتی تھی، ایک روز ہم نے قاضی صاحب کو دعوت دی، مولوی اسحاق صاحب، مولوی قمر صاحب باندرہ مسجد کے امام افتخار احمد صاحب بھی مدعو تھے، سب کے سب مولوی اسحاق صاحب کے وہاں جمع ہوئے اور پھر میں سب کو ساتھ لے کر گھر آیا، دسترخوان جو پہلے سے بچھا ہوا تھا، اس پر مسالے دار پوریاں جو مٹی کے کونڈوں میں سجی سجائی رکھی تھیں، اس کونڈے پر پھول بندھے ہوئے تھے، اسی طرح کھیر بھی مٹی کے کونڈے میں تھی، اس پر بھی پھول کا ہار بندھا ہوا تھا، سب مولوی صاحبان ایک دوسرے کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے کہ میرے والد محترم نے کہا کہ اسحاق میاں اور قاضی صاحب قمر چلو یہاں ہاتھ دھولو اور دسترخوان پر آجاؤ، سب نے خاموشی سے ہاتھ دھویا اور چپ چاپ دسترخوان پر بیٹھ گئے، سب میٹھا ہی میٹھا تھا، اس لیے جتنا کھا سکے کھائے اور پھر جب اٹھے تو ایک خاص برتن میں ان کے ہاتھ دھلائے گئے اور اس پانی کو بڑی حفاظت کے ساتھ سمندر میں لے جاکر پھینکا گیا، جب سب لوگ کونڈے کے دسترخوان سے میٹھا کھا کر اور ہاتھ دھوکر بیٹھے ہی تھے کہ ایک دوسرے کمرے میں اٹھا کر لے گیا، وہاں بھی دسترخوان تیار تھا، مگر اس پر کچھ تھا نہیں، بعد میں دال، گوشت اور چاول جو بمبئی والوں کا مرغوب کھانا ہے، لایا گیا۔ سب لوگوں نے سیر ہوکر کھایا، اس کے بعد سب نے نل پر ہاتھ دھوئے اور میرے والد صاحب سے ہاتھ ملاکر تیسرے منزلہ سے نیچے اترتے ہی مجھ سے قاضی صاحب نے دریافت کیا کہ یہ دوسرے دسترخوان پر اور دوسرے کمرے میں کیوں

کھلایا گیا؟ میٹھا اور کھارا ایک ہی جگہ کیوں نہیں کھلائے تم لوگوں نے؟

اس وقت مجھے دینی معلومات کچھ بھی نہیں تھی اور نہ ہی بدعت کیا ہے؟ اس کا علم تھا، بس جو ہمیشہ گھر میں ہوتا آیا ہے، وہی ہورہا تھا۔ اس لیے صاف صاف بتادیا کہ وہ امام جعفر صادق کے کونڈے کی نیاز تھی، جس کو بڑے اہتمام سے پکایا اور کھلایا جاتا ہے، اس پر ایسے ویسے کی چھاؤں تک نہیں پڑتی اور اس کا ہاتھ دھلا پانی بھی بڑی عزت اور احترام کے ساتھ کسی درخت پر یا صاف جگہ یا پھر سمندر میں، اب بمبئی میں درخت اور صاف جگہ کہاں ملے گی؟ اس لیے سمندر ہی مناسب جگہ ہے، وہاں لے جاکر پھینکا جاتا ہے۔ وہاں بیٹھ کر اور کچھ بھی نہ کھا سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے قریب لا سکتے ہیں؛ اس لیے آپ لوگوں کو میٹھا کھانے کے بعد ہاتھ دھلوائے گئے اور پھر دوسرے کمرے میں غوث پاک کی نیاز تھی، اس کو کہیں بھی کھا سکتے ہیں، کہیں بھی دوسرے گھر میں بھی لے جایا جاسکتا ہے۔ قاضی صاحب نے بڑے غور سے پوری تفصیل سنی اور صرف اتنا کہا کہ صدیق! تیری محبت میں سب کھالیا، دسترخوان سے اٹھنا چاہتا تھا مگر اٹھ نہ سکا، صرف اس وجہ سے کہ تجھے دلی تکلیف پہنچے گی، آج یہ میری زندگی کی پہلی اور آخری غلطی ہے صدیق!، دوسروں نے کچھ نہیں کہا، ہنستے بولتے چلتے رہے، مگر قاضی صاحب کا ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا، میں برابر دیکھتا رہا اور اس بات کا اقرار انھوں نے جواہر القرآن میں تفصیل کے ساتھ کیا تھا اور میری بدعت کا خاتمہ اسی روز سے ہوگیا جس روز قاضی صاحب نے اپنے کالم میں اپنی غلطی کہا اس طرح کے کھانے کو، مجھے بھرپور تربیت ملتی رہی، دل ودماغ صاف ہوتا گیا، میں ہر سال اپنے والد کی جھڑکیاں اور برا بھلا سنتا رہا، مگر قاضی صاحب کی بدولت میرے اندر بڑا فرق آگیا اور آج میں ان تمام چیزوں سے دور ہوں۔ قاضی صاحب کبھی اپنا کام دوسروں سے لینا پسند نہیں کرتے تھے، اگر جھجکیر میں اوپر بیٹھے ہوئے ہوں، ترکاری تیار ہوچکی تو خود نیچے جاتے اور روٹی لے آتے اور اتنی خاموشی سے اترتے کہ پتہ نہیں چلتا کہ کب نیچے اتر گئے۔ کبھی کبھی میں زبردستی ان سے پیسے چھین کر سامان لے آتا، مولوی اسحاق صاحب کے ہاتھ کا سالن بہت پسند تھا انھیں، وہ بھی گائے کے گوشت کا، اور وہ گوشت لانا میرے ذمہ تھا، منگل کے روز باندرہ سلاٹر ہاؤس میں مولوی افتخار کی وجہ سے، کیوں وہ باندرہ جامع مسجد کے امام تھے، اس وقت نہیں معلوم کیسا معاملہ تھا کہ صرف ایک گائے کاٹی جاتی تھی اور پندرہ روپیہ کا تین سیر ملتا تھا، مہینہ میں کسی بھی

ایک دن مجھے جانا پڑتا تھا، ہمیشہ مولوی اسحاق صاحب ہی گوشت منگایا کرتے تھے اور ایک بار مولوی اسحاق صاحب کافی روز بنارس رہ گئے، جیسے ہی وہ آئے بس ایک روز میرے پاس آئے اور کہا کہ صدیق آج منگل ہے اور مولوی اسحاق بھی آگئے ہیں، میں سمجھ گیا کہ اب گوشت لانا ہے، مگر میں خاموش رہا، مولوی صاحب نے آہستہ سے شیروانی کی جیب سے نہیں، اندر کُرتے کی جیب سے پیسے نکالے اور ایک کی سولہ نوٹ میرے پاس رکھ دیئے کہ جا اور جلدی سے آ، اس وقت ۴ر آنے ہی ٹکٹ تھا، گوشت رات ۷ر بجے لایا، اس وقت تمام مسالے تیار تھے، ۱۱ر بجے ہم لوگوں نے کھانا کھایا اور پھر جنجیکر چھوڑ آئے۔

مولوی صاحب کی آمدنی میں جب اضافہ ہونا شروع ہوا تو ہم لوگوں نے یعنی قمر اور میں نے ستانا شروع کر دیا، قاضی صاحب انکم ٹیکس سے بہت ڈرتے اور ہم ان کو ڈراتے رہتے اور کھانے پینے کا راستہ نکالتے رہتے تھے، کسی بھی دوست کو انکم ٹیکس افسر بنا کر جنجیکر بھیجتے، وہ انقلاب، انجمن اسلام، انجمن خدام النبی اور اس ادارے کے صدر صاحب کے گھر ٹیوشن کے بارے میں دریافت کرتا اور دوسری بار آنے کا وعدہ کر کے چلا جاتا اور قاضی صاحب بس اس کے جاتے ہی بڑی تیزی سے قمر صاحب کو آکر بہت رازداری کے ساتھ یہ واقعہ بتاتے۔ اور پھر قاضی صاحب سے بمبئی میں میری پہنچ اور اثر ورسوخ کے بارے میں زمین وآسمان ایک کر دیتے، پھر وہ دونوں اپنی رازداری میں مجھے شامل کر لیتے اور قمر صاحب اک دعوت کا اہتمام کرتے، اس فرضی انکم ٹیکس والے کی بھی خاطر کی جاتی اور پھر انکم ٹیکس کا معاملہ ختم کر دیا جاتا۔

مگر ایک بار وہ فرضی انکم ٹیکس والا طلاق کے معاملے میں اپنے دوست کے ہمراہ مسئلہ دریافت کرنے جنجیکر پہنچا، اب وہاں مسئلہ پوچھنے والے صاحب سے قاضی صاحب کے ''انقلاب'' کی وجہ سے اچھے تعلقات تھے، وہاں معلوم ہوگیا کہ وہ صاحب انکم ٹیکس والے نہیں، بلکہ ایک پرائیوٹ ادارے کے ٹیچر ہیں، راز کھل جانے پر انھوں نے بھی سچ سے کام لیا اور میرا نام بتادیا کہ میں نے بھیجا تھا، اب قاضی صاحب یہ بات سن کر کہاں برداشت کرنے والے تھے؟ ان کو رخصت کر کے سیدھے ہمارے آفس پہنچے، ہمارے آنے کا انتظار کرتے رہے اور جب ہم آئے تو مت پوچھئے مسعود! کہ کیا درگت ہوئی، دو چار زبردست دھول پڑے، قاضی صاحب کے غصے کو اس بار

دیکھا، مزا بھی آیا اور خوف بھی طاری ہوا اور افسوس بھی۔ مگر دوسرے دن جنجیکر ساتھ لے گئے، روٹی میرے ہاتھ سے منگوائے، ساتھ بیٹھ کر کھانا کھلایا، خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے، اور یہ واقعہ خود بھی بھول گئے اور مجھے بھی بھلا دیا۔ مگر آج کا وہ واقعہ اور اپنی بچپن کی نازیبا شرارت پر آج افسوس ہی نہیں بے انتہا ندامت اور شرمندگی ہے، مگر دوستی میں سب جائز سمجھ کر اپنی غلطیوں پر احساس کر کے اس وقت اپنے بڑوں سے بات بات پر معافی مانگ کر دوبارہ نہ کرنے کا اقرار کر کے پھر وہی اپنی پرانی حرکتوں پر باز نہ آنا، پھر معافی کے طلب گار ہونا اور ان کا وسعت وفراخ دلی سے بار بار معاف کر کے اپنے قریب کرنا۔ یہ دریا دلی کی ایسی مثال ہے جس کا کوئی حساب نہیں ہے۔

ایک روز بمبئی میں الیمنٹا کے دیکھنے کا پروگرام بنا، کھانا میرے گھر تیار کیا گیا، قاضی صاحب، مولانا قمر، مولوی اسحاق اور ہمارے آفس کے حشمت کانپوری اور جلال الدین ایک اور صاحب تھے، صبح ۵؍ بجے سے عورتیں تیار کر رہی تھیں، ساڑھے سات بجے تیار ہوا تو جلال الدین گھر آ گئے کہ جلدی چلو، میں نے تیار کھانے سے بھرا ٹیفن جلال کے ہاتھ میں دیا کہ میں ابھی کپڑے بدل کر آ رہا ہوں، جلال بڑی تیزی کے ساتھ نکل گئے اور میں کپڑے بدلنے میں رہ گیا، اب کشتی کے چھوٹنے کا وقت ۸؍ بجے تھا، یہ سب لوگ وقت مقررہ پر گیٹ آف انڈیا پہنچ گئے اور لانچ وقت پر نکل گئی اور میں باہر ہی رہ گیا اور یہ سب لوگ چلے گئے، اس کے بعد اور کوئی دوسری کشتی نہیں تھی کہ میں چلا جاتا، چپ چاپ گھر واپس آ گیا، اس وقت تک میرے ہاتھ پر گھڑی نہیں تھی، اتوار کا دن تھا، آفس میں بھی کام نہیں تھا، مگر آفس گیا، تین بجے کے قریب مولانا حبیب الرحمٰن مئو والے سامان کے ساتھ آ گئے اور جنجیکر سے گھر بند دیکھ کر ہمارے وہاں آئے، ان کو پورا واقعہ سنایا کہ اس طرح مجھے یہ سب چھوڑ کر چلے گئے، ساڑھے پانچ بجے یہ سب لوگ واپس آ گئے، قمر صاحب میری غصہ بھری صورت دیکھ کر ہنس پڑے، بس ان کا ہنسنا تھا کہ قاضی صاحب برس پڑے اور ان کی اس حرکت پر خوب ڈانٹ پلائی اور مجھے وقت کی پابندی پر خوب نصیحت کی اور معلم کے مکہ آ جانے پر ان سے کہہ کر ایک گھڑی دلائی، گھڑی قاضی صاحب کی وجہ سے ہاتھ پر باندھنے کی عادت پڑی۔

مسعود! تم تو اولاد ہی ہو، لیکن ہم تاحیات اس بات کو نہیں بھول سکتے کہ قدم قدم پر ہمیں تربیت ملی، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، رہنے سہنے کا ادب لحاظ کس کس بات کو لکھیں، اب یادداشت برابر

نہیں رہی، ۶۲ ر سال کی عمر ہے، قاضی صاحب کا ۲۱ ر سال ساتھ یہ دو ورقوں میں کہاں آسکتا ہے، ہم خوش قسمت تھے، کہاں مبارکپور اور کہاں خلدآباد کہ اللہ رب العزت نے ایسی شخصیت سے ملایا، جو آج کی دنیا کا ولی اور کامل ولی تھا، کسی بات میں دکھاوا نہیں، خودنمائی نہیں، بناوٹ نہیں۔ بڑے سے بڑے دنیادار سے یہاں تک کہ ۵۶ء میں شاہ سعود کے اسٹیج پر بڑے بڑے دم بخود تھے، الا قاضی صاحب کے، بے خوف بے جھجک نہ اس کی بادشاہت کسی خاطر میں تھی اور نہ حالات کا رعب ودبدبہ، وہی کرتا پاجامہ، اس پر اپنی شاندار سوتی شیروانی، ہمیشہ کی طرح اسی کپڑے کی ٹوپی اور وہی جوتا، کوئی رکھ رکھاؤ اور نہ ہی اپنی سادگی سے شرمندہ، بڑے کروفر کی زندگی، اپنے آپ علمی دنیا کے بادشاہ، علم کا سینہ میں موج مارتا ہوا سمندر لئے ہوئے جب تک جیئے، اس شان کے ساتھ اور رخصتی بھی اسی طرح کی ہر علم رکھنے والے کے دل سے زندگی بھر اس شہنشاہ کی یاد کو نکالنا مشکل، ہر ایک ہاتھ دعا کے لیے اٹھا ہوا، ہر چھوٹے بڑے جریدے میں ان کی شایان شان رخصتی کی اطلاع موجود، پورا عالم اسلام باخبر:

موت ایسی کہ کرے جس پہ زمانہ افسوس
ورنہ مرنے کو تو ہر روز مرا کرتے ہیں لوگ

مسعود میاں! میری طرف سے، میرے تمام گھر والوں کی طرف سے اور میرے تمام دوستوں کی طرف سے، آپ تمام خاندان اطہر کی خدمت میں سلام اور سب شرکاء غم ہیں خاندان اطہر کے، اور پورے خلدآباد کی عوام کے ساتھ حاضر ہیں دل وجان کے ساتھ آپ کے غم میں، ہمارے خلدآباد کا ہر شخص جانتا ہے، یہاں دوبار قاضی صاحب اپنے قدموں سے اس زمین کو نوازا ہے۔ مسعود! میری ایک گزارش ہے کہ آپ کی خدمت میں کہ آپ جب بھی قاضی صاحب کے مزار مقدس پر حاضر ہوں تو میرا اسلام ضرور عرض کرنا۔ فقط آپ کے پورے گھر وبھر کو سلام عرض ہے۔

فقط والسلام
آپ کا شریک غم
صدیق احمد
خلدآباد ۴۳۱۱۰۱ ضلع اورنگ آباد، مہاراشٹر

☆☆☆☆☆

محترم والد صاحب قبلہ!

قاضی ظفر مسعود ابن قاضی اطہر صاحب مبارکپوریؒ

ہم سب بہن بھائی والد صاحب کو ''ابا'' کہتے تھے، مگر خط لکھتے تو ''محترم والد صاحب قبلہ'' لکھتے تھے۔ والد صاحب ۱۹۵۰ء تک جن حالات سے گذرے اس کا تذکرہ خود نوشت تذکرہ ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' میں نہایت بلیغ الفاظ ''گریۂ یعقوب اور صبر ایوب'' سے کیا ہے، ہمارے بڑے بھائی مولانا خالد کمال مبارکپوری متوفی ۶ر دسمبر ۱۹۹۹ء (نیوزی لینڈ) بھی والدین کے ساتھ حالات کی بہت سی سنگینیوں سے گذرے تھے۔ مگر مولانا قمرالدین صاحب رسولپوریؒ فرماتے تھے کہ قاضی صاحب ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ میرے بچوں کو یہ احساس نہ ہو کہ ہمارے گھر آج کھانے کو نہیں ہے، ہمارے والدین سخت پریشانیوں سے گذر رہے ہیں اس کے لئے وہ تم لوگوں کو پکوا کر کھلاتے تھے اگرچہ میاں بیوی خود بھوکے رہتے تھے، کہتے تھے کہ میں نہیں چاہتا کہ میرے بچے احساسِ کمتری میں ابھی سے مبتلا رہیں اور ان کی نشو ونما پر اس کا اثر پڑے۔

۱۹۵۰ء کے بعد جب ہم لوگوں نے ہوش سنبھالا تو ہماری ہر جائز ضرورت اور خواہش کو والد صاحب نے پورا کرنے کا اہتمام کیا، کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سادگی اور ایمانداری سے رہنے کی تلقین فرماتے تھے۔ غلط باتوں اور غلط کاموں سے سختی سے روکتے تھے، ہر کسی کے ساتھ اخلاق سے پیش آنے کی تعلیم دیتے اس لئے ہم لوگوں کے ساتھ کبھی کوئی ایسا مسئلہ یا معاملہ پیش ہی نہیں آیا کہ جو قابل ذکر ہوا تنا ضرور ہوا کہ بچپن کی شرارتیں: مثلاً کبھی پڑھنے نہ جانا، نہانے کیلئے تالاب یا پوکھرے میں چلے جانا یا کبھی شکار کیلئے دیہات یا ندی چلے جانا کسی چیز کیلئے ضد کرنا، اس پر والدہ مرحومہ کا ناراض ہونا اور دھمکانا کہ اچھا جب تمہارے ابا آئیں گے تو میں شکایت کر کے تم سب کی خبر لوں گی اور پٹواؤں گی، ہم لوگ کہتے

ٹھیک ہے کہہ دیجئے گا اور جب والد صاحب آتے ...... جو سال میں چند ماہ کیلئے ضروری ہوا کرتا تھا......تو والدہ صاحبہ کسی مناسب موقع سے باری باری سب کے احوال سناتیں، کبھی والد صاحب ضروری سرزنش کرتے، کبھی ہنس کر ٹال دیتے، کبھی ساتھ بازار لیجا کر وہ چیز دلا دیتے جس کیلئے ہم نے ضد کی ہوتی، جب یہ ہوتا تو والدہ صاحبہ خفا ہوتیں کہ آپ بچوں کو اور بگاڑتے ہیں بھلا یہ مجھ سے کیسے ڈریں گے؟ جب آپ خود ہی ان کی ضد پوری کر دیتے ہیں، آپ چلے جاتے ہیں اور یہ سب پریشان مجھے کرتے ہیں، والد صاحب ہنس کر ٹال دیتے اور کبھی کہتے کہ سنو میں سال بھر بمبئی رہتا ہوں چند ماہ کیلئے گھر آتا ہوں اگر ان کی جائز باتوں کو نہ سنوں اور ہر بات پر پھٹکارا کروں تو بھلا یہ کیسے میرے پاس آئیں گے اور مجھے کیسے باپ سمجھیں گے۔ بچے ہیں شرارت تو کریں گے ہی یہ تو ان کا فطری حق ہے جب بڑے ہوں گے انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ پڑھنے لکھنے کیلئے کون سا وقت نکلا جارہا ہے اور دوسروں کے ساتھ بھی یہی شفقت اور محبت آمیز رویہ ہمیشہ رکھتے جس سے ان کی پوری زندگی بھری پڑی ہے۔

کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کے معاملے میں خود تو انتہائی درجہ سادگی پسند کرتے تھے مگر ہم لوگوں کے حق میں اس کے برعکس معاملہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میں نہیں چاہتا کہ میرے بچے کسی ذہنی دباؤ یا احساس کمتری میں مبتلا رہیں یا کسی کے سامنے اپنے کو بے حیثیت محسوس کریں حتی الامکان اپنا کام خود کرنے کے عادی تھے کھانا نہایت سادہ کھاتے تھے کبھی دو سالن ایک ساتھ نہیں کھاتے تھے اگر گوشت روٹی سے کھایا تو چاول پر دال استعمال کرتے تھے اگر کباب رہتا تو ایک آدھ لے لیتے بقیہ اور کوئی سالن یا مرکبات بالکل نہ لیتے اور جب ہم لوگ کہتے کہ ابا یہ بھی ہے تو فوراً کہتے کہ ہاں میں دیکھ رہا ہوں ایک مرتبہ میں نے کہا کہ ابا دسترخوان پر اور چیزیں بھی رہتی ہیں آپ بالکل نہیں کھاتے جس سے ہم لوگوں کو تکلیف بھی ہوتی ہے اور اس کے کھانے میں تکلف بھی، کہنے لگے کہ تم سب اس معاملہ میں میرا بالکل خیال نہ کرو ہمارے محدثین واسلاف کیسی کیسی تکلیفیں اٹھا اٹھا کر اور روکھی سوکھی کھا کر دنیا سے گزر گئے، ہم لوگ ہر دم پیٹ ہی بھرنے کے چکر میں رہتے ہیں۔

غالباً ۱۹۵۸ء کی بات ہے، ہم سب بیٹھے کھا رہے تھے، دادا مرحوم (میانجی محمد حسن متوفی ۷۸ء)

کہا کہ عبدالحفیظ! میں سنتا ہوں کہ بمبئی میں تمہاری بڑی عزت اور شہرت ہے، بچے بڑے ہو رہے ہیں ان کی شادی کیلئے بھی کچھ انتظام کیا ہے؟ کہنے لگے کہ ہاں بابا! آپ نے جو کچھ سنا ہے بالکل صحیح سنا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی دو خاص نعمتوں سے مجھے نوازا ہے ایک عزت دوسرے سکون، اور یہ دونوں نعمتیں وہ اپنے کم بندوں کو ایک ساتھ دیتا ہے۔ اس کو میں کسی صورت میں برباد نہیں کرسکتا، اگر بمبئی سے میں دولت کمانا چاہوں تو میرے چار لڑکے ہیں چاروں کیلئے الگ الگ بنگلہ اور کار کا ایک سال کے اندر انتظام کرسکتا ہوں مگر میں ایسا نہیں کروں گا، میں نے بمبئی میں کسی کی ایک چائے بھی غلط نہیں پی ہے مجھ پر جو شرعی ذمہ داری ہے تعلیم کی، شادی کی، اور روزگار کے ساتھ لگا دینے کی، وہ انشاء اللہ سب پورا کروں گا۔

کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کیلئے ہمیشہ اہتمام سے تاکید کیا کرتے تھے حتیٰ کہ خط میں بھی لکھا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ضرورت کی چیز نہ رہے تو اس کو بازار سے لاکر دیا کرو، وہ کچھ سمجھ کر تمہارے پاس آیا ہے، اگر کوئی ضرورت مند کوئی چیز فروخت کر رہا ہو تو اس کو کبھی مت لینا ورنہ جب بھی اس چیز کو وہ دیکھے گا اسے تکلیف ہوگی۔ بلکہ جو ہو سکے اس کی مدد کر دیا کرو، بمبئی کے متعلق کہتے تھے کہ بمبئی بہت خراب جگہ ہے اور بہت اچھی بھی، میں بچوں کو بمبئی اس لئے نہیں لیجاتا کہ وہاں بننے کا موقع کم ہے اور بگڑنے کا زیادہ، الحمدللہ کہ ہم لوگوں نے بھی کبھی بمبئی میں رہنے کیلئے ان سے نہیں کہا، ہر وہ چیز جو ہم لوگ چاہتے تھے بہتر سے بہتر پہلی فرصت میں بھیج دیا کرتے تھے اس لئے کبھی ہم لوگوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا ہاں کبھی جی چاہا تو گئے اور گھوم گھام کر چلے آئے۔ ہم لوگوں کو خود بمبئی میں اچھا نہیں لگتا تھا۔

۱۹۶۴ء میں جب میں پہلی بار حج کیلئے گیا تو مجھے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ میں کوئی اجنبیت اور پریشانی نہیں ہوئی بلکہ جہاں بھی گئے بھائی صاحب (مولانا خالد کمال) کے ساتھ والد صاحب کی وجہ سے لوگ اخلاص اور محبت سے ملتے تھے، اس وقت مکہ مکرمہ میں ایک زبردست عالم اور مجذوب قسم کے بزرگ مولانا عبداللہ زمزمی حرم سے متصل محلہ اجیاد میں رہتے تھے جہاں ہر وقت ملنے والوں کی بھیڑ رہا کرتی تھی، بھائی صاحب کے ساتھ ملنے گیا تو سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمانے لگے کہ اس وقت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی، مولانا قاضی اطہر صاحب

مبارکپوری، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری اور مولانا عبدالحی صاحب مراکشی یہ حضرات دنیائے علم کے چراغ ہیں، پھر بہت بہت دعائیں دیتے رہے، ان کی مجلس میں جو کچھ تحفہ تحائف آتا تھا اسی مجلس میں بانٹ دیتے تھے، مجھے انھوں نے اچار دیا تھا۔

ایک مرتبہ والد صاحب کے ساتھ شبلی منزل گیا تو شاہ معین الدین صاحب کہنے لگے کہ قاضی صاحب آپ ایک صدی پہلے کے لوگوں میں ہیں، ایک صدی کے بعد دنیا میں آئے ہیں، بمبئی اور اطراف واکناف بمبئی کے بہت سے حضرات صرف ملنے اور دیکھنے کیلئے آتے تھے کہنے لگے کہ ایک بار دوپہر میں کمرے میں لیٹا کتاب دیکھ رہا تھا کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا دروازہ کھولا تو انھوں نے کہا کہ میں قاضی اطہر مبارکپوری سے ملنے کیلئے آیا ہوں، والد صاحب نے کہا کہ اندر آیئے اور بیٹھئے! والد صاحب نے کرتہ پہن کر کہا کہ میں ہی قاضی اطہر ہوں تو وہ صاحب کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے کہ آپ مجھے سینے سے لگالیں میں صرف آپ سے ملنے کیلئے احمد آباد سے آیا ہوں۔ ایسے بہت سے واقعات ہیں بمبئی میں تو ہر طبقے اور ہر حلقے کے لوگ اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے کہ قاضی صاحب ہمارے یہاں آتے ہیں، یا آئے تھے، اور اس کا نہایت انشراح اور تشکر سے اظہار بھی کرتے تھے۔

بمبئی کی مشہور سماجی شخصیت، دیندار مخیّر تاجر اور مہاراشٹر میں مسلم بچوں اور بچیوں کی عصری ودینی تعلیم کیلئے درد رکھنے والے اور کام کرنے والے حاجی عبدالغنی صاحب اطلس والا ایک بار کہنے لگے کہ قاضی صاحب کا بمبئی میں یہ حال تھا کہ قاضی صاحب آگے آگے اور بمبئی ان کے پیچھے پیچھے چلتی تھی مگر قاضی صاحب مرحوم اپنے پیروں سے بمبئی کو جھٹک جھٹک کر چلتے تھے، اسی سفر میں بمبئی کے ایک اور مشہور دیندار اور نوجوان مخیّر تاجر...... جو بلاشبہ اپنی دولت دینی ترجیحات پر خرچ کرتے ہیں...... کہنے لگے کہ اگر قاضی صاحب مجھ سے پچاس لاکھ روپیہ مانگتے تو میں انھیں بخوشی دے دیتا اور اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا اور کبھی واپسی کا خواہشمند نہیں ہوتا، ایسے بہت سے لوگ تھے جو یہ خواہش رکھتے تھے کہ قاضی صاحب کبھی خدمت کا موقع دیں اس کا اظہار بھی کیا کرتے تھے، جیسے سیٹھ عبدالستار صاحب احمد عمر مل والا، زنیل علی رضا مشہور جوہری وغیرہ وغیرہ ایک بار کہنے لگے کہ میں انقلاب کے دفتر میں تھا زنیل علی رضا جوہری کے سکریٹری کا فون آیا کہ

اگر قاضی اطہر مبارکپوری موجود ہوں تو کہئے کہ انھیں زنیل علی رضا صاحب یاد کر رہے ہیں ملاقات کرلیں، والد صاحب نے کہا کہ آپ کہہ دیں کہ اگر زنیل علی رضا بھائی اپنی دولت میں بڑے ہیں تو قاضی اطہر اپنے علم میں بڑے ہیں اگر انھیں ضرورت ہے تو میرے پاس آئیں، سعودی فرمانروا شاہ سعود انھیں چچا کہتے تھے۔

مولانا مختار احمد صاحب ندوی صدر جماعت اہل حدیث جن کا مستقل قیام بمبئی میں ہے، اپنے مجلّہ البلاغ اکتوبر ۱۹۹۶ء میں ''آہ! قاضی اطہر مبارکپوری'' کے عنوان سے لکھتے ہیں'' قاضی صاحب نے کبھی اپنے علم کا رعب نہیں جمایا، اور نہ اپنے خداداد علم کو دنیا کی پونجی بنایا، وہ چاہتے تو علم کی جس بلندی پر تھے دنیا ان کے پیچھے پیچھے دوڑتی اور زینہ بزینہ اس سے زیادہ مادی ترقی کے مینار پر ان کو پہونچا دیتی۔ قاضی صاحب ایک مثالی انسان تھے انھوں نے بمبئی کے سیٹھوں کو کبھی منہ نہیں لگایا یا کسی کے پاس اپنی یا اپنی اولاد کی کوئی ضرورت لے کر نہیں گئے، انتہا درجہ کے خوددار، غیرت مند اور حساس آدمی تھے، قناعت اور صبر وتحمل ان کی عادت تھی،

مسٹر ہاشم احمد چوگلے جو گیارہ سال تک انقلاب کے شعبۂ اشتہارات سے منسلک رہے ،۱۹؍جولائی ۱۹۹۶ء کے انقلاب میں ''قاضی صاحب کی بھی کیا ہستی تھی'' کے عنوان سے لکھتے ہیں'' قاضی صاحب ۶۔۷ مہینوں کے بعد انقلاب کے دفتر آیا کرتے تھے تو ہم لوگ خصوصی طور پر قاضی صاحب سے مصافحہ کرتے اس دوران کمپنی کا کیشیر قاضی صاحب کے پیچھے پیچھے رہتا تھا اور پچھلے ۶۔۷ ماہ کی تنخواہ پیش کرتا تھا ہم نے وہ منظر بھی دیکھا ہے کہ قاضی صاحب ان روپیوں کو ایسی بے دردی سے اپنے ہاتھوں میں لئے رہتے تھے کہ جیسے یہ کوئی بہت گھٹیا چیز ہو اللہ ایسے دیندار مخلص عالم کی مغفرت فرمائے۔ آمین

مسٹر اے اے خاں (عبد العزیز خاں) جو ایک دیندار اور مخلص سیاسی اور سماجی شخص ہیں ہمیشہ بمبئی شہر کی کانگریس پارٹی کے صدر رہے اور جمعیۃ علماء سے ان کا خصوصی تعلق رہا، ۱۰؍مئی کے انقلاب میں ''کیسے کیسے لوگ یہاں آکر چلے گئے'' کے تحت لکھتے ہیں'' قاضی صاحب ایک دن صبح صبح میرے غریب خانہ پر تشریف لائے اور عظیم المرتبت عالم دین کی مجھ بے حیثیت شخص کے گھر تشریف آوری یقیناً تعجب کی بات تھی، میں نے ادب سے گفتگو شروع کی تو قاضی صاحب فرمانے

لگے کہ بھائی میں ایک علمی آدمی ہوں یہ جماعتی کام میرا نہیں ہے اس عہدۂ صدارت کو قبول کر کے میں ایک الجھن محسوس کر رہا ہوں تم زندگی بھر جمعیۃ علماء میں رہے ہو یہ میرا کام بھی عارضی طور سے تمہیں سنبھالو میں نے کہا کہ حضرت جمعیۃ میں تو سبھی آپ کا احترام کرتے ہیں اور آپ کا نام جمعیۃ کے نام سے مہاراشٹر میں بڑا ہے''

یہ چند باتیں اس لئے لکھدیں کہ پوری بمبئی ان کے لئے آغوش کھولے ہوئے تھی مگر انھوں نے علم دین کو دنیا کی پونجی نہیں بنایا اور اس پر پوری استقامت سے قائم رہے۔

۱۹۷۸ء میں چوتھے حج کے بعد ممالک عربیہ کے دورہ کے سلسلے میں پہلی منزل ریاض پہونچے تو ہر علمی مجلس اور حلقے میں آنا جانا اور ملنا جلنا رہا، ہمارے بڑے بھائی مولانا خالد کمال مبارکپوری بھی ساتھ ساتھ رہتے تھے کہنے لگے کہ ایک دن دارالافتاء میں گئے تو شیخ بن باز وغیرہ نے پُر جوش خیر مقدم کیا، آفس میں کسی سعودی نے کہا کہ مگر یہ اتنے بڑے عالم معلوم نہیں ہوتے ہیں، کہاں سے تعلیم حاصل کی ہے، تو شیخ بن باز کے سکریٹری شیخ لقمان سلفی نے برجستہ جواب دیا کہ تم پوچھتے ہو کہ کہاں تعلیم حاصل کی ہے، اگر ان کی کتابیں تمہارے سر پر رکھ دی جائیں تو تمہارا سر پھٹ جائے گا اور اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔

بھائی صاحب بیان کرتے ہیں کہ قاہرہ میں تو اس سے بھی دلچسپ واقعہ پیش آیا، میدان عتبہ میں جو قاہرہ کا بھنڈی بازار ہے ایک مکتبہ میں ہم لوگ گئے، والد صاحب نے اپنی کتاب ''رجال السند والہند'' طلب کی تو صاحب مکتبہ نے ڈھونڈ کر کتاب نکالی اور سامنے رکھ دی، والد صاحب نے قیمت معلوم کی تو ۵/ پونڈ مصری بتلایا، والد صاحب نے کہا کہ قیمت تو آپ زیادہ مانگ رہے ہیں اس پر تو قیمت بہت کم درج ہے، مالک مکتبہ نے یہ کہتے ہوئے کتاب لے لی کہ یہ آپ کے مطلب کی نہیں ہے کوئی اور کتاب دیکھئے، ہمارے پاس جب ریسرچ اسکالر آتے ہیں تو دس پونڈ دے کر لے جاتے ہیں، بھائی صاحب نے والد صاحب کا کارڈ نکال کر اس کی میز پر رکھ دیا اب وہ کبھی کارڈ پڑھے کبھی والد صاحب کی طرف دیکھے کبھی بھائی صاحب کی طرف، وہ حیرت زدہ تھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ واقعی کتاب کا مصنف اگر موجود ہے تو ان میں باپ کون ہے اور بیٹا کون؟ جب بھائی صاحب نے تفصیل سے سب بتایا تو اس نے آس پاس کے مکتبہ والوں کو

بلایا اور کہا کہ یہ عجوبہ دیکھو اس کتاب کا مصنف ہمارے سامنے موجود ہے ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ پچھلی صدی کے کوئی بہت بڑے ہندی عالم گذرے ہیں ان کی یہ تصنیف ہے پھر انھوں نے بہت شاندار دعوت کی ۔ والد صاحب اور بھائی صاحب میں اس قدر مشابہت تھی کہ روز کے ملنے جلنے والے دور سے دیکھتے تو یہی سمجھتے کہ قاضی صاحب آرہے ہیں یا جارہے ہیں ، ایک مرتبہ بھائی صاحب جدہ سے بمبئی کیلئے چلے اس جہاز پر مدینہ منورہ کے دونو جوان جو پہلی مرتبہ ہندوستان آرہے تھے سوار ہوئے ، بھائی صاحب نے کہا کہ تم پہلی مرتبہ بمبئی چل رہے ہو میں حتی الامکان بمبئی میں سہولتیں پہونچانے کی کوشش کروں گا جب کسٹم میں آئے تو والد صاحب بھی چند احباب کے ساتھ ہوائی اڈے پر بھائی صاحب کو لینے پہونچے تھے ، جب اندر سے بھائی صاحب نے کہا کہ دیکھو میرے والد صاحب مجھے لینے آگئے ہیں تو وہ کہنے لگے کہ ہم سنا کرتے تھے ہندوستان جادو اور شعبدوں کا ملک ہے آپ نے تو یہیں سے جادو دکھانا شروع کردیا خود یہاں موجود ہو اور وہاں اپنے کو دکھلا کر کہتے ہو کہ دیکھو میرے والد صاحب ہیں ۔

۱۹۷۸ء والے سفر کی واپسی میں اُردن سے براہ ٹیکسی جب سعودی عرب میں تبوک کی کسٹم چوکی سے داخل ہوئے تو کسٹم آفیسر بار بار پاسپورٹ دیکھتا اور والد صاحب کی طرف دیکھتا پھر میری (مولانا خالد کمال) طرف بھی دیکھتا ، میں سمجھ گیا کہ معاملہ یہاں بھی کچھ ہے ، چنانچہ استفسار پر بتلایا کہ کچھ دنوں قبل اسی راستے سے بیروت سے کتابوں کا بنڈل مدینہ منورہ گیا ہے اور اس پر تحشیہ و تعلیق کرنے والے کا نام غالبًا یہی تھا تو کیا واقعی یہی صاحب ہیں تو بھائی صاحب نے بتلایا کہ ہاں یہی قاضی اطہر مبارکپوری ہیں وہ کتاب ''جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول'' جسے مکتبہ نمنکانی مدینہ منورہ نے بیروت میں چھپوا کر منگوایا تھا ، پھر اس کسٹم آفیسر نے نہایت اخلاص اور محبت کا معاملہ کیا اور خاطر تواضع کرکے رخصت کیا ۔

۱۹۸۴ء میں جب صدر جمہوریہ ایوارڈ ملا تو اطلاع آئی کہ ایک شخص کے ساتھ ہوائی جہاز یا فرسٹ کلاس ایرکنڈیشن سے دہلی تشریف لائیں ، ٹھہرنے کیلئے فلاں ہوٹل میں انتظام کیا گیا ہے ، سفر کے جملہ اخراجات متعلقہ شعبہ ادا کرے گا ۔ میں بھی والد صاحب کے ساتھ گیا والد صاحب نے سکنڈ کلاس سے سفر کیا ، ہوٹل میں دو آدمیوں کا کھانا آتا تھا تو بیرے سے والد صاحب نے

دوسرے وقت ہی کہہ دیا کہ تم صرف ایک آدمی کا کھانا لایا کرو سب خراب ہوتا ہے۔ پروگرام کے بعد جب واپسی ہونے لگی تو متعلقہ شعبہ کا آدمی آیا کہنے لگا کہ مولانا جو کچھ اخراجات آمدورفت کے ہوں آپ بلاتکلف بتلادیں تاکہ اس کی ادائیگی کی جاسکے، والد صاحب نے کہا کہ لگ بھگ بارہ سو روپیہ خرچ ہوگا، اس نے کہا کہ مولانا سوچ لیں اگر کچھ بھول رہے ہوں تو یاد کرلیں، تب والد صاحب نے کہا کہ میاں لگ بھگ آنے میں چھ سو روپیہ خرچ ہوا ہے جانے میں بھی اتنا ہی خرچ ہوگا میں نے اسی لئے بارہ سو روپیہ بتلادیا اس نے نکال کردیا اور کہا کہ میرے علم میں یہ اب تک کا سب سے کم خرچ ہے جو آپ لے رہے ہیں لوگ تو بہت زیادہ وصول کرتے ہیں۔ والد صاحب کہنے لگے کہ اگر خدانخواستہ میں زیادہ لیتا تو یہ کہتا کہ یہ مولوی لوگ ہیں جو زیادہ لیتے ہیں۔

اسی طرح سفر پاکستان کے دوران ڈاکٹر نذیر احمد صدر شعبہ فاسی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور والد صاحب ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں ٹھہرے تھے تو وہاں بھی مستقل ایک ہی آدمی کا کھانا منگاتے تھے اور دونوں حضرات کیلئے کافی ہوجاتا تھا۔

دوسری مرتبہ ۱۹۸۶ء میں جب پاکستان کا سفر کیا تو واپسی پر کہنے لگے کہ مجھے پاکستان میں رہنے کیلئے باقاعدہ پیشکش کی گئی اور بنگلہ، کار اور وظیفہ کی سہولت فراہم کرنے کیلئے کہا گیا مگر میں نے انکار کردیا،

والد صاحب کہتے تھے کہ میں انقلاب میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ تو اپنے بچوں کی پرورش اور دنیا کمانے کیلئے لکھتا ہوں مگر جو کتابیں لکھتا ہوں وہ علم دین کی خدمت کیلئے اور اپنی آخرت کیلئے کرتا ہوں اس لئے اس پر پیسہ یا رائلٹی نہیں لیتا ہوں، جب پاکستان اور قاہرہ میں رائلٹی کی بات آئی تو یہ کہتے ہوئے صاف انکار کردیا کہ جب میں نے اپنے ملک میں رائلٹی نہیں لی تو غیر ملک میں کیا لوں گا یہ میری طرف سے اہل پاکستان کیلئے علمی تحفہ سمجھا جائے۔

میں نے والد صاحب کے ساتھ تقریباً پورے ہندوستان کا سفر کیا ہے جلسوں اور کانفرنسوں میں آیا گیا ہوں، بلاشبہ پورے ہندوستان میں بلاکسی تفریق وامتیاز ہر مکتبہ فکر، ہر جماعت اور ہر گروہ کے ہر قسم کے پڑھنے لکھنے والے اہل قلم واہل علم حضرات سے ملنا جلنا رہا چاہے وہ مدرسہ کے مولانا ہوں یا کالج کے مسٹر، سب والد صاحب سے نہایت احترام واکرام سے ملتے تھے اور اپنے کو بے مایہ بنا کر پیش کرتے تھے جبکہ والد صاحب ہر چھوٹے بڑے سے اس کی

حیثیت کے مطابق ادب ولحاظ سے پیش آتے تھے۔
۱۹۶۸ء میں علی گڈھ کے سیمینار میں میں بھی ساتھ تھا، والد صاحب، مولانا وحیدالدین خاں صاحب اور مفتی ظفیر الدین صاحب دیوبند، یہ لوگ مولانا تقی امینی صاحب ناظم دینیات کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے، مولانا وحیدالدین خان کہتے تھے کہ قاضی صاحب میرے سفر علی گڈھ کا حاصل یہ رہا کہ میں آپ کو سمجھ سکا، جب کسی معاملہ میں وہ کسی انگریز کا حوالہ دیتے تو والد صاحب ٹوکتے کہ خان صاحب ہمارے اکابر میں فلاں صاحب نے اس معاملے میں یہ بات کہی ہے اس کا حوالہ کیوں نہیں دیتے، سیمینار میں تقریر کے دوران والد صاحب نے یہ کہا کہ میں نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ پتھر کی لکیر ہے، وہ سند ہے، اس کو کوئی کاٹ نہیں سکتا تو اجلاس کے بعد پروفیسروں اور اساتذہ نے گھیر لیا کہ قاضی صاحب آپ یہ سب لائے کہاں سے ہیں؟ تو والد صاحب نے کہا کہ پڑھئے سب کچھ اسی میں ملے گا۔
اسی سفر میں جب مرادآباد پہونچے تو مدرسہ شاہی نے اپنے اس پرانے طالب علم کا شاندار استقبال کیا، اس وقت فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین صاحبؒ موجود تھے انھوں نے دوپہر میں دعوت کی، جب ہم لوگ پہونچے تو باہری دالان میں پلنگ پر بیٹھے انتظار فرما رہے تھے والد صاحب کو سرہانے بیٹھانا چاہا والد صاحب نے کہا کہ حضرت کیسے ممکن ہے کہ آپ کا شاگرد آپ کے سامنے اس طرح بیٹھے، میں جو کچھ ہوں آپ حضرات کی جوتیاں سیدھی کرنے ہی کے طفیل تو ہوں، مولانا نے دوسرا پلنگ منگوا کر برابر بچھوایا اور اس پر اپنے شاگرد کو اپنے سامنے سرہانے بیٹھایا۔ اللہ اللہ یہ ہے بزرگوں کا انداز! فرمانے لگے کہ مجھے طالب علمی کے زمانے میں ہی یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ آپ آگے چل کر اپنے سلسلے کے بزرگوں کا نام روشن کریں گے۔ والد صاحب نے کہا کہ حضرت میں بھی آپ کا شاگرد ہوں اور میرے دولڑکے خالد کمال اور سلمان مبشر بھی، یہ تیسرا لڑکا (احقر ظفر مسعود) کیوں محروم رہے اس کو بھی سندِ حدیث عنایت فرمادیں تا کہ یہ بھی آپ کے سلسلے میں داخل ہوجائے، کہنے لگے ٹھیک ہے دیوبند آرہے ہیں انشاء اللہ وہاں دیدوں گا، ہم لوگ دیوبند پہونچے تو سند عطا فرمائی جو آج میرا سرمایۂ حیات ہے۔
اسی سفر میں جب دہلی پہونچے تو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے یہاں ندوۃ المصنفین

میں قیام رہا، مولانا فارقلیط مرحوم نے دعوت کی جب ساتھ چلے تو مولانا بار بار پیچھے ہوجاتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ آگے آگے چلیں میں راستے کی نشاندہی کرتا رہوں گا، آخر ایسا کرنا پڑا جب وہ کسی صورت سے آگے چلنے کیلئے تیار ہی نہ ہوئے،

جب دہلی سے واپس ہونے لگے تو بیڈنگ مفتی صاحب نے اٹھالی والد صاحب نے کہا کہ یہ لڑکا ظفر مسعود اٹھالے گا آپ زحمت نہ کریں مگر مفتی صاحب کسی صورت سے بیڈنگ دینے کیلئے تیار نہیں ہوئے میں نے بھی بہت کہا تو مفتی صاحب نے آخر میں یہ کہا کہ قاضی صاحب یہ بیڈنگ سڑک تک تو میں ہی لے کر چلوں گا آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ اللہ اپنے بزرگوں کا یہ تھا اخلاص اور اخلاق۔

اس بات کو میں مشہور ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی کے اس انٹرویو پر ختم کرتا ہوں جسے روزنامہ راشٹریہ سہارا نے اپنے سنڈے ایڈیشن ۲۲؍مئی ۲۰۰۰ء میں شائع کیا ہے۔

’’ہندوستان میں مسلمانوں کے دو اسکول چلے ایک شبلی کا دوسرا سرسید کا، شبلی نیشلسٹ اور سرسید خان بہادر، میں خود کو شبلی کا پیرو سمجھتا ہوں، اسلام میں انسانیت کو سمیٹنے کی جو خوبی ہے، شبلی میں وہ خوبی پوری طرح ملتی ہے۔ شبلی کی یہ خوبی ان کے ہم وطن قاضی اطہر مبارکپوری میں بھی ملتی ہے، قاضی اطہر مبارکپوری کی نثر پر شبلی کی پوری چھاپ ہے،‘‘

اب آخری وقت کے کچھ حالات بھی سن لیجئے، ۱۲؍جولائی بروز جمعہ فجر کے بعد کہنے لگے کہ رات پانچ چھ بار کرک کے ساتھ پیشاب ہوا ہے جس کی وجہ سے تکلیف بڑھ گئی ہے کپڑے بدلے اور ارادہ کیا کہ جمعہ پڑھنے جامع مسجد چلنا ہے مگر عین وقت پر بارش ہونے کی وجہ سے مسجد نہ جاسکے، منہ کا مزہ بالکل خراب ہوگیا تھا کھانے کی اشتہاء بالکل نہیں تھی، پھر بھی دوپہر اور شام میں تھوڑا تھوڑا کھایا۔ ۱۳؍جولائی کی صبح کو بالکل ہلکا ناشتہ کیا اور کہنے لگے کہ کھانے کی اشتہاء بالکل نہیں ہے کمزوری بہت زیادہ محسوس ہورہی ہے جس کی وجہ سے پورے بدن میں درد ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا وقت آگیا ہے، دن میں صرف دوبار موسمّی کا جوس لیا کمزوری کی وجہ بے خبری میں رہتے تھے مگر جب کوئی بات کرتا تو پوری توجہ اور ہوش سے بات کرنے لگتے، دوائیں وغیرہ چلتی رہیں ۱۴؍جولائی کو فجر کی نماز کے بعد اطمینان سے بیٹھے ایک انڈا نیم برشت زبردستی کھایا

کہتے تھے کہ قطعاً کھانے کی کوئی اشتہاء نہیں ہے بدن میں بالکل طاقت نہیں ہے، اب میرا وقت آ گیا ہے دیکھو میں نے بڑی تکلیفیں اٹھا اٹھا کر یہ علمی خزانہ جمع کیا ہے اگر تم سب اس کی حفاظت نہ کر سکنا تو اس کو دارالعلوم دیوبند یا مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کو دیدینا تا کہ اس سے افادہ کا سلسلہ قائم رہے، تمہاری ماں اور بہنیں ہیں انھیں کوئی تکلیف نہ ہو رشتہ داروں اور مہمانوں کا خیال رکھنا اور اس گھر کی روایت کو باقی رکھنا اب میری زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں کسی وقت کوئی بات ہوسکتی ہے میں اور حسان احمد رونے لگے اور کہنے لگے کہ نہیں ابا ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ ڈاکٹروں کے مطابق ٹھیک ہیں کہنے لگے کہ سب ٹھیک ہے مگر میں اس کو سمجھتا ہوں نہایت اطمینان سے یہ سب باتیں کرتے رہے، دوپہر تک کافی کمزوری بڑھ گئی ظہر کی نماز کیلئے بار بار کہتے رہے تیمّم کیا مگر کمزوری کی وجہ سے قعدہ میں بیٹھ نہیں سکے پھر لٹا دیا گیا، پانچ بجے پھر کہا کہ نماز پڑھوں گا کہا گیا کہ لیٹے لیٹے پڑھ لیں کہنے لگے کہ لیٹے لیٹے کیوں پڑھوں نیچے جاءنماز بچھاؤ میں نیچے بیٹھ کر نماز پڑھوں گا نیچے اتارا گیا مگر کمزوری کی وجہ سے بیٹھ کر نماز ادا نہ کر سکے، پھر مغرب کے وقت بھی بار بار اٹھنے کی کوشش کرتے رہے اس کے بعد سے نیم بے ہوشی کی حالت میں رہے، جیسے جیسے وقت گذرتا رہا بیہوشی اور نقاہت بڑھتی گئی سانس کی رفتار کچھ تیز ہوگئی اسی حال میں علم وعمل کا یہ روشن مینارہ تاریخ اسلام کا نیر تاباں جو خطۂ اعظم گڈھ سے چمکا اور نصف صدی اپنی علمی و دینی تحقیقی و تاریخی ضیاپاشیوں سے سارے عرب وعجم کو منور کرتا رہا ''کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَان'' کا اطلاق اس پر بھی ہو کر رہا آخر ۲۸ر صفر ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۴ر جولائی ۱۹۹۶ء بروز یکشنبہ شب میں ۹ بج کر ۵۵ منٹ پر تاریخ اسلام کا یہ روشن آفتاب غروب ہوگیا۔ اناللہ و اناالیہ راجعون

دوسرے دن دوشنبہ کو ساڑھے بارہ بجے دن میں میت کو غسل کیلئے نکالا گیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی نہا کر سوئے ہیں اٹھ بیٹھیں گے، مردنی کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہو رہا تھا پورا بدن روئی کی طرح نرم، چہرہ تو ایسا روشن کہ ہر شخص کی زبان پر یہی کلمہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کے عمل کی بشارت دنیا ہی میں سب کو دکھادی۔ سوا تین بجے نماز جنازہ مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ بنارس نے پڑھائی اور ساڑھے تین بجے میت قبر میں اتاری گئی اور تدفین عمل میں آئی، ؎ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

درویش صفت عالم مولانا قاضی اطہر مبارک پوری

چند مشاہدات وتأثرات

مولانا نورالحسن راشد صاحب کاندھلوی مدظلہٗ
مدیر مجلّہ ''احوال وآثار'' کاندھلہ ضلع مظفرنگر (یوپی)

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کا نام ان محترم شخصیات میں سے ایک محترم نام ہے جن سے کہا جا سکتا ہے کہ نوعمری سے واقفیت ہے، قاضی صاحب کا نام سب سے پہلے کب سنا اور ان کے مضامین سے استفادہ کا پہلا موقع کب آیا اس کا سن تو یاد نہیں مگر نوعمری کی بات ہے میرے تائے ابا مولانا اظہارالحسن صاحب کاندھلوی (جو بعد میں مرکز تبلیغ نظام الدین چلے گئے مرکز کے بڑے استاذ حدیث اور نگراں تھے ۲۷ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ۔۱۳ اگست ۱۹۹۶ء کو وفات ہوئی) کے پاس کبھی کبھی ماہنامہ البلاغ کا تازہ شمارہ رکھا ہوا نظر آتا تھا اس وقت ان رسالوں کے مضامین کو سمجھنے کا بھی شعور نہ تھا اور بڑوں کی طرف سے رسالے اور غیر ضروری چیزیں پڑھنے پر سخت پابندی بھی تھی مگر چوری چھپکے کسی نہ کسی طرح ان رسالوں کی ورق گردانی کر ہی لیتا تھا۔ جہاں تک یاد ہے قاضی صاحب کا نام نامی سب سے پہلے البلاغ ہی کے ذریعہ سامنے آیا پھر آہستہ آہستہ قاضی صاحب کے مضامین اور تحریروں سے دلچسپی اور ان کی ذات گرامی سے عقیدت بڑھتی رہی لیکن تعلیم کے لئے مظاہر علوم سہارن پور تک جانے تک قاضی صاحب کی کوئی کتاب باقاعدہ پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ سہارن پور میں اگرچہ طلبہ پر خارجی مطالعہ کی سخت پابندی تھی مگر چونکہ حضرت شیخ اور مولانا احتشام الحسن صاحب کے یہاں بیسوں رسالے آتے تھے کبھی کبھی ان میں سے چند رسائل کی کسی نہ کسی طرح سے ورق گردانی یا ان پر اچٹتی سرسری نظر ڈالنے کا موقع مل جاتا تھا اسی وقت سے قاضی صاحب کی تحریریں اور مضامین کسی قدر توجہ سے پڑھنے کا اہتمام کیا اگرچہ صحیح طور پر پڑھنے کا شعور اور ان کی قدر وقیمت کا احساس تو اس وقت بھی نہیں تھا مگر قاضی صاحب کی تحریروں سے ایک انسیت سی ہو گئی تھی اس لئے ڈھونڈ ڈھونڈ کر قاضی صاحب کے مضامین پڑھا

کرتا تھا اور اگر چہ مدرسہ کے طلبہ کا بلا کسی خاص ضرورت کے کتب خانہ میں آنا منع تھا۔ مگر میرا ایک گھنٹہ اسباق سے فارغ تھا وہ کتب خانہ میں گذرتا تھا کتب خانہ مظاہر علوم میں بے شمار کتابیں تھی مگر رہنمائی اور سر پرستی کرنے والا کوئی نہیں تھا جو یہ بتلا تا کہ کیا پڑھنا ہے اور کیا نہیں پڑھنا ہے جو کچھ پڑھنا یا مطالعہ کرنا ہے اس کی کیا ترتیب ہونی چاہئے کن مصنفین کی کون کون سی کتابیں پہلے پڑھنی ہیں اور کس کو بعد میں دیکھنا چاہئے اور ان کتابوں سے زیادہ نفع اٹھانے اور صحیح استفادہ کی کیا تدبیر ہو اس لئے شتر بے مہار کی طرح کبھی یہاں منہ مارتا کبھی وہاں، ایک کتاب نکالی ورق گردانی کی رکھ دی دوسری نکالی چند صفحات پڑھے طبیعت اکتائی اور دفع کر دیا، لیکن اسی دوران بیسوں کتابوں کو اپنے خیال میں اہتمام سے پڑھا جس کی حلاوت اور فائدہ اب تک محسوس ہوتا ہے اسی زمانہ میں جب ایک الماری میں ماہنامہ البلاغ کا تعلیمی نمبر نظر آیا تو دل کی کلی کھل گئی یہ معلوم تھا کہ البلاغ نے اس طرح کا ایک نمبر چھاپا ہے جب وہ نگاہوں کے سامنے آیا تو غیر معمولی خوشی ہوئی اور ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی دولت مل گئی اسی وقت اس کو نکالا اور کبھی یہاں سے اور کبھی وہاں سے دیکھنا پڑھنا شروع کیا، کئی مضامین جو دلچسپ معلوم ہوئے پڑھے۔ قاضی صاحب کی بھی دو تین تحریریں تھیں، اسی وقت سے قاضی صاحب کی اور کتابوں کے مطالعہ کا شوق ہوا اور انہی دنوں میں رجال السند والہند کی پہلی زیارت ہوئی زیارت اس لئے کہ اس کے پڑھنے کی لیاقت نہیں تھی جی چاہتا تھا کی قاضی صاحب کی جو چیزیں ملیں ان کو پڑھ لوں اسی وقت سے جو کچھ جہاں کچھ ملتا رہا اس کی ورق گردانی سے لیکر ابتدا سے آخر تک جیسا موقع ہوا پڑھا۔ یوں قاضی صاحب کی کتابوں کے مطالعہ اور ان سے استفادہ کی تمنا بڑھتی ہی رہی اگر چہ چند ایک کی زیارت سے تو اب تک محروم ہوں۔ جب قاضی صاحب کا کوئی مضمون یا کتاب پڑھتا تو جی چاہتا تھا کہ کاش قاضی صاحب کی زیارت و ملاقات ہوتی اور ان کی مجلس میں بیٹھنے کا موقع ملتا۔ مگر یہ خواہش برسوں تک پوری نہیں ہوئی حضرت شیخ کے یہاں اکثر مشاہیر اہل علم، نامور بزرگ اور مشائخ وقائدین قدم رنجہ فرماتے رہتے تھے بہت سے اکابر وعلماء کو پہلی مرتبہ وہیں دیکھا قاضی صاحب کی تشریف آوری کی کوئی اطلاع نہیں ملی اس لئے زیارت سے محرومی رہی ممکن ہے کسی وقت آئے ہوں مگر چونکہ قاضی صاحب کے مزاج میں بے حد سادگی تھی اور کسی طرح محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ بڑے

عالم مصنف ومحقق ہیں اس لئے ہوسکتا ہے کہ ہم ادنیٰ درجہ کے طالب علموں کو قاضی صاحب کے آنے کی خبر نہ ہوئی ہو قاضی صاحب کبھی کبھی دیوبند تشریف لاتے تھے لیکن اس وقت میرا دیوبند جانا نہ جانے کے برابر تھا ایک دوسال میں ایک آدھ مرتبہ تھوڑی بہت دیر کے لئے حاضری ہوئی اور بس! دیوبند میں دوتین ہم عمروں کے علاوہ کسی سے تعارف بھی نہیں تھا اس لئے اشتیاق کے باوجود قاضی صاحب سے ملاقات کی تمنا دل کی دل میں ہی رہی۔ مظاہر علوم سے آنے کے تین چار سال بعد ایک مرتبہ کسی ضرورت سے دہلی **ندوۃ المصنفین** میں جانا ہوا وہاں حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سے ملاقات کے لئے علماء اور مشاہیر کثرت سے آتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی مجلس جمی ہوئی تھی کسی نے بتایا کہ ان میں قاضی اطہر مبارک پوری بھی ہیں۔ مجلس ندوۃ المصنفین کے برآمدہ میں ہو رہی تھی اور لوگ صحن کی طرف پشت کئے ہوئے تھے غالباً انہیں میں قاضی صاحب بھی تھے یہ جرأت نہ ہوئی کہ آگے بڑھ کر سلام ومصافحہ کرتے دور سے دیکھ کر الٹے قدموں واپس آ گئے، غالباً ڈیڑھ دو گھنٹے بعد اس خیال سے دوبارہ ندوۃ المصنفین گئے کہ جو علماء آئے ہوئے ہیں ان کی قریب سے زیارت ہو جائے اور ان سے سلام ومصافحہ کرلیں مگر وہاں ان میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا معلوم ہوا کہ سب کہیں تشریف لے گئے ہیں کیا کرتے افسوس کے ساتھ واپس آ گئے قاضی صاحب کے مضامین معارف، برہان، الفرقان اور دارالعلوم وغیرہ میں پڑھنے کی توفیق ملتی رہی، مگر قاضی صاحب سے ملاقات کی تمناجوں کی توں باقی رہی بہت عرصہ کے بعد غالباً ۱۹۹۳ء یا ۱۹۹۴ء میں راقم کا لکھنؤ جانا ہوا تو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں غالباً ندوہ کی مجلس شوریٰ کا اجلاس تھا یا کسی نشست میں شرکت کے لئے اکابر علماء کی ایک بڑی جماعت آئی ہوئی تھی اس وقت سنا کہ قاضی اطہر صاحب مبارک پوری بھی تشریف لائے ہوئے ہیں قدرتی طور پر غیر معمولی خوشی ہوئی جی چاہا کہ ابھی جا کر نیاز حاصل کرلوں مگر معلوم ہوا کہ اس وقت کہیں مشغول ہیں ملاقات متوقع نہیں ہے اور ساتھ ہی یہ اطلاع دی گئی کہ قاضی صاحب مہمان خانہ میں قیام فرما ہیں بعد میں وہاں ملاقات ہوسکتی ہے دوسرے وقت مہمان خانہ میں حاضر ہوا تو اس کمرے میں جہاں قاضی صاحب کا قیام تھا دوسرے حضرات بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ندوہ کے طلبہ اور زائرین وشائقین کا مختلف علماء سے ملاقات کے لئے خاصا ہجوم تھا میں یہ دیکھ کر واپس آ گیا دوبارہ پھر جانا

ہوا تو قاضی صاحب مہمان خانہ کے ایک کمرے کے کونے کی آخری چار پائی پر تشریف فرما طلبہ
اور اہل علم کے درمیان گھرے بیٹھے تھے راقم بھی حاضر ہوا اور سب سے پیچھے بیٹھ گیا زیادہ دیر نہیں
گذری تھی کہ قاضی صاحب کو کوئی ضرورت پیش آ گئی اور اچانک مجلس برخاست ہو گئی میں بھی
واپس چلا آیا مگر قاضی صاحب سے جو ملنے کا اشتیاق تھا وہ پھر حاضری کا تقاضا کر رہا تھا اس مرتبہ
جو مہمان خانہ حاضر ہوا تو اکثر مہمانوں کے بستر خالی تھے کہ وہ ندوہ یا شہر میں مدعو یا اپنے کاموں
میں مشغول تھے صرف قاضی صاحب تشریف فرما تھے ایک عالم اور تھے جو اپنی چار پائی پر تھے اس
وقت پہلی مرتبہ قاضی صاحب سے باقاعدہ ملاقات و نیاز حاصل ہوا ایک صاحب ساتھ تھے انھوں
نے قاضی صاحب سے تعارف کرایا قاضی صاحب نے ایسی شفقت و عنایت اور توجہ فرمائی کہ اس
کا دل پر نقش قائم ہو گیا جو امید ہے کہ ہمیشہ باقی رہے گا میں قاضی صاحب کے ارشادات سن رہا
تھا، نگاہیں قاضی صاحب کے لباس سامان اور جوتوں وغیرہ کا جائزہ لے رہی تھیں دل و دماغ محو
حیرت تھے ذہن میں قاضی صاحب کی شخصیت کا جو تصور تھا قاضی صاحب اس سے سراسر مختلف
نکلے، ایسی سادگی، ایسی تواضع ایسی مسکنت اور ایسی محبت جو خال خال نظر آتی ہے قاضی صاحب کی
بات چیت لباس اور طرز معیشت و معاشرت کہیں سے بھی نہیں جھلکتا تھا کہ وہ اتنے بڑے آدمی
ایسے بڑے مصنف عظیم محقق اور برصغیر کی مشہور شخصیت ہیں علم کا خزانہ اپنی تصانیف کی یاددہانی نہ
اپنی تحقیقات کا تذکرہ نہایت سادہ اور بے تکلف اس طرح ملاقات فرمائی کہ جس نے مسخر کرلیا اور
یہ تأثر دیا کہ جیسے قاضی صاحب کو بھی اس حقیر نیاز مند کی ملاقات کا اشتیاق تھا، ملاقات کی پہلی
نشست مختصر رہی قاضی صاحب نے دوبارہ آنے کے لئے فرمایا دوسری ملاقات میں بہت دیر تک
نوازا تقریباً دو پونے دو گھنٹے تک قاضی صاحب کی خدمت میں حاضری رہی اور اس کے بعد سے
پھر مستقل یاد فرماتے رہے خطوط تحریر فرماتے، راقم کی معروضات کا فوراً جواب عنایت فرماتے
جب دیوبند کا سفر ہوتا تو مطلع فرماتے راقم دیوبند حاضر ہوتا اور قاضی صاحب سے تفصیلی ملاقات
اور استفادہ کا موقع ملتا مولانا بدرالدین اجمل صاحب کی عنایت سے دو تین مرتبہ قاضی صاحب
کے ساتھ اسی کمرہ میں قیام ہوا اور سادگی و بے نفسی قاضی صاحب کا مزاج اور طبیعت ثانیہ بن گئی
ہے نہ مسکن اور لباس میں تجمل و تصنع نہ اچھے کھانے کا اہتمام نہ اپنی شخصیت کا اظہار! اہل علم سے

نہایت کشادہ پیشانی اور ایسی تواضع سے ملتے کہ اکثر لوگوں کو شرمندگی کا احساس ہوتا قاضی صاحب کا رویہ کچھ ایسا ہوتا کہ اس سے بعض لوگوں کو اپنے بارے میں غلط فہمی بھی ہوسکتی تھی لیکن قاضی صاحب کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

قاضی صاحب کی عنایت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کی وہ دیو بند کے سفر کے دوران اس نواح میں اپنے نیازمندوں اور رابطہ رکھنے والوں سے ملاقاتیں کرکے خوش ہوتے تھے اور جو لوگ قاضی صاحب سے گذارش کرتے ان کے مدارس کا سفر کرتے جس کے لئے نہ موٹر کی ضرورت تھی نہ زاد راہ اور نذرانہ کا سوال، میں نے بھی ایک مرتبہ کاندھلہ تشریف لانے کی درخواست کی تو اس کو بلا تامل قبول فرمایا اور جلد ہی (اس وقت شیخ الہند اکیڈمی کے رفیق) مولانا عبدالرشید بستوی کے ساتھ کاندھلہ پہونچے، کتابیں اور بزرگوں کے آثار وتحریرات وتبرکات ملاحظہ کئے اور بہت ہی خوش ہوئے خصوصا جب میں نے علامہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی مشہور تفسیر بحر مواج قلمی نسخہ کی دوجلدیں دکھائیں تو قاضی صاحب کی خوشی دیدنی تھی کتاب کے بار بار ورق الٹتے اور کہتے کہ ساری عمر اس کتاب کے دیکھنے کی تمنا تھی آج یہ تمنا پوری ہوئی آج اس کی زیارت نصیب ہوئی اور بعد میں کئی مرتبہ اس کا ذکر کیا اور یہ ارادہ ظاہر کیا کہ میں دو چار دن کے لئے یہاں آکر رہنا چاہتا ہوں تاکہ ان تحریرات وکتابوں کو کچھ تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملے اور فرمایا کہ میرے پاس خاندان ولی اللہ کے علماء کی کتابوں کے چند قلمی نسخے ہیں وہ یہاں زیادہ مناسب رہیں گے، چنانچہ دوبارہ قاضی صاحب تشریف لائے تالیفات ولی اللہ کے تین اہم قلمی نسخے (مجموعۂ فتاوی حضرت شاہ عبدالعزیز جو خود شاہ صاحب کا عطیہ ہے، تفسیر آیت النور اسرار المحبۃ ......شاہ رفیع الدینؒ) عنایت فرمائے۔ راقم سطور نے اس علمی عطیہ کا احوال وآثار میں تذکرہ کیا تو بے حد خوش ہوئے اور اس کے تعارف کی بھی تحسین فرمائی۔ اس درمیان جب قاضی صاحب کی کتاب خیر القرون کی درس گاہیں چھپ کر آئی تو قاضی صاحب نے ہدایت کی کہ احوال وآثار میں اس پر تبصرہ آنا چاہئے۔ راقم نے اس ہدایت کی تعمیل میں تبصرہ لکھا۔ اس کتاب میں حضرت ربیعۃ الرائے کا مشہور قصہ بھی شامل تھا جس میں ربیعۃ الرائے کے والد کی ستائیس سال کے بعد خدمت دین اور جہاد سے گھر واپسی اور گھر کے دروازہ پر ربیعۃ الرائے سے ملاقات اور ان سے اختلاف کا تذکرہ

تھا۔ راقم نے اس مشہور قصہ کے غلط اور بے بنیاد ہونے کا ذکر کیا۔ قاضی صاحب نے تبصرہ پڑھا اور پسند کیا، اس وقت قاضی صاحب کے بڑے پن کا ایک اور نمونہ سامنے آیا۔ قاضی صاحب نے اسی وقت شیخ الہند اکیڈمی کو خط لکھا اور ہدایت کی کہ اس کتاب کی آئندہ اشاعت میں سے یہ روایت نکال دی جائے۔ قاضی صاحب اس نواح میں جب بھی تشریف لاتے راقم دیوبند حاضر ہوتا۔ قاضی صاحب کے آخری سفر تک ہر ایک موقع پر قاضی صاحب سے ملاقات و استفادہ کا شرف حاصل رہا۔

قاضی صاحب کی صحت ماشاءاللہ بہت اچھی تھی لیکن ناک میں تکلیف کی کچھ شکایت تھی اس کے علاوہ کوئی اور بیماری یا تکلیف ایسی نہیں تھی کہ جس سے عام صحت متاثر ہوتی اور زندگی کے سفر سے اختتام کا کوئی خطرہ محسوس ہوتا لیکن جب وقت آجاتا ہے تو اس کے اسباب بعض مرتبہ غیر محسوس طریقے پر اثر انداز ہوجاتے ہیں۔ قاضی صاحب کی ناک کی یہ تکلیف اچانک بڑھ گئی، ڈاکٹروں کے مشورہ پر ناک کے آپریشن کا فیصلہ کیا گیا جس سے وقتی طور پر کچھ افاقہ سا محسوس ہوا، لیکن چند دنوں کے بعد یہی تکلیف زیادہ شدت سے حملہ آور ہوئی اور یہی مرض وفات ثابت ہوئی۔

لکھنؤ میں ملاقات کے بعد قاضی صاحب سے مستقل رابطہ تھا، راقم عریضہ لکھتا فوراً جواب سے نوازتے، کبھی کبھی خود بھی یاد فرماتے، خطوط کا اہتمام سے فوراً جواب دینے کا معمول تھا۔

راقم سطور کی قاضی صاحب سے مراسلت کوئی بہت زیادہ نہیں رہی میرے نام قاضی صاحب کے کوئی چودہ یا پندرہ گرامی نامے صادر ہوئے۔ آخری خط وفات ۱۴؍ جولائی ۱۹۹۶ء سے ایک مہینہ پہلے ۱۲؍ جون ۱۹۹۶ء کا لکھا ہوا ہے اس کے بعد افسوس صد افسوس کہ:

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

☆☆☆☆☆

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

از ضیاءالدین اصلاحی، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

(۱)

میں مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے نام نامی سے اس وقت سے واقف ہوں جب میں نے اخبار ورسالے پڑھنا شروع کیا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۴۹ء یا ۱۹۵۰ کا زمانہ تھا، میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ۱۹۵۲ء میں پہلی مرتبہ انہیں موضع بمہور میں اس وقت دیکھا جب مئی کے مہینہ میں گرمی کی شدت اور تپش کی وجہ سے مغرب بعد وہ شہرۂ آفاق مصنف وعالم مولانا امین احسن اصلاحی صاحب تدبر قرآن سے ملنے کے لئے ان کے دولت کدہ پر آئے تھے، مولانا اصلاحی ان دنوں پاکستان سے اپنے والد بزرگوار کی وفات کے بعد اپنے آبائی وطن تشریف لائے تھے، میں بھی انہیں سے ملنے کے لئے گیا تھا اور پہلے سے وہاں موجود تھا۔

یہ میرے لڑکپن کا واقعہ ہے جس پر طویل عرصہ گزر جانے کی وجہ سے اب یہ بالکل یاد نہیں رہا کہ قاضی صاحب کے ہمراہ دو اور بزرگ کون تھے اور مولانا اصلاحی سے ان حضرات نے کن امور ومسائل پر گفتگو کی تھی۔ بعد میں قاضی صاحب سے اس کا تذکرہ آیا تو انہوں نے فرمایا کہ غالباً مولوی شمس الدین صاحب نائب ناظم جامعہ احیاء العلوم رہے ہوں گے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد جب قاضی صاحب نے جانے کی اجازت چاہی تو مولانا امین احسن صاحب نے شب میں قیام کرنے اور رات کے کھانے کیلئے اصرار کیا مگر قاضی صاحب نے معذرت کی کہ ہم لوگ تو صرف نیاز حاصل کرنے آئے تھے۔ مولانا اصلاحی نے فرمایا ''اجی حضرت میں تو خود نیاز مند ہوں''

(۲)

بات آئی گئی ہوئی اور پھر برسوں قاضی صاحب سے ملاقات کی نوبت نہ آئی۔ جب مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں تعلیم مکمل کر کے ۱۹۵۷ء میں دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی سے میری

وابستگی ہوئی تو یہاں قاضی صاحب کی برابر آمد ورفت رہتی تھی۔اس طرح یہاں ان سے بار بار ملاقات ہوتی اور تعلقات بھی رفتہ رفتہ بہت بڑھ گئے ،ایک زمانے میں ان کا یہ معمول ہوگیا تھا کہ سال میں کسی نہ کسی بہانے ہم نیازمندوں کو اپنے دولت کدہ پرضرور بلاتے اور بڑی پر تکلف اور وسیع دعوت کرتے ،اس طرح راقم کو ان کی سیرت وشخصیت سے اچھی طرح واقفیت ہونے اور انہیں قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا پورا موقع ملا،میرے علم ومشاہدہ میں ان کی ہمدردی، دل نوازی،شرافت،مہر ومروت اور اخلاق وسیرت کے جو تابناک جلوے نظر آئے ہیں پہلے انہی کو دکھانے کی کوشش کرتا ہوں۔

(۳)

قاضی صاحب ایک بے لوث ،شریف النفس اور پاک طینت شخص تھے،ان کی زندگی سادہ اور تکلفات سے بری تھی ،ان کا دل نرمی،مروت،اخلاص ومحبت کا وہ آئینہ تھا جو تملق ،خود غرضی ،منافقت ،ریا،رشک وحسد،بغض ونفرت اور کینہ وکدورت کے گرد وغبار سے زنگ آلود نہیں ہوا تھا، جو کچھ ان کے دل میں ہوتا تھا وہی زبان پر بھی آتا تھا،ان کی گفتگو بناوٹ اور تصنع سے خالی اور ان کا عمل ظاہرداری اور نمائش کی آلائشوں سے پاک تھا،ان کی کسی ادا سے رعونت یا پندار کا اظہار نہیں ہوتا تھا،ان کی چال ڈھال ،رفتار گفتار،رہنے سہنے اور ملنے جلنے کے انداز سے غرور وتمکنت کا پتہ نہیں چلتا تھا۔وہ خواہ مخواہ مرعوب کرنا اور لوگوں پر اپنی عظمت وبرتری کا سکہ جمانا پسند نہیں کرتے تھے،ان کو نام ونمود،شہرت اور جاہ طلبی سے نفرت تھی ،وہ ستائش کی تمنا اور صلہ سے بے پرواہ ہوکر اپنے حال اور دھن میں مست اور صرف اپنے کام سے مطلب رکھتے تھے۔کبھی کسی کی دل شکنی ودل آزاری کے درپے نہ ہوتے ، وہ کسی امتیاز وتفریق کو پسند نہیں کرتے تھے۔بڑوں کی طرح ،چھوٹوں سے،تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح ناخواندہ اور اصحاب جاہ و حشمت اور ذی حیثیت لوگوں کی طرح ،غریب اور مفلوک الحال اور کم حیثیت لوگوں سے ملنے میں انہیں عار نہ ہوتا تھا وہ اپنے خوردوں اور نیازمندوں سے بھی بڑی گرم جوشی اور تپاک سے ملتے تھے اور ہمیشہ ان کی ہمت وحوصلہ افزائی کرکے ان کا دل بڑھاتے اور ان کی دل جوئی کرتے تھے۔

اس خاکساری اور سراپا عجز وفروتنی کے باوجود ان میں بڑی غیرت وخودداری بھی تھی ۔طبیعتاً نہایت مستغنی اور بے نیاز واقع ہوئے تھے، ہمیشہ علم کے وقار وعظمت کا خیال رکھتے، نہ کبھی اپنے علم کا سودا کیا اور نہ ارباب دول کی عقیدت ونیازمندی کا دم بھرا۔طلبہ اور اہل علم کے سامنے وہ مجسم تواضع وانکسار بنے رہتے ،مگر دولت وثروت کے متوالوں کی طرف نگاہ اٹھانا بھی گوارانہیں کرتے تھے،علماء اور بے لوث لوگوں کے پاس سر کے بل جانا پسند کرتے تھے۔لیکن امراء واغنیاء کے پاس جانا علم کی توہین سمجھتے تھے،کبھی ان کی خوشامد اور مدحت طرازی سے اپنی زبان کوآلودہ نہیں ہونے دیتے۔

بڑے فراخ دل، کشادہ قلب اور سیع المشرب تھے۔ان کے دل میں ہر طبقہ ومسلک اور ہر مذہب وملت کے لوگوں کے لئے یکساں گنجائش تھی ،تعصب، تنگ نظری،تحزب اور فرقہ آرائی کی لعنتوں نے ان کے قلب کو داغ دار نہیں کیا تھا۔وہ ہر طبقہ فکر اور ہر حلقہ خیال کے لوگوں کے ساتھ نشست وبرخاست رکھتے تھے، اوران کے اصحاب فضل وکمال کی قدر کرتے تھے، ان کو عظمت وبلندی کا نقش اور شرافت ومحبت کا جلوہ جہاں بھی دکھائی دیتا اس کے سامنے بلا امتیاز فرقہ وقوم اپنی جبین نیاز خم کر دیتے تھے۔

قاضی صاحب کا وطن اعظم گڑھ ضلع کا مشہور قصبہ مبارک پور ہے جو صنعت وحرفت کے علاوہ مردم خیزی میں شروع ہی سے ممتاز چلا آرہا ہے۔آج بھی دینی علوم کے کئی چشمے یہاں جاری اور تشنگان علوم دین کی سیرابی کا سامان بنے ہوئے ہیں، یہاں کے اصحاب فضل وکمال اور خود قاضی صاحب کی نانہال جو یہیں ہے کے فضلاء کی عظمت علم وفن کا اندازہ قاضی صاحب کی موقر تصنیف تذکرہ علمائے مبارکپور سے ہوتا ہے۔خصوصاً مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی اور مولانا عبیداللہ رحمانی شارح مشکوٰۃ کا غلغلہ ہندوستان کے باہر اسلامی ملکوں میں بھی گونج رہا ہے۔اسی سلسلۃ الذھب کی ایک کڑی مولانا قاضی اطہر مبارک پوری مرحوم بھی تھے،جن کا آوازۂ شہرت، ہندوستان اور اسلامی ملکوں سے گزر کر یورپ کے علمی حلقوں تک پہنچ چکا ہے۔

عموماً افراد واشخاص کو ان کے وطن کے باہر چاہے کیسی ہی غیر معمولی شہرت ومقبولیت

حاصل ہو لیکن خود ان کے وطن میں ان کی کوئی پرسش اور پذیرائی نہیں کی جاتی، مگر ہمارے قاضی صاحب کی ذات اس سے مستثنیٰ تھی، ان کی ہر دل عزیزی و محبوبیت جس طرح وطن کے باہر تھی اسی طرح ان کے وطن میں بھی تھی، اس سے ان کی سیرت و کردار کی عظمت و بلندی کے علاوہ ان کے حسن سلوک اور اخلاص کا پتہ چلتا ہے جو اپنے ہم وطنوں سے ان کو تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قاضی صاحب کا دل جن اخلاقی خوبیوں اور کمالات سے معمور اور منور تھا اس کی مثال خود غرضی، منافقت اور عیاری کے اس دور میں معدوم ہے، میرؔ نے سچ کہا ہے:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

(۴)

قاضی صاحب کا طغرائے امتیاز اور ان کو بقائے عام کے دربار میں جگہ دینے والی ان کی یادگار تصنیفات ہیں، ان کی عزت، شہرت اور عظمت کا حقیقی باعث ان کے عظیم الشان علمی و تحقیقی کارنامے ہیں۔ ان کے ذکر کے بغیر قاضی صاحب کا خاکہ نامکمل رہے گا۔

قدرت کی فیاضیاں عام ہیں اور ابر کرم کی تر دستیاں دشت و چمن اور گلشن و بیاباں ہر ایک کو سیراب کرتی ہیں مگر۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

قاضی صاحب کی نشو و نما جس ماحول اور جن حالات میں ہوئی وہ تصنیف و تالیف کے لئے زیادہ موزوں اور سازگار نہ تھے، انہوں نے قدیم طرز کے مدرسوں میں تعلیم پائی اور وہ قدیم طرز کے علماء و مدرسین کی صحبتوں مین رہے اور انہی سے تعلیم حاصل کی، اس کے باوجود تحریر و تصنیف کا یہ عمدہ سلیقہ اور اچھا ذوق حیرت انگیز ہے۔

سر خدا کہ عارف و سالک بکس نہ گفت در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

قاضی صاحب کا حال اس سبزۂ خودرو کی طرح تھا جس کی تراش خراش کرنے والا کوئی مالی نہیں ہوتا، قاضی صاحب بھی فن تصنیف کے ماہرین کی تربیت و رہنمائی اور بڑے اداروں اور تحریکوں کے سہارے کے بغیر ہی ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کا شمار صف اول کے اہل قلم اور ممتاز مصنفین میں کیا جانے لگا۔

ان کی تصنیفات میں موجودہ ترقی یافتہ دور کے لوگوں کیلئے بھی کشش و جاذبیت کا پورا سامان موجود ہے، ان کے انداز بیان، طرز تحریر، اسلوب نگارش، ترتیب مواد اور طرز استدلال میں وہی دل کشی و رعنائی اور وہی شگفتگی و سلاست اور حلاوت و شیرینی ہے جو شبلی اسکول کا طرہ امتیاز ہے۔ فرق یہ ہے کہ قاضی صاحب کی ساری متاع علم ان کے اپنے دست و بازو کی کمائی ہے، ان کا ذوق تالیف و تحریر فطری ہے جس کو بجز فیض قدرت کے کسی اور کا شرمندۂ احسان نہ ہونا پڑا۔

(۵)

قاضی صاحب کی تصنیفات کمیت و کیفیت دونوں حیثیتوں سے اہم اور قابل قدر ہیں، ان کو قدرت نے مختلف و متضاد صلاحیتوں سے نوازا تھا اور وہ بڑے زود نویس تھے، تفسیر و حدیث، طبقات رجال، سیر و تذکرہ، تاریخ و جغرافیہ، کلام و معقولات، شعر و ادب اور صحافت ہر میدان میں ان کے قلم نے جولانیاں دکھائی ہیں اور گلکاریاں کی ہیں۔ ان موضوعات پر انہوں نے جن بلند پایہ تصنیفات کا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے، ان کو سہولت کے خیال سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ہندوستان کے ابتدائی اسلامی عہد کی تاریخ، اس دور کے مسلمانوں کے علمی و عملی کارنامے اور عرب و ہند کے تعلقات۔

(۲) علمائے اسلام خصوصاً شیراز ہند جون پور اور دیار مشرق کے علماء و ارباب فضل و کمال کے تذکرے۔

اول الذکر موضوع سے غالبًا قاضی صاحب کو دلچسپی علامہ سید سلیمان ندوی کی دو تصنیفات (۱) عرب و ہند کے تعلقات (۲) عربوں کی جہاز رانی سے ہوئی ہوگی۔ اس سلسلہ کا آغاز انہوں نے اپنی مشہور عربی تصنیف رجال السند والہند سے کیا تھا۔ اس کی تصنیف و تالیف کے سلسلے میں ان کے پاس اتنا مواد اکٹھا ہو گیا تھا اور اس موضوع سے ان کو ایسی شیفتگی ہو گئی تھی کہ ایک دو نہیں متعدد تصنیفات لکھیں۔

قاضی صاحب کی اس کد و کاوش کے نتیجہ میں عرب و ہند کے تعلقات کے متعدد گوشے اور دور رسالت، خلفائے راشدین اور اموی و عباسی عہد کی ساری علمی و ادبی سرگرمیوں کا خاکہ

سامنے آ گیا۔ ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ کا اصل ماخذ فارسی زبان کی تاریخیں ہیں۔ لیکن ان تاریخوں میں ابتدائی چند صدیوں کا کوئی ذکر نہیں ملتا، فارسی مورخین اوران کے تتبع میں انگریزی، اردو اور ہندی کے مورخوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کا باقاعدہ آغاز سلطان محمود غزنوی اوراس کے عہد کے واقعات سے کیا ہے۔لیکن مولانا اطہر مبارکپوری نے عرب سیاحوں، مورخوں، جغرافیہ دانوں اور مصنفوں کی کتابوں کا دیدہ ریزی سے مطالعہ کرکے ابتدائی صدیوں کی تاریخ اور مسلمانوں کی رزم و بزم کی داستانیں، سندھ، منصورہ، ملتان، مکران اورطوران میں ان کی حکومتوں کے عروج وزوال کے واقعات قلم بند کئے ہیں۔

قاضی صاحب کا دوسرا شاندار کارنامہ شیراز ہند جون پور کی علمی سرگرمیوں کی تفصیل وتحقیق ہے، انہوں نے اس نواح کے علماء وفضلاء اور مشائخ کے کارناموں کو جو امتداد زمانہ سے ماند پڑ گئے تھے ازسرنو زندہ اور روشن کر دیا، ان کی اس علمی خدمت کی بدولت متعدد اکابر گوشہ گمنامی کی نذر ہونے سے محفوظ رہے۔تذکرہ علمائے مبارک پور اسی سلسلی کی ایک قابل قدر کتاب ہے۔ا س کے علاوہ اعظم گڑھ کے دوسرے مردم خیز قصبات، ماہل، نظام آباد، سرائے میر، مینہہ نگر، دیوگاؤں، محمدآباد اور گھوسی وغیرہ کے بھی متعدد ارباب کمال کی جانب بھی علمی حلقوں کو متوجہ کرنے کا سہرا قاضی صاحب کے سر ہے۔

(۲)

ظاہر ہے کہ جس شخص کے علمی وتحقیقی کام اتنے وسیع، گوناگوں اور متنوع ہوں اس سے اگر کچھ غلطیاں اور فروگذاشتیں بھی ہوگئی ہوں تو اس میں نہ کوئی حیرت کی بات ہے اور نہ ان کی وجہ سے اس کی عظمت وکمال میں کوئی فرق آ سکتا ہے۔قاضی صاحب کی خوبی اور قابل ذکر خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے اوپر تنقید کو خندہ روئی اور بشاشت سے برداشت کر لیتے تھے۔اگر ان کی فروگذاشتوں کی جانب توجہ دلائی جاتی تھی تو وہ اس کا برا نہیں مانتے تھے بلکہ جائز اور درست تنقیدوں کا خیر مقدم کرتے تھے۔ان کی کتاب مآثر ومعارف ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔اس میں بعض مضامین کے ساتھ وہ تنقیدیں بھی شامل ہیں جو اہل علم نے ان پر کی ہیں۔

☆☆☆☆☆

طبقۂ علماء کا قیس وفرہاد

کتاب ’’قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک‘‘

کے مصنف (ولادت: ۱۳۳۴ھ، وفات: ۱۴۱۷ھ)

مولانا قاری ابوالحسن صاحب اعظمی

یہ روایت اور طریقہ راقم الحروف کے نزدیک عجیب وغریب ہے کہ جب کوئی عظیم شخصیت دنیا سے چلی جاتی ہے تو اس کی حیات اور کارناموں سے متعلق مضامین اور تذکرے لکھے جاتے ہیں، سوانح حیات مرتب کی جاتی ہے، اسے شائع کیا جاتا ہے، رسم اجرا کے عنوان سے اس پر مقالے پڑھے جاتے ہیں، اس پر سیمینار وتذکار کا انعقاد کیا جاتا ہے، اس کے مناقب وفضائل، خصوصیات وکمالات پر دھواں دھار تقریریں اور بیانات آتے ہیں؛ مگر کب؟ جب وہ اس دنیائے آب وگل سے کنارہ کش ہو کر اتنی دور چلا جاتا ہے کہ اس تک رسائی ناممکن ہو جاتی ہے، اس کی ذات ستودہ صفات اور کمالات سے بھری پُری شخصیت سے استفادہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ ایسی با کمال ونادر خصوصیات کی حامل شخصیات پر اس کی زندگی ہی میں بہت مفصل نہ سہی مضامین اور اس کی حیات وکارناموں پر مختصر سی کتاب آجائے؛ تاکہ ناظرین وقارئین اسے دیکھ پڑھ کر حسب صلاحیت اس سے کچھ سیکھنے کی کوشش کریں، معدودے چند ہی حضرات واکابر ایسے ہیں جنھوں نے یا تو خود آپ بیتی اور خود نوشت سوانح حیات مرتب کر دی یا کسی اور نے ان پر قلم ان کی زندگی میں اٹھایا اور کچھ لکھ دیا، اس سے مذکورہ فائدے کے ساتھ ایک بڑا اہم فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ لکھنے والوں کے لیے ایک آسان سی بنیاد اور معتبر ڈگر مل جاتی ہے۔

انھیں چند گنی چنی شخصیات میں ہمارے محبوب اور مہربان قاضی صاحب بھی ہیں، جنھیں آج مرحوم لکھتے ہوئے قلم پر کیا کچھ گزر رہی ہے۔

حضرت قاضی صاحبؒ جنھیں راقم نے قیس وفرہاد سے تعبیر کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ایک اشارہ ہے، ورنہ کہاں قاضی صاحبؒ جیسا باکمال وکامیاب محقق اور کہاں شہرت یافتہ مگر ناکامِ زمانہ قیس وفرہاد!

قاضی صاحبؒ کیا کچھ تھے؟ آپ کی تنہا ذات میں کتنی گونا گونی اور بوقلمونی تھی؟ ہر ہر زاویے سے ان پر مضامین لکھے جائیں گے، آپ کی ذات سے والہانہ تعلق رکھنے والے اہل قلم کی ایک بڑی تعداد ہے، جو ان شاء اللہ اس کا حق ادا کریں گے۔

آپ نے قلم کے ذریعہ اپنے علم ومطالعہ اور تحقیق وتجسس کے جواہر پارے کتابی شکل میں اہل نظر کے حوالے کئے، اس کی حقیقی قدر ومنزلت تو اس میدان کے راہرو ہی کچھ جان اور پہچان سکتے ہیں، ان زاویوں اور گوشوں پر حضرت قاضی صاحبؒ کے رفیق قدیم مولانا اسیرؔ ادروی مولانا اعجاز احمد اعظمی، ''دارالعلوم دیوبند'' کے مدیر شہیر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی اور ان جیسے دوسرے بہت سے اہل تحقیق ونظر قلم اٹھائیں گے۔ راقم الحروف کیا اور کیا اس کا ہیچ پوچ قلم!

قاضی صاحبؒ کی عربی اور اردو کی بلند پایہ کتابیں ''رجال السند والهند''، العقد الثمين في فتوح الهند ومن ورد فيها من الصحابة والتابعين''، الهند في العهد العباسيين'' اور اردو میں مستقل پچیسوں کتابوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، جو ہر پڑھنے لکھنے والے کی نگاہوں کو بہر حال روک لیتا ہے، لیکن ناظرین تعجب کریں گے کہ یہ کمترین حضرت قاضی صاحبؒ کی جس کتاب سے سب سے زیادہ متأثر ہوا اور جس کتاب کو سب سے زیادہ مؤثر سمجھا، وہ آپ کی بظاہر ضخامت میں مختصر لیکن حقیقت میں بڑی ہی بھاری بھرکم اور رجال ساز کتاب ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' ہے، یہ اپنا اپنا مزاج اور انداز فکر ونظر ہے، راقم الحروف اصلاً ایک طالب علم ہے، طالب علمانہ زندگی گزار رہا ہے اور تقریباً چھتیس سال سے اسی راہ کی خاک چھان رہا ہے، اس کے دل کو تو یہی البیلی کتاب لگی، بلکہ چپک کر رہ گئی، تین سال پہلے اس کتاب کا لیتھو ایڈیشن ایک عزیز سے ہاتھ لگا، کیا لکھوں اور کس طرح بیاں کروں کہ پڑھا اور کیا کچھ دل ودماغ پر بیت گئی؟ دل کا ساتھ آنکھوں

نے بھی دیا اور بار ہا ایسا ہوا کہ آنکھوں کے پیالے آنسوؤں کو چھلکنے سے نہ روک سکے، آہ! کیا دل وجگر نکال کر رکھ دیا ہے۔

انھیں ایام میں حضرت قاضی صاحبؒ کا دیوبند میں ورود مسعود ہوا، مطالعہ کے بعد اپنے قلبی ودماغی تأثرات کو بیان کیا، سن کر مرحوم میرے تأثر سے خود بھی بہت متأثر ہوئے۔ عرض کیا: حضرت! آپ کی عربی اور اردو کی بڑی بڑی اور موٹی موٹی محققانہ کتابیں تو بڑے حضرات جانیں، یہ طالب علم تو یہ چاہتا ہے کہ اس کتاب پر جناب اضافہ فرمائیں اور تعلیمی مشقت اور جدوجہد سے بھری زندگی سے فراغت کے بعد کے علمی کاروان حیات نے اپنے پیچھے کیا کچھ نقوش چھوڑے ہیں، اسے ضرور قلمبند فرمادیں، پہلے قاضی صاحبؒ نے تو کچھ عذر ومعذرت اور ٹال مٹول سے کام لینا چاہا؛ مگر میری طرف سے برابر اصرار بڑھتا رہا، کہنا چاہئے کہ میں ان پر مسلط ہوگیا، بالآخر میری طالب علمانہ ضد اور خواہش کو شرف قبول سے نوازتے ہوئے ایک مختصر سی تحریر عنایت فرمادی، آپ کے اعتبار سے تو یہ مختصر ضرور ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ بعد کے لوگوں کے لیے یہ ایک اہم اور بیش قیمت تحریر ہے۔

راقم الحروف نے اسے آفسیٹ کی کتابت کرا کے اس اہم تحریر کے ساتھ، بعنوان: فراغت کے بعد کا علمی سلسلہ حیات'' پہلی بار ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ میں اپنے مکتبہ صوت القرآن دیوبند سے شائع کیا۔

کتاب ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' کے شروع میں حضرت قاضی صاحبؒ کے رفیق درس اور قدیم ساتھی، ایک باصلاحیت عالم ادیب اور ملک کے منجھے ہوئے، جانے مانے صاحب قلم مولانا نظام الدین صاحب اسیر ادروی استاذ جامعہ اسلامیہ بنارس کے نوک قلم سے نکلا ہوا ایک بڑا ہی خوب صورت مقدمہ ہے، اس ابتدائیہ سے حضرت قاضی صاحبؒ کی مشقت اور عسرت سے بھری زندگی کی طرف بڑا واضح اشارہ ہوتا ہے۔ ذرا یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجئے:

> '' قاضی صاحب نے جوانی ہی میں کثرتِ مطالعہ کی دیوانگی میں قدرت کو آنکھوں کی روشنی کا بڑا حصہ دے کر اس کے بدلے میں علم کی دولت مانگی تھی، میں دیکھ رہا تھا کہ وہ بڑی بے دردی سے اپنی آنکھوں کی قیمتی روشنی لٹا رہے ہیں، میں یہ نہ سمجھ سکا کہ اس روشنی سے زیادہ قیمتی کون سی دولت ہے جسے وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں.......... یہ راز اس وقت فاش ہوا جب ان کی

تصنیف نے ملک کے اہل قلم سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔

قاضی صاحب نے جن روح فرسا حالات میں اپنی علمی زندگی کا آغاز کیا ہے اس نے میرے دل میں ان کی عظمتوں کا چراغ روشن کردیا ہے، جس کی روشنی میں ان کے علمی کمالات کے خدوخال کو واضح طور پر دیکھ رہا ہوں۔ درس وتدریس کی عسرت بھری زندگی سے نکل کر امرتسر، لاہور، بہرائچ، ڈابھیل پھر بمبئی کے اَسفار اور بھاگ دوڑ نے ان کے جسم کو ضرور تھکا دیا اور وہ قبل از وقت آنکھوں کی روشنی کا بڑا ذخیرہ کھو چلے اور بالوں کی سیاہی نے شباب کی حکمرانی سے بغاوت کرتے ہوئے امن کا سفید پرچم لہرایا لیکن مشکلات وشدائد کی بھٹی نے ان کے جسم کو جتنا تپایا ان کے جوہر علم کا سنہرا رنگ اور نکھرتا گیا، اور آج ان کے علمی مقام کی بلندیوں کی طرف سر اٹھایا جاتا ہے تو بڑے بڑے اہل علم کی ٹوپیاں گر جاتی ہیں (ص:۳/۴)

آخری زیرخط جملے نرمی محبت اور عقیدت کے جذبے سے نہیں نکل گئے ہیں، بلکہ یہ ایک اظہر من الشّمس فی نصف النہار جیسی حقیقتِ واقعی ہے، جس کا جی جب چاہے دیکھ سکتا ہے۔

مقدمہ کا ایک ٹکڑا ازرااور دیکھئے:

’’قاضی صاحب نے تاریخ کے جس پہلو کو اپنا موضوع بنایا ہے بلاشبہ وہ اچھوتا ہے، عرب وہند کے تعلقات کو عہد رسالت، عہد صحابہ، عہد تابعین وتبع تابعین کے چھوٹے چھوٹے اور تنگ دائروں میں محدود کرکے قاضی صاحب نے اپنے لئے تحقیق کا راستہ دشوار بنایا، اس کا کچھ اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جنھیں اس قسم کے تحقیقی کاموں کا تجربہ ہے۔‘‘

قاضی صاحب کو احادیث کے بہت بڑے ذخیرہ کے علاوہ تاریخ وسیر، قدیم وجدید سفرناموں، تذکروں، عربی شعراء کے دواوین اور محاورات وامثالِ عرب کا بڑا گہرا مطالعہ کرنا پڑا ہوگا۔ سیکڑوں صفحات پلٹنے اور پڑھنے کے بعد شاید چند سطریں موضوع سے متعلق دستیاب ہوئی ہوں گی۔ آپ خیال کرسکتے ہیں کہ ہزاروں صفحات کی ترتیب میں کتنا خونِ جگر جلانا پڑا ہوگا، کتنی راتیں چراغوں کی لَو میں بسر کرنی پڑی ہوں گی، صبح وشام کی کتنی دلآویزیوں سے بے خبر رہ کر یہ ذخیرۂ معلومات فراہم کیا گیا ہوگا، اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، پھر لطف کی بات یہ ہے کہ کتاب کی ایک ایک سطر مستند، ایک ایک واقعہ حقائق کی کسوٹی پر کسا ہوا، ایک ایک حوالہ بذاتِ خود سند، نہ معلوم کتنے سمندروں کو کھنگالا گیا ہوگا تب کہیں جا کر لآلیِ آبدار کا یہ ذخیرہ آج اہل علم کی نگاہوں کو دعوتِ نظارہ دے رہا ہے۔ (ص:۵/۶)

قاضی صاحب کا مقصود اپنی تعلیمی داستانِ حیات سے کیا تھا، مناسب یہ ہے کہ اس کی غرض وغایت خود حضرت قاضی صاحبؒ ہی کے الفاظ میں ملاحظہ کریں، قاضی صاحب رقم طراز ہیں:

''خود اعتمادی اور خود سازی کی یہ طویل داستان ان عزیز طلبہ کی تشجیع وتشویق اور ہمت افزائی کے لئے لکھی گئی ہے، جو بہترین ذہن ودماغ لے کر دار العلوموں اور جامعات کی لق و دق اور شاندار عمارتوں میں جاتے ہیں تاکہ وہاں کے بہترین تعلیمی وتربیتی نظام کے ماتحت لائق وفائق اساتذہ کی توجہ سے علم حاصل کریں، مگر عام طور پر ان کو اپنے مقصد میں ناکام ہو نے کے ساتھ اپنی نالائقی اور بدنامی کی سند ملتی ہے، کیونکہ ان مدرسوں کے ذمہ داروں کی وجہ سے تعلیم وتربیت کا معیار حد درجہ ناقص بلکہ علم کش ہوتا ہے اور وہ لوگ سارا الزام طلبہ کے سر رکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور اگر کچھ طلبہ اپنے طور پر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔''

حضرت قاضی صاحبؒ نے ان سطروں میں جو کچھ بیان کرنا چاہا ہے، کیا آج کے دور میں مدارس کا یہ المیہ نہیں ہے؟ ذرہ برابر کیا ان میں مبالغہ ہے؟ ساٹھ، ستر سال پہلے کے ماحول کو ذرا چشمِ تصور میں لائیے اور آج کے تعیش پسند ماحول کا نظارا کیجئے تو کھلی، آنکھوں کو اس سے بڑھ چڑھ کر منظر آئے گا۔ پہلے اساتذہ کیا ہوتے تھے؟ بے حد معمولی اور قلیل مشاہرہ پر صبر وقناعت کر کے حساب کم بیش سے یکسو ہو کر رات دن پڑھنے پڑھانے میں مصروف رہا کرتے تھے۔ ایک دن میں دس، دس، بارہ، بارہ، اسباق پڑھاتے تھے مدرسہ کے خارج اوقات میں طلبہ کو اپنے گھروں پر بلا کر عمدہ تعلیم اور بہترین تربیت دیتے تھے، خود محنت کر کے، طلبا سے محنت کراتے تھے وہ حریص تھے کہ ان کے شاگردوں کو علم آجائے، شب وروز، مردم گری اور رجال کی فکر میں رہتے تھے اسی کا نتیجہ تھا کہ طلبہ اپنے اپنے وقت پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکتے اور ایک عالم کو اپنی علمی ضیا پاشیوں سے منور کرتے تھے۔ آج اکا دُکا اگر کہیں کوئی باقی ماندہ نظر آجاتا ہے تو وہ اسی شخصیت ساز دور کی یادگار ہے ورنہ تن آسانیوں کا خدا ناس کرے، مدارس کی موجودہ فضا مایوس کن ہے۔

قاضی صاحبؒ آگے ارقام فرماتے ہیں:

''ایسے طالب علموں کو ہم جیسے چھوٹے مدرسوں کے طلبہ سے سبق لے کر اپنے بلند مقا صد میں کامیابی کی جد وجہد کرنی چاہئے، میں نے اپنی طالب علمی کی یہ کہانی خودستائی اور خود

نمائی کے لئے نہیں لکھی ہے۔عزیز طلبہ اس تحریر کو اس نقطہ نظر سے نہ پڑھیں بلکہ اس کو پڑھ کر آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کریں۔'' (ص:۸)

آگے ص:۹ سے اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔

پہلا عنوان ہے: ''خاندانی سلسلہ اور پیدائش'' اس عنوان کے تحت کہ اپنی تاریخ پیدائش کے ساتھ خاندانی پسِ منظر پر روشنی ڈالی ہے، یہ سلسلہ ص:۱۱ تک ہے۔

دوسرا عنوان، ص:۱۱ سے ''باقاعدہ تعلیم کی ابتداء'' ہے، یہ ص:۱۳ تک ہے۔

تیسرا عنوان، ص:۱۳ پر ''میرا تعلیمی ماحول'' ہے۔اس عنوان کے تحت اپنے علمی قصبہ مبارکپور کے اور سوادِ قصبہ کے متبحر علماء اور مدرسین و مصنفین کا مختصر تعارف کرایا ہے۔اس عنوان کے تحت اپنے علمی قصبہ مبارکپور اور سواد قصبہ کے متبحر علماء اور مدرسین و مصنفین کا مختصر تعارف کرایا ہے، اس عنوان کے تحت قصبہ مبارکپور کی نامی گرامی ایک علمی شخصیت صاحبِ ''تحفۃ الاحوذی'' شرح ترمذی، مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث مبارکپور (م ۱۳۵۳ھ) کا ذکر آیا ہے قاضی صاحبؒ آپ کے پاس بغرض علاج اور گاہے بگاہے ویسے بھی آمد و رفت رکھتے تھے اسی عنوان کے تحت محدث مبارکپوری کی زبان سے عربی کا نہایت گرانقدر مقولہ سناتے ہیں۔مَنْ سَاوٰی یومَاہُ فَھُوَ فِی الْخُسْرَان ''یعنی جس انسان کے دونوں دن (کل اور آج) برابر ہوں وہ نقصان میں ہے، یعنی ہر اگلا دن پچھلے دن سے بڑھا ہونا چاہئے.........اسی عنوان کے تحت نہایت معروف و مشہور تصنیفی ادارہ **المجمع العلمی**، **دار المصنفین** اور اس کی علمی تصنیفی سرگرمیوں کی جانب اشارہ بھی ملتا ہے۔

چوتھا عنوان ص:۱۶ پر ''مدرسہ کا ماحول اور اساتذہ'' ہے۔اس عنوان کے تحت مقامی مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور اور اس وقت کے اساتذۂ کرام کا تعارف کراتے ہوئے بڑے کام کی دوسری باتیں بھی آگئی ہیں۔

قاضی صاحبؒ اس عنوان کے تحت فرماتے ہیں:

> ''طالب علم میں محنت اور کوشش کے ساتھ آگے بڑنے کا حوصلہ اور ذوق وشوق ہوتو چھوٹی جگہ رہ کر بڑا ہوسکتا ہے، اور اگر یہ باتیں نہ ہوں تو بڑی جگہ رہ کر چھوٹا ہی رہے گا،۔''

آگے درسِ نظامیہ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ درس نظامیہ میں بہت کچھ کتر بیونت کے باوجود اب بھی وہ بہت مفید اور کارآمد ہے، کئی مدارس نے اپنے یہاں نئے نصاب جاری کئے مگر نتیجہ کے طور پر ان سے ایسے علماء پیدا نہیں ہوئے جو درس نظامیہ کے فضلاء کی صف میں بیٹھ کر ٹھوس تعلیمی و تصنیفی خدمات انجام دے سکیں اور دینی علوم وفنون میں مستند فکر اور معتبر نظر رکھتے ہوں، حالات اور تقاضے کے مطابق نصاب میں تغیر وتبدل ہونا چاہئے، مگر طلبہ میں پختہ علمی استعداد وصلاحیت اور اعتقاد وعمل میں صلابت کا خیال مقدم ہونا چاہئے، کیونکہ دینی مدارس کے وجود کا مقصد یہی ہے، اسی نام سے وہ جاری ہیں، اور یہی ان کا اصل کام ہے، میں نے مجموعی طور سے اسی درس نظامیہ کو پڑھا ہے اور مجھے جو کچھ ملا ہے اسی سے ملا ہے۔''

پانچواں عنوان ''قوتِ مطالعہ کی برکت'' ص: ۲۰ پر ہے۔ اس عنوان کے تحت بھی بڑی اچھی باتیں آگئی ہیں۔

چھٹا عنوان ''ذہن ساز کتابیں جن کا مطالعہ کیا۔''

ساتواں عنوان ''مطبوعات کی خریداری اور مخطوطات کی فراہمی'' ص: ۲۵ سے ۳۳ تک اس عنوان کے تحت تحریر کا پھیلاؤ ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اس تحریر سے قاضی صاحبؒ کے ذوقِ مطالعہ، کتابوں سے عشق اور ان سے استفادہ اور فراہمیٔ کتب کے سلسلہ میں ہر قسم کے مجاہدہ کے اور بڑی سے بڑی قربانی دینے کا جذبۂ وافر امنڈتا ہوا نظر آتا ہے، اس عنوان کے تحت تحریر قدرے تفصیل سے ہے، اور آپ نے بڑی لذت سے مزہ لے کر لکھا ہے، حقیقتاً یہ ہے بھی بڑی لذیذ تحریر! اس میں نہایت نایاب کتابوں اور بڑے ہی بیش قیمت رسائل کا پتہ بھی ملتا ہے، بڑی خاصے کی چیز ہے۔

آٹھواں عنوان ''مضمون نگاری اور تصنیف وتالیف'' ص: ۳۳ سے ص: ۳۹ تک ہے۔ قاضی صاحبؒ کے اصلی ذوق کا یہ میدان ہے اور ہر لکھنے پڑھنے والے صاحبِ ذوق طالب علم کے پڑھنے کے لائق ہے۔

نواں عنوان ''مضمون نگاری، شاعری کے ابتدائی نمونے'' ص: ۳۹ سے ۴۴ تک ہے۔ سب سے پہلا مضمون جو آپ نے لکھا اور اس زمانہ کے رسالہ ''مومن'' بدایوں (۱۳۵۳ مطابق دسمبر ۱۹۳۴ء) میں چھپا بعنوان ''مساوات'' تھا، یہ مضمون جناب قاضی صاحبؒ کا بنام ''جناب مولوی عبدالحفیظ (اصلی نام) صاحب اعظمی متعلم مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور'' طبع ہوا۔ اس مضمون کی

صرف ایک مختصر سی جھلک بطور نمونہ یہاں دی جاتی ہے:

''بنی نوع انسان میں مساوات و یکسانیت کا حد اعتدال پر قائم رکھنا اتنا ضروری اور لازمی امر ہے کہ جس کے بغیر نہ کسی سلطنت کا نظام اچھی طرح قائم رہ سکتا ہے اور نہ دنیا کی کوئی جماعت فروغ پا سکتی ہے، جو مذہب یا قانون مساوات و یکسانیت سے خالی ہے سمجھ لو کہ وہ بالکل ناقص ہے، اسی طرح جو جماعت یا سوسائٹی اپنے افراد میں مساوات و یکسانیت بدرجۂ اتم قائم و برقرار نہ رکھ سکتی ہو یقین کرلو کہ وہ آج نہیں تو کل دنیا سے فنا ہو جائے گی۔''

قاضی صاحبؒ نے ابتداء میں شاعری بھی کی، مگر جلد ہی طبیعت کو اس سے الگ کرلیا۔ جامع مسجد مبارکپور کی تعمیر کے زمانے میں بسلسلۂ چندہ آپ نے ایک نظم لکھی تھی یہاں اس کا ایک ابتدائی بند پیش کیا جارہا ہے:

نظر جب جب اٹھائی جا رہی ہے
جھلک کعبہ کی پائی جا رہی ہے
نظر میں نور پیدا ہو رہا ہے — یہ دل شاد تمنا ہو رہا ہے
زمیں پر عام چرچا ہو رہا ہے — فلک پر شور برپا ہو رہا ہے
کوئی مسجد بنائی جا رہی ہے

قاضی صاحبؒ کی پہلی نظم مشہور و معروف دینی اور علمی رسالہ ''الفرقان'' جو اس وقت بریلی سے شائع ہوتا تھا اس میں جمادی الثانیہ ۱۳۵۷ھ میں ''مسلم کی دعاء'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔

دسواں عنوان......طبعی رُجحانات......ص:۴۴ پر ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کا ابتدائی حصہ نقل کر دیا جائے تا کہ قارئین کو پتہ چلے کہ آج کے قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے میلاناتِ طبع اور رکھ رکھاؤ کا انداز کیا تھا! فرماتے ہیں:

''طالب علمی کا تقریباً پورا دور عسرت اور تنگی میں گذرا، کھانے پینے اور پہننے میں کفایت شعاری اور سادگی ہی رہی اس وقت آج کل کی طرح معاش و معیشت کی فروانی و فراخی نہیں تھی۔ عام طور سے لوگ روکھی پھیکی زندگی کے عادی تھے، اس لئے تنگ دستی اور غربت کا احساس نہیں تھا بلکہ سب لوگ اسی زندگی پر راضی و خوش رہا کرتے تھے۔ اس میں بڑی خیر و برکت تھی۔ میں بھی ہر معاملہ میں اپنے ذوق و شوق کے مطابق سامان مہیا کرلیا کرتا تھا اور

کبھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوا۔

سفید گزی گاڑھے کا کرتا پائجامہ عام لباس تھا، شیروانی بہت کم پہنتا تھا اور صدری ہوا کرتی تھی، ٹوپی کشتی نما اچھے کپڑے کی ہوتی تھی جو اس زمانہ کے لحاظ سے قیمتی ہوتا تھا، عطر کی شیشی ہمیشہ جیب میں رکھتا تھا، کپڑے خود ہی دھولیا کرتا تھا، یہی وضع قطع آج بھی باقی ہے، مگر اب احساس ہوتا ہے کہ اتنی سادگی بھی اچھی نہیں ہے بلکہ بعض اوقات مضر، موہم بخل اور باعث تحقیر ہوجاتی ہے۔''

قاضی صاحبؒ کے طبعی رُجحانات کے سلسلہ میں ایک اقتباس اور بھی پڑھتے چلئے:

''بعض اوقات قصبہ کے بڑوں کے یہاں طلبہ و مدرسین کی دعوت ہوا کرتی تھی، میں کسی بہانے سے بچ کر ان کے لقمہ تر کے مقابلہ میں اپنی نان جویں میں زیادہ لذت پاتا تھا۔

مرادآباد گیا تو ابتداء میں ایک گھر سے کھانا لانا پڑتا تھا۔ ایک آدھ ہفتہ ضمیر پر جبر کر کے چھپتے چھپاتے یہ کام کیا، پھر ڈھائی روپیہ ماہوار مدرسہ سے وظیفہ لے کر اس سے نجات حاصل کر لی اور ایک معمولی ہوٹل میں چھ پیسہ فی وقت کے حساب سے کھانا کھانے لگا، قیام مرادآباد کی مدت میں پچاس ساٹھ روپیہ گھر کے خرچ ہوئے۔ میری پوری تعلیم پر بہت ہی کم خرچہ ہوا ہے۔

آگے چل کر کفایت شعاری، سادگی، خودشناسی اور کم آمیزی نے بہت فائدہ دیا، اسی کی برکت ہے کہ بمبئی جیسے شہر میں مدت دراز تک رہنے کے باوجود میں بمبئی والا بالکل نہیں بن سکا، بڑی بڑی عقیدت مندانہ پیش کش کو شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا، تملق، چاپلوسی اور خوشامد سے نفرت رہی اور مدرسہ کی فضا میں جو ذہن و مزاج بنا تھا وہ اس شہر کی رنگینی اور دولت کی نذر نہ ہوسکا، اور الحمدللہ کہ میں نے اس شہر کے ایک معمولی کمرہ میں بیٹھ کر وہ کام کیا جو بڑی بڑی تنخواہوں پر علمی اور تصنیفی و تالیفی اداروں میں کیا جاتا ہے اور اس سے دولت کمائی جاتی ہے۔''

قدم ہونہی تو نہیں منزلوں نے تھام لیا
جنوں سے کام یہاں ہم نے گام گام لیا

''میں نے اپنی کسی کتاب پر نہ کسی قسم کا معاوضہ لیا، نہ رائلٹی کی بات کی، اور نہ اس کے لئے کوئی تحریر لکھی، بلکہ علم کی خدمت و اشاعت کے جذبہ سے لکھی اور اسی جذبہ سے ناشروں کو ان کی طباعت و اشاعت کی اجازت دی۔''

☆☆☆☆☆

قاضی اطہر مبارکپوری میری نظر میں

مولانا محمد نعیم صدیقی، مقیم ابوظہبی

غالباً ۶۳۔۱۹۶۲ء کی بات ہے، اس وقت میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں عالمیت کے درجہ پنجم میں زیر تعلیم تھا، کسی تعطیل کے زمانے میں اپنے وطن اعظم گڑھ آیا ہوا تھا۔ ایک دن کتب خانہ دار المصنفین کے مرکزی ہال میں مولانا ابوالبقاء ندوی کی خدمت میں جو اس وقت دار المصنفین سے وابستہ تھے حاضر تھا، یہی دس گیارہ بجے دن کا عمل رہا ہوگا۔ اچانک شبلی منزل کے صدر دروازہ کی طرف نظر اٹھی تو ایک صاحب گردن اٹھائے آتے نظر آئے، قد و قامت متوسط، ناک نقشہ موزوں اور مجموعی سراپا دلکش، آنکھوں پر موٹے شیشوں کی سنہری عینک لگائے۔ داہنے ہاتھ میں چھڑی اور بائیں ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلا لئے وہ سیدھے کتب خانے کی جانب چلے آرہے تھے۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا یہ کون بزرگ تشریف لا رہے ہیں۔ مولوی ابوالبقاء صاحب نے ادھر دیکھتے ہوئے بتایا کہ یہ قاضی اطہر مبارکپوری ہیں۔ آج بھی مجھے خوب یاد ہے کہ یہ نام کانوں میں پڑتے ہی مجسمہ حیرت واستعجاب اور مرقع عقیدت ومحبت بن گیا تھا۔ دل نے کہا ارے یہی وہ قاضی اطہر مبارکپوری ہیں جن کے علمی و تصنیفی فضل وکمال کی عظمت میرے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہے، اور جن کے ظاہری سراپا کے بارے میں نوع بنوع نقشے میرے پردہ ذہن پر عرصہ سے بنتے اور بگڑتے رہے تھے۔ آج اپنے تصورات سے یکسر مختلف اس مجسمہ علم وسادگی کو اپنے روبرو دیکھ کر بے ساختہ میرے دل میں عقیدت ومحبت کا ایک سمندر موجزن ہوگیا۔ اس اثناء میں رفقائے دار المصنفین قاضی صاحب کا پرتپاک خیر مقدم کرکے انہیں اپنے حلقہ میں لے کر بیٹھ چکے تھے اور قاضی صاحب مختلف موضوعات پر اپنے مخصوص دلچسپ اور بے تکلف انداز میں گوہر فشانی کررہے تھے۔ میں اس وقت ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے وہاں موجود تھا اس لئے کسی نے قاضی صاحب سے میرا تعارف کرانے

کی ضرورت نہیں سمجھی۔ تھوڑی دیر بعد قاضی صاحب کی نظر خود ہی مجھ پر پڑی تو از راہ شفقت التفات فرمایا اور چند لمحے تخاطب کا شرف عطا کیا۔ یہ تھی قاضی صاحب سے میری پہلی ملاقات، جو مرور ایام کے باوجود آج بھی میری یاد یا دداشت میں اسی طرح تازہ ہے۔ اس پہلی بار کے دیدار میں قاضی صاحب کی غیر معمولی سادگی و بے تکلفی، عالی ظرفی، ذرہ نوازی اور اس کے ساتھ عالمانہ تبحر، مصنفانہ بصیرت، وسعت مطالعہ اور دقیقہ رسی کے جو گہرے نقوش میرے دل پر مرتسم ہوئے وہ علم وشعور کی ترقی کے ساتھ برابر ارتقا پذیر رہے، اور آج تو یہ عالم ہے کہ میں گذشتہ کئی دہائیوں میں انہیں اس حیثیت سے منفرد مقام دیتا ہوں کی ایسی نظیریں خال خال ہی مل سکتی ہیں جو کردار وسیرت کی اس ہمالیائی بلندی کے ساتھ تبحر علم، وسعت فکر اور تصنیفی صلاحیتوں کے اتنے اعلیٰ مقام کی حامل ہو۔ آپ میرے اس عقیدت مندانہ دعوے کو بلاغت کی اصطلاح میں غلو واغراق کا نام دیجئے، یا اسے میری کوتاہ نظری اور بے بصری پر محمول کیجئے مگر میں پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے اس دعوے پر شواہد و نظائر کا ایک انبار رکھتا ہوں جس کی طوالت کی متحمل یہ مختصر تحریر نہیں ہو سکتی۔ مجھے یقین کامل ہے کہ قاضی صاحب کی معیت میں چند روز گزارنے اور ان کی تصنیفات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہر شخص میرا ہمنوا ہو جائے گا۔

قاضی صاحب کی شخصیت اور کردار کے نمایاں اوصاف کا اگر تجزیہ کیا جائے تو سادگی، قناعت، استغنا، بے نیازی، خوش طبعی و بے تکلفی، راست گوئی اور خورد نوازی اس کے جلی عنوانات ہوں گے۔ ان کی زندگی ایک کھلی کتاب کے مانند ہے۔ اس میں ظاہر و باطن کی کوئی تفریق نہیں۔ ان کے ہاں منافقت اور تضاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی باعث دوسروں کی مصلحت پسندی اور منافقت کو بھی وہ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ وہ سچی اور حق بات تنہائی میں ہی نہیں بھری محفل میں روبرو بھی کہہ دیتے ہیں۔ اس لئے کبھی کبھی ان کی صاف گوئی خود ان کی راہ میں کانٹے بو جاتی ہے، مگر وہ انجام سے بے خبر راستبازی کی راہ پر گامزن رہتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ وہ عوائد رسمیہ سے واقف نہ ہوں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مصلحت بینی اور رسمی ظاہر داری کا لیبل لگا کر منافقت برتنا ان کے طبعی حسن کردار کے منافی ہے۔

قاضی صاحب کا لباس، غذا، انداز تکلم اور طرز زندگی سب سادگی کی مکمل تصویر ہیں، انہیں

ہر تصنع اور تکلف سے شدید ترین نفرت ہے خواہ وہ معاشرت کا نفع ہو مخاطبت کا، تحریر کا نفع ہو یا تقریر کا، وہ برجستگی و بے تکلفی کو عملی طور پر اس حد تک برتتے ہیں کہ ان کا خوردوں کے ہاتھوں سے کبھی کبھی ادب و احترام کا سر رشتہ چھوٹ جاتا ہے۔ انکسار و تواضع قاضی صاحب کا خمیر، وضعداری اور اخلاص ان کی سرشت ہے، وہ مصلحت آمیز ملاقاتوں کے سخت مخالف ہیں۔ خوشامد و تملق سے انہیں خدا واسطے کا بیر ہے۔ اس لئے ارباب اقتدار اور مغرور و بددماغ، اہل علم، اہل قلم اور اہل ثروت سے ان کی دوستی نہیں ہو پاتی ہے۔ منکسر المزاج اور ملنسار لوگوں سے ان کے گہرے اور پرخلوص تعلقات ہیں۔ میں نے تعلقات کے احترام میں ابھی تک قاضی صاحب کا مثل نہیں پایا ہے۔ وہ غالب کے الفاظ میں وفاداری بشرط استواری اصل ایمان کے نہ صرف قائل بلکہ مکمل طور سے اس پر عامل بھی ہیں۔ انکساری وفروتنی نے انہیں شاخ ثمر کی طرح جھکا کر زمیں بوس کردیا ہے۔

خاکسار راقم سطور کے قاضی صاحب سے روابط کی عمر تقریباً پندرہ سال ہو چکی ہے اس عرصہ میں ان کی بزرگانہ شفقتوں اور مسلسل حوصلہ افزائیوں کے جو جلوے سامنے آئے ہیں ان کی تفصیل کے لئے ایک مستقل دفتر درکار ہے۔ ظاہر ہے عمر کے اعتبار سے میں ان کے کئی صاحبزادوں سے بھی چھوٹا ہوں مگر قاضی صاحب کی خوردنوازی اور محبت وشفقت کا یہ عالم ہے کہ ہر ملاقات میں اپنی باغ وبہار طبیعت اور بے تکلفانہ انداز گفتگو سے عمر وعلم کے امتیاز وتفریق کو مٹا دیتے ہیں۔ میرے لئے بعض وقت یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوجاتا ہے کہ قاضی صاحب کے کردار واخلاق کا پلہ بھاری ہے یا ان ے علمی و تصنیفی فضل وکمال کا۔ آج بیسویں صدی کی اس دہائی میں شب وروز کا مشاہدہ ہے کہ معمولی صلاحیتوں کے حامل اہل قلم کے...... **لمن الملک الیوم** اور نعرہ **انا و لا غیری** سے ساری فضا معمور ہے، ادبی گروپ بندیوں کا دوردورہ ہے۔ ایسے عالم میں قاضی صاحب کی شخصیت رجال سلف کی یاد تازہ کرتی ہے۔ وہ شہرت پسندی سے نفور اور اپنے گوشہ علم میں گم ہو کر بحر تحقیق کی غواصی میں مصروف ہیں۔ اردو پر ادیبانہ قدرت رکھنے کے ساتھ عربی پر بھی کلی عبور رکھتے ہیں۔ چنانچہ اب تک وہ اردو عربی میں پندرہ بیس ضخیم تحقیقی وعلمی کتابیں تصنیف کر چکے ہیں جن میں سے ہر ایک اتنی بلند پایہ ہے کہ بلاشبہہ ہر

یونیورسٹی اس پر اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگری دے کر فخر محسوس کر سکتی ہے۔

قاضی صاحب کا قابل ذکر اور لائق صد تحسین کمال یہ ہے کہ انھوں نے ملک کے تمام علمی مراکز اور ماحول سے دور رہ کر محض انفرادی طور پر وہ علمی کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں جو تاریخ علم وفن میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ان کی ہر تصنیف طویل مطالعہ، عمیق غور وفکر وسعت مطالعہ اور دیدہ ریزی پر شاہد عدل ہے۔ وہ صحیح معنوں میں چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے اکٹھا کرتے ہیں، مستند اور قدیم ترین نادر، کم یاب مآخذ کے حوالوں نے قاضی صاحب کی علمی تخلیقات میں غیر معمولی وزن اور وقار پیدا کر دیا ہے۔ بمبئی جیسے خودی فروش اور خدا فراموش شہر میں قاضی صاحب نے علم وفن کے چراغ روشن کر کے ماحول کی ناسازگاری کے شکوہ سنجوں کے لئے عبرت وموعظت کا ایک قابل تقلید نمونہ پیش کیا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ قاضی صاحب اپنی تخلیقات کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے حوالوں کی تلاش میں کوچہ بکوچہ کو بہ کو گھومتے ہیں۔ایک بار مجھ سے خود فرمایا کہ ''دیکھو بھائی تم تو اتنی بڑی لائبریری میں رہتے ہو، مطالعہ وتحقیق کے بڑے مواقع حاصل ہیں تم کو اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا کہ میں ایک ایک حوالہ کو کتنی محنت وجستجو سے اکٹھا کرتا ہوں۔اس لئے طبعی طور پر میری خواہش ہوتی ہے کہ یہ حوالہ میری اس تحریر میں ضرور آجائے۔اب اگر کسی رسالہ کا مدیر اسے حذف کر دیتا ہے تو مجھے تکلیف ہونا قدرتی بات ہے''

قاضی صاحب کی علمی سرگرمیوں کا محور دو موضوعات ہیں اور ان میں انہیں بلاشبہہ درجہ اختصاص حاصل ہے۔ایک عرب و ہند کے قدیم ترین گونا گوں تعلقات کی داستان سرائی اور دوسرا دیار پورب میں علمی و تعلیمی ترقیوں کی روشن تصویر پیش کرنا۔عرب سیاحوں، جغرافیہ نویسوں اور مورخوں نے اس ملک کی تمدنی اور سیاسی تاریخ کے ساتھ خصوصی اعتنا کیا ہے۔ جاحظ، سلیمان تاجر، ابن خرداذبہ، مسعودی، قاضی صاعد اندلسی، عبدالکریم شہرستانی، ابن ابی صیبعہ، ابن بطوطہ اور قلقشندی وغیرہ نے اپنی تصانیف میں ہندوستان کے جغرافیہ، تہذیب وتمدن، معاشرت، نظام حکومت اور مذاہب پر مبسوط و فاضلانہ بحث کی ہے۔ اردو میں اس موضوع پر سب سے پہلی مبسوط اور محققانہ تصنیف علامہ سید سلیمان ندوی کی عرب و ہند کے تعلقات ہے۔ ۱۹۲۹ء میں

جب یہ منصۂ شہود پر آئی تھی تو علمی دنیا اس کی نادر تحقیقات و معلومات کے غلغلہ سے گونج اٹھی تھی،
لیکن دنیائے تحقیق میں کسی بات کو حرف آخر کا درجہ حاصل نہیں ہے۔اس کا کارواں ہمیشہ ہر دم رواں پیہم دواں رہتا ہے۔اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علامہ سید صاحب نے اپنی ژرف بنی اور تلاش و جستجو سے ہندوستان سے عرب کے گونا گوں روابط کا ایک دلکش اور معلومات آفریں مرقع پیش کر دیا ہے۔لیکن قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنی کاوش و تحقیق اور مزید نایاب مآخذ سے استفادہ کر کے اس زمین کو آسمان بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اور چھ ضخیم مجلدات میں عرب و ہند کے عہد بعہد سیاسی، تجارتی، علمی اور مذہبی روابط کے بے شمار گوشوں اور گونا گوں خصوصیات کو اجاگر کیا ہے۔ان میں بکثرت ایسے قیمتی اور نادر مآخذ کے حوالے ملتے ہیں جن تک اس عہد میں سید سلیمان ندوی کی رسائی نہیں ہو سکی تھی۔اس بیش قیمت سلسلہ تصنیف سے جہاں وقت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل ہوتی ہے وہیں ملک میں قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ میں بھی اس سے بہت مدد ملتی ہے جو بجائے خود قاضی صاحب کا ایک زندہ جاوید کارنامہ ہے جس کی قدر صرف علمی حلقوں ہی کو نہیں بلکہ ارباب اقتدار کو بھی کرنا چاہئے۔
قاضی صاحب کی ان گرانقدر تصانیف ہی سے ہم پر اس تاریخی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین ہمیشہ سے مختلف تہذیبوں کا سنگم اور ایک اعلیٰ تمدن کا گہوارہ رہی ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں جنوبی ہند کے بعض ساحلی علاقوں اور سندھ میں عربوں کی تہذیب آئی اور پھر جب راستہ کھل گیا تو سولہویں صدی تک مسلمان اپنے جلو میں تہذیب و تمدن کے رنگا رنگ جلوے ساتھ لے کر ہندوستان آتے رہے اور پھر جب اس کا امتزاج ہندوستان کی مخصوص تہذیب سے ہوا تو اسلامی تہذیب ابھر کر سامنے آئی جس کی باد نسیم اس ملک میں عرصہ تک چلتی رہی۔قاضی صاحب کی تحقیقات سے ہماری معلومات میں یہ بھی اضافہ ہوتا ہے کہ عربوں نے ہندوستان میں صرف سیاست رانی اور جہانبانی ہی کے جوہر نہیں دکھائے بلکہ انھوں نے یہاں اسلامی علوم وفنون کی ہر شاخ کو گرانبار کیا اور اپنے شاندار علمی کارناموں سے اس ملک کو اقوام عالم کی صف پیشیں میں ممتاز مقام عطا کیا ہے۔
اسی طرح دیار پورب میں جو قدیم زمانے سے علم وفن کا مرکز اور علماء وفضلاء کا مخزن رہا

ہے اس کی علمی تاریخ مدون کرنے کی باضابطہ اور منظّم کوشش ابھی تک نہیں کی گئی تھی ۔ قاضی صاحب نے وقت کے اس اہم تقاضے کو محسوس کیا اور اس مردم خیز خطہ کے متعدد علمی ادوار قائم کرکے رسالہ معارف میں ایک طویل سلسلہ مضمون شائع کیا۔ مزید برآں خاص مبارک پور کے علماء وفضلاء کے سوانح وکمالات کا ایک ضخیم تذکرہ مرتب کیا جو اس موضوع پر ایک قیمتی مستند مآخذ بن گیا ہے۔ قاضی صاحب خود بھی اسی معدن فضل وکمال کے ایک لعل گرانمایہ ہیں اور آئندہ دیار پورب کے اہل کمال کا تذکرہ قلم بند کرنے والا مورخ انہیں اپنی فہرست میں نمایاں مقام دینے پر مجبور ہوگا۔

مستقل تصانیف کے علاوہ قاضی صاحب نے مختلف علمی ، مذہبی موضوعات پر نہایت کثرت سے معیاری مقالات بھی سپرد قلم کئے ہیں ۔ جو ملک کے بلند پایہ رسائل مثلاً معارف اور برہان وغیرہ میں شائع ہوکر ذوق شناسان علم وفن کے حلقہ میں پسند کئے گئے ، اگر صرف معارف ہی میں قاضی صاحب کے مطبوعہ مضامین کو یکجا کیا جائے تو سیکڑوں صفحات پر مشتمل ایک ضخیم مجموعہ تیار ہوسکتا ہے۔

حضرات! اس مضمون میں قاضی صاحب کی تمام علمی و تصنیفی خدمات کا مبسوط وتنقیدی جائزہ لینا مقصود نہیں ہے۔ اور نہ اس عجلت میں یہ ممکن ہی ہے۔ خلاصہ کلام کے طور پر صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس جلالت مرتبت اور علوئے شان کے باوجود قاضی صاحب کی خدمات کا وہ اعتراف نہیں کیا گیا ہے جس کے وہ واقعی مستحق ہیں۔ اس کا واحد سبب وہی ہے جس کی طرف میں ابھی تھوڑی دیر پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ یہ تخریب پسندی کا دور ہے اور جو اہل قلم کسی خاص گروہ اور جماعت سے وابستہ نہیں ہیں وہ انفرادی طور پر خواہ آسمان علم وادب کا آفتاب و ماہتاب ہی کیوں ہوں ۔ ان کی شہرت وعظمت کے اعتراف میں ہمیشہ بخل سے کام لیا جائے گا۔ مگر قاضی صاحب کی سیرت وشخصیت کے جن بنیادی اوصاف کی ابھی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس میں ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواہ کی گنجائش ہی کہاں ہے۔ قاضی صاحب نے تو اپنی تمام علمی خدمات اور تصنیفی کارناموں کی قدر وقیمت کا فیصلہ حال کے بجائے مستقبل کے مورخ کے ہاتھوں چھوڑ دیا ہے۔

قاضی اطہر مبارکپوری

بحیثیت مربی و معلم

مولانا مطیع الرحمٰن صاحب عوف ندوی

شفقت و محبت اور عظمت و رفعت کی چند جھلکیاں

لیجئے سلسلۂ حسرات کی کڑیوں میں ایک اور اضافہ ہوا، اور ۱۲؍ جولائی ۱۹۹۶ء کو علم وفن اور تحقیق و تصنیف کی دنیا میں نصف صدی تک رنگ و نور بکھیرنے والا ایک اور آفتاب غروب ہوگیا اور حسن اخلاق، تواضع و خاکساری، خودداری و بیباکی، اخلاص و محبت اور جہد و عمل کے ایک پیکر مجسم نے اس جہان فانی کو الوداع کہا۔ جس کے نفس گرم سے علمی مجالس میں رونق اور جس کی روشنی و تابانی سے دنیائے علم میں تابانی تھی، جس نے اپنا خون جگر پگھلا کر علم و تحقیق کے چراغ جلانے اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے گمنام گوشے روشن کئے۔ یہ شخصیت وہی ہے جس کو دنیا قاضی اطہر مبارکپوری کے نام سے جانتی ہے۔ قاضی صاحب نے قرآن و حدیث، تذکرہ و سوانح اور تاریخ کے موضوع پر تین درجن سے زائد تصنیفات یادگار چھوڑیں، جو ان کے وسعت علم اور زور تحقیق کی آئینہ دار ہیں۔ خصوصاً عرب و ہند کے تعلقات پر شائع شدہ ان کی کتابیں ایک انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتی ہیں جو اس بات کا ثبوت دیتی ہیں کہ قاضی صاحب علم کے آبشار اور استقامت کے پہاڑ تھے اور وہ سمندر کی تہوں سے موتی نکال لاتے تھے اور اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ اس نحیف و نزار جسم نے کتنے کتب خانوں کی گرد جمی ہوئی کتابوں کو الٹا پلٹا ہو اور اس میں سے اپنے مطلب کی چیزیں تلاش کرلی ہوں، اس کا پورے طور پر وہی اندازہ کرسکتا ہے جس نے قاضی صاحب کی کتابوں بالخصوص عرب و ہند تعلقات کے موضوع پر ان کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہو یا ان کی ذاتی زندگی اور ان کے معمولات سے واقف رہا ہو۔ قاضی صاحب عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ میری زیادہ تر ان سے ملاقات انہیں آخری سالوں میں رہی۔

باوجود اس عمر اور خرابی صحت کے خود ہی سارا کام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے کسی مضمون کا ایک صفحہ بھی دوسرے سے صاف کرانا گوارا نہ کرتے تھے۔ مضامین خود صاف کرتے اور بہت خوبصورت خط میں اپنے مخصوص قلم سے لکھتے۔

قاضی صاحب کا تعلق اس خطۂ علم وفن سے تھا جو اپنی مردم خیزی میں ضرب المثل ہے اور جسے ہندوستان میں ''پورب کا شیراز'' کہا جاتا ہے۔ اس خطہ میں کوئی عالم گیر شہرت کا ادیب و شاعر ہے تو کوئی تحقیق اور تصنیف میں ضرب المثل۔ کسی نے تاریخ نویسی اور سیرت نگاری کے سنگ میل قائم کئے تو کسی نے فلسفہ وسیاست کی پرخار وادیاں طے کیں۔ آج علامہ شبلی نعمانی سے کون ناواقف ہے، مولانا حمید الدین فراہی کا انکار کون کرسکتا ہے اور تحفۃ الاحوذی کے مصنف مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری اور مولانا عبیداللہ رحمانی شارح مشکوٰۃ المصابیح کو کون نہیں جانتا جو اس مردم خیز خطہ میں پیدا ہوئے؟ علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی نے اپنے ایک قصیدہ میں اس قصبہ کا بڑے والہانہ انداز میں تذکرہ کیا ہے وہ کہتے ہیں:

و غدا سراجا للبداية فی مبا — رکبور بل فی سائر البلدان

اسی طرح علامہ محمود طرازی نے بھی صاحب رجال السند والہند کے دیار کا بڑی خوبی اور بڑائی کے ساتھ ذکر کیا ہے:

بقيت (مباركپور) بالعلم، غضة
فضائك بالانوار دوما منور
فانك مبدأ العلم فی كل فترة
فقيه جليل من فنائك يظهر
وان لم يكن المولف وحده
كفاك و هذی منة لم تنكر

قاضی صاحب مرحوم کے تمام علمی کمالات اور صلاحیتوں کا مظہر ان کی وہ شہرہ آفاق کتابیں ہیں جنہوں نے علم وتحقیق کی دنیا میں اپنا سکہ جمایا، مصر وعرب اور ہندوپاک سے شائع ہونے والی ان کتابوں کے متعدد زبانوں میں ترجمے ہوئے، قاضی صاحب نے ایک ایسے

موضوع کا اپنی تحقیق کے لئے انتخاب کیا جو اچھوتا اور نرالا ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی عرق ریزی اور کدوکاوش کا محتاج تھا اس سے قبل اس موضوع پر علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کے قلم گہربار سے جو لکھا گیا تھا وہی موجود تھا گو علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب عرب و ہند کے تعلقات اپنے معنویات کے اعتبار سے عرب و ہند کے تعلقات پر جامع کتاب ہے جو اس موضوع پر پہلی کتاب کہی جانے کی مستحق ہے لیکن بہت مختصر ہے ۔ قاضی صاحب نے اس موضوع کو پھیلا کر ہندوستان کو عہد رسالت ، خلافت راشدہ ، بنوعباس ، بنوامیہ سے جوڑ دیا اور اس طرح سے یہ کتابیں سیرت وتاریخ کی اول درجہ کی کتابیں تسلیم کی گئیں ۔

قاضی صاحب بڑے ہی متواضع ،شفیق اور حق گو تھے اس حد تک علمی بلندی کے باوجود وہ عام لوگوں سے ان کے گھر کے ایک فرد کی طرح ملتے اور کبھی علمی تفوق اور اپنے اختیار کو جتاتے نہیں تھے ۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگ ان کا حد درجہ احترام کرتے تھے قاضی صاحب کا معمول تھا کہ وہ شام کو عموماً بعد عصر بازار جاتے تھے ان کا خاص مقصد لوگوں سے ملاقات کرنا ہوتا وہ لوگوں سے ملتے خیریت پوچھتے ،اگر کوئی پریشان ہوتا تو اس کو تسلی دیتے اور آگے بڑھ جاتے ،خلیق تھے ، شفقت ومحبت ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔خصوصاً اہل علم کے ساتھ اس طرح پیش آتے اور ایسا اکرام کرتے کہ خود ان کی عظمت کا احساس تک نہ ہوتا بڑی ہمت افزائی کرتے تھے ۔بعض مرتبہ مجھے اہم شخصیات سے ملاتے وقت ایسا تعارف کرایا کہ مجھے شرم محسوس ہونے لگی ۔ قاضی صاحب کی محض عالی ظرفی ہی کہی جائے گی یہ ان کی عظمت تھی کہ وہ چھوٹوں اور خردوں کو آگے بڑھانا چاہتے تھے اسی وجہ سے وہ ان کو پکڑ کر چلنا سکھاتے تھے ۔ وہ ملت کے مسائل سے بھی حد درجہ متاثر ہوتے ،خصوصاً علم کی ناقدری پر بہت سوچتے ،فکر مند رہتے اس مادی دور میں علم اور علماء کی جو ناقدری ہورہی ہے اس کے بارے میں اپنے تفکرات ظاہر کرتے تو ان کے احساس دردمندی کا اظہار ہوتا وہ حقیقت میں عجم کے حسن طبیعت اور عرب کے سوز دروں کی ایک تصویر تھے ، قاضی صاحب کی طبیعت باغ و بہار تھی جس مجلس میں بیٹھتے تھے ایسا نہیں تھا کہ ان کی وجہ سے تکلف کے باعث مجلس پھیکی ہوجاتی وہ ،فوراً بے تکلف ہوجاتے اور مجلس میں ایک زندگی دوڑا دیتے ،عمر کفایت شعاری میں گزاری اور تادم آخر وہ استغناء ، کفایت شعاری اور صبر جمیل کا

مجسمہ تھے، علم کے ایسے بحر نا پیدا کنار تھے کہ برصغیر کے بڑے بڑے علماء، دانشوران، محققین ،ریسرچ اسکالرس اور ادباء آپ کو اپنے فن میں یکتا سمجھتے تھے۔ قاضی صاحب جس موضوع پر لب کشا ہوتے ایسا لگتا کہ علم کا آبشار ہے۔ حافظہ بے پناہ تھا اس کا اندازہ ان کی علمی مجلسوں اور علمی و تاریخی گفتگو سے ہوتا تھا، اور اکثر ان کے گھر علماء اور تعلیم یافتہ حضرات آتے رہتے تھے۔ قاضی صاحب ایک اچھے خطیب بھی تھے ایک بار بتایا کہ بمبئی میں عالم شباب میں دو دو ڈھائی ڈھائی گھنٹے تقریر کی ہے۔ لیکن عمر کے ساتھ ساتھ آواز میں پستی آتی گئی۔ اس کے ساتھ پوری بات کو بخوبی سمجھنے میں بھی دشواری ہوتی تھی۔ اس لئے تقریر بہت کم کرتے تھے۔ قاضی صاحب کے ساتھ دو تین بار سفر کیا، ان اسفار کی روداد بہت ہی دلچسپ اور یادگار رہے، علاقوں کی تاریخ بالخصوص اعظم گڑھ کے ایک ایک گاؤں کی تاریخ سے اس طرح واقف تھے جیسے کہ انسان اپنے گھر اور خاندان سے واقف ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ، راستہ میں جتنے گاؤں پڑتے سب سے پہلے ان کی وجہ تسمیہ بتاتے اور اس کے بعد اس سے منسوب کوئی اہم تاریخی چیز ہوتی تو اسے بتاتے، نیز وہاں کی اہم شخصیات کا بھی ذکر کرتے۔ مبارکپور سے متصل علاقے ویسے بھی ماشاءاللہ بڑے مردم خیز رہے ہیں۔ قاضی صاحب جب انگلی اٹھا کر بتاتے کہ یہ فلاں گاؤں ہے اور یہاں کے مولانا امین احسن اصلاحی ہیں، یہ فلاں گاؤں ہے، یہاں مولانا عبدالحمید فراہی پیدا ہوئے تھے اور فلاں یہاں پیدا ہوئے، فلاں یہاں تو ایسا لگتا کہ یہ ماوراءالنہر کا کوئی خطہ ہے

قاضی صاحب سے میرا تعلق عرصہ سے غائبانہ تھا بچپن میں جب والد صاحب کی ڈاک میں قاضی صاحب کے خطوط دیکھتا تو دل چاہتا کہ کاش میری بھی خط و کتابت ہوتی اور تعارف ہوتا۔ اس کے بعد جب ہوش ہوا تو البلاغ وغیرہ میں مضامین پڑھے تو ملنے کا اشتیاق مزید بڑھتا گیا لیکن وہ بمبئی جیسے دور دراز علاقہ میں تھے۔ اس لئے باوجود خواہش کے ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ اور جب قاضی صاحب ندوۃ العلماء کی مجلس شوریٰ میں تشریف لائے تو پہلی بار ملاقات ہوئی اور ساتھ میں محمود آباد تک بھی گیا، اس وقت قاضی صاحب کا تین دن ہمارے یہاں قیام رہا ،خط و کتابت اس ملاقات کے پہلے سے شروع ہو چکی تھی۔ دیدار نے اس تعلق کو اور بڑھا دیا اور

اب مبارکپور جانے کا شوق سر میں سما گیا چنانچہ اس کے بعد جلد ہی مبارکپور گیا اور تقریباً ۶ روز کے قیام کے بعد واپسی ہوئی، ان ملاقاتوں میں قاضی صاحب کو بھی مجھ سے بڑا تعلق ہو گیا تھا اور ان کی محبت وشفقت نے مجھے بڑا حوصلہ دیا اور اس میں کوئی دورائے نہیں کہ میں نے اپنی زندگی کا پہلا دیا اسی شمع سے جلایا تھا اور جب ان سے ملتا تو مزید روشنی پاتا۔ قاضی صاحب کو بھی مجھ سے حد درجہ لگاؤ اور انس تھا اور وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح ہاتھ پکڑ کر مجھے لکھنا سکھاتے۔ جب تک ان کے یہاں رہا یہ تحقیق وہ جستجو، یہ نام اس کتاب میں اس سلسلے میں آیا ہے تو فلاں میں کس طرح ہے وغیرہ وغیرہ، الغرض قاضی صاحب نے مجھے تلاش وتحقیق اور لکھنے پڑھنے کا طریقہ سکھایا یہی وجہ ہے کہ آج تک مجھے اس سے بڑھ کر کوئی رنج نہیں ہوا جتنا قاضی صاحب کی وفات سے ہوا، میں نے ایک ایسے علمی سرپرست کو کھو دیا جس کی جدائی میرے ذہن ودماغ کو برداشت نہ ہوسکی اور ہر وقت ان کی شخصیت ایسی سمائی رہتی ہے کہ تصور میں ہر آن انہیں کا چہرہ اور باتیں، کتابیں، مسکراتا بولتا چہرہ رہتا ہے۔ قاضی صاحب کے تعلق کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ۹۲ء میں میرے بائیں ہاتھ کی ایک ہڈی میں فریکچر ہو گیا تو اس کی اطلاع ملنے پر لکھا۔

۱۰؍رجب ۱۴۱۵ء ۱۴؍دسمبر ۱۹۹۴ء

عزیزی مولوی مطیع الرحمٰن سلّمہٗ اللہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کل خط ملا، ہاتھ کے حادثہ کی خبر سے افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ جلد شفا دے، تمہاری بائیں کلائی میں موچ آ گئی ہے، بچپن میں میرا بایاں پاؤں ٹوٹ گیا تھا یعنی ہڈی ٹوٹ گئی تھی، یہ کسر وانکسار آہنگی اور مناسبت کی علامت ہوسکتی ہے، دو تین دن ہوئے مفصل لفافہ روانہ کیا ہے جس میں اصحاب صفہ سے متعلق اپنی کتاب کے مسودہ کے اوراق بھی رکھ دیئے ہیں۔ اور ایک مفصل خط بھی ہے غالباً مل گیا ہوگا، اصحاب صفہ پر کام وقت ملنے پر کرتے رہو، حلیۃ الاولیاء ابونعیم اصفہانی سے جو حالات مل سکیں نقل کرلو، اس کی تلخیص **صفوۃ الصفوۃ لابن جوزی** میرے پاس ہے، اس میں بھی کچھ نہ کچھ ہوگا، دیکھوں گا اپنی کتاب بنات اسلام میں اضافہ کر رہا ہوں تکمیل ہو چکی ہے۔ حسان اور ظفر، مسعود سلام کہتے ہیں۔ قاضی اطہر مبارکپوری

جب بانگ درا میں لکھنا شروع کیا تو اپنی تحریر پڑھ کر بے اعتمادی سی ہوتی، اور دل چاہتا

کہ اگر کوئی قاعدے سے مستقل اصلاح کرتا تو شاید تحریر ٹھیک ہو پاتی، اطمینان نہ ہوتا، قاضی صاحب کو اس سلسلے میں لکھا کہ شاید اس جانب وہ رہنمائی کریں تو انھوں نے اس کے جواب میں جو تحریر کیا وہ تمام طالب علموں اور تحریر و تصنیف سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مشعل راہ اور ہمت افزائی کا باعث ہے اس کو بھی نقل کیا جارہا ہے۔

قاضی منزل، مبارک پور باسمہٖ تعالیٰ

یکم جمادی الثانیہ ۱۴۱۴ھ ۱۶؍نومبر ۱۹۹۳ء

عزیزی مولوی مطیع الرحمٰن سلّمه الله تعالیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میں ۶؍اکتوبر سے ۱۳؍نومبر تک دہلی، دیوبند، جے پور، اجمیر بمبئی کے سفر میں تھا۔ اس درمیان میں تم عزیز کا خط آیا، نیز عزیزی مولوی محمد عوف سلّمہٗ اللہ تعالیٰ کا خط آیا آج دونوں کو جواب دے رہا ہوں، مضمون میں کوئی بات قابل اصلاح ہوگی تو لکھوں گا اور اصلاح کی کیا ضرورت ہے، لکھتے لکھتے خود ہی اصلاح ہو جاتی ہے، لکھتے رہو، اصلاح ہوتی رہے گی، ہم سب کا یہی طریقہ رہا ہے، علمی وادبی، ثقافتی خبروں کا اضافہ دلچسپی کا باعث ہوگا اور رسالہ میں تنوع ہوگا، نیز اس سلسلے میں تحقیق وتلاش کا ذوق بڑھے گا۔ ہاں بانگ درا میں م، ع سیتاپوری کون صاحب ہیں؟ ابھی سے نام چھپانے کا خیال مناسب نہیں ہے۔ اوساط علمیہ میں متعارف ہونے کا یہی وقت ہے۔ ہر مضمون میں اپنا نام لکھا کرو، ویسے کبھی مضامین کی کثرت کی وجہ سے ایسا کیا جاتا ہے، مولانا مفتی ظہور صاحب اور مولانا عتیق صاحب کو سلام کہو۔ والسلام

الغرض قاضی صاحب نے نئی نسل کی رہنمائی اور علمی ذوق کے فروغ کے لئے پوری دلچسپی اور شوق سے کام لیتے تھے اور وقتاً فوقتاً خطوط اور ملاقاتوں کے ذریعہ اس ذوق کو نکھارنے کی کوشش کرتے رہتے۔ جب مولانا سید محمد امین صاحب نصیر آبادی کے مخطوطہ (فتاوی) کی تخریج وغیرہ کا کام شروع کیا تو فطری طور پر سید صاحب کی زندگی سے واقفیت کا بھی خیال پیدا ہوا ان کا حلقہ اصلاح و دعوت اعظم گڑھ، سلطان پور رائے بریلی تھا۔ جب مبارکپور گیا تو قاضی صاحب سے خواہش ظاہر کی، میرا خیال تھا کہ قاضی صاحب راستہ وغیرہ کی رہنمائی فرمادیں گے اور میں چلا جاؤں گا۔ لیکن معلوم ہوا کہ قاضی صاحب خود تیار ہیں۔ پہلے خیر آباد جانے کا پروگرام بنایا گیا

وہاں قاضی صاحب خیرآباد مدرسہ منبع العلوم تشریف لے گئے اور اساتذہ کرام سے تعارف و ملاقات کرائی، اور آنے کا سبب بتایا نیز وہاں کے امام صاحب جنھوں نے بچپن میں سید صاحب کا زمانہ دیکھا ان سے ملاقات کرائی اس سفر میں کافی کامیابی ہوئی۔ خاص کر قاضی صاحب نے اس سفر کو مزید دلچسپ اور یادگار بنادیا، قاضی صاحب کی علم نوازی اور شفقت ومحبت کی ایک زندہ جاوید مثال ہے۔

دوسرے دن جہانا گنج جانا تھا، اگر چہ بارش کا موسم تھا لیکن اس دن بظاہر بارش کے آثار نہیں تھے، دھوپ تھی، شام ۴؍ بجے ہی قاضی صاحب اور ہر طرح سے خیال رکھنے والے ان کے پوتے اور حاجی ظفر مسعود صاحب کے بڑے صاحبزادے جوان دنوں دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کررہے ہیں، اور اب الحمدللہ وہاں سے فراغت حاصل کر چکے ہیں، برادرم فرحان قاسمی صاحب ہمراہ تھے۔ اتفاق سے اس روز ہم لوگ موٹر سائیکل سے مبارکپور سے کچھ ہی دور نکلے تھے کہ ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی، بالآخر رکتے رکاتے، بھیگتے بھاگتے، رات میں بعد عشاء منزل پر پہونچے۔ ہم سب پانی میں شرابور تھے، وہاں پہونچ کر کپڑے بدلے، نماز ادا کی، اور اس کے بعد کھانے وغیرہ سے فارغ ہوکر آرام کیا دوسرے دن مدرسہ میں اساتذہ سے ملاقات کی، لائبریری دیکھ کر قاضی صاحب بہت خوش ہوئے۔ ایک ایک کتاب اٹھا اٹھا کر دیکھی۔ اس کے ایڈیشن اور دیگر خصوصیات یا کوئی قابل ذکر بات ہوتی تو اس کو بھی بتاتے جاتے، مدرسہ کے مہتمم جناب مولانا عبدالرب قاسمی صاحب نے اردو کے رسالہ کی اجراء کی خواہش ظاہر کی تو بہت خوش ہوئے اور اس میں ہر طرح کے تعاون کا وعدہ کیا۔ شام تک وہاں سے واپسی ہوئی، معلوم ہوا کہ قاضی صاحب علاقہ کے تمام مدارس سے گہرا ربط رکھتے ہیں۔ ان کے ذمہ داروں کی حوصلہ افزائی، نظام تعلیم میں دلچسپی اور ان کی جملہ رہنمائی کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ان مدارس میں آتے جاتے رہتے ہیں، اسی طرح شبلی اکاڈمی اعظم گڑھ بھی آمد ورفت رہتی، پہلی بار میرا شبلی اکاڈمی میں قاضی صاحب کے ساتھ ہی جانا ہوا۔ محترم مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور مولانا عمیر الصدیق صاحب وغیرہ سے ملاقات ہوئی اور ان سے تعارف کرایا، الغرض قاضی صاحب ہر طالب علم خاص طور سے علمی ذوق رکھنے والے ہر فرد سے ربط رکھتے تھے

اوران کا ہر طرح تعاون کرتے تھے۔خطوط اور ملاقاتوں کے ذریعہ ان کے موضوع کے لائق چیزیں بتاتے ،مبارکپور میں ان کے پاس طلباء کے وفود آتے اور ایک نیا جوش وولولہ اورتازہ عزم وہمت لیکرواپس جاتے ،جب قاضی صاحب شیخ الہند اکیڈمی کے سلسلہ میں دیوبند جاتے تو کبھی کبھی کئی روز قیام کرتے وہاں بھی طلباء کے اندر علمی ذوق وشوق اجاگر کرنے کے لئے قاضی صاحب طلباء کی تربیت کرتے ،ان کے مطالعہ کے سلسلے میں مکمل رہنمائی کرتے اور طلباء سے اس طرح بے تکلف ہوجاتے کہ ان سے استفادہ میں نہ کوئی تکلف حائل ہوتا اور نہ کسی قسم کی جھجک ہوتی۔اس طرح عام مزاج سے ہٹ کر قاضی صاحب سے فائدہ اٹھانا زیادہ آسان ہوجاتا تھا۔

قاضی صاحب کی پوری زندگی طالبان علوم نبوت کے لئے اور دنیا میں کچھ کرجانے کا عزم رکھنے والوں کے لئےمشعل راہ اور سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔بمبئی جیسے صنعتی وتجارتی شہر میں تمام ہنگاموں سے قطع تعلق کرکے قاضی صاحب نے اپنی ساری کتابیں تصنیف کیں۔ یہ قاضی صاحب کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ وسائل کی کمی اور مسائل کی کثرت کے باوجود قاضی صاحب اپنی دنیا میں مگن رہے۔انھوں نے کسی مشکل کی پرواہ اور اپنے بنائے ہوئے نظام اور اصولوں کوکبھی نہیں توڑا۔آخرکارکامیابی وکامرانی نے ان کے قدم چومے۔یہی وجہ ہے کہ قاضی صاحب آخر عمر تک ان اصولوں کی خلاف ورزی نہ کرتے تھے۔

قاضی صاحب نام تھا اصول کا ، جدوجہد کا ، جانفشانی کا ، آج قاضی صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے۔لیکن ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ان کے مضامین کا ایک ایک لفظ اوران کی تحریروں کا ایک ایک نقش ہمیں یہ بتارہاہے کہ وہ زندہ ہیں،اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔ان کی رات دان کی محنت وجانفشانی آنے والی نسلوں کوایک درس دیتی ہے۔اوران کی پوری زندگی ایک آئیڈیل اور قابل تقلید ہے۔آج بھی ان کے گہرے نقوش ان کی زندگی کا پتہ دیتے ہیں اور رہتی دنیا تک دیتے رہیں گے۔

کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی   ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

☆☆☆☆☆

کچھ اہم کتابوں کے تعارف

۱۔۔۔تعارف ''العقد الثمین''

۲۔۔۔دیار پورب میں علم اور علماء

۳۔۔۔تعارف ''رجال السند والہند''

تعارف العقد الثمین

حضرت مولانا زین العابدین صاحب الاعظمی المعروفی
صدر شعبہ تخصص فی الحدیث جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

یہ کتاب مورخ عصر جناب قاضی اطہر صاحب مبارکپوری مرحوم کی تالیف ہے جس میں عرب اور ہند کے ثقافتی روابط کا بیان ہے یہ عربی زبان میں تین سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

کتاب کا پورا نام: اس کا پورا نام یہ ہے''القعد الثمین فی فتوح الهند ومن ورد فيها من الصحابة والتابعين '' یعنی یہ ایک بیش قیمت لڑی ہے جس میں اسلامی ہند کی فتوحات اور یہاں تشریف لانے والے صحابہ وتابعین جیسے آب دار موتیوں کے دانوں کو پرو دیا گیا ہے۔

وجہ تصنیف: مصنف نے یہاں نہایت قلق کے ساتھ اس کی وجہ تالیف وہ بیان کی ہے جس کو مصنف تاریخ جرجان نے حسرت سے لکھا تھا:

''اکثر ملکوں اور شہروں کے باشندوں کو میں دیکھتا ہوں کہ ان لوگوں نے پوری حمیت سے اپنے اپنے علاقوں کے حالات تحریر کئے ہیں اور فخریہ طور سے صحابہ وتابعین اور دیگر علماء بلکہ ان رؤساء تک کے حالات کو اپنی کتابوں میں جمع کر دیا ہے جن کا تعلق ان علاقوں سے رہا ہے مگر اپنے علاقہ کے علماء نے اس عظیم خدمت کی طرف توجہ نہیں کی حالانکہ اکابر سلف، صحابہ کرام وتابعین عظام کے بعد بڑے بڑے علماء زمانہ ہمارے یہاں بھی پیدا ہوئے، مگر نہ خود ان کے فضل وکمال کا علم بعد والوں کو ہوا اور نہ ان بزرگوں نے اپنے سے پہلے والے بزرگوں کے کارناموں پر کوئی تاریخ مرتب فرمائی تو میں نے اپنی ناتوانی کے باوجود اپنے مقدور بھر اس خدمت کو انجام دینے کا بیڑہ اس وقت اٹھایا جب بڑے بڑے لوگ دنیا سے چلے گئے اور ان کی معلومات کو فراہم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہا اور اگر کسی نے روزنامچہ لکھا بھی تھا تو بعد میں آنے

والوں کی ناقدری دیکھ کر انہوں نے خود ہی ضائع کر دیا۔ پس جتنا بھی میرا بس چلے تفتیش و تحقیق کرنے کے بعد اکابر کے حالات لکھتا ہوں (تاریخ جرجان از ابوالقاسم بن یوسف الجرجانی ۱؍۳،۴ (العقد الثمین ص:۲)

ترتیب :۔ ہندوستان کے متعلق یہی تاثر دینے کے بعد قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ میں اس کتاب میں سب سے پہلے ان غزوات کا بیان کروں گا جن کا وقوع اسلامی خلفاء کے زمانہ میں ہندوستان میں ہوا، اور ان ہندوستانی حکمرانوں اور امیروں کا ذکر کروں گا جو خلفاء اسلام کی طرف سے ہندوستانی ریاستوں یا ہندوستانی غزوات میں نامزد ہوئے تھے، پھر تھوڑے سے ان صحابہ کا ذکر ہوگا جو ہندوستان میں تشریف لائے اور وہ بہت تھوڑے لوگ ہیں، اس کے بعد تابعین اور مخضرمین کا پھر ان اکابر کا تذکرہ کروں گا، جنھوں نے تابعین کا زمانہ پایا اور تبع تابعین کا بھی ذکر کروں گا اور یہ سب اس طرح کہ ان کے صحابی ہونے یا تابعی ہونے کی تصریح کردوں گا اور تابعی ہونے کی تصریح میں اس بات کا لحاظ رکھوں گا کہ ان کی روایت کسی صحابی سے براہ راست مجھ کو مل جائے یا صراحۃً ان کی ملاقات کسی صحابی سے ثابت ہو جائے ورنہ محض تابعین کے زمانہ میں ہونے کی وجہ سے ان کو تابعی نہیں سمجھوں گا بلکہ تابعی کا معاصر سمجھوں گا سب سے آخر میں ایک باب ایسا مقرر کروں گا جس کا تعلق ہندوستان میں علم حدیث سے ہوگا۔ اس باب میں ہندوستانی محدثین اور دوسرے ایسے علماء کا بھی ذکر خیر ہوگا جو صدر اول میں ہندوستانی نسل سے پیدا ہوئے ہیں۔

ناظرین کرام اس بات کا خیال رکھیں کہ جناب قاضی صاحب کے پیش نظر وہ ہندوستان ہے جو ملک سندھ کو شامل ہے جس کے کچھ علاقے سردست پاکستان میں پڑ گئے ہیں بلکہ ان میں سے بعض افغانستان میں واقع ہیں اور کچھ اس وقت روس کے زیرنگیں ہیں کیونکہ خلافت اسلامیہ کے زمانے میں یہ سب ممالک حاکم خراسان کے ماتحت رہا کرتے تھے مثلاً کرمان کا علاقہ (روس میں) اور القفص یعنی بلوچستان جس کا آدھا اس وقت افغانستان میں واقع ہے یعنی اس وقت کا ہندوستان جو غیر منقسم ہندوستان سے بھی مغرب میں بڑھا ہوا تھا۔

خلفاء راشدین کے زمانہ میں جو ہندوستانی روابط عرب سے ہوئے ان میں سے سیدنا

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں سے صرف اتنے کا ذکر ہے کہ عرب میں آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جو ارتداد یا فتنہ اٹھا تھا اور ان کے خلاف جو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جنگی مہمیں چلائیں تو مرتدین کے ساتھ دو قومیں ایسی بھی شریک تھیں جو نسلاً ہندوستانی تھے لیکن عرصہ سے عرب میں فروکش ہو گئے تھے وہ تھیں قوم زُط (جاٹ) سیابجہ ( ) یہ دونوں بھی مرتدین کے ساتھ مل گئی تھیں اور انکے شکست کھانے کے بعد یہ بھی پسپا ہو گئی تھیں۔

عمر فاروقؓ کا دور خلافت:۔ اس خلافت کے دور میں زط اور سیابجہ کا اسلام لانا اور خود ہندوستان میں اسلامی شعاعوں کے پھوٹنے کا ذکر کرنے کے بعد تین امراء کا ذکر کیا گیا ہے۔ عثمان بن ابی العاص ثقفی، ان کے بھائی حکم بن ابی العاص ثقفی اور ان کے دوسرے بھائی مغیرہ کا، اور ان دونوں کو عثمان بن ابی العاص نے بعض علاقوں کی امارت سپرد کی تھی۔ جبکہ عثمان بن ابی العاص کو حضرت عمرؓ نے بحرین اور عمان کا امیر مقرر کیا تھا اور سات غزوات کا تذکرہ ہے :(۱) تھانہ اور بھروچ وغیرہ کی فتح (۲،۳) مکران کی دو فتح (۴) قفص (بلوچستان) کی فتح (۵) سجستان سے ملحق سندھ کے علاقوں کی فتح (۶) اھواز میں زط سے مسلمانوں کا مقابلہ اور فتح

اس کے بعد چند صحابہ اور تابعین اور مدرکین وغیرہ کا ذکر ہے اور ان کے ذکر سے پہلے قاضی صاحب نے فرمایا کہ ہندوستان میں بہت ہی کم صحابہ آئے ہیں اور جو آئے ہیں وہ عموماً صغار صحابہ ہیں، ان میں سے کچھ وہ بھی ہیں جو صحابہ کے ساتھ ملحق کئے جا سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے کہ آنحضور ﷺ کے زمانہ میں پیدا ہو چکے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عام عادت کے موافق غالب گمان یہ ہے کہ ان کو ان کے بڑے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں تحنیک و تبریک کیلئے لائے ہوں گے۔ البتہ عظیم صحابہ کرام جن کا ہندوستان سے صرف اتنا تعلق ہے کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں کسی غزوہ میں ہندوستان آئے یا ہندوستان کے غزوہ میں شرکت کی تمنا ہی لئے ہوئے آخرت کو سدھار گئے۔ ان چند کے حالات درج کئے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ:۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ۷ھ میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضور ﷺ کی مجلس کے خاص حاضر باش صحابی ہیں صفہ پر قیام تھا۔ سوائے حدیث یاد کرنے کے ان کا کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ ان کی حدیثیں حدیث کے ذخیروں میں پانچ

ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) ہیں اتنی حدیث کسی صحابی سے ہم تک نہیں پہونچی ہے۔ سنن نسائی میں ایک حدیث وارد ہوئی ہے۔

''کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو غزوۂ ہند کی بشارت دی، اگر میں اس غزوہ کو پالوں تو اپنی جان و مال میں اس پر قربان کردوں گا اور اگر میں اس میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تو میرا شمار افضل الشہداء میں ہوگا اور اگر بچ کر واپس آ گیا تو میں جہنم سے آزاد کیا ہوا ابو ہریرہ ہوں گا۔'' (العقد الثمین ص:۲۱)

یہ حدیث سنن نسائی باب غزوۃ الہند ج:۲ ص:۶۳ پر ہے اس کے بعد ایک اور حدیث بھی وہیں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا میری امت کے دو گروہ ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے آگ سے محفوظ کر دیا ہے: (۱) وہ جماعت جو ہندوستان کا غزوہ کرے گی (۲) وہ جماعت جو عیسیٰ بن مریم کے ساتھ ہوگی۔''

یہ دونوں حدیثیں اسلامی ہند کے لئے عظیم بشارتیں ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا انتقال حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے اخیر دور میں ۵۹ھ کے آخر میں یا ۶۰ھ کے شروع میں ہوا۔

حضرت عثمان بن ابی العاص: ۔ آپ کی کنیت ابو عبداللہ ہے سلسلہ نسب پدری یہ ہے عثمان بن ابی العاص بن بشر بن عبد دھمان اس کے بعد ساتویں پشت پر جُشم بن قسی ہین اور قسی بن منبہ کا لقب ثقیف ہے اس لئے یہ ثقفی ہیں۔

اور مادری سلسلہ یہ ہے عثمان بن صفیہ بنت امیہ بن عبد شمس اور دوسرا قول یہ ہے عثمان بن فاطمہ بنت عبداللہ بن ربیعہ ہر دو اقوال کی بنا پر ماں کی طرف سے قرشی ہوئے۔ ۹ھ میں وفد ثقیف کے ساتھ مدینہ میں آکر مشرف باسلام ہوئے اس وقت پورے وفد میں یہ سب سے چھوٹے تھے۔ اس لئے جب سب لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جاتے تو یہ سامان کی حفاظت کی غرض سے پڑاؤ پر رہ جاتے جب دوپہر کے قریب سب لوگ پڑاؤ پر آجاتے تو یہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں باریاب ہوکر قرآن کریم سیکھا کرتے۔ اگر نبی اکرم ﷺ سے ملاقات نہ ہوتی تو یہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کے پاس جاکر ان

سے قرآن سیکھتے ، جب بنوثقیف کا وفد واپس جانے لگا تو انہوں نے درخواست کی کہ ان کی قوم میں سے کسی کو ان کا امیر مقرر کر دیا جائے ۔حضور اقدس ﷺ نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے مشورہ سے انہیں کو امیر مقرر کر دیا اور یہ نصیحت فرمائی:

’’کہ نماز پڑھاتے وقت سب سے کمزور شخص کا اندازہ لگا کر اتنی ہی لمبی نماز پڑھانا جس کو سب لوگ بشاشت اور دل جمعی سے ادا کر سکیں اور ایسا موذن مقرر کرنا جو اذان پر اجرت نہ چاہے‘‘۔

آنحضرت ﷺ کے بعد جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور ارتداد کا فتنہ اٹھا تو ان کی قوم میں جو ضعیف الایمان تھے وہ بھی مرتد ہو جانا چاہتے تھے ۔انھوں نے ان سب کو سنبھالا اور کہا کہ یہ بہت بری بات ہے اسلام لانے میں تو تم لوگ سب سے پچھڑ گئے اور اسلام چھوڑنے میں پیش قدمی کرنے لگے خبردار!

وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۔(سورۃ البقرۃ:۲۱۷)

جو دین چھوڑے گا اور کفر کی حالت میں جائے گا اسکے دنیا و آخرت کے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے۔

آپ کی یہ نصیحت کارگر ہوئی اور ثقیف میں سے کوئی بھی مرتد نہ ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ نے عثمانؓ کی امارت کو برقرار رکھا پھر حضرت عمرؓ نے بھی اس کی اتباع کی پھر ۱۵ھ میں جنگی مہم پر جب حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کو بحرین بھیجنا چاہا تو ان کو یہ تردد لاحق ہوا کہ وہ تو طائف میں آنحضرت ﷺ کے مقرر کردہ امیر ہیں کیسے میں ان کو بلاؤں آخر میں یہ طے پایا کہ عثمان بن ابی العاص اپنی پسند کے موافق کسی کو طائف کا امیر مقرر کر کے مدینہ چلے آئیں پھر حضرت عمر نے ان کو بحرین اور عمان کا حاکم مقرر کر دیا اور وہاں انھوں نے فارس کے علاقہ سے اسلامی فوجوں کو ملک ہند کے قریب پہنچا دیا پھر ہندوستان میں انہوں نے تین غزوات کئے کسی میں خود امیر ہوتے کسی میں اپنے بھائی حکم بن ابی العاص کو امیر سریہ بناتے اور مقام ’’توج‘‘ میں غزوہ سے واپس آ کر کچھ دنوں آرام کرتے فارس اور خراسان کے کئی شہروں کو فتح کیا پھر ہندوستان کے علاقوں میں تھانہ، بھڑوچ اور دیبل کو فتح کیا۔ ۲۹ھ میں حضرت عثمانؓ نے ان کو مدینہ بلا لیا اور

خراسان کی مہم پر عبداللہ بن عامر بن کریز کو امیر مقرر فرما دیا۔ مدینہ پہونچ کر حضرت عثمانؓ سے آپ نے بصرہ میں رہنے کی اجازت لی اور وہیں وفات تک مقیم رہے ان کی وفات بھی حضرت معاویہ کے زمانہ میں ۵۰ھ یا ۵۱ھ میں ہوئی۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔ (ماخوذ از عقد ثمین ص: ۳۴ تا ۶۴)

ایک اشکال:۔ تھانہ بھڑوچ اور دیبل کے غزوہ کا ذکر قاضی صاحب نے جمہرۃ انساب العرب سے نقل کیا ہے جن میں سے دونوں آج بھی ہندوستان مین ہیں اور دیبل سندھ میں ہے لیکن ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث غزوۃ الہند کے بارے میں گزر چکی کہ اگر میں غزوہ کا زمانہ پالوں گا تو اپنی جان، مال سب اس کی شرکت پر قربان کردوں گا مگر کسی بھی مورخ نے حضرت ابو ہریرہؓ کا اس غزوہ میں شریک ہونا ذکر نہیں کیا۔ ۵۹ھ تک وہ وہ مدینہ میں ہی رہے اور وہیں وفات پائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کا غزوہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں نہیں ہوا اور حکم کی وفات ابو ہریرہ سے بھی پہلے ہو چکی ہے۔ اس لئے ہندوستان میں ان کا پہونچنا بہت ہی مشتبہ ہو جاتا ہے، اور جمہرۃ انساب العرب کی روایت نسائی کی صحیح حدیث کے مقابلہ میں بہر حال مرجوح رہے گی۔

جواب:۔ ممکن ہے کہ حضرت ابو ہریرہ غزوۂ ھند سے مراد ایسے غزوہ کو سمجھ رہے ہوں جو خاص مدینہ یا دارالخلافت سے باقاعدہ ہند فتح کرنے کے لئے روانہ ہوا ہو جیسا کہ ۹۳ھ میں محمد بن قاسمؒ نے باقاعدہ لشکر کشی کی اور وہ ابو ہریرہؓ کی وفات کے ۳۳۔۳۴ برس بعد کا واقعہ ہے۔ اسی کی تمنا لئے ہوئے حضرت ابو ہریرہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اور عثمان بن ابی العاص غزوہ ہند کیلئے نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ بحرین اور عمان کی امارت پر مقرر ہوئے تھے آگے انھوں نے اپنی عمل داری بڑھائی اور خراسان کی اس سرحد تک پہونچ گئے جو ملک سندھ کی سرحد سے ملتی تھی۔ پھر ۲۳ھ میں اپنے بھائی حکم بن ابی العاص کے تعاون سے ان تینوں شہروں کا غزوہ کیا ہو جس کی خبر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو نہ پہونچی ہو۔ اس طرح جمہرۃ انساب العرب کی روایت کو مرجوح کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ اور حضرت ابو ہریرہ کی اس غزوہ مین شرکت کا عذر بھی نکل آئے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

حکم بن ابی العاص ثقفی:۔ عثمان کے بھائی ہیں ۔ ابن سعد نے ان کو صحابی شمار کیا ہے ۔ ان کے بھائی نے انہیں بحرین کی ولایت دی تھی تو اس وقت حکم نے کئی شہروں کو فتح کیا جس میں ''شہرک'' کے قیدی مدینہ بھیجے گئے بھروچ اور تھانہ پر حکم ہی نے چڑھائی کی تھی اور اپنے بھائی کے ساتھ مل کر اس کو فتح کیا تھا۔

لیکن دوسرے محدثین ان کو صحابی نہیں مانتے اس طرح خاص ہندوستان میں صرف ایک یا دو صحابی آئے مگر وہ بھی فتح کے بعد بصرہ چلے گئے تھے۔ حکم کی وفات ۵۱ھ میں ہوئی۔

مغیرہ عرف حفص بن ابی العاص:۔ دیبل کی فوج کے ذمہ دار تھے لیکن صراحۃً ان کی صحابیت قاضی صاحب کے نزدیک بھی ثابت نہ ہوسکی البتہ حجۃ الوداع سے پہلے چونکہ پورا مکہ ، مدینہ اور طائف اسلام قبول کر چکا تھا اور عموماً وہ تمام حضرات حجۃ الوداع میں شریک تھے اس قرینہ سے ان کا صحابی ہونا بظن غالب ثابت ہوسکتا ہے۔

ان کے علاوہ قاضی صاحب نے سات صحابہ کا اور ذکر کیا ہے مگر ہندوستان کے علاقوں میں ان کی تشریف آوری یقینی نہیں بلکہ جن تاریخی روایتوں کو آپ نے ذکر کیا ہے ان کی رو سے ان بزرگوں کی شرکت کرمان ، مکران ، بحستان کی فتوح میں ثابت ہوتی ہے اور بعض کی ''بعض بلاد السند'' کی فتوح میں شریک ہونے کی صراحت ہے ۔ اس طرح ''فیمن ورد فی الھند عن الصحابۃ'' سے مطابقت نہیں ہوتی الا یہ کہ سند کو بھی ہند ہی کا ٹکڑا مان لیا جائے تو بعض کی مطابقت ہو جائے گی مگر کرمان جو خراسان میں ہے وہاں کی نسبت کے مطابق پھر بھی ہندوستان کی تشریف آوری ثابت نہ ہوگی ۔ تبرکاً ان کے اسماء گرامی تحریر کئے جاتے ہیں۔

۱۔ ربیع بن زیاد حارثی مذحجی (یہ کرمان اور مکران کے لشکر میں تھے) صحابی
۲۔ حکم بن عمرو التغلبی (صحابی ، فتح مکران میں شریک تھے)
۳۔ عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان انصاری (صحابی ، فتح مکران میں شامل)
۴۔ سہل بن عدی بن مالک الخزرجی (صحابی ، فتح مکران میں شامل)
۵۔ شہاب بن مخارق بن شہاب (آنحضرت کا زمانہ پایا مکران میں شہید ہوگئے)
۶۔ صحار بن عباس العبدی (فتح مکران میں شامل تھے اور فتح مکران کی خوشخبری امیر المومنین عمر

کے پاس لے گئے) یہ وفد عبدالقیس میں آنحضرت کے پاس آنیوالوں میں سے ہیں، بہت قادرالکلام خطیب تھے۔آنحضرت ﷺ سے نشہ آور مشروب کے بارے میں سوال کیا تھا آپ نے فرمایا نہ خود پیو نہ اپنے ساتھی کو پلانا خدا کی قسم جونشہ کا مزہ حاصل کرنے کو پئے گا قیامت کی شراب طہور نہیں پاسکتا۔ان کی حاضر جوابی کا ایک قصہ منقول ہے ان کی آنکھیں کڑنجی تھیں اور رنگ سرخ تھا۔حضرت معاویہؓ نے مزاحاً کہااو کڑ نجے، بولے باز کڑنجا ہوتا ہے،انہوں نے کہااو لال! بولے خالص سونا لال ہوتا ہے، جب فتح مکران کی خوشخبری لے کر حضرت عمر کے پاس پہونچے توانہوں نے پوچھا وہاں کا حال بیان کرو۔صحار بن عباس بولے:

: **سهلها جبل و ماؤها وشل** :وہاں کی نرم زمین پہاڑ ہے،وہاں کا پانی قطرہ قطرہ جمع کیا جاتا ہے۔

: **وتمرها دقل و عدوها بطل**: وہاں کی کھجور ردی ہوتی ہے اور وہاں کے دشمن بہادر ہوتے ہیں۔

ان سے دو یا تین حدیثیں مروی ہیں۔(العقد الثمین ص:۷۴۔۷۶)

لیکن علامہ ابن الجوزی نے تلقیح میں لکھا ہے کہ ان سے پانچ حدیثیں مروی ہیں،حضرت معاویہ کے زمانے میں فوت ہوئے۔

۷۔**عاصم بن عمرو التميمی . ۸. عبدالله بن عمر الاشجعی** : یہ دونوں صحابی ہیں سجستان سے متصل سندھ کے بعض علاقوں کی فتح میں شریک رہے ہیں۔

تابعین:۔(۱)نسیر بن دیسم بن ثور العجلی مخضرم تابعی ہیں ''**فتح القفص** ''میں شریک رہے۔

(۲) سعد بن هشام بن عامر۔تابعی ہیں ثقہ ہیں ان کی روایت صحیح مسلم اور ابوداؤد وغیرہ ہے، مکران میں شہید ہوئے ابوبکر حازمی کہتے ہیں کہ مکران میں میم کوضمہ ہے ہندوستان کا ایک شہر ہے۔مکران ۲۳ھ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فتح ہوا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور خلافت: پہلے گذر چکا ہے کہ ''فتح مکران'' کی خوشخبری جب مدینہ پہونچی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مکران کے حالات دریافت کئے،قاصد نے کہا تھا کہ وہاں پانی کی قلت ہے اور دشمن بہادر ہیں اس پر حضرت عمرؓ نے مزید فوج ہندوستان میں بھیجنی مناسب

نہیں سمجھی۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مفتوحہ علاقوں میں شورش ہوگئی تو آپ نے حکیم بن جبلہ عبدی کو پہلے وہاں حالات کی تحقیق کرنے کیلئے بھیجا۔

حکیم بن جبلہ عبدی: ۔ چنانچہ حکیم بطور سیاح کے یہاں آئے اور حالات معلوم کر کے گئے تو انھوں نے بھی وہی رپورٹ دی بلکہ کچھ اور باتیں بھی حضرت عثمان کو بتائیں کہ **ان کثر الجند بها جاعوا وان قلوا ضاعوا** ، اگر وہاں زیادہ فوج پہونچ گئی تو فاقہ کشی ہوگی اور اگر کم فوج گئی تو دشمن ہلاک کردیں گے۔

اس کے بعد دو قسم کی متضاد روایتیں ہیں۔ (۱) ایک یہ کہ تحقیق حال کے بعد حضرت عثمانؓ نے بھی لشکر بھیجنا مناسب نہیں سمجھا یہاں تک کہ ان کی شہادت واقع ہوگئی، پھر حضرت علی کے زمانہ میں خانہ جنگی چھڑ گئی ۔جس کی وجہ سے لشکر نہ جا سکا اس کے بعد عام الاجتماع کے بعد امویوں کے دور میں بقیہ علاقہ جات فتح ہوئے۔

دوسری روایتوں کے مطابق براہ راست ہند میں تو لشکر کشی نہیں ہوئی، لیکن مدبر اور تجربہ کار امراء کو ہندوسندھ کے ملحق ممالک میں بھیجا گیا جنھوں نے حسن تدبیر سے شورش زدہ علاقوں کو فتح کرلیا، وہ امراء تین تھے۔

۱۔عبداللہ بن عامر بن کریز جو پورے خراسان اور ملحق علاقوں کے امیر تھے۔
۲۔عمیر بن عثمان بن سعد
۳۔سعید بن کندیر خاص مکران کے امیر

پھر تین غزوات ہوئے جن کے سپہ سالاروں کے نام یہ ہیں:

۱۔مجاشع بن مسعود جنھوں نے قفص (بلوچستان) فتح کیا۔
۲۔عبدالرحمٰن بن سمرہ جنھوں نے کابل فتح کیا۔
۳۔عبیداللہ بن معمر تیمی ،جنھوں نے مکران فتح کیا

ان میں سے مجاشع اور عبدالرحمٰن دونوں صحابی ہیں بقیہ حضرات تابعی ہیں۔

حضرت معاویہؓ کا دور حکومت: آپ کا دور حکومت ۴۱ھ سے ۶۰ھ تک بیس سال رہا ہے اس زمانے میں ہندوستان سندھ بلوچستان میں جو غزوات ہوئے۔ان کی تفصیل قاضی صاحب نے

لکھی ہے۔

ہم سرسری طور سے ان فتوحات کو لکھ رہے ہیں کسی کسی کے امراء کا بھی ذکر کر دیں گے۔

(۱) فتح ارمائیل علاقہ سندھ (۲) فتح کابل۔ عبدالرحمٰن بن سمرہؓ کی امارت میں

(۳) فتح قیقان (قلات) راشد بن عمر کی امارت میں

(۴) فتح بنوکوھاٹ، لاہور، قندابیل، مہلب بن ابی صفرہ، سنان بن سلمہ بن المحبق کی امارت میں

(۵) فتح قندھار و کچھ، عباد بن زیاد بن ابی سفیان کی امارت میں۔

دوسرے اموی حکمرانوں کا دور: بہت تفصیل سے اموی حکمرانوں کے دور کی فتوحات ہند وسندھ کو بیان کیا ہے۔ اس میں سے ولید بن عبدالملک کا دور ہندوستان کی تاریخ میں بہت روشن ہے جو ۸۶ھ سے ۹۶ھ تک دس سال کا زمانہ ہے اسکے زمانہ میں محمد بن قاسم ثقفی نے نوجوانی میں غزوہ ہند کی فوج کی کمان سنبھالی تھی اور شاندار فتح سے ہم کنار ہوئے اور ان کے ساتھ ہندوستان میں بہت سے تابعین اور اتباع تابعین آئے تھے کیونکہ اس دور میں معدودے چند صحابہ دنیا میں موجود تھے، ان میں سے کوئی اس سفر میں ساتھ نہیں تھا۔ یہ بیان ص: ۱۷۱ سے لیکر دوسو چھتیس (۲۳۶) تک پھیلا ہوا ہے اور اس میں جن تابعین کی شرکت کا حال مل سکا سب کو بیان کرنے کے بعد ۴۲ ایسے ناموں کو قاضی صاحب نے ذکر کیا ہے جن کا تذکرہ محمد بن قاسم کے لشکر میں ملتا ہے۔ لیکن رجال و تاریخ کی کتابوں سے ان ناموں کی مکمل تحقیق نہیں ہو سکی۔

فتح سندھ:۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ: امام ذہبیؒ نے ''عبر'' میں لکھا ہے کہ ولید بن عبدالملک کو یہ عظیم سعادت حاصل ہوئی کہ اس نے دمشق کی جامع مسجد بنوائی اور اسی کے زمانے میں ہندوستان، ترکستان، اندلس اور مغرب کا بڑا حصہ فتح ہوا۔ ۹۳ھ میں ہندوستان کی اتنی طول طویل، اور شاندار فتح حاصل ہوئی جتنی سیدنا عثمانؓ کے زمانہ سے لیکر اب تک حاصل نہ ہوئی تھی۔ عبدالملک کی وصیت کے مطابق ولید نے حجاج کو بہت زیادہ اختیارات دے رکھے تھے، حجاج نے اپنے خاندان کے ایک نوجوان محمد بن قاسم بن محمد بن الحکم بن ابی عقیل کو سندھ کا امیر مقرر کیا، محمد بن قاسم اس وقت فارس میں تھے، حجاج نے ان کو لکھا کہ اپنے لشکر میں سے ابوالاسود جہم بن زجر جعفی کو مقدمۃ الجیش پر امیر مقرر کر کے رَے پہونچو اور وہاں سے سندھ کی سرحد پر جاؤ اور میں

اہل شام میں سے مزید چھ ہزار انسانوں کو تمہارے لشکر میں بھیج رہا ہوں، سندھ کی سرحد پر پہونچ کر شیراز میں رک کر انتظار کرو اور جب یہ لشکر مع ساز و سامان کے پہونچ جائے تب ان کو لے کر آگے بڑھو، اسی کے ساتھ ایک جنگی بیڑہ بھی حجاج نے بھیجا جس میں سامان رسد کا بھی کافی انتظام تھا۔ یہاں تک کہ سرکہ بھی بھیجا تھا، پھر ڈاک کا ایسا اچھا انتظام کر رکھا تھا کہ ہر تین دن میں جانبین کی خبریں ایک دوسرے کو پہونچتی رہیں۔

محمد بن قاسم اپنی فوج لے کر پہلے مکران پہونچے چند روز قیام کر کے ''فزر پور'' آئے اور اس کو فتح کر کے ''ارمائیل'' آئے اسے بھی فتح کیا اور دیبل کے ساحل پر پہونچے تھے کہ جنگی بیڑہ بھی وہاں آپہونچا جس میں سامان جنگ کے علاوہ سامان رسد بھی وافر مقدار میں تھی۔

دیبل شہر سے باہر ایک بہت اونچا ٹیلہ تھا اور اس کے اوپر بہت بڑا بت خانہ تھا اس کے اوپر ایک سرخ رنگ کا جھنڈا اتنا بھاری گاڑا ہوا تھا کہ جب ہوا چلتی تو جھنڈے کا پھریرا پورے شہر پر پھیل جاتا تھا، محمد بن قاسم نے ایک اتنی بڑی منجنیق نصب کی جس کو پانچ سو آدمی مل کر چلا سکتے تھے۔ پھر صف بندی کر کے سب سے پہلے ٹیلہ پر حملہ کیا اور وہ ٹیلہ گرا تو اسی کے ساتھ بت خانہ بھی زمین پر ڈھیر ہو گیا، کفار طیش میں آکر دست بدست جنگ پر آمادہ ہو گئے، اسلامی فوج نے پوری پامردی کے ساتھ مقابلہ کر کے انہیں شکست دی، پھر بہت سے انسان مارے گئے، راجہ داہر کسی طرح بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ تین دن کے بعد وہاں ایک مسجد کی بنیاد رکھ کر محمد بن قاسم نے فوج کو پیش قدمی کرنے کا حکم دیا، یہ لوگ موضع ''بیرون'' پہونچے وہاں کے برہمنوں نے صلح کر لی۔ پھر ''مہران'' کے قریب دریائے سندھ کو پار کر کے اسلامی لشکر ''سروپ داس'' پہونچا، وہاں کے حاکم نے بھی جزیہ منظور کر کے صلح کر لی۔

اس کے بعد محمد بن قاسم نے ''سیہان'' کو فتح کیا اور ایک لشکر محمد بن مصعب بن عبدالرحمٰن ثقفی کی امارت میں سدوسان بھیجا وہاں کے لوگوں نے جزیہ منظور کر کے صلح کر لی اور چار ہزار جاٹوں کو لے کر محمد بن مصعب، محمد بن قاسم کے پاس سیہان پہونچا، پھر راوڑ کو فتح کیا جہاں داہر کی بیوی چھپی تھی۔ پھر ''بغرور'' ساوندری، سکہہ اور بسمد کو فتح کرتے ہوئے دریائے بیاس کو پار کر کے ملتان پر حملہ کیا وہاں فتح ہوئی اور بہت سارا مال و دولت غنیمت میں حاصل ہوا کیونکہ

ملتان کا مٹھ ایسا تھا کہ ہندو قوم اس کا طواف کرتی تھی اور اس پر بہت کچھ سونا، چاندی نذرانہ میں پیش کرتی تھی لیکن راجہ داہر اب تک مسلمانوں کے ہاتھ نہیں آیا تھا، معلوم ہوا کہ راسل کے شہروں میں چھپا ہے جو کہ کچھ کا علاقہ ہے، اس لئے پوری تیاری کے ساتھ ''کچھ'' پر حملہ کیا راجہ داہر بھی بڑی بہادری سے لڑا اور اس جنگ میں ہاتھیوں کو بھی شریک کرلیا تھا ان کے سونڈوں میں تلوار باندھ دی جاتی تھی، وہ ہاتھی بھی بڑی بے جگری سے لڑتے تھے، داہر خود ایک جنگی ہاتھی پر سوار تھا، اس کتاب میں ہاتھیوں کی جنگ کو ذکر نہیں کیا لیکن ''رجال السند والہند'' میں اس کی بھی تفصیل لکھی ہے اور یہاں کے ٹھاکروں نے بھی میدان کارزار میں اچھا کارنامہ انجام دیا۔ آخر بنو کلاب کے ایک شخص اور بنو طے کے قاسم بن ثعلبہ نے مل کر داہر پر حملہ کیا ایک نے داہر کو قتل کیا دوسرے نے اس کے ہاتھی کے سونڈ پر تلوار ماری سونڈ کٹ گئی اور ہاتھی الٹا بھاگا اب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوگئی اور کفار شکست کھا کر کچھ بھاگے اور کچھ قید کئے گئے۔

داہر کے قتل کے بعد محمد بن قاسم کا پورے سندھ پر قبضہ ہوگیا، اس لشکر پر حجاج نے چھ کروڑ روپیہ خرچ کیا تھا محمد بن قاسم نے بارہ کروڑ غنیمت کے اموال کو دارالخلافہ میں روانہ کیا اور راجہ داہر کا سر بھی بھیجا۔

مقام عبرت:۔ آخر رمضان ۹۵ھ میں حجاج بن یوسف مرا مگر محمد بن قاسم برابر فتوح ہند و سندھ میں مشغول رہے اور بہت سے شہروں کو فتح کیا اور مفتوحہ علاقوں میں حکومت عادلہ قائم کرتے چلے گئے اور ملک میں امن و امان پھیلاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ ولید بن عبدالملک کا بھی انتقال ہوگیا اس کے بعد سلیمان بن عبدالملک دمشق کے تخت پر بیٹھا جس کی محمد بن قاسم سے مختلف وجوہ کی بنا پر عداوت تھی اس نے محمد بن قاسم کو معزول کردیا اور ان کی جگہ یزید بن ابی کبشہ سکسکی کو امیر بنایا اور حکم دیا کہ محمد بن قاسم کو ہتھکڑی ڈال کر بیڑی پہنا کر خراسان کے راستہ سے دارالحکومت بھیجدو، جب محمد بن قاسم کو بیڑی ڈالی گئی تو مفتوحہ علاقہ کے غیر مسلمین بھی رو دیئے اور محمد بن قاسم نے مثالاً یہ شعر پڑھا؛

اضاعونی و ای فتیً اضاعوا لیوم کریھة و سداد ثغر

واسط شہر کا ایک امیر صالح نام کا تھا، اس کا بھائی آدم خارجی تھا جس کو حجاج نے قتل کرادیا تھا اسی کا

انتقام لینے کے لئے صالح نے محمد بن قاسم کو واسط میں روک لیا، واسط ہی کے جیل خانہ میں ستا ستا کر محمد بن قاسم کو مار ڈالا۔ حمزہ بن بیض حنفی نے مرثیہ کہا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

ان المروءۃ والسماحۃ والندی لمحمد بن القاسم بن محمد

فسبحان الملک الحی الذی لا ینام ولایموت

خلاصہ یہ ہے کہ یہ کتاب عرب و ہند کے ثقافتی تعلقات، فتوح ہند اور صحابہ و تابعین کے ہندوستان میں آنے کی تاریخ میں ایک شاہ کار کتاب ہے جس کو مورخ عصر جناب قاضی اطہر صاحب مبارکپوری نے تصنیف فرما کر تاریخ کے ایک خاص گوشہ کی کامیاب رہنمائی کی ہے جو کہ آپ کی ذات کو اور آپ کے ذکر کو بعد میں آنے والوں کے درمیان ذکر دوام مرحمت کرنے والی ہے۔ ع خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیار ''پورب'' میں علم اور علماء

قاضی اطہر مبارکپوری کی ایک قابل قدر تصنیف

تعارف اور قدرے تلخیص

مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہٗ

مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ نے علامہ غلام آزاد بلگرامی کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''پورب کی سمت میں تین صوبے تھے۔ صوبہ الہ آباد، صوبہ اودھ (۲) اور صوبہ عظیم آباد۔ مغلوں سے پہلے اودھ اور جونپور ایک ساتھ بولے جاتے تھے اور قنوج سے لے کر بہار کی سرحد تک ایک صوبہ کی حیثیت سے ایک حاکم کے ماتحت تھا جس میں اودھ اور جون پور دونوں شامل تھے اور دوسرا صوبہ کڑا یعنی الہ آباد کا تھا جس میں گنگا کے اس پار کا علاقہ موجودہ کان پور سے کڑہ مانک پور، فتح پور، موجودہ رائے بریلی، سلون وغیرہ سے گزرتا ہوا غازی پور تک چلا جاتا تھا، صوبہ عظیم آباد، موجودہ بہار کا صوبہ ہے۔ (حیات شبلی: ص: ۱۰)

(۱) کتاب کے نام اور ہمارے اس مضمون میں ''پورب'' کا لفظ بطور وصف کے نہیں بلکہ بطور علم اور نام کے استعمال ہوا ہے اور یہ علم مغل بادشاہ شاہجہاں کے ایک جملہ ''پورب شیراز ماست'' سے ماخوذ ہے، یہ ایک خاص علاقے کا نام ہے، جس کی تفصیل آپ کو اس مضمون میں ملے گی۔ اس لئے دیارِ پورب کی فارسی اضافت پر اعتراض صحیح نہیں ہے، کہ دیار عربی لفظ ہے، اور پورب ہندی، اور ایسے دو لفظوں جن میں ایک عربی یا فارسی ہو، اور دوسرا ہندی، کی فارسی اضافت صحیح نہیں ہوتی، پس جب لفظ ''پورب'' ایک خاص علاقے کا نام ہے، تو چونکہ علم ناقابل تغیر ہوتا ہے، اس لئے یہ اضافت درست ہے۔

(۲) سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ: یہ (اودھ) اصل میں اس شہر کا نام تھا، جس کو رام اور لچھمن کے مولد بننے کا فخر حاصل تھا، جو اب بھی فیض آباد کے پاس اجودھیا کے نام سے مشہور ہے، مسلمانوں نے اس کو اپنے تلفظ میں (اودھ) کیا اور ایک پورے صوبے کا نام۔ حیات شبلی ص: ۷

قاضی اطہر صاحب نے اپنی کتاب ''دیار پورب میں علم اور علماء'' میں اس خطے کے علم اور علماء کی تاریخ مرتب کی ہے، خود قاضی صاحب کے قلم سے بھی اسی علاقہ کا تعارف ملاحظہ کر لیجئے۔

''مسلم دور حکومت میں دہلی کے مشرق میں صوبہ الہ آباد، صوبہ اودھ اور صوبہ عظیم آباد پر مشتمل جو وسیع اور محدود خطہ ہے اس کو ملک پورب کہتے تھے، ہر صوبہ میں دارالامارت ہر دارالامارت سے متعلق بڑے بڑے شہر، ہر شہر سے متعلق قصبات اور ہر قصبہ سے متعلق دیہات تھے، ملک پورب کے قصبات شہروں کے حکم مین تھے جن میں عالی شان عمارتیں ، شرفاء کے محلات ، علماء مشائخ ، مختلف قسم کے پیشہ ور ، مدارس ومساجد تھیں جو جمعہ و جماعت سے معمور رہتی تھیں، اسی ملک کو ہم دیار پورب سے تعبیر کرتے ہیں۔(ص:۲۱)

ہندوستان کا یہ مشرقی حصہ اس کے مغربی حصہ ہی کی طرح بڑا مردم خیز اور علم و ہنر کا گہوارہ تھا، اسلام کا ابر کرم سرزمین عرب سے اٹھ کر جانب سندھ بڑھا تو مکران، سندھ، ملتان سے ہوتا ہوا دہلی تک کی سرزمین کو نہال اور خوش حال کر گیا، پھر چشم فلک نے دیکھا کہ یہ ابر نیساں پورب کی طرف بڑھ رہا ہے اور مشرق کے اس خطے پر جس کا ہم نے ابھی اوپر کی سطروں میں تعارف کرایا۔ موسلا دھار برس رہا ہے۔ یہ مٹی بڑی زرخیز تھی۔ اس ابر کرم کا ہر قطرہ گہر بن بن کر اس علاقہ کو روشن کرنے لگا۔ اس علاقے کا ہر شہر ہر قصبہ بلکہ ہر قریہ معدن علم وعلماء بن گیا۔ بالخصوص جونپور کی تاسیس وتعمیر کے بعد اس کے اطراف ونواح، مسجدوں اور مدرسوں اور خانقاہوں کے ساتھ علماء وفضلاء اور مشائخ سے کچھ اس طرح معمور وآباد ہوئے کہ دیار پورب شیراز ھند بن گیا۔ اس خطہ میں بڑے بڑے نامور علماء ومشائخ پیدا ہوئے، جنھوں نے اپنے علم وعمل اور روحانیت و تقویٰ سے پورے خطے کو جگمگا دیا۔

ان علماء ومشائخ کی ایک مختصر اجمالی فہرست دیکھنی ہو تو زیر تذکرہ کتاب ''دیار پورب میں علم اور علماء'' کی مختصر سی تمہید پڑھ لیجئے جو خود قاضی صاحب کے قلم سے ہے، لکھتے ہیں:

اس خطۂ زمین سے شیخ الاسلام فرید الدین اودھی، شیخ الاسلام شرف الدین یحییٰ منیری، مولانا علاء الدین نیلی اودھی، شیخ شمس الدین یحییٰ اودھی، شیخ نصیر الدین اودھی، چراغ دہلی، شیخ حسام الدین مانک پوری، راجہ سید حامد شاہ مانک پوری، ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت

آبادی، ملا محمود جونپوری، ملا محمد افضل جونپوری، مولانا حاجی ابوالخیر بھیروی، مولانا الہداد جونپوری، دیوان محمد رشید جون پوری، شیخ احمد عبدالحق ردولوی، سید اشرف جہاں گیر سمنانی، شیخ علی متقی جونپوری، برہان پوری مکی، علامہ سید مرتضٰی بلگرامی زبیدی، شیخ محبّ اللہ بہاری، حافظ امان اللہ بنارسی، ملا احمد جیون امیٹھی، ملا نظام الدین فرنگی محلی، شیخ غلام نقشبند گھوسوی لکھنوی، مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی لہراوی اور ان کے علاوہ بہت سے عباقرہ دوراں اور جہابذۂ زماں پیدا ہوئے، اس دیار میں روحانی طرق سلاسل میں چشتیہ، سہروردیہ، شطاریہ، اشرفیہ، قلندریہ عاشقیہ، مداریہ کوفروغ حاصل ہوا۔ آخری دور میں اس سرزمین سے مجاہدین کی تحریک عام ہوئی جو بنگال سے سرحد تک پھیلی ہوئی تھی۔ ص:۱۷

علماء ومشائخ کے یہ نام جو آپ نے پڑھے ان میں سے ہر ایک آسمان علم وکمال کا آفتاب وماہتاب تھا، جہاں اتنے اتنے صاحبان علم وفضل رہے ہوں۔ حق یہ تھا کہ ان کی مفصل تاریخ لکھی جاتی، ان کے سوانح حیات کی چھان بین کی جاتی۔ ان کے علمی وذہنی کارناموں کو یاد رکھا جاتا، ان کی روحانی تربیت کے آثار کو محفوظ کر دیا جاتا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے علماء وفضلاء اور مشائخ کے مقابلہ میں دیار پورب کے ان بزرگوں کے تذکرے کم لکھے گئے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ:

> علمائے پورب پر اب تک کوئی ایسی جامع اور مفصل کتاب نہیں لکھی گئی جس سے ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا تفصیلی تعارف ہو سکے اور معلوم ہو کہ اس قدیم معدن علم و علماء اور شیراز ھند پورب سے کیسے کیسے سرآمدگان روزگار اٹھے ہیں اور انھوں نے کیا خدمات انجام دی ہیں۔ ص:۱۹

زیر نظر کتاب میں اسی علمی وتاریخی قرضہ کی ادائیگی کی پہلی کوشش ہے قاضی صاحب نے پورب کی علمی تاریخ کو چار دور مین تقسیم کیا ہے اور ہر دور کی علمی و دینی سرگرمی اور ارباب فضل وکمال کا اجمالی تعارف کرایا ہے۔ اس کے بعد اس علاقے کے آٹھ بڑے بڑے علماء ومشائخ کا تفصیلی تذکرہ لکھا ہے ان کے ضمن میں بہت سے دوسرے ارباب کمال کا بھی ذکر آ گیا ہے۔

(۱) بھیرا ایک متوسط آبادی کا گاؤں ہے، جو محمد آباد کے شمال میں مائل بہ مغرب تین کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے، ٹونس ندی کے شمالی کنارے پر آباد ہے، راقم الحروف کا مولد یہی گاؤں ہے۔

(۱) قاضی اطہر صاحب مبارکپور ہی کے رہنے والے تھے، اور اسی نام کی نسبت سے اپنے کو مبارکپوری لکھتے ہیں۔

پہلا علمی دور

اس عنوان کے تحت قاضی صاحب نے بڑی جستجو اور تحقیق کے بعد یہ بتایا ہے کہ پورب کے اس خطہ میں اسلام کی روشنی کب چمکی اور کیسے پھیلی اور پھیلتی چلی گئی، یہ روشنی پہلی بار کب چمکی اور کس جگہ سے اس کا آغاز ہوا، یہ بتانا مشکل ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے مسلسل فتوحات کے عہد میں یہ خطہ اسلام اور مسلمانوں سے آشنا ہو چکا تھا اس کے بعد حضرت سید سالار مسعود غازی (شہادت ۴۸۸) اور ان کے رفقاء کی مجاہدانہ سرگرمیوں نے اس روشنی کو عام کیا۔

سید سالار مسعود غازی کی شہادت کے بعد ایک صدی تک تاریخ پر سناٹا چھایا رہا، پھر ۵۹۱ھ میں سلطان شہاب الدین نے قنوج پر فوج کشی کی، اس فوج کشی میں مسلمان کامیاب رہے، اس کے بعد قنوج سے بنارس تک تمام علاقوں سے مسلمانوں کا غلبہ ہوگیا اور بنارس سے نیپال کی سرحد تک پھر اسکے آگے پورب کی طرف بنگال تک راستہ صاف ہوگیا۔ اس دور میں کڑہ مانک پور اس دیار کا دارالحکومت بنا۔

سلطان شہاب الدین غوری نے اپنے غلام قطب الدین ایبک کو ۵۵۴ھ میں نظام سلطنت سونپا تھا۔ قطب الدین ایبک نے ۶۰۲ھ میں دہلی کو فتح کر کے غلام سلطنت کی بنیاد رکھی اس کے دور میں پورب میں قنوج اور اودھ کے علاقے فتح ہوئے اور نیپال کے نیچے سے لیکر بنارس تک کا علاقہ مسلمانوں کے زیر نگیں آ گیا۔ یہ حکومت مختلف بادشاہوں کی ماتحتی میں ۶۸۹ھ تک رہی۔ ۶۸۹ میں خلجیوں کی حکومت قائم ہوئی ۷۲۰ تک رہی ۷۲۰ میں خاندان تغلق مسند حکومت پر آیا۔ جس نے ۸۱۶ھ تک اپنا قبضہ جمائے رکھا، اس خاندان کے نامور اور علم پرور بادشاہ سلطان فیروز شاہ نے جس کا نام جونا تھا اپنے نام پر جون پور آباد کیا۔

قاضی صاحب نے ۶۰۲ سے لے کر ۷۷۲ء تک یعنی شہر جون پور کی تاسیس وتعمیر تک پورب کی علمی تاریخ کا دور اول قرار دیا ہے، پھر تفصیل سے ہر عہد سلطنت میں علم وعلماء کی تاریخ مرتب کی ہے اس میں بڑی قیمتی معلومات اور تاریخی حقائق قاضی صاحب نے تحریر کئے ہیں۔ اس

دور کے بکثرت علماء کا اجمالی تذکرہ آگیا اور علم وفضل کے چمن اور اس کی بہار کا تذکرہ بڑے دلآویز انداز میں کیا ہے۔

غلام خاندان کے دورحکومت میں قاضی صاحب نے حسب ذیل علماء کا نام لیا ہے۔

شیخ الاسلام شیخ فریدالدین اودھی ان کا شمار اس دور کے نامور علماء میں تھا۔ پھر ان کے تلامذہ میں مولانا علاءالدین نیلی اودھی اور مولانا شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی خاص شہرت کے مالک ہوئے۔

اودھ کے مشہور قدوائی خاندان کے جداعلیٰ شیخ قدوۃ الدین بن میرک شاہ اسرائیلی اودھی جو حضرت عثمان ہارونی کے مرید اور خواہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے پیر بھائی تھے۔ ہندوستان تشریف لائے اور اودھ میں مقیم ہوئے سلطان التمش کے دور میں مولانا ابوتوامہ شرف الدین حنفی دہلوی نے دہلی سے بنگال کا رخ کیا اور وہاں کے سنارگاؤں میں درس وتدریس کی بساط بچھائی، ان سے مشہور شیخ بزرگ حضرت شرف الدین یحییٰ منیری قدس سرہ نے تعلیم حاصل کی۔ اسی دور میں دو بھائی سید شمس الدین اور سید شہاب الدین شہرگردیز سے دہلی آئے، سید شہاب الدین دہلی سے آکر کٹرہ مانک پور میں آباد ہوگئے، ان کی نسل سے سید راجہ مانک پوری ہیں، جنھوں نے دیار پورب میں سلاطین شرقیہ کے عہد میں دیار پورب کو اپنا دینی اور روحانی مرکز بنایا، ان کی اولاد میں راجہ سید مبارک نے مبارک پور اور راجہ سید خیراللہ نے خیرآباد کی تعمیر کی۔

غلام خاندان کے بعد خلجیوں کا دورحکومت آیا۔ اس دور میں بھی علم اور علماء کی بہار رہی، یہ دور ۳۰ رسال تک رہا قاضی صاحب خبر دیتے ہیں کہ:

اس مختصر دور سلطنت میں پورب اور بہار بنگال میں دینی اور علمی رونق بڑھتی رہی اور ان علاقوں میں علماء ومشائخ مدرسوں اور خانقاہوں کے ذریعے اپنے اپنے انداز میں کام کرتے رہے (ص:۲۹) اس دور میں کچھ خاص خاص علماء کا تذکرہ کرتے ہوئے قاضی صاحب نے مولانا بدرالدین حنفی اودھی کا نام لیا ہے کہ وہ سلطان علاءالدین خلجی کے دور میں اودھ کے علماء کبار میں تھے اور یہاں سے دہلی تشریف لے جایا کرتے تھے اور کئی کئی ماہ وہاں رہ کر وعظ وتذکیر کی خدمت انجام دیتے تھے۔

اس سلسلے میں انھوں نے بہار کے مشہور بزرگ مخدوم شیخ شرف الدین احمد بن یحیٰی منیری کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ وہ ۶۶۱ھ میں بعہد سلطان ناصر بن محمود بن التمش پیدا ہوئے، انھوں نے خلجی دور میں بہار میں دین وایمان کی بزم سجائی ان کے فیوض و برکات سے خلجی دور خوب مستفید ہوا۔ص:۲۹

خلجی خاندان کے بعد ہندوستان کی زمام حکومت تغلق خاندان میں آئی، اس خاندان کے تیسرے بادشاہ فیروز شاہ تغلق نے ۷۷۲ھ میں جونپور شہر آباد کر کے بلاد پورب کو علم ومعرفت کے نئے دور میں داخل کیا۔

اسی خاندان کے دور حکومت میں مولانا فریدالدین اودھی شیخ الاسلامی کے منصب پر فائز تھے، ان کے علم وفضل کی دھوم اودھ سے دہلی تک مچی ہوئی تھی۔ ان کے دو شاگرد ہندوستان کے مایۂ ناز علماء میں ہوئے۔ ایک مولانا شیخ شمس الدین محمد بن یحیٰی اودھی ہیں جن کے تلامذہ میں مشہور عالم و بزرگ حضرت مولانا شیخ نصیرالدین محمود ہیں، جو حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کے سب سے بڑے خلیفہ ہیں اور ''چراغ دہلی'' کے لقب سے ممتاز ہیں۔

ان کے دوسرے شاگرد مولانا علاءالدین نیلی اودھی ہیں جو خاص شہرت کے مالک ہیں، اس دور میں یہ اودھی علماء ومشائخ دہلی کی علمی و روحانی فضا پر چھائے ہوئے تھے اور کفرستان اودھ کے ان ایمانی چراغوں سے دہلی کے بام و در روشن تھے۔

اسی دور میں اودھ کی بزم علم ومعرفت کے ایک چراغ نے سرزمین بنگال کو بقعۂ نور بنایا تھا، یعنی مولانا سراج الدین عثمان چشتی اودھی (خلیفہ حضرت محبوب الٰہی) بنگال تشریف لے گئے اور ان سے خلق اللہ نے فیض پایا، ان ہی میں حضرت شیخ علاءالدین عمر بن اسعد لاہوری پنڈوی متوفی ۷۵۸ھ بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے مرشد سراج الدین عثمان اودھی کے کام کو آگے بڑھایا اور پنڈوہ میں مستقل قیام کر کے ارض بنگال کو علم ومعرفت کا گلستان بنادیا۔

ان حضرات کے علاوہ قاضی صاحب نے اور متعدد علماء کبار اور مشائخ کرام کا نام لکھا ہے، یہ دیار پورب کی علمی وعملی تاریخ کا دور اول ہے جو ۶۰۲ھ سے شروع ہو کر ۷۷۲ھ میں ختم ہوتا ہے۔

دوسرا علمی دور

قاضی صاحب نے اپنی کتاب میں دوسرے علمی دور کا تعارف کراتے ہوئے بتایا ہے کہ دور اول جو پونے دوسو سال کے عرصے کو محیط ہے، میں علماء وفضلاء کی اچھی خاصی تعداد مختلف قصبات وقریات میں پائی جاتی تھی۔

''مگر مانک پور کڑہ کے علاوہ پورب کے علاقہ میں کوئی دوسرا علمی اور دینی مرکز نہیں تھا تا آنکہ تغلق خاندان کے تیسرے حکمراں سلطان فیروز شاہ تغلق نے ۷۷۲ھ میں شہر جونپور آباد کر کے ایک عظیم علمی ودینی مرکز قائم کیا اور قطب الاسلام حاجی صدر الدین چراغ ہند ظفر آبادی کی ذات والا صفات سے سواد جونپور میں اسلام کو فروغ ہوا، اور عہد فیروز شاہ تغلق سے لے کر خاتمۃ السلاطین محمد شاہ کے دور تک تقریباً چار سو سال یہ شہر حدود سمیت علم وفضل اور علماء وفضلاء کا گہوارہ بنا رہا ہے۔ص:۳۲

قاضی صاحب نے دوسرے علمی دور کا تذکرہ کرتے ہوئے تاسیس جونپور ۷۷۲ھ سے لودھی سلطنت کے خاتمہ ۹۳۲ھ تک قرار دیا ہے۔

اس دور میں پورب کے اندر علما اور علماء کی تاریخ بڑی تابناک رہی ہے، فیروز شاہ تغلق نے مولانا علاء الدین دہلوی سے درخواست کی کہ وہ جون پور تشریف لیجائیں، وہ جب جونپور کیلئے دہلی سے نکلے ہیں تو بادشاہ نے اپنا خاص گھوڑا سواری کیلئے پیش کیا اور خود رکاب پکڑ کر سوار کرایا، مولانا چار سو طلبہ کو لے کر جونپور تشریف لے آئے، شاہزادہ فتح خاں جو اپنے والد فیروز شاہ کی طرف سے جونپور کا حاکم تھا اس نے شہر سے بارہ کوس آگے بڑھ کر مولانا کا استقبال کیا اور دو مرتبہ انہیں سونے کے سکوں سے تولا وہ رقم انہیں نذر کی۔

مولانا نے اشاعت علم کیلئے ایسی جدوجہد کی کہ تھوڑے ہی عرصے میں جونپور اور اس کے اطراف میں تعلیم وتدریس کے چوالیس مدرسے قائم ہوگئے، اور ہر طرف علم وفن کا چرچہ عام ہوگیا ،مولانا کا انتقال ۷۸۲ھ میں ہوا۔

۷۹۶ھ میں تغلق خاندان کے آخری فرمانروا سلطان محمود شاہ تغلق نے اپنے باپ کے زیر

ملک سرور خواجہ جہاں کو سلطان الشرق کا خطاب دے کر جونپور کی فرمانروائی عطا کی، وہ اپنے ساتھ دہلی سے مولانا شرف الدین لاہوری کو جون پور لایا۔ ان دونوں کی آمد سے جون پور علم و فضل کے لحاظ سے اور چمک اٹھا۔

قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ:

درحقیقت سرزمین پورب کا سارا علمی افتخار ان ہی چاروں کا مرہون منت ہے جن میں دو امراء (فتح خاں اور خواجہ جہاں ملک الشرق) اور دو علماء (مولانا علاء الدین دہلوی اور شیخ شرف الدین لاہوری) شامل ہیں، ان ہی عناصر اربعہ سے یہاں کا علمی مزاج بنا، اس پچیس سالہ دور میں باہر کے کئی علمی خانوادے دیار پورب میں آکر مستقل سکونت پذیر ہوئے جن میں صدیوں علم و فضل کا چرچا رہا۔ ص: ۳۸

شرقی سلطنت:۔ ۷۹۶ یا ۷۹۷ھ میں حاکم جونپور ملک سرور خواجہ جہاں نے اپنی مستقل حکومت کا اعلان کیا اور سلطان الشرق کے خطاب کے ساتھ تخت نشیں ہو کر ایک نئی حکومت کی بنیاد ڈالی اسی حکومت میں جو شرقی سلطنت کے نام سے معروف ہوئی۔ چھ بادشاہ ہوئے جن میں سب سے نامور اور سب سے زیادہ علم پرور سلطان ابراہیم شاہ شرقی از ۸۰۴ھ تا ۸۴۲ھ بادشاہ ہوا۔

شرقی سلطنت کی حدود طبقات اکبری کے بیان کے مطابق مشرق میں بہار کے صوبے میں علاقہ ترہت تک تھیں، یعنی مظفر پور اور دربھنگہ تک، قاضی صاحب لکھتے ہیں:

جون پور کی تاسیس ۷۷۲ھ سے لے کر شرقی سلطنت کے پہلے حکمراں کے آخری زمانے ۸۰۳ھ تک دیار مشرق میں علم وعلماء کی تازہ بہار آتی رہی اس دور میں جب کہ دہلی کا مرکز حوادث وفتن کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور وہاں کی علمی اور دینی محفلیں اجڑ اجڑ کر دوسرے دیار و امصار کی طرف منتقل ہو رہی تھیں جون پور دار العلوم دار الامان اور دہلی ثانی بن رہا تھا ص ۴۱)

شرقی سلطنت کے تیسرے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا چالیس سالہ دور اس سلطنت کا عہد زریں، اور پورب میں علمی بہار کا زمانہ ہے، ابراہیمی دور میں تمام اطراف کے علماء و مشائخ کھنچ کھنچ کر جون پور آگئے اور ہندوستان کے علم کا خلاصہ یہاں جمع ہو گیا۔ ص: ۴۵

اس دور میں علماء کی فہرست طویل ہے اس مختصر مضمون میں ان سب کے ذکر کی گنجائش نہیں

ہے تاہم چند ناموں کا ذکر ناگزیر ہے۔

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی، قاضی نصیر الدین دہلوی، مولانا قیام الدین دہلوی شیخ محمد عیسیٰ دہلوی، شیخ فتح اللہ اودھی انصاری، شیخ محمد بن خضر دہلوی۔

سلسلہ عالیہ چشتیہ کے مرکزی بزرگ حضرت شیخ احمد عبدالحق ردولوی متوفی ۸۳۷ھ ابراہیمی دور کے اکابر اولیاء اللہ میں تھے، شیخ محمد بن خضر متوفی ۸۱۱ھ ابراہیمی دور میں دہلی سے جونپور تشریف لائے، ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ مشید کو پرگنہ محمد آباد گہنہ میں قریہ ولید پور وغیرہ کئی گاؤں جاگیر میں دیئے گئے، بعد میں شیخ مشید کا خاندان وہیں منتقل ہوگیا جس میں شاہ ابوسعید، شاہ ابوالخیر شاہ اسمٰعیل ملا محمود، شاہ ابوالغوث ملا محمود اور شاہ ابواسحاق وغیرہ پیدا ہوئے ص:۴۹

قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ:

ہمارے خیال میں دیار اعظم گڈھ میں سب سے پہلا مدرسہ شیخ مشید کی جاگیرداری میں موضع سلطان پور (بھیرا)(۱) میں جاری ہوا۔ص:۴۹

اسی دور میں شیخ فتح اللہ بن عبداللہ انصاری اودھی دہلی سے جون پور آئے، جامع مسجد میں ان کا وعظ ہوتا جس میں عمائدین سلطنت شریک ہوتے، بعد میں انہیں پرگنہ ماہل میں کئی گاؤں جاگیر میں ملے، ان کی اولاد میں علمی سلسلہ باقی رہا۔ مولوی حسن علی ماہلی متوفی ۱۲۵۸ھ انہیں کی اولاد میں ہوئے۔

حضرت شیخ محمد بن عیسیٰ تاج جونپوری متوفی ۸۷۰ھ دور ابراہیمی کے کبار اولیاء اللہ میں تھے۔

اس دور میں علماء ومشائخ کی جو کثرت تھی وہ حد بیان سے باہر ہے، ان میں سب سے اہم اور مشہور ومقبول شخصیت حضرت قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تھی۔

قاضی صاحب نے شرقی سلطنت کے زمانے میں علماء وفضلاء کی ایک اجمالی فہرست بھی

(۱) بھیرا ایک متوسط آبادی کا گاؤں ہے، جو محمد آباد کے شمال میں مائل بہ مغرب تین کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے، ٹونس ندی کے شمالی کنارے پر آباد ہے، راقم الحروف کا مولد یہی گاؤں ہے۔

لکھی ہے جو تقریباً ستر علماء ے کبار کے ناموں پر مشتمل ہے، اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ اس وقت پورب کا ملک علم وعلماء کی کثرت سے کیسا بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔

مشرق سلطنت کا خاتمہ بہلول شاہ لودھی کے ہاتھوں ہوا، اس حکومت کا اختتام ۸۸۱ھ میں ہوا، لودھی حکومت ۸۸۱ھ سے ۹۳۳ھ تک رہی، لودھیوں میں سلطان سکندر لودھی کا عہد سلطنت قریب قریب ویسا ہی رہا۔ جیسا کہ ابراہیم شاہ شرقی کا تھا، اس کا اٹھائیس سالہ دور بہت خیر و برکت کا تھا۔

اس دور کے چند علماء کے نام یہ ہیں۔

شیخ نظام الدین میران شاہ چشتی مانک پوری، راجہ سید حامد شاہ مانک پوری، مولانا الہداد حنفی جونپوری، شیخ قطب الدین بینائے دل وغیرہ قاضی صاحب نے تقریباً بیس نام شمار کرائے ہیں۔

تیسرا علمی دور

دیار پورب میں تیسرا علمی دور مغل سلطنت کے قیام ۹۳۲ھ سے شروع ہو کر ۱۱۳۰ھ تک پھیلا ہوا ہے، قاضی صاحب لکھتے ہیں:

اس دوسو سالہ مدت میں ہندوستان کے مختلف دیار وامصار کی طرح دیار پورب میں بھی بہت سے علمی و دینی مرکز پورے انبساط ونشاط کے ساتھ اپنے اپنے علمی حلقوں میں کام کرتے رہے، کہنا چاہئے کہ گذشتہ دونوں ادوار کے حسنات و برکات تیسرے دور میں پوری طرح کھل کر سامنے آ گئے تھے اور اس دیار کے قصبات وقریات علم وعلماء کی کثرت اور سرگرمی کی وجہ سے ہرات اور نیشاپور معلوم ہوتے تھے، اور اسی دور کے پانچویں سلطان شہاب الدین، محمد شاہ جہاں کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا کہ ''پورب شیراز ماست'' ص: ۷۰

مغلیہ حکومت کے دور میں دو بادشاہوں نے خاص طور سے پورب کے علمی چمنستان کی رکھوالی کی اور اسے آباد وشاداب رکھنے کا اہتمام کیا۔ ایک جہاں گیر، دوسرے شاہجہاں۔

قاضی صاحب لکھتے ہیں:

واضح ہو کہ صوبہ الہ آباد، صوبہ اودھ، اور صوبہ عظیم آباد تینوں ملکوں کے مجموعے کو ملک پورب کہا جاتا تھا اور تینوں علاقوں میں مسجدیں، مدارس، خانقاہیں ارباب علم وفن اور علماء ومشائخ سے

آباد تھیں، البتہ ان میں الہ آباد اور صوبہ اودھ تیموری عہد میں جداگانہ شان رکھتے تھے، پھر ان دونوں میں صوبہ اودھ کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔

قاضی صاحب علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کی کتاب ماثر الکرام اور مولانا خیر الدین محمد جون پوری کی کتاب تذکرۃ العلماء کے دو طویل اقتباس نقل کئے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں ملک پورب کی علمی و دینی سرگرمیوں اور رونق کا کیا حال تھا۔

ہمایونی عہد سلطنت میں دیار پورب میں کئی ایسے علماء و مشائخ آباد ہوئے جن کے خانوادوں میں صدیوں تک علم و فضل اور علماء و فضلاء کی رونق رہی، اسی دور میں ایک مشہور بزرگ میر علی عاشقان متوفی ۹۵۰ھ علاقۂ سرھند سے آکر یہاں آباد ہونے اور اپنے نام سے ایک بستی سرائے میر ضلع اعظم گڈھ میں بسائی۔

اسی زمانہ میں خانوادہ حامدیہ چشتیہ کے چشم و چراغ راجہ سید مبارک شاہ نے مبارک پور(۱) کو اپنے نام سے آباد کیا، اسی دور میں چریا کوٹ کا نام بھی دینی و علمی تاریخ کے صفحات پر نظر آتا ہے۔

دور ہمایوں میں قاضی خاں ظفر آبادی علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے۔

دور اکبری میں بھی ملک پورب علم اور علماء کے لازوال سرمایہ سے مالا مال تھا۔ کبار علماء اس عہد میں یہاں موجود تھے، دور جہانگیری تو اس حیثیت سے امتیاز رکھتا ہے کہ علم اور دین کے گلستاں پر بہار چھا رہی تھی۔ جہانگیری دور میں ایک زبردست عالم و فاضل ملا محمد افضل جونپوری تھے۔ جن کے شاگردوں میں ملا محمود جونپوری اور دیوان محمد رشید جونپوری نہایت نامور ہوئے۔

دور جہانگیری میں گلستان علم پر جو بہار آنی شروع ہوئی تھی دور شاہجہانی میں وہ اپنے شباب پر آگئی تھی۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں:

> شاہ جہاں نے تقریباً تیس سال حکومت کی، اس کا طویل دور سلطنت علم و علماء کے حق میں بڑا پر بہار تھا...... اس کا زمانہ ہر اعتبار سے بہتر تھا بلاد پورب میں علم و فن کی نشأۃ نو ہوئی اور جون پور دار العلم، دار الامن اور دہلی ثانی کے القاب کے بعد شیراز

(۱) قاضی اطہر صاحب مبارکپور ہی کے رہنے والے تھے، اور اسی نام کی نسبت سے اپنے کو مبارکپوری لکھتے ہیں۔

ہند کے لقب سے یاد کیا گیا۔ص:۸۲

دیار پورب پر شاہجہاں نے خاص توجہ کی، شاہجہاں نے اپنی بیٹی شہزادی جہاں آراء کو قصبہ مئو بطور جاگیر کے دیا۔ شہزادی نے اپنے شوق سے یہاں کپڑے بننے والے کاریگروں کو جمع کیا اور جامع مسجد بنوائی جس کے چاروں طرف طلبہ کیلئے حجرے بنوائے۔

شیخ مشید کے خاندان میں ایک بزرگ مولانا حاجی ابوالخیر بھیروی متوفی ۱۰۵۹ھ میں ملا محمود جونپوری کے بہنوئی اور معاصر تھے، وہ شاہجہانی دور میں پورب کے علمائے فحول میں شمار ہوتے تھے اور شاہی دربار سے انکے تعلقات نہایت گہرے تھے۔

جہانگیر نے ملا محمد افضل جونپوری بھیروی متوفی ۱۰۶۲ھ تھے اور دوسرے دیوان محمد رشید جون پوری متوفی ۱۰۸۳ھ تھے، استاذ الملک فرمایا کرتے تھے کہ علامہ جرجانی اور علامہ تفتازانی کے بعد ایک عہد اور ایک شہر میں ان دو فضلاء کے جیسے اب تک دو فاضل جمع نہیں ہو سکے تھے۔ص:۶۸

ملا محمود جونپوری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد حکمت و فلسفہ میں ان کی ٹکر کا کوئی عالم پیدا نہیں ہوا۔

اس دور میں بڑے علماء و مشائخ میں ملا رکن الدین بحری آبادی غازیپوری، مفتی عبدالسلام دیوی، قاضی محمد حسین جون پوری، مفتی مبارک بن مفتی ابوالبقاء جونپوری مفتی محمد صادق بن شیخ شمس الدین جون پوری وغیرہ تھے۔

مشائخ چشتیہ میں ایک بڑے مقام و مرتبہ کے بزرگ حضرت شاہ محبّ اللہ الہ آبادی بھی اس دور شاہجہانی کی ایک عظیم برکت تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر خود ایک صاحب علم وفضل بادشاہ تھے، انھوں نے علماء کی بڑی سرپرستی فرمائی، فتاویٰ ھندیہ کے نام سے فقہ وفتاویٰ کا عظیم الشان ذخیرہ جمع کرایا تھا۔

قاضی صاحب نے عہد عالمگیری کے علماء و مشائخ اور ان کے بعد عہد تیموری کے اکابر و بزرگان کی ایک طویل فہرست لکھی ہے اور ہر ایک کا مختصر مختصر تعارف کرایا ہے۔

عہد تیموری کے اواخر میں علم وفضل کی محفلیں اجڑنے لگیں تھیں، سیاسی اتھل پتھل اور انگریزوں کی دخل اندازیوں نے بہار علم کو بڑا نقصان پہونچایا ۱۱۳۰ھ کے بعد دہلی کی مرکزیت

طوائف الملوکی سے بدل گئی۔قاضی صاحب لکھتے ہیں:

''اس بدامنی میں علمی مراکز بھی تباہی سے دوچار ہوئے، مدتوں کے جمے ہوئے مدرسے اکھڑ گئے، خانقاہیں ویران ہوگئیں اور علماء وطلبہ ادھر ادھر منتشر ہوگئے، مورخین بغداد کی تباہی کو روتے ہیں، لیکن ہندوستان کی بربادی کی داستان اس سے کچھ کم دردناک نہیں ہے۔ص:۱۰۳

چوتھا علمی دور

دیار پورب کا چوتھا علمی دور اودھ کی نوابی کے قیام ۱۱۳۰ھ سے اس کے خاتمہ ۱۲۷۳ھ تک کل ۱۴۳ سال ہے۔ یہ دور علم اور علماء کیلئے بڑا نامبارک دور تھا۔نوابان اودھ شیعی تھے، نہایت تنگ نظر تھے۔عیش وعشرت میں مست رہتے تھے انہیں علم اور علماء سے دلچسپی نہ تھی۔

قاضی صاحب لکھتے ہیں:

اس دور میں ان اطراف کی ساری علمی رونق سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ (شیعوں) میں محدود ہوکر رہ گئی، قدیم علمی ودینی خانوادے تباہ وبرباد ہوگئے۔ان کی جاگیریں اور معافیاں ضبط کر لی گئیں، وظائف بند کر دیئے گئے اور مختلف طریقوں سے ان کو شیعہ بنایا جس کے نتیجے میں ایک نیا علمی ماحول اور نئی مذہبی زندگی قائم ہوئی۔ص:۱۰۳

قاضی صاحب نے اس دور کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں، انھوں نے یہ داستان بھی سنائی ہے کہ کس طرح علمی ودینی خانوادوں کو جو صدیوں سے علم اور دین کی خدمت کرتے آئے تھے، شیعہ مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا اور جو لوگ سنی ہونے پر مصر ہوتے، انہیں کن کن ایذاؤں سے دوچار ہونا پڑتا، اور پھر یہ کہ شیعہ علماء کس کس طرح انعام واکرام سے نوازے جاتے تھے۔اس کے باوجود حوصلہ مند حضرات متعدد جگہوں پر علم وفضل کا چراغ روشن کئے ہوئے تھے۔

قاضی صاحب اپنی اس کتاب میں ۶۰۲ھ سے شروع کر کے ۱۲۷۳ھ تک کو چار دور میں تقسیم کر کے پورب میں علم وعلماء کی تاریخی داستان سنائی ہے۔

قاضی صاحب نے اس کتاب میں تاریخ کی ایک نئی جہت کا سفر شروع کیا ہے، یہ کام بہت مشکل تھا مگر قاضی صاحب کی ہمت مردانہ ایسی ہی مشکل جہتوں کو اختیار کرتی تھی اور مظفر

ومنصور ہوا کرتی تھی۔عرب وہند کے قدیم کی تعلقات تلاش میں نکلے، کئی کئی مجلدات تیار کردیئے ، پورب میں علم وعلماء کی کہانی سنانے بیٹھے تو تقریباً پانچ سو صفحات کا ایک ضخیم دفتر تیار کردیا۔

اس اجمالی تاریخ اور تذکرے کے بعد قاضی صاحب نے کچھ خاص خاص بڑے بڑے علماء کے تفصیلی تذکرے لکھے ہیں جن کے ضمن میں اور بھی بہت سے علماء کا ذکر آ گیا ہے، اس طرح یہ کتاب نادر معلومات کا گنج گرانمایہ بن گئی ہے، جن علماء کا تفصیلی تذکرہ قاضی صاحب نے کیا ہے ان کی فہرست علی الترتیب یہ ہے۔

(۱) ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی متوفی ۸۴۹ھ قاضی صاحب کا تذکرہ ص:۱۲۱ سے ص:۲۱۰ تک پھیلا ہوا ہے۔

(۲) حضرت راجہ سید حامد مانک پوری متوفی ۹۰۱ھ ان کا اور ان کے خانوادے کے حالات کا سلسلہ ص:۲۱۱ سے ص:۲۴۸ تک ہے۔

(۳) حضرت میر علی عاشقان سرائمیری متوفی ۹۵۰ھ ان کا تذکرہ ص:۲۴۹ سے ص:۲۸۷ تک پھیلا ہوا ہے۔

(۴) ملا محمود جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ یہ تذکرہ ص:۲۸۸ سے ص:۳۷۵ تک پھیلا ہوا ہے۔

(۵) مولانا حافظ امان اللہ بنارسی متوفی ۱۱۳۳ھ یہ تذکرہ ،ص: ۳۷۶ سے شروع ہوتا اور ص:۳۹۷ پر اختتام کو پہونچتا ہے۔

(۶) مولانا شیخ غلام نقشبندی گھوسوی متوفی ۱۱۲۶ ان کا تذکرہ ص:۳۹۸ سے شروع ہوکر ص: ۴۲۶ پر ختم ہوتا ہے۔

(۷) مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی لہراوی متوفی ۱۱۷۸ھ از ص:۴۲۷ تا ص:۴۶۳

(۸) مولوی حسن علی ماہلی متوفی ۱۲۵۸ھ از ص:۴۶۴ تا ص:۴۸۰

تفصیلات اصل کتاب میں پڑھنے کے لائق ہے، اس کتاب کی ترتیب وتالیف میں قاضی صاحب نے پچاس کتابوں سے استفادہ کیا ہے، ان کے نام شروع کتاب میں انھوں نے درج کردیئے ہیں۔

☆☆☆☆☆

سندھ و ہند کی علمی تاریخ

رجال السند والھند

مولانا عبداللہ صاحب المعروفی
استاذ شعبۂ تخصص فی الحدیث دارالعلوم دیوبند

''رجال السند والہند'' سرزمین سندھ و ہند کا ایک علمی و ثقافتی تذکرہ ہے، یہ کتاب عالمی شہرت کی حامل ہے، ملک و بیرون ملک کے علمی و تحقیقی مراکز، اکیڈمیوں اور لائبریریوں میں اس کی عدم موجودگی ایک اہم خلاء تصور کی جاتی ہے، ملکوں اور قوموں کی علمی، تمدنی اور ثقافتی تاریخ سے شغف رکھنے والا ہر طالب تحقیق بذات خود اس کتاب کو حاصل کرنا نہ صرف ضروری سمجھتا ہے بلکہ اس کی ذاتی لائبریری میں یہ اس کا سرمایۂ ناز ہوتا ہے، اپنی راہ تحقیق و جستجو میں اسے سنگ میل قرار دے کر جس سمت بھی چلتا ہے وہی اس کی صحیح سمت ہوتی ہے، اور ایک نتیجہ خیز منزل کی طرف گامزن جاتا ہے، اس دعویٰ کے ثبوت میں عالم اسلام کے مستند محقق عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہٗ (جسٹس، سپریم کورٹ پاکستان) کا یہ ریمارک پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

عراق کے ایک مشہور عالم پاکستان تشریف لائے اور جب کراچی آئے تو وہ میرے مہمان ہوئے، انھوں نے مجھے بتایا کہ میں متحدہ ہندوستان کی علمی وتہذیبی واسلامی تاریخ پر تحقیق کر رہا ہوں، اسلامی ہند کی شخصیات، علماء ومحدثین اور اعاظم رجال پر ایک کتاب مرتب کرنا چاہتا ہوں آپ اس سلسلے میں میری رہنمائی کریں اور ایسے مآخذ ومراجع کی نشاندہی کریں جو عربی زبان میں ہوں تاکہ میرے لئے استفادہ آسان ہو،

میں نے ان سے کہا کہ پورے ہندوستان (بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش) میں آپ کے معیاری کام کیلئے صرف دو کتابیں کارآمد ہیں، ایک مولانا حکیم عبدالحی رائے

بریلوی کی ''نزہۃ الخواطر'' دوسری مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی ''رجال السند والہند'' تیسری اور کوئی کتاب نہیں۔

(ترجمان الاسلام بنارس، قاضی اطہر نمبر ص:۱۲، بحوالہ ''البلاغ'' کراچی)

اتنی اہم اور کلیدی حیثیت کی حامل کتاب کے تعارف کیلئے ماہنامہ ضیاءالاسلام کے مدیر مولانا ضیاءالحق خیرآبادی زید مجدۂ نے ایک بے مایہ اور تاریخ سے نابلد شخص کا انتخاب کیا، جس کی اپنی تو کوئی رائے کیا ہوتی اپنے اسلاف و پیش رَو اہل علم واصحاب تحقیق کے تأثرات، تبصروں اور تنقیدات کو سلیقے سے پیش کرنا بھی اس کے لئے مشکل ہے، حیران ہوں کہ اس پُر پیچ وادی میں کدھر سے داخل ہو اور کہاں سے بات شروع کرے؟ واللہ ولی التوفیق

موضوع و پس منظر:۔ اس میں شک نہیں کہ دوسرے ممالک اسلامیہ کی طرح سندھ و ہند (جو عرب مؤرخین کے نزدیک دو مستقل ملک تھے) میں ہر علم وفن کے بڑے بڑے امام اور نامور بزرگ پیدا ہوئے، جن کی کوششوں سے یہاں کی علمی وادبی، روحانی و مذہبی روایات کسی طرح دوسرے اسلامی ملکوں سے کم نہیں رہیں، کتنی ہی باکمال شخصیتیں اس اقلیم میں پیدا ہوئیں جن کا حصہ اسلامی وعربی ثقافت کی تعمیر میں وترقی میں بغداد وقرطبہ کے رواۃ علم وادب کے مقابلے میں کچھ کم نہیں تھا، لیکن اسلامی ثقافت کے اصلی مرکز، دمشق، بغداد اور حرمین سے قریب تر ہونے کے علاوہ مخصوص سیاسی حالات کی بنا پر سندھ کی مرکزیت ان عظیم مرکزوں کا ضمیمہ بنی رہی، اس کے نتیجہ میں سندھ کی باکمال شخصیتوں کو وطن سے باہر اپنے جوہر دکھلانے کے جتنے مواقع حاصل ہوئے وہ خود ان کے اپنے وطن میں انہیں میسر نہیں آسکے، یہی وجہ ہے کہ سندھ کی معروف ترین شخصیتیں صرف اپنی غریب الدیاری کی بدولت زندۂ جاوید رہیں، ورنہ سندھ میں رہ کر ان کو بغداد کے خطیب (۴۶۳ھ) وابن النجار (۶۴۳ھ) مَرو کے سمعانی (۵۶۲ھ) یا دمشق کے ابن عساکر (۵۷۱ھ) جیسے تذکرہ نگار کہاں سے میسر آسکتے تھے، جو ان کے کارناموں کو اجاگر کرتے؟ کاش سندھی وہندی رواۃ علم وادب کیلئے بھی کوئی ابن الفرضی (۱۰۱۳ء) یا ابن بشکوال (۱۱۸۳ء) پیدا ہوتا تو آج کتنی ہی نامعلوم شخصیتوں کا شمار مشاہیر میں ہوتا، عربی تاریخوں کے ضمنی ابواب متعلقہ فتوح سندھ کے علاوہ گنتی کی چند کتابیں (جیسے چچ نامہ، تاج المآثر، طبقات ناصری،

اور بعض اعتبار سے آداب الحرب والشجاعۃ ،لب الالباب ، جوامع الحکایات وغیرہ اصولی مآخذ) ہیں ،لیکن ان سے دونوں ملکوں کی سیاسی تاریخ کا چوکھٹا تو جوں توں تیار ہوسکتا ہے ،مگر علمی وثقافتی تاریخ کے سلسلے میں ہمارے پاس کوئی مرتب ومستند دستاویز نہیں تھا ،جو صحیح معنوں میں نشان راہ بن سکتا ہو ، تاریخ وجغرافیہ اور تذکرہ وسوانح کی ضخیم کتابوں میں پراگندہ مواد موجود تھا جسے ہم سندھ وہند کے قدیم علماء کی پرچھائیوں سے تعبیر کرسکتے ہیں ان پرچھائیوں کو تحقیق کی گرفت میں لانا اور بقول مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی ''ذمہ دارانہ شناخت کے بعد ان سے بزم پیشیں کا آراستہ کرنا'' ''جام وسنداں باختن'' کا مصداق ہے ،

قاضی اطہر مبارکپوریؒ نے اپنی شبانہ روز جانکاہی کے نتیجے میں انھیں پرچھائیوں کی شناخت کر کے ایک بزم پیشیں سجانے کا وقیع کارنامہ انجام دیا ہے ،اب اس کتاب کے ذریعے ہمیں ساتویں صدی ہجری تک کے سندھ وہند کے محدثین ،مفسرین ،فقہاء ،ادباء ،متکلمین ،فلاسفہ ،شعراء ،اطباء اور دوسرے قابل ذکر اشخاص کی ایک بہت بڑی جماعت کا تعارف بیک نظر حاصل ہوجاتا ہے ، کتاب کی اہمیت موضوع کی سنگلاخی کے تناظر میں دیکھنی چاہئے ،مؤلفؒ نے مقدمۂ کتاب میں مذکورہ بالا امور پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کے بعد خاص اس موضوع سے متعلق اپنے بعض پیش رو مصنفین کے کارناموں کا بھی ذکر کیا ہے ،اور یہ کہ ان کی موجودگی میں ''رجال السند والہند'' کی تالیف کی کیا ضرورت تھی؟ ذیل میں مؤلفؒ کی عربی عبارت کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے

''مولانا غلام علی آزاد بلگرامیؒ پر خدا کی رحمت ہو کہ سب سے پہلے انھوں نے اس خلاء کو محسوس کیا اور اسے پُر کرنے کی کوشش کی اور ہندوستان کے علماء ومشائخ کے تراجم جس طرح ہوسکے متقدمین کے طرز پر جمع کردیئے ، چنانچہ عربی میں ''**سُبحَۃُ الْمَرْجَان فی آثار الھندوستان** ''اور فارسی میں ''مآثر الکرام'' تالیف کی ، فارسی ہی میں رحمٰن علی ناروی نے ''تذکرہ علماء ہند'' لکھی اور آخر میں سید عبدالحی حسنیؒ (م ۱۳۴۱ھ) نے اپنی کتاب ''نزھۃ الخواطر'' تصنیف فرمائی جو (مشترکہ) ہندوستان کی اہم شخصیتوں کے تراجم میں سب سے بڑی اور مستند کتاب ہے اور اس جیسی کتاب اب تک وجود میں نہیں آئی تھی ،مگر چونکہ اعیان سندھ وہند کا دائرہ اس سے بھی وسیع تر ہے اس لئے میں نے

صرف ساتویں صدی تک کے سندھ و ہند کے رجال کے حالات مزید وسعت کے ساتھ جمع کرنے کی کوشش کی، کیونکہ ساتویں صدی تک کے سندھ و ہند کے رجال پر بہت ہی کم لکھا گیا ہے، ''نزھۃ الخواطر'' کی پہلی جلد جو پہلی صدی سے ساتویں صدی تک کے رجال پر مشتمل ہے انتہائی مختصر ہے اس میں اکثر تراجم ان لوگوں کے ہیں جو غیر ممالک سے آکر ہندوستان میں آبسے تھے، ہاں ساتویں صدی کے بعد کے تراجم کی تعداد واقعۃً بہت ہے، اس لئے میں نے خاص ساتویں صدی تک کے رجال پر محنت مرکوز کردی اور سالہا سال تراجم اور تاریخ وطبقات کی کتابوں کی ورق گردانی کا نچوڑ ''رجال السند والہند'' کی شکل میں پیش ہے، ان رجال میں علماء، فقہاء، محدثین، راویان حدیث، مشائخ صوفیہ، قاضی، حکام، سربرآوردہ لوگ، شعراء، ادباء، نحو ولغت کے ماہرین، اطباء، فلاسفہ، متکلمین، تاجر پیشہ اور اہل اسلام کے مختلف فرقے اور نظریوں سے تعلق رکھنے والے حضرات شامل ہیں'' (ص:۱۲، ۱۳ ۔ طبع دارالانصار قاہرہ)

نہج وترتیب، پہلا مرحلہ:۔ کتاب کی تکمیل درحقیقت دو مرحلوں مین ہوئی ہے، پہلا مرحلہ ذوالحجہ ۱۳۷۷ھ (جون ۱۹۵۸ء) کو پورا ہوتا ہے، جب ''رجال السند والہند'' کا پہلا ایڈیشن حجازیہ پریس محمد علی روڈ بمبئی سے طبع ہوکر منظر عام پر آیا، جس کا نہج اور ترتیب کچھ اس طرح ہے۔

(۱) کتاب کے ابتدائی صفحات میں مختلف ممالک کے علماء، اہل قلم اور سربرآوردہ حضرات کی تقریظیں نظم ونثر میں درج ہیں، جن حضرات کی تقریظات شامل کتاب ہیں ان کے نام یہ ہیں!
(۱) مولانا ابوالوفاء افغانیؒ، صدر دائرۃ إحیاء المعارف النعمانیہ، حیدرآباد (۲) محقق وادیب شیخ عبدالمنعم النمر عضو بعثۃ الازھر فی الھند (۳) شیخ عبدالعال عقباوی عضو بعثۃ الازھر فی الھند (۴) مؤرخ ومحقق احمد سباعی مکی، آڈیٹر وزارت مالیات حکومت سعودی عرب ومؤلف تاریخ مکہ (۵) شیخ سلیمان دارانی مدرس جامع بنی امیہ دمشق (۶) شیخ سعد بن عبد اللہ الثملان بحرین (۷) استاذ احمد فرید مقیم بمبئی (۹) شیخ محمود بن الندیر طرازی مدنی مدرس حرم مکی،

(۲) ص:۱۱ سے ص:۴۶ تک مصنف کا مبسوط مقدمہ ہے، جس میں موضوع کی سنگلاخی، مواد کی ندرت وکمیابی کا ذکر کرتے ہوئے ان کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو خاص سندھ و ہند پر

پیش رَو مصنفین نے لکھی ہیں، اس ضمن میں ان کتابوں کی حیثیت وافادیت کے ساتھ نقص وخلل کے پہلوؤں کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے، ''رجال السند والہند'' کی وجہ تالیف کے ساتھ ساتھ مؤلف نے اپنے منہج اور انداز تحقیق کو تفصیل سے پیش کیا ہے، اس کے بعد سندھ وہند کا عالم اسلام میں علمی، ادبی اور ثقافی اعتبار سے کیا مقام ومرتبہ ہے، اس پر روشنی ڈالی گئی ہے، پھر ان دونوں ملکوں کے وہ مشہور شہر جن کا ذکر کتاب میں اکثر وبیشتر آیا ہے ان سب کا تعارف یکجا طور پر کرادیا گیا ہے اور ان کے ناموں کی ترتیب حروف ہجاء پر رکھی گئی ہے تاکہ دوران مطالعہ کسی شہر کی جغرافیائی وتمدنی حالت معلوم کرنے کی ضرورت پڑے تو پلٹ کر بآسانی معلوم کی جا سکے، تراجم وسوانح کا حصہ جو کتاب کا اصل عنصر ہے ص: ۴۷ سے شروع ہوکر ۳۱۹ پر ختم ہو جاتا ہے، اس میں ۳۱۶ رمردوں، عورتوں کے تذکرے ہیں، اس کے بعد فہرست رجال ص: ۳۲۵ تک اور آخر میں مصادر وماخذ کی طویل فہرست ص: ۳۲۸ تک درج ہے۔

(۳) تراجم کی ترتیب متعلقہ اشخاص کے ناموں کے حروف کے لحاظ سے حروف تہجی پر رکھی گئی ہے، مثلاً الف میں احمد، ابراہیم، ابان، آنکو وغیرہ، باء میں باجھر، بختیار، بشر وغیرہ علیٰ ھٰذا القیاس دیگر حروف کے اسماء، البتہ حرف الف میں برکۃً احمد کو اور حرف میم میں محمد کو اس کے دیگر ناموں پر مقدم رکھا گیا ہے، اگر ایک نام کے بہت سے رجال ہوں تو ان کے آباء کے ناموں کے حروف کو ترتیب ہجائی پر مرتب کیا گیا ہے تاکہ تلاش کرنے میں آسانی رہے، ناموں کے بعد کنیتوں کا اسی ترتیب سے ذکر ہے، مثلاً ابوجعفر، ابوحارثہ، ابورواح وغیرہ، آخر میں مبہم اور بغیر نام والوں کا ذکر ہے۔

(۴) عرب کے قدیم مؤرخین وجغرافیہ داں حضرات کی پیروی کرتے ہوئے مؤلفؒ نے بھی سندھ وہند کو دو ملک کی حیثیت سے ذکر کیا ہے ورنہ اس میں شبہ نہیں کہ دونوں ایک ہی ملک کے دو حصے ہیں۔

(۵) اس جلد میں دو طرح کے علماء واعیان کو پیش کیا گیا ہے، ایک وہ جو سرزمین سندھ یا ہند میں پیدا ہوئے یہیں زندگی کا اکثر حصہ بسر کیا خواہ ان کی وفات کسی بیرونی ملک میں واقع ہوئی ہو، دوسرے وہ جو اصلاً تو سندھی یا ہندی نژاد تھے، لیکن ان کے آباواجداد دوسرے ملکوں میں منتقل

ہوگئے تھے اور یہ وہیں پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور زندگی باہر ہی بسر کی، باقی وہ لوگ جو دوسرے ملکوں سے آکر ہندوستان میں سکونت پذیر ہوگئے ان کو بالقصد اس جلد میں نہیں لیا گیا بلکہ پروگرام میں ان لوگوں کو کتاب کے اگلے حصہ کیلئے اٹھا رکھا گیا۔

(۶) جیسا کہ اوپر معلوم ہوا کہ ہندوستانی علماء و مصنفین کی کتابوں میں یہاں کے اہل علم واعیان کے تراجم بہت ہی کم دستیاب تھے، اس لئے مؤلفؒ نے عام کتب تاریخ ورجال، کتب طبقات اور دوسرے مخصوص ملکوں اور خطوں کی کتب تاریخ کے علاوہ حدیث، سیر ومغازی، جغرافیہ ،لغت ،شعر، ادب اور بعض دیگر علوم وفنون کی سو سے زائد امہات کتب سے استفادہ کیا اور متعلقہ ترجمہ کو خاطر خواہ معلومات بہم پہونچائیں۔

(۷) صاحب ترجمہ کے حالات میں زیادہ تر دوسری کتابوں کے اقتباسات بعینہ نقل کئے گئے ہیں، ان میں نقل بالمعنیٰ یا قطع وبرید کی کوشش نہیں کی گئی ہے، بلکہ احتیاط کا عالم یہ ہے کہ کہیں کسی عبارت میں اگر (قاضی صاحب کے علم وتحقیق کے مطابق) غلطی تھی تو اس غلطی کے ساتھ ہی نقل کی گئی اور الگ سے اس پر تنبیہ اور غلطی کی تصحیح کردی گئی، مثلاً ص:۲۵۳-۲۵۴ پر راجہ اَلور'' مہروک بن رایق'' کا ترجمہ بزرگ بن شہریار کی کتاب عجائب الہند سے ماخوذ ہے، اس میں ''ملک اَلور'' کے بجائے ہر جگہ ''ملک الرا'' ہوگیا ہے پورا ترجمہ نقل کرنے کے بعد قاضی صاحب فرماتے ہیں''قال القاضی : کان المهروک بن رایق من رجال المائة الثالثة وکان ملک ''اَلْوَ ر'' و''الرا'' فی کل موضع من هٰذہ العبارۃ تصحیف ا لنسخ أو الطبع'' مہروک بن رایق تیسری صدی کے ''الور'' کا راجہ تھا اور عبارت میں ہر جگہ جو''الرا'' ہے وہ یا تو نقل کی غلطی ہے یا طباعت کی۔

(۸) صاحب ترجمہ کے سال وفات کے ذکر اور زمانے کے تعیین کا اہتمام کیا گیا ہے، اگر دونوں باتوں میں سے کسی ایک کی بھی صراحت مؤلف کو کسی مأخذ میں نہیں ملی تو خود اس کے شیوخ وتلامذہ اور معاصرین میں غور وفکر کرکے زمانے کی تعیین کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً ص:۵۴ پر احمد بن السندی البغدادی المطر ز کا ترجمہ خطیب بغدادی کی تاریخ سے صرف ڈھائی سطر میں منقول ہے، اس میں انکے شیخ یعقوب بن ابراہیم الدورقی کا بھی ذکر ہے، پھر قاضی صاحب فرماتے ہیں:

''قال القاضی ! ذکرہٗ السمعانی فی کتاب الأنساب أیضاً ولم أجد سنة وفاته ومات شیخ الدورقی فی سنة اثنتین وخمسین ومائتین فکان أحمد بن السندی المطرز من رجال المائة الثالثة'' یعنی چونکہ ان کے استاذ یعقوب بن ابراہیم الدورقی کی وفات ۲۵۲ھ میں ہوئی اس لئے اتنا تو بہرحال کہا جاسکتا ہے کہ صاحب ترجمہ تیسری صدی ہجری کے اعیان میں ہیں۔

(۹) متن کتاب میں اگر کسی منقولہ عبارت کے تحت کسی قبیلہ، خاندان یا قوم ونسل وغیرہ کا ذکر آگیا جو عام طور پر معروف نہیں یا کسی اہمیت کے حامل ہیں تو ان پر بھی مؤلف نے مفصل وتشفی بخش نوٹ لکھے، مثلاً ! ص:۲۷۲ پر ابو سالمہ الزطی الہندی کے کے ترجمہ میں بلاذری کی فتوح البلدان سے عبارت نقل کی، جس میں ''سیابجہ'' اور ''زط'' کے الفاظ آئے ہیں، چنانچہ قاضی صاحب دونوں کی تشریح یوں کرتے ہیں:

قال القاضی !(السیابجة) معربٌ سیاہ بچه وھم علوج السند،قال ابن الفقیه الھمدانی فی کتاب البلدان فی الیمن ! وقال الکلبی ! علوج مصر القبط وعلوج الشام جراجمة، وعلوج الجزیرہ جرامقة، وعلوج ا لسواد نبط ، وعلوج السند سیابجة ، وعلوج عمان المرزَن ، وعلوج الیمن سامران ،

سیابجہ سیاہ بچہ کا معرب ہے، اور یہ علوج سندھ کو کہتے ہیں، (عُلوج عِلج کی جمع ہے، جس کے معنیٰ ہیں، سیاہ فام، سخت جان، مزدور پیشہ) ابن الفقیہ نے کتاب البلدان فی الیمن میں کلبی سے نقل کیا ہے مصر کے علوج قبطی کہلاتے ہیں، شام کے جراجمہ، جزیرہ کے جرامقہ، سواد کے نبط، سندھ کے سیابجہ، عمان کے مرزن اور یمن کے علوج سامران کہے جاتے ہیں،

(والزط)معربٌ جاٹ، وقد کان قدومھم إلیٰ العرب فی أیام الجاھلیة وکان کثیرٌ منھم فی جند المسلمین أیام عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فأسلموا وحسن إسلامھم ولھم فی الإسلام روایات وآثارٌ،

زط ''جاٹ'' (ایک قوم) کا معرب ہے، زمانہ جاہلیت میں یہ لوگ عرب سے آئے اور ان میں بہت سے لوگ خلافت فاروقی میں مسلمانوں کی فوج میں شامل ہوئے، اسلام لائے اور کیا

خوب لائے، ان کے اسلامی دور کے واقعات اور قصے بہت ہیں۔

پھر آگے قاضی صاحب نے ڈھائی صفحات میں مختلف مصادر کی مدد سے ''زط'' قوم کے رہن سہن، جغرافی اعتبار سے ان کی جائے سکونت، اشاعت اسلام کے تئیں ان کی خدمات اور ان کی خصوصیات مثلاً خودداری و بہادری وغیرہ امور کی بابت مفید معلومات بہم پہونچائی ہیں،

(۱۰) چونکہ یہ کتاب تذکرہ وتراجم کی کتاب ہے مناقب کی نہیں، اس لئے علماء، وائمہ اور سرکردہ حضرات کے ناموں کے ساتھ بھاری بھرکم القاب نہیں لگائے گئے الا یہ کہ کسی مصنف کی عبارت میں کسی نام کے ساتھ موجود ہوں تو بعینہٖ نقل عبارت کے ضمن میں ایسے القاب آگئے ہیں، گویا اس سلسلہ میں مؤلف نے مؤلفین متقدمین کے طریقے کی پیروی کی ہے۔

زبان خلق:۔ کتاب ابھی تالیف کے مرحلے میں تھی کہ قاضی صاحب کے اس کام کا چرچا اوساط علمیہ میں شروع ہو گیا تھا اور بہت سے اہل علم کو کتاب کی آمد کا شدت سے انتظار تھا طباعت سے پہلے مختلف اہل علم اور اصحاب ذوق وتحقیق کے سامنے قاضی صاحب کا یہ کام آیا تو سب نے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور حوصلہ افزائی کی،

(۱) مولانا ابوالوفاء صاحب افغانیؒ اپنے ذوق تحقیق، وسعت مطالعہ اور علم دوستی میں مشہور ہیں، آپ نے کتاب کا مسودہ دیکھ کر بلاتصنع یہ اونچے کلمات ثبت فرمائے!

قد طالعتُ تراجم من الكتاب الذى جمعهٔ أخونا الفاضل الجليل القاضى أطهر النبيل فى علماء السند والهند من كتب عديدة بجد وجهدٍ، فسرنى جهدهٔ حيث ملأ الخلأ الذى لم يسبقه إلىٰ ملئهٖ أحدٌ قبله، شكر الله مساعيهٔ وبارک فى قلمهٖ وكشف عليه سبيل إتمامهٖ(ص:۴)

میں نے اپنے دوست فاضل جلیل ونبیل کی جمع کردہ اس کتاب کے چند تراجم دیکھے جو انھوں نے سندھ وہند کے علماء سے متعلق مختلف کتابوں سے انتہائی محنت کے ساتھ مرتب کیا ہے، مجھے ان کی محنت سے خوشی ہوئی کہ ایسے خلاء کو پُر کیا ہے، جس کو ان سے پہلے کوئی نہیں کرسکا، اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو بارآور بنائے، قلم میں برکت دے اور اس کی تکمیل کی راہ ہموار فرمائے۔

شیخ عبدالعال العقباوی نے اپنے خیالات کا اظہار ان پُرشکوہ الفاظ میں کیا ہے!

''مؤلف کی یہ محنت قابل قدر ہے، اپنی اس کتاب کے ذریعہ انھوں نے ان رجال علم کی معرفت آسان کردی جنھوں نے ہندوستان میں اسلام کی آمد سے لیکر ساتویں سدی ہجری تک اسلام کی خدمت انجام دی ہے، مؤلف نے ان کو اجاگر کرکے آسان ترتیب میں مرتب کردیا جو کوئی ان مراجع و مآخذ پر نظر ڈالے گا جنھیں مؤلف نے کھنگال ڈالا ہے وہ اس بیش قیمت کتاب کی تالیف میں صرف شدہ محنت کا انداز بخوبی لگالے گا، اللہ تعالی دوسرے جز کی تکمیل کا انھیں حوصلہ وعزم دے کہ اس کا نفع عام اورتام ہو'' (ترجمہ از تقریظ)

دیگر تقریظ نگاروں نے بھی اسی طرح کے جذبات وخیالات کا اظہار کیا ہے، مؤلفؒ کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہوئے آئندہ کے پروگراموں کی تکمیل کے لئے دعائیہ کلمات لکھے ہیں۔

(۳) مناسب معلوم ہوتا ہے کہ **شیخ محمود ابن النذیر الطرازی المدنی** مدرس حرم مکی کے طویل منظوم خراج تحسین کے چند نمونے کے اشعار بھی ہدیہ ناظرین کردئے جائیں جو انشاءاللہ دلچسپی کا سامان ہوں گے۔

(۱) **هنيئًا لكم يا سادة العصر أبشروا　　كتاب ''رجال السند والهند'' يُنشَرُ**

(۲) **كتابٌ به السند السنية تزدهی　　وسفرٌ به الهند الحكيمة تفخرُ**

(۳) **كتابٌ قضىٰ فی جمعهٖ نصف عمرهٖ　　مكرُّمنا القاضی المفسر أطهرُ**

(۴) **يعيش لنا القاضی المؤلف قد أتىٰ　　بما جمعهٗ فی العصر لا يُتصوّرُ**

(۵) **أديبٌ ، فقيهٌ ، ناقدٌ ، متكلمٌ　　بليغٌ ، ولكن لم تلده زِمخشرُ**

ترجمہ:۔(۱) اے وقت کے سرکردہ لوگو! تمہیں مبارک ہو، خوش ہوجاؤ کہ کتاب ''رجال السند والہند'' شائع ہورہی ہے۔

(۲) ایک ایسی کتاب جس پر تابناک خطۂ سندھ کو ناز ہوگا، ایک ایسا دستاویز جس پر حکمت سے لبریز سرزمین ہند فخر کرے گی۔

(۳) ایک ایسی کتاب جس کی تالیف میں ہمارے معزز قاضی ومفسر اطہر (مبارکپوری) نے اپنی آدھی عمر کھپا ڈالی ہے۔

(۴) ہمارے قاضی صاحب کی عمر دراز ہو کہ ایسی کتاب پیش کی جس کی تالیف اس

زمانہ میں تصور نہیں کی جاسکتی۔

(۵) وہ ادیب ہیں، فقیہ ہیں، ناقد ہیں، اور بلیغ بھی ہیں مگر ان کی پیدائش زمخشر کی نہیں ہے، (کہیں ان کمالات کی وجہ سے انھیں کوئی ''زمخشری'' نہ سمجھ لے)

کتاب طبع ہوکر منظر عام پرآ گئی، اہل علم کے ہاتھوں میں پہونچی، ملک و بیرون ملک کے علماء نے نہ صرف پسندیدگی کا اظہار کیا بلکہ مختلف مؤقر رسالوں اور نجی مکاتبت کے ذریعہ قاضی صاحب کو ہدیۂ تبریک وخراج تحسین پیش کیا، مؤلف کی محنت کو سراہا گیا اور علم وتحقیق کے شائقین کو اس متاع بے بہا کی طرف متوجہ کیا گیا، ان تبصروں کے چند نمونے ملاحظہ ہوں،

(۴) مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ نے ماہنامہ ''برہان'' دہلی کے شمارہ بابت مارچ ۱۹۵۹ء میں شاندار تبصرہ کیا، موضوع کی اہمیت، پس منظر وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے کتاب کا اجمالی تعارف اور بعض فروگزاشتوں یا کمیوں (جن کا ذکر آگے آئے گا) کا ذکر کرکے لکھتے ہیں۔

''تاہم لائق مصنف قابل مبارکباد ہیں کہ عربی میں یہ تذکرہ مرتب کرکے انھوں نے ایک اہم علمی خدمت انجام دی ہے، ہندوستان میں اسلام کی تاریخ اور ابتدائی اور متوسط قرون اسلام میں عرب وہند کے تعلقات باہمی کا مطالعہ کرنے والوں کیلئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے''

(۵) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان اپنے نجی خط بنام قاضی اطہر مبارکپوریؒ مرسلہ ۱۵/اپریل ۱۹۵۹ء میں یوں سراہتے ہیں:

''حضرت العلامہ قاضی ابوالمعالی اطہر مبارکپوری کی تصنیف ''رجال السند والہند'' کے مطالعہ سے مستفید اور محظوظ ہوا، اللہ تعالیٰ موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے، آپ نے ہند وسندھ کے مایۂ فخر وامتیاز مگر تاریخی مظلوم گروہ کے تراجم اور تذکرہ کو ایک منظّم صورت میں پیش کرکے ایک بڑے خلاء کو پُر فرمایا''

آگے تحریر فرماتے ہیں،

''اللہ تعالیٰ مصنف علام کو توفیق مزید عطاء فرمائے کہ اپنے وعدہ کے مطابق ان رجال کا تذکرہ بھی جمع فرمادیں جو اگرچہ ہند وسندھ میں پیدا نہیں ہوئے، مگر ان کا طویل قیام استفادہ یا افادہ کی صورت میں ان ملکوں میں رہا، اللہ تعالیٰ ناشر کو بھی جزائے

خیر عطاء فرمائے جس نے اس مفید علمی سرمایہ کو بصورت طباعت شائع کر کے علمی دنیا کیلئے نہایت اہم تحفہ مہیا فرمادیا'' (ترجمان الاسلام قاضی اطہر نمبر ص:۱۲۶)

(۶) مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ''صدق جدید'' ۱۲/ جون ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں کتاب کی خصوصیات وغیرہ کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:

''قاضی صاحب نے یہ کتاب تیار کر کے ہندوستانی اہل قلم کا سر دنیائے اسلام میں بلند کیا ہے، جس پر وہ اور ان کے پبلشر، دونوں قابل مبارکباد ہیں، کاش قاضی صاحب کو اتنی فرصت اور اطمینان نصیب ہو کہ کتاب کی آئندہ جلدوں کو چودھویں صدی ہجری تک کے مشاہیر تک لکھ سکیں''

(۷) رسالہ ''معارف'' اعظم گڈھ نے جولائی ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں لکھا:

''فاضل مصنف نے بڑی محنت اور جستجو کے بعد یہ کتاب لکھی ہے اور سینکڑوں مخزنوں کو کھنگال کر معلومات کے جواہر کو جمع کیا ہے، اس کتاب کی اشاعت سے ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی، تاریخی وطبقات وتراجم میں ایک بیش قیمت کتاب کا اضافہ ہوا ہے، جس کیلئے فاضل مؤلف مبارکباد کے مستحق ہیں''

(۷) روزنامہ ''الندوہ'' مکہ مکرمہ نے ۲۷/ شعبان ۱۳۷۸ھ کی ایک اشاعت میں تین کالموں میں ''نظرةٌ فی کتاب رجال السند والهند '' کے عنوان سے کتاب کی اہمیت وافادیت پر ایک طویل مضمون شائع کیا ہے، جسے مؤلفؒ نے کتاب کی دوسری کامل اشاعت کا جزء بھی بنایا ہے، مضمون نگار ہیں الاستاذ ع، ابو مامون، مضمون کے آخر پیراگراف کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے،

''اس کتاب کو دیکھ کر ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ مصنف نے اس کی تالیف میں کس قدر محنت ومشقت اٹھائی ہوگی، تاریخ وسیر کی کتنی کتابوں کو کھنگالا چھانا اور پھٹکا ہوگا، صرف اس لئے کہ ہمارے سامنے ان باکمال رجال کی منتشر سیرت کو محقق شکل میں پیش کرسکیں، خصوصاً جب کہ اس سے پہلے کسی نے اس میدان میں قدم رکھنے کی ہمت نہ کی ہو''

نقد ونظر:- قاضی صاحب نے اپنی پوری محنت اور بھرپور اجتہادی صلاحیت کتاب کی ترتیب

وتنقیح میں صرف فرمادی تھی، پھر بھی وہ ایک انسان تھے، اللہ کی کتاب کے علاوہ روئے زمین پر کوئی بھی کتاب ایسی نہیں ہے جس کے مصنف سے کچھ فروگذاشت نہ ہوئی ہو، پھر جہاں موضوع کی جدت، مواد کی ندرت اور مختلف امور کو جوڑ کر ایک غیر معلوم نتیجہ برآمد کرنا ہی اصل کام ہو وہاں فروگذاشتوں کے وقوع کا امکان اور بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ قاضی صاحب کی اس کتاب کو بھی نقد ونظر کی کسوٹی پر پرکھا گیا، بجا یا بے جا تنقیدیں ہوئیں جن کا اثر کتاب کے اگلے ایڈیشن پر مرتب ہوا، اس اثر کا ذکر ہم انشاء اللہ آگے چل کر کریں گے، یہ مضمون نامکمل رہے گا اگر ان تنقیدات کا ذکر نہ کیا جائے، اس لئے ناظرین کی دلچسپی اور مزید غور وخوض کیلئے دو بالغ نظر، مستند، صاحب تحقیق علماء کی تحریریا اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مدیر ماہنامہ ''برہان'' دہلی ......جن کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے...... ''برہان'' کے اسی تبصرے میں رقم طراز ہیں، جس کا حوالہ اوپر گذر چکا۔

''اتنی ضخیم کتاب میں ناموں اور بیانات میں غلطیوں کا ہونا مستبعد نہیں ہے، چنانچہ اس میں بھی ہیں، مثلاً باب الالف کے پہلے صفحہ پر ہی دوسرے پیراگراف کی سطر دو میں بجائے ''پریچ بن ا لنعمان'' کے ''سریچ بن النعمان'' پیراگراف تین سطر اول میں ''سندی بن بحر'' کے بجائے ''سندی بن الحسن'' ہونا چاہئے، اسی طرح ص:۵۴ر پر احمد بن السندی کے تذکرہ میں یہ عبارت لکھی ہے ''وذکرهٔ أنه سمع بالبصرة'' یہاں لفظ ''سمع'' کے بعد ''عنه'' ہونا چاہئے، (خطیب بغدادی ج:۴ ص:۱۸۷) علاوہ ازیں مشہور امام لغت الحسن بن محمد صغانیؒ جیسے مشاہیر کے تذکرے میں مزید تحقیق وتفتیش کی گنجائش تھی'' (برہان مارچ ۱۹۵۹ء)

راقم عرض کرتا ہے کہ ''سریچ بن النعمان'' ہی صحیح ہے، اور تاریخ خطیب میں اسی طرح ہے یہ ایسے راوی ہیں جن کے طریق سے خطیب بکثرت روایتیں تخریج کرتے ہیں، معلوم نہیں مؤلف نے دوسرے ایڈیشن میں اس کی تصحیح کیوں نہیں کی؟ رہا ''سندی بن بحر'' کا معاملہ تو اگر چہ یہ بھی تاریخ خطیب میں اسی طرح ہے جیسا کہ تبصرہ نگار مرحوم نے ذکر کیا، لیکن یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو قابل گرفت ہو کیوں کہ بکثرت ایک راوی کو اس کے باپ کی طرف منسوب نہ کرکے دادا کی

طرف منسوب کردیا جاتا ہے، صغانی کا معاملہ تو دوسرے ایڈیشن میں ان کے ترجمہ پر نظر ثانی کرتے ہوئے مؤلف نے بہت کچھ حک واضافہ کیا ہے، بلکہ اگر کہا جائے کہ پوارا ترجمہ ہی نئے سرے سے لکھا ہے تو بے جا نہ ہوگا، ملاحظہ ہو ص:۹۸۔۱۰۴(طبع اول) اور ۹۲۔۔۹۵ (طبع دوم)

(۲) دوسرا تنقیدی مضمون درحقیقت ''رجال السند والہند'' کا تفصیلی جائزہ ہے، مضمون نگار ہیں، مولانا ابومحفوظ الکریم صاحب معصومی لکچرر تاریخ مدرسہ عالیہ کلکتہ، تاریخ چونکہ آپ کا مخصوص مضمون ہے، اس لئے آپ نے بڑی دلچسپی و باریک بینی سے قاضی صاحب کی کتاب کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ مراجع کی مراجعت اور اپنے ذخیرۂ معلومات سے موازنہ بھی کیا ہے، آپ کا یہ مضمون اتنا طویل ہے کہ ''برہان'' کے تین شماروں بابت جولائی تا ستمبر ۱۹۵۹ء میں قسط وار چھپا اور تقریباً ۴۰ رصفحات کو محیط ہے، اس میں شبہ نہیں کہ فاضل مقالہ نگار کے ذریعہ اٹھائے گئے بیشتر نکات طالب تحقیق کے دل کو لگتے ہوئے ہیں، اس لئے ذیل میں اس مضمون کا خلاصہ قارئین کی نذر کیا جاتا ہے تاکہ ان ملحوظات کا کتاب سے مقارنہ کرتے ہوئے اس سے استفادہ کیا جائے۔

اصولی نکات:۔ (۱) قدیم عرب مؤرخین وجغرافیہ دانوں کے مطابق سندھ وہند کو دو مستقل ملکوں کی حیثیت دینا بجا ہے، لیکن ان کے دائرہ کو وسعت دیتے ہوئے بعض علاقوں کو سندھ کا حصہ قرار دینا محل نظر ہے، مثلاً بامیان کو سندھ کا علاقہ قرار دے کر بامیانی علماء کو شامل کتاب کرنا صحیح نہیں ہے، (اسکے بعد معصومی صاحب کی تحقیقات ہیں) اُحید بن الحسین بن علی البامیانی اور محمد بن علی بن احمد ابوبکر البامیانی کو شامل کتاب کرنا صحیح نہیں ہے، یا اسی طرح زمن داور یا ارض الداور کے بارے میں فاضل ناقد کا خیال ہے کہ یہ سندھ میں داخل نہیں ہے۔

قاضی صاحب کا موقف:۔ بامیان کو سندھ کا علاقہ قرار دینے کی بابت مؤلف اپنی جگہ مطمئن ہیں، اس لئے آپ نے بامیانی علماء کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ فاضل نقد نگار نے الزامی طور پر حکیم افضل بامیانی کا ذکر کیا تھا کہ انھیں بھی مؤلف کو داخل کتاب کرلینا چاہئے یہ ان کی شرط پر ہیں، چنانچہ مؤلف نے حکیم صاحب کو خوش آمدید کہتے ہوئے شامل کتاب کرلیا، (دیکھئے طبع دوم ص:۷۳)

نقد:۔ (۲) سندھ کے مشہور شہر ''بیرون'' کے نام میں قدیم تصحیف برقرار رکھی گئی ہے،

اور یہ صحیح ''نون'' کے ساتھ ''نیرون'' ہے، ابوریحان البیرونی کا ترجمہ ایک غلط جغرافیائی بیان تسلیم کر لینے کی وجہ سے داخل کتاب ہوا، تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق خوارزم سے تھا۔

قاضی صاحب کا موقف:۔ بیرون و نیرون کی جو دقیق بحث فاضل نقد نگار نے فرمائی تھی چونکہ بیشتر مستند مؤرخین کی رائے وہی ہے جس پر قاضی صاحب نے عمل کیا، اس لئے اس جدید تحقیق پر توجہ نہیں دی گئی، بلکہ ابوریحان بیرونی کا ترجمہ اس دوسرے ایڈیشن میں اور خوبصورت اور زوردار بنا دیا گیا اور کئی ایک تصریحات کا اضافہ کر دیا گیا جو بیرونی کو سندی نژاد بتاتی ہیں، (دیکھئے طبع دوم ص:۱۰۴)

نقد:۔ (۳) ''رجال السند والہند'' کے موضوع سے صرف ان شخصیتوں جن کا تعلق ہے، کا مولد و منشاء سندھ کا کوئی علاقہ ہو، خواہ وفات کسی بیرونی شہر میں ہوئی ہو، یا جن کا نسبی تعلق سندھ و ہند سے ثابت ہو لیکن ان کا مولد و مسکن باہر کا کوئی ملک رہا ہو، یا جو لوگ باہر سے ترک وطن کر کے ہند و سندھ کے کسی علاقہ میں آ بسے ہوں۔

کتاب کے تراجم پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ مؤلف نے پہلی دو شرطیں یا تو بالقصد توڑی ہیں، یا غیر شعوری طور پر ٹوٹ گئی ہیں، کسی شخص کے سندی الاصل یا سندی المولد بتانے کیلئے جن قرائن و شواہد کی ضرورت ہوسکتی ہے اصولی طور پر مؤلف کے پاس اس کا کوئی نقشہ نہیں ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ تراجم و طبقات کی کتابوں میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ملتی ہے جن کے اسماء، کنیتیں، یا القاب سندی، ہندی، ابوالسندی، ابوالہندی، ابن السندی، ابن الہندی، وغیرہ ہیں، پھر ان کی اولاد اپنے بڑوں کی طرف منسوب ہو کر السندی یا الہندی کہلائی، اس لئے ضروری نہیں کہ جہاں کہیں السندی، الہندی، ابوالسندی، ابوالہندی، وغیرہ آئے وہاں متعلقہ شخص سندی یا ہندی نژاد قرار پائے، جب تک اس کی سندیت یا تذکرہ نگاروں کی صراحت یا تاریخی قرائن کی دلالت سے پایۂ ثبوت کو پہونچ نہ جائے اس وقت تک ''رجال السند والہند'' میں اس کا ذکر نہیں کیا جاسکتا۔ (اس کے بعد فاضل تنقید نگار نے کئی صفحات میں اس کے دلائل اور ان اشخاص کی فہرست دی ہے جو اس اصول کی رُو سے سندی نژاد نہیں قرار دئے جاسکتے ہیں)

قاضی صاحب کا موقف:۔ سندی ، ابوالسندی ، ہندی یا ابوالہندی کے متعلق فاضل ناقد کی تحقیق مؤلف کے نزدیک نا قابل قبول تھی ، چنانچہ اس تعلق سے کوئی جزوی ترمیم نہیں کی گئی ، البتہ فاضل ناقد کی نشاندہی کے مطابق مؤلفؒ نے ابوالہندی محدث (ص:۲۸۶) دوسرے ابوالہندی محدث (ص:۲۸۷) اور ابوالہندی الکوفی الشاعر (ص:۲۸۷) کے تراجم سرے سے حذف کر دیئے کیونکہ ان کے ہندی ہونے پر واقعۃً کوئی ثبوت نہیں تھا۔

نقد:۔ ایک اصولی غلطی جس کو بار بار دہرایا گیا وہ یہ ہے کہ بعض ایسی نسبتیں جو ایک نام کے کئی شہروں کے تعلق سے مشترک ہیں یا الگ الگ ہونے کے باوجود خطی مشابہت کی وجہ سے ایک دوسرے سے محرف ہو جایا کرتی ہیں ، ایک دوسرے کی تمیز صحیح طور پر نہ ہونے کی وجہ سے مؤلف بار بار غلطیوں کا شکار ہوئے ہیں ، مثلاً ''المنصوری'' یہ نسبت مؤلف کے خیال میں تنہا ''منصورۃ السند'' کی طرف ہو سکتی ہے ، حالانکہ سندھ کے علاوہ خوارزم ، آرمینیا ، اور طبرستان وغیرہ کے کئی شہر اس نام سے آباد تھے ، یا اسی طرح ایک تصحیف شدہ نسبت ''البوقانی'' کی ہے ، ''بوقان'' سندھ کا معروف علاقہ بھی ہے ، لیکن اور بھی علاقے سندھ سے باہر اسی کے ہم شکل نام کے تھے ، یہی حال ''الـدَیبُـلـی'' نسبت کا ہے ، جو سندھ کا مشہور شہر ہے ، اسی سے ملتی جلتی ایک نسبت ''الـدَبِیلی'' ہے ، جو ''دبیل'' بروزن امیر شام کی ایک مشہور بستی ہے ، (اس سلسلہ میں بھی فاضل تنقید نگار نے اپنے دعوی کو مثالوں کے ذریعہ مدلل کرنے کی کوشش کی ہے)

قاضی صاحب کا موقف:۔ قاضی صاحب کتاب کے طبع دوم کے مقدمہ میں اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں:

> ''میں نے اپنی طرف سے ''سندی تراشی'' یا ''ہندی تراشی'' کی کوشش نہیں کی ہے ، صرف ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کی سندھ و ہند کی جانب نسبت مجھے علماء کی کتابوں میں صراحۃً ملی ہے ، تاہم مجھے بعض دَیبُـلـی حضرات کی بابت شک ہے کہ آیا واقعی وہ دَیبُل سند سے منسوب ہیں یا دَبِیل شام سے ، اسی بعض بوقانی لوگوں کے متعلق کہ آیا وہ سندھ کے بوقان نامی علاقے سے منسوب ہیں یا نوفان وتوفان سے ، جو سندھ کے باہر کے شہر ہیں۔

(۵) فاضل تنقید نگار کا کہنا ہے کہ: ہر چند کہ کسی شخص کو سندی یا ہندی قرار دینے کے بارے ہم مؤلف کے نقطۂ نظر سے اپنا اختلاف مدلل واضح کر چکے ہیں، لیکن یہاں مؤلف کے نقطۂ نظر کے موافق چند تراجم کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں، (اس کے بعد ان اسماء کا ذکر ہے)

قاضی صاحب کا موقف:۔ فاضل ناقد نے ابراہیم بن السندی بن علی بن بہرام کا نام ''تاریخ اصفہان لابی نعیم'' کے حوالے سے ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ بھی (موضوع کے متعلق نہ سہی مگر) مؤلف کی شرط پر ہیں انھیں بھی داخل کتاب کرنا چاہئے اور شاید ابراہیم بن علی السندی کے عنوان سے جن صاحب کا ترجمہ مؤلف نے (ص:٦٨) پر ''حلیۃ الاولیاء'' کے حوالے سے لکھا ہے وہ یہی ہیں، اگر دونوں کو ایک مانا جائے تو چونکہ تاریخ اصفہان میں صاحب ترجمہ کی تاریخ وفات مع دیگر تفصیلات کے درج ہے، اس لئے دونوں کو ملا کر اس کے حالات میں مواد کا اضافہ ہوسکتا ہے،

قاضی صاحب نے یہ مشورہ مانتے ہوئے دونوں کو ضم کر کے ایک جامع ترجمہ بنا دیا (دیکھئے طبع اول ص:٦٨، وطبع دوم ص:۵۹)

فاضل تنقید نگار نے چند ناموں کی جانب رہنمائی کی تھی، کہ یہ بھی نفس موضوع سے متعلق ہیں، لہٰذا داخل کتاب کئے جانے چاہئیں، ان میں سے تین کو مؤلفؒ نے شامل کتاب کر لیا ہے،

(۱) ابوحفص عمر بن محمد بن سلیمان المکرّانی (طبع دوم ص:۱۷۹) (۲) عبدالرحمٰن بن ابی یزید مولیٰ عمر بن الخطابؓ (ص:۱٦۴) (۳) دَوم السندیة النبّاذیة (ص:۱۱۳)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عمدہ سے عمدہ علمی کاوش جب تک نقد ونظر کی کسوٹی پر پرکھ نہیں لی جاتی اس میں نکھار پیدا نہیں ہوتا، کتاب یا موضوع سے متعلق بہت سے ایسے پہلو ہوتے ہیں جو صرف ناقدین کے نقد سے سامنے آتے ہیں یا منقح ہوتے ہیں، اسی لئے ہر دور کے مصنفین نے اپنی عرق ریزی وجانکاہی کے ثمرات اہل علم پر پیش کئے اور ان کی تعدیلات پر غور کیا۔

ہمیں یہ کہنے مین ذرا بھی تأمل نہیں کہ قاضی صاحب کی ''رجال السند والہند'' کے دوسرے ایڈیشن کو جو کچھ امتیازی شان حاصل ہوئی اس میں خود ان کی تنقیدی نظر وذوق تحقیق کے

علاوہ دوسرے ناقدین کے علمی مناقشات اور تنقیدات کا خاصا دخل ہے، جیسا کہ ابھی آپ نے مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی کے مفصل تبصرہ کا مختصر خلاصہ ملاحظہ کیا،

دوسرا مرحلہ:۔ عام طور پر طبیعتیں کسی خاص موضوع پر کچھ دنوں کام کر لینے کے بعد اکتا جاتی ہیں، خصوصاً جب کہ کسی نہ کسی حد تک کام تکمیل کو بھی پہونچ گیا ہو، لیکن قاضی صاحب کے یہاں اکتاہٹ وملال نام کو بھی نہ تھا، پلٹ پلٹ کر موضوع پر آتے جمع شدہ مواد پر نظر ثانی، تنقیح وتہذیب اور اضافہ کا سلسلہ جاری رکھتے اور تشنۂ تکمیل پہلوؤں کو نظر میں رکھ کر آگے کا کام جاری رکھتے تھے۔ ''رجال السند والہند'' کے پہلے حصہ میں آپ نے لکھا تھا:

> **''ولم نذكر الذين جاؤا إلىٰ الهند وتأهلوا وتوطنوا فيها، ومن حقوقهم علينا أن نذكرهم أيضاً وهم كثيرون، ولعل الله يحدث بعد ذٰلك أمراً''** (جو لوگ باہر سے اس ملک میں آئے اور پھر یہیں کے ہو گئے یا ایک طویل مدت تک یہاں قیام پذیر رہے، ہمارے اوپر حق ہے کہ ان کا بھی تذکرہ لکھیں، ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہے، شاید کہ اللہ تعالیٰ کوئی سبیل پیدا کردے۔

چنانچہ دیگر کئی اہم وقابل قدر کاموں کے ساتھ ساتھ مذکورہ بالا کمی کی تلافی قاضی صاحب نے کر لی، اس کے علاوہ بیس سال کی مدت میں مطبوعہ حصہ میں بہت کچھ تہذیب وتنقیح اور حذف واضافہ بھی کر ڈالا، جس سے کتاب کی اہمیت اور قدر وقیمت دوبالا ہوگئی، اور ۱۹۷۸ء میں دارالانصار قاہرہ سے ''رجال السند والہند'' کا کامل ومکمل ایڈیشن منظر عام پر آ گیا۔ قاضی صاحب سفر مصر جنوری ۱۹۷۸ء کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

> ''اس سلسلہ میں یہ بات اہل علم کیلئے دلچسپی کا باعث ہے کہ میری کتاب ''رجال **السند والهند** '' بیس سال پہلے شائع ہوئی تھی اور اب بالکل نایاب ہو چکی ہے، اور عرب ممالک میں خاص طور سے اس کی تلاش رہتی ہے، نیز درمیان میں راقم نے بہت سے نئے تراجم کا اضافہ بھی کیا ہے اور کتاب کو نئے سرے سے مرتب کر کے اس کی ''**القسم الثاني** '' بھی تیار کر لی ہے، اس طرح یہ کتاب مزید اہمیت کی حامل ہوگئی ہے، اس سفر میں اس کا مسودہ ساتھ رکھ لیا تھا تاکہ کسی عرب ملک میں اس کی اشاعت کا انتظام ہو جائے، چنانچہ قاہرہ کے ایک ادارہ سے اس کی

طباعت واشاعت کی بات چیت مکمل ہوچکی ہے اور ان شاء اللہ یہ کتاب مزید تحقیق وتنقیح اور اضافہ کے ساتھ قاہرہ سے جلد ہی شائع ہوجائے گی'' (ترجمان الاسلام قاضی اطہر نمبر ص:۱۶۱)

امتیازات:۔ اس دوسرے ایڈیشن کے امتیازات حسب ذیل ہیں:

(۱) اسلامی دور سے قبل کے ہندوستانی فلاسفہ واطباء کے ساتھ ساتھ محلد یپ کے بادشاہوں اور سومرہ کے حاکموں کے تراجم یکسر حذف کردیئے گئے، چنانچہ حذف شدہ اطباء وفلاسفہ کی تعداد ۲۵ رہے، اور حذف شدہ سلاطین وامراء کی تعداد ۳۲ر یا اس سے متجاوز ہے۔

(۲) بعض ایسے اصحاب علم وفضل جن کا ہندی یا سندی نژاد نہ ہونا مؤلف پر ظاہر ہوا ان کے تراجم بھی حذف کردیئے گئے ہیں، مثلاً: مشہور محدث عبد بن حمید الکِسّی (بالکسر) کو سابقہ ایڈیشن (ص:۱۶۵۔۱۶۷) میں ''کَس'' (بالفتح) (یعنی کچھ گجرات) کی طرف منسوب سمجھ کر داخل کتاب کرلیا گیا تھا، چنانچہ ان کے ترجمہ میں آپ نے لکھا'' **إنما أوردنا جميع ما ذكره الحموى فى "كِسى" لأن الناس يختلفون فيها ولأنه صرح أن عبد بن حميد الكسى من كس الهند وهى معرب "كچھ"،** لیکن بعد میں مؤلف پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ یہ نسبت درحقیقت ''کِس'' (بالکسر) کی طرف ہے، جس کا جائے وقوع ماوراء النہر کے شہر ''نخشب'' کے قریب ہے، تو آپ نے دوسرے ایڈیشن میں ان کا ترجمہ سرے سے حذف کردیا کہ یہ کتاب کی شرط پر نہیں تھے۔

اس بنیاد پر جن اہم رجال کو حذف کیا گیا ہے ان میں سہیل بن ذکوان ابوالسندی المحدث (۱۵۲) ابوسعید المالکی الہندی الفقیہ (۳۷۵) ابوالہندی الشاعر (ص:۲۸۷) جیسے لوگ ہیں، ان کی تعداد سولہ یا اس سے متجاوز ہے۔

(۳) بہت سے تراجم میں نظر ثانی کر کے حسب تحقیق کمی بیشی کی گئی ہے مثلاً:

ابراہیم بن السندی بن شاہک کا ترجمہ (طبع اول ص:۷۰) میں مفصل تھا اور طبع دوم (ص:۶۴) میں بہت مختصر ہے، یہی حال ابان بن محمد السندی (طبع اول ص:۶۶) اور (طبع دوم ص:۵۹) کا ہے۔

(۴) بہت سے نئے تراجم کا اضافہ کر کے مؤلف نے اس دوسرے ایڈیشن میں کتاب

کو چار چاند لگا دیا ہے، ہماری گنتی کے مطابق ۵۷/ سے زائد ایسے اصحاب فضل کا اضافہ اس نسخہ میں ہے جو سابقہ ایڈیشن میں نہیں تھے۔ چند اہم لوگوں میں مشہور محدث اسمٰعیل بن ابراہیم المعروف بابن عُلیۃ، ان کے صاحبزادگان حماد بن اسمٰعیل وابراہیم بن اسمٰعیل شامل ہیں، اس طرح سابقہ ایڈیشن سے ایک معتد بہ حصہ حذف کرنے کے بعد دوسرے ایڈیشن کی صرف (القسم الاول) کے رجال کی تعداد ۳۰۳/ رہے۔

القسم الثانی :۔ (۵) جیسا کہ معلوم ہوا کہ دوسری طباعت میں ایک گرانقدر اضافہ ''القسم الثانی'' کا ہے، جو ایک مستقل تصنیف ہے، قسم اول میں صرف ان رجال کو شامل کیا گیا تھا جو سندھ و ہند کے کسی حصہ میں پیدا ہوئے اور ان کی زندگی یہیں گذری چاہے کسی وجہ سے ان کی وفات باہر کسی ملک میں ہوئی، یا ان رجال کو جن کی اصلیت سند و ہند سے ثابت ہو گو ان کی پیدائش و بود و باش کسی اور ملک کی ہو، تیسری قسم ان رجال کی ہے جن کی اصلیت و پیدائش تو کسی اور ملک کی ہے لیکن سیاسی، اقتصادی یا تبلیغی اغراض سے آ کر سند و ہند کے کسی علاقہ میں آبسے، یا اپنی مہم پوری کر کے واپس چلے گئے، ان لوگوں کو بالقصد پہلی جلد میں شامل نہیں کیا گیا تھا، ہاں غلطی سے کوئی دَر آیا ہو تو طبع دوم میں اسے قسم اول سے نکال کر قسم ثانی میں شامل کر لیا گیا ہے، مثلاً عمران بن موسیٰ بن یحیٰی البرمکی کا ترجمہ (طبع اول ص:۱۸۹) پر تھا جو اب قسم ثانی کے (ص:۴۶۸) پر ہے۔ یہ قسم بلاشبہ سندھ و ہند کی ثقافتی تاریخ کے تعلق سے ایک بے مثال کارنامہ ہے، جس کی ضخامت ۲۷۲/ صفحات اور درج شدہ تراجم کی تعداد ۲۴۵/ رہے، جن میں ۱۴/ حضرات صحابہؓ ہیں، (اس سے قطع نظر کہ ان میں بعض کی صحابیت میں اختلاف اور بعض کے متعلق راجح یہ ہے کہ وہ صحابی نہیں تھے، بعض علماء نے وہماً انھیں صحابہ میں شمار کر لیا) ان کے شرف و منزلت کے باعث مؤلفؒ نے ان حضرات کو مقدم کیا ہے۔ شروع میں صحابۂ کرام کی ہندوستان آمد کے تعلق سے ایک بیش قیمت مقدمہ ہے جو مختلف کتب علوم حدیث کی ورق گردانی کے بعد مرتب کیا گیا ہے، اس کے بعد حروف تہجی کے اعتبار سے ان رجال کے تراجم ذکر کئے گئے ہیں جو قسم ثانی کی شرط پر اترتے ہیں۔

اس طرح دونوں قسموں کے تراجم کی مجموعی تعداد ۵۴۸/ ہو جاتی ہے، جو قاضی صاحب

کے بقول ہندوسندھ سے متعلق قابل ذکر اصحاب فضل کی واقعی تعداد کے ہزارویں حصہ سے متجاوز نہیں ہے۔

یہ قدرے تفصیل تھی اس اجمال کی جو مؤلفؒ کی اس عبارت میں ہے:

"وفی خلال هٰذهٖ الفترة حصل لی کثیرٌ من التراجم الجدیدة فی جنب الاستدراکات المفیدة فألحقتُها فی مواضعها ..... إلیٰ قولهٖ: لتکون الطبعة الثانیة أحسن من الأولیٰ"

حرف آخر:۔ قاضی صاحب رحمہ اللہ کی یہ پہلی اہم تصنیف تھی، جس میں مؤلف کا اشہب قلم تدوین، تہذیب اور تنقیح کا ایک طویل راستہ طے کرتے ہوئے منزل مقصود پر خیمہ زن ہوگیا اور اس نے اپنی انفرادیت وافادیت کا لوہا پوری دنیائے علم سے منوالیا، افسوس کہ اب ہندوستان میں عام طور سے لوگ اس کی قدر وقیمت سے ناآشنا ہیں، لیکن! عالم اسلام میں قدردانوں کی کمی نہیں، ضرورت ہے کہ اس گنج گرانمایہ کو جدید طرز تحقیق پر ایڈٹ کر کے خوبصورت طباعت سے مزین کردیا جائے تاکہ اس کی افادیت دوبالا ہوجائے۔ **لعل اللّٰہ یحدث بعد ذٰلک أمراً .**

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

قدر شناسی

۱۔۔۔اہل حرمین سے ملاقاتیں

۲۔۔۔قاضی صاحب، معاصر اہل علم کے خطوط کے آئینے میں

۳۔۔۔قاضی اور اہل سندھ

اہل حرمین سے ملاقاتیں

مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوریؒ

ہندوستانی علماء کرام جو زندگی بھر علوم دینیہ کو عربی زبان میں پڑھتے پڑھاتے ہیں، چونکہ انھیں عربی میں گفتگو کرنے کی مزاولت نہیں ہوتی، اس لئے حج کے موقع پر گو کہ ان کی ملاقاتیں عرب علماء سے ہوتی ہیں، لیکن عربی گفتگو پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے اظہار خیال نہیں کر پاتے، اور ان کا علم اور ان کی ذہانت ''کنز مخفی'' بن کر رہ جاتی ہے، اس بات کا احساس اکثر و بیشتر علماء کو رہا کرتا تھا۔

اسی تأثر کا اظہار محترم احمد غریب صاحب نے اپنے ایک خط میں کیا تھا، قاضی صاحب جب حج کو گئے، تو وہ عرب علماء سے بے تکلفانہ ملے، ان سے کھل کر اظہار خیال کیا، کیونکہ عربی لکھنے اور بولنے کا انھیں ملکہ تھا۔ اس سے عرب علماء متأثر ہوئے، قاضی صاحب نے اپنے اس مضمون میں اسی کی داستان بیان فرمائی ہے۔

فروری کے ''البلاغ'' میں محترم احمد بھائی صاحب کا ایک خط ''مکتوب مکہ مکرمہ'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جس میں موصوف نے ہند و پاکستان کے علماء کے عربی میں بات چیت نہ کرنے پر اظہار خیال فرمایا ہے (۱)، ان کی علمی و دینی حمیت نے ہمیشہ یہ بات بڑی شدت سے محسوس کی ہے کہ ہمارے علماء عربی زبان حاصل کرنے اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں مدت العمر رہنے کے باوجود اس پر قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے عرب علماء کے سامنے بے زبان بن جاتے ہیں، جس کی وجہ سے بڑی حد تک دیار عرب کے علماء ہندوستانی علماء کو کچھ یوں ہی سا سمجھتے ہیں، جو

(۱) بہت دنوں سے قاضی اطہر صاحب کی کچھ خبر نہیں، دو ہفتہ قبل مدینہ منورہ میں ان کے صاحبزادے مولوی خالد کمال سے ملاقات ہوئی تھی، ماشاء اللہ دینی معلومات میں کافی ترقی کر لی ہے اور ہمارے یہاں کے علمائے کرام و فضلائے عظام میں جو کمی محسوس کر رہا تھا عربی بول چال میں کی، انھوں نے وہ کمی بہت اچھی طرح پوری کر لی ہے، عربی میں گفتگو بہت اچھی طرح کر لیتے ہیں اور اس چیز کی مجھ جیسے خادم علماء کو کھٹک رہتی تھی، ایک مرتبہ ہم بھائیوں نے یہاں ایک دعوت کی، جس میں چار پانچ ہندوستان و پاکستان کے علماء کو مدعو کیا، اسی موقع پر یہاں کے علماء کو بھی دعوت دی، عربی و عجمی دونوں پارٹیاں علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتی تھیں، کیونکہ اپنے علماء عربی میں گفتگو پر قادر نہیں ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے مولانا علی میاں اس سے مستثنیٰ ہیں کہ وہ عربی زبان پر قدرت رکھتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان کے مولانا محمد یوسف صاحب بنوری بھی عربی میں گفتگو پر قدرت رکھتے ہیں۔

شخص کسی زبان کو زندگی بھر پڑھے پڑھائے وہ بہر حال اس میں بات چیت کرنے پر کچھ نہ کچھ قدرت رکھتا ہوگا، اگر نہیں رکھتا تو اسے رکھنا چاہئے، موصوف نے جب اپنے حلقہ کے ایک طالب علم (عزیزم خالد کمال مبارکپوری) کو اس معاملہ میں چند ہی سالوں میں مدینہ منورہ میں رہ کر بہت آگے پایا تو اپنے ذوق میں ایک اہتزاز اور نشاط محسوس کرتے ہوئے اس کا نہایت اچھے انداز میں اظہار فرمایا، اور ہمت افزائی کی، محترم احمد بھائی صاحب کی ان ہی چند سطروں پر تعلیق کے طور پر یہ معروضات پیش کی جارہی ہیں، اس میں گزشتہ سال کے سفر حج کے کچھ سفر پارے بھی ہیں اور عربی زبان میں بات چیت کرنے کے تجربات بھی۔

ہندوستان کے عام علماء کی عربی گفتگو پر قدرت نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ماحول میں اس کو رواج نہیں دیتے اور عمر بھر پڑھنے پڑھانے کے بعد بھی جب عربی میں گفتگو کی بحث آتی ہے تو ’’**ھٰذا شیٌ دیگرٌ** ‘‘ کہہ دیتے ہیں، ورنہ ان ہی عالموں میں جن کو تھوڑا بہت سابقہ پڑجاتا ہے، وہ چند ہی دنوں میں اس پر قادر ہوجاتے ہیں اور ہر موضوع پر نہایت بے تکلفی سے عربی میں بات چیت کرتے ہیں۔

راقم کو نہ عربیت کا دعویٰ ہے، نہ عربی دانی کا زعم ہے اور نہ ہی عربی زبان میں زیادہ گفتگو کرنے کا سابقہ ہی پڑا ہے، مگر بمبئی میں رہ کر مختلف عرب ممالک کے علماء، ادباء، قراء، ارباب حکومت، اہل دُول اور تجار وعوام کے ساتھ بسا اوقات عربی میں گفتگو کرنے کا سابقہ پڑا، ابتداء میں جھجھک اور جھینپ محسوس ہوتی تھی اور میں نیک صورت بن کر **نعم** کہہ دیا کرتا تھا، مگر آخر کب تک یہ بات باقی رہتی، علمی، سیاسی، تاریخی ہر قسم کی باتیں نکلتی تھیں، اور ان میں حصہ لینا پڑتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ’’کام چلاؤ‘‘ عربی گفتگو پر قدرت ہوگئی، اور الٹے سیدھے بحث ومباحثہ میں حصہ لینا شروع کردیا جس کی وجہ سے جھجھک ختم ہوگئی اور زبان بہر حال چلنے لگی۔

پہلی بار ۱۳۷۶ھ میں حج وزیارت کی دولت نصیب ہوئی تھی، اس زمانہ میں بھی علمی اور دینی طبقہ سے بات چیت میں کبھی ناکامی نہیں ہوئی، اور ہر جگہ کام چلتا رہا، اور گزشتہ سال ۱۳۸۵ھ میں حاضری ہوئی تو گویا کوئی بات ہی نہیں تھی، جدہ، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کہیں بھی کسی حلقہ میں ایسا نہیں ہوا کہ گفتگو پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے خاموشی رہی ہو، یہ دوسری بات ہے کہ

برمحل اور برجستہ گفتگو میں عربیت کے ابرو پر بل آ جاتا رہا ہو، اس کی نفسیاتی وجہ یہ تھی کہ اب کے بار عزیزم خالد کمال سلمہٗ متعلم جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے تعارف و تعلق اور ''رجال السند والہند'' کے مطالعہ کی وجہ سے اکثر مشائخ اور علماء پہلے ہی سے یاد فرماتے تھے اور ملنے کے خواہشمند تھے، ان سے زیادہ راقم اپنے ان نادیدہ بزرگوں اور حسن ظن رکھنے والے ارباب صفا سے نیاز حاصل کرنے کی تیاری کر کے گیا تھا، نیز راقم کا ایک مقالہ عربی زبان میں ''من النارجيل إلى النخيل'' حکومت ہند کے عربی سہ ماہی مجلّہ ''ثقافة الهند'' میں تین قسطوں میں چھپ چکا تھا جس کی زائد کاپیاں جدہ کے ہندوستانی سفارت خانہ کے آفیسروں نے طلب کر کے سعودی عرب کے صحافیوں، ادیبوں اور عالموں کو پیش کیا تھا، اس مقالہ میں عرب اور ہندوستان کے ابتدائی اسلامی تعلقات کو جغرافیہ، رحلات اور تاریخ کی کتابوں سے بیان کیا گیا تھا، یہ مقالہ سعودی عرب کے علمی اور تحقیقی حلقہ میں بہت زیادہ پسند کیا گیا، بلکہ سعودی عرب کے سب سے مشہور اور قدیم صحافی و مؤرخ الاستاذ عبدالقدوس الانصاری نے پورا مقالہ چار قسطوں میں اپنے مجلّہ ''المنهل'' جدہ میں نہ صرف شائع کیا بلکہ اس پر جگہ جگہ تعلیقات لکھیں، نیز ہندوستانی سفیر محترم کامل قدوائی صاحب، فرسٹ سیکریٹری محترم سید شہاب الدین صاحب، محترم مولانا خالد صاحب اور عزیز گرامی فضل الرحمٰن صاحب نے وہاں کے ادیبوں اور صحافیوں سے تذکرہ کیا کہ اس سال فلاں آدمی آ رہا ہے، وہ سب حضرات ملاقات کے خواہش مند تھے، راقم کو ہندوستان ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ سفارت خانہ کے ارکان اس مقالہ کی وجہ سے، نیز عزیزم خالد کمال سے تعلق و تعارف کی وجہ سے میری حاضری کے منتظر ہیں، ان باتوں کی وجہ سے راقم کو ضغطہ اور احساس کمتری کا سامنا نہیں کرنا پڑا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے تشکر و امتنان کی فضا میں ادھر بھی امنگ اور خواہش تھی کہ اب کے حجاز مقدس کے علماء، مشائخ اور ارباب علم سے کھل کر تبادلۂ خیالات کرنا چاہئے، چنانچہ اس انشراح و انشباط نے اور بھی ہمت افزائی کی، اور جدہ اترتے ہی اس کا سلسلہ شروع ہو گیا، میں ابھی کسٹم ہاؤس کے باہر ہی تھا کہ جناب خالد صاحب ملے اور انداز سے پہچان کر نام دریافت کیا میں نے بتایا تو بڑی محبت سے لپٹ گئے اور انتظار کا تذکرہ کیا، اتنے میں کامل قدوائی صاحب تشریف لائے اور تعارف ہوتے ہی پان پیش فرمایا، اور نہایت حسن خلق سے ملے، ادھر خالد

صاحب نے محترم سید شہاب الدین صاحب سے جا کر کہا کہ میں ایک خاص آدمی سے مل کر آیا ہوں انھوں نے جھٹ میرا نام لے کر پوچھا کہ فلاں صاحب ہونگے، پھر وہ بھی فوراً تشریف لائے، اور بڑی محبت سے ملے، تقریباً ان سب حضرات نے ''من النار جیل الی النخیل'' والے مقالے کا تذکرہ کیا، اور یہ کہ یہاں کے اہل علم آپ سے ملنا چاہتے ہیں، یہ باتیں بالکل ہنگامی تھیں، رات بھر جدہ میں رہکر کل مکہ مکرمہ جانا تھا، پھر خالد کمال کی والدہ کی وجہ سے ایک گونہ پابندی بھی تھی، وہ بھی ایک دو دن پہلے مدینہ منورہ سے جدہ آ گئے تھے۔

چونکہ آخری جہاز مظفری سے روانگی ہوئی تھی اور ایام حج قریب تھے، اس لئے اصل کام میں مصروفیت رہی جس کیلئے حاضری ہوئی تھی، اس درمیان میں مختلف ممالک کے اہل علم اور مشائخ سے ملاقات ہوتی رہتی تھی، عزیزم خالد کمال حج کے بعد دس بارہ روز تک ساتھ رہے، ان کے ہمراہ ''رابطۃ العالم الاسلامی'' کے دفتر میں آتا جاتا رہا، نیز شیخ سید علوی مالکی اور دوسرے مشائخ سے ملاقات ہوتی رہی، ان کے مدینہ منورہ چلے جانے کے بعد قیام مکہ مکرمہ کے زمانہ میں بارہا ''رابطۃ العالم الاسلامی'' میں حاضری ہوئی، تنہا بھی اور بعض دوسرے ہندوستانی احباب کے ساتھ بھی، عام طور سے مجلّہ ''رابطۃ العالم الاسلامی'' کے ایڈیٹر شیخ محمد سعید العامودی اور ان کے دفتر کے دوسرے عملہ سے بات چیت رہا کرتی تھی، رُخ سیاسی اور ملکی ہوا کرتا تھا، اکثر دیگر ممالک سے آئے ہوئے صحافی اور اہل علم بھی رہا کرتے تھے اور سیاسیات پر بحث چھڑ جاتی تھی، کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بات میں تیزی آ جاتی، راقم کھل کر پورے طور سے ان مباحث میں حصہ لیتا تھا، اور آخر میں ٹیپ کا بند یہ ہوتا کہ یہ باتیں ذاتی اور شخصی ہیں، جب بھی شیخ محمد سعید عامودی کی مجلس سے چلا تو موصوف نے فرمایا کہ پھر کب آئیں گے؟ ہم پھر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ راقم کو بھی جب موقع ملتا پہونچ جاتا، اس مدت میں وہاں کے کئی حضرات سے اچھی خاصی اُنسیت پیدا ہوگئی تھی، رابطہ کے دفتر میں ہندوستان کے بعض حضرات کی ترجمانی بھی کی اور فیجی مسلم لیگ کے سکریٹری جناب بہادر علی صاحب کو ساتھ لے جا کر رابطہ کی طرف سے فیجی میں اسلام اور مسلمانوں کی ضرورت کیلئے ہر قسم کے تعاون کی بات چیت کرائی، اس مدت میں متعدد بار شیخ سید علوی مالکی کے مکان (قرارہ میں) حاضری ہوئی تھی، وہ مکہ مکرمہ کے نہایت ذی علم حضرات میں سے ہیں۔ اور

ہر وقت باغ و بہار رہتے ہیں، پہلے سفر حج میں بھی ان سے ملاقات ہوتی تھی، اب کے بار تو نہایت گہری ملاقاتیں رہیں، آخر میں مدینہ منورہ روانگی کے وقت ملاقات نہ ہو سکی، جس کی شکایت ان کے صاحبزادے نے مدینہ منورہ میں خالد کمال سے کی کہ والد محترم ان کا انتظار کر رہے تھے اور تصانیف ہدیہ دینے کیلئے رکھا تھا، نیز مکہ مکرمہ میں مکتبۃ الحرم میں جانا ہوا تھا، جب مکتبۃ الحرم پہونچا تو اس کے مدیر و شیخ سے بات چیت ہونے لگی موضوع ہندوستان کی وہ علمی و تاریخی کتابیں تھیں جو عہد قدیم سے لے کر آج تک حرمین شریفین کی تاریخ پر لکھی گئیں ہیں، احقر نے بتایا کہ فلاں تاریخیں ہندوستانی علماء کی مطبوعہ ہیں اور فلاں فلاں غیر مطبوعہ ہیں، جن میں سے بعض کا قلمی نسخہ ہمارے پاس ابتک محفوظ ہے، انھوں نے اس گفتگو کی بڑی قدر کی اور فرمایا کہ یہ باتیں عام ہونی چاہئیں، پھر انھوں نے ایک عربی روزنامہ کے مدیر کو فون کیا کہ فلاں کو میں روانہ کرتا ہوں آپ ان سے انٹریو لے کر کل کے اخبار میں شائع کر دیں، مگر اتفاق سے ایڈیٹر صاحب موجود نہیں تھے، اور انھوں نے مجھ سے معذرت کرتے ہوئے عصر کے بعد بلایا کہ میں آپ کے ساتھ اپنا آدمی کر دوں گا، آپ یہ باتیں ایڈیٹر سے کر لیں تا کہ ان معلومات سے یہاں کے اہل علم بھی واقف ہوں، میں ان کے وعدہ پر گیا مگر وہ اتفاق سے اس وقت نہیں مل سکے، پھر نہیں جا سکا، حالانکہ اس کیلئے بہت سے حضرات کوشش کرتے ہیں کہ عربی اخبارات میں ان کا انٹریو اور بیان آ جائے۔ مدرسہ صولتیہ میں بار بار حاضری ہوتی تھی جہاں ہندوستانی اور عرب علماء سب ہی ہوتے تھے، مولانا محمد سلیم صاحب اور ان کے صاحبزادے مولانا محمد شمیم صاحب بہت زیادہ خیال فرماتے تھے۔

۸ر محرم ١٣٨٦ھ کو مدینہ منورہ میں حاضری ہوئی اور ایک ماہ تک یہاں قیام کی سعادت نصیب ہوئی، مدینہ منورہ گویا گھر تھا، ہر وقت جامعہ کے ہندوستانی پاکستانی طلباء، وہاں کے اہل علم اور مشائخ سے ملاقاتیں کتب خانہ شیخ الاسلام میں حاضری نماز اور صلوٰۃ وسلام کے بعد کے مشاغل تھے، عزیزم خالد کمال سلمہٗ نے مدینہ منورہ کے ہر دینی و علمی حلقہ میں تعلق پیدا کر رکھا ہے، اور ہر کوچہ وگلی کے حضرات ان سے آشنا و مانوس ہیں اس لئے شہر کے بہت سے اہل علم سے ملاقاتیں رہا کرتی تھیں، ۱۴ر محرم کو الشیخ محمد بن ابراہیم العبودی امین عام جامعہ اسلامیہ نے رات کو کھانے پر بلایا، جہاں الشیخ عمر افریقی اور دوسرے بعض مشائخ بھی مدعو تھے، کھانے کے بعد تین

گھنٹہ تک مجلس جمی رہی اور مختلف علمی و دینی موضوعات پر بات چیت ہوتی رہی، یہ محفل بہت ہی دلچسپ اور علمی و معلوماتی تھی، شیخ عبودی نے دریافت فرمایا کہ آپ نے یہ عربی کہاں سیکھی ہے؟ میں نے کہا کہ ہندوستان میں عربی زبان اور اسلامی علوم بڑے اہتمام سے پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ وہاں باہمی گفتگو کا موقع نہیں ملتا اس لئے وہاں کے علماء آپ لوگوں کے سامنے گونگے بہرے بنے رہتے ہیں، اور آپ حضرات خیال کرتے ہیں کہ یہ بولی سے ناواقف مذہبی علماء ہیں، بات یہ ہے کہ میں نے بمبئی میں عربوں سے ملنے جلنے کیوجہ سے تھوڑا بہت عربی بولنا سیکھ لیا ہے، جس کی وجہ افہام و تفہیم میں دقت نہیں ہوتی، ۱۷ر محرم کو استاذ شیخ عمر افریقی مساعد امین عام جامعہ اسلامیہ نے عشاء کے بعد کھانے کی دعوت دی، ان کے یہاں افریقہ اور سوڈان وغیرہ کے دو تین علماء تھے، یہاں دو گھنٹہ سے زائد مجلس رہی اور مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں، ان حضرات کی مجلس میں کھل کر نہایت بے تکلفی سے دوستانہ انداز میں گفتگو رہی، ۱۶ر محرم کو جمعہ کی نماز کے بعد حضرت الشیخ عبدالعزیز بن باز نائب الرئیس جامعہ اسلامیہ نے کھانے پر بلایا، یہاں بھی گھنٹوں گفتگو رہی، شیخ نے یہاں کے علماء کا علمی اور دینی حال دریافت کیا، سلسلۂ کلام میں بعض تاریخی مباحث پر گفتگو نکلی اور بعض کتابوں کے بارے میں بات چیت رہی، شیخ ابن باز پوری مملکت میں بڑے معزز و محترم مانے جاتے ہیں اور بڑے باوقار ہیں، مگر نجی مجلسوں میں بے تکلف نظر آتے ہیں، یہاں بھی شیخ عبودی اور کئی مشائخ شریک تھے، محترم الشیخ سید محمود الطرازی مدنی سے پرانی ملاقات تھی، ایک دن ان کے یہاں ناشتہ کی دعوت رہی، ہندوستان کے طلباء نے بڑے ذوق و شوق اور اخلاص سے دعوتیں کیں، عزیزان مولوی امیر احمد صاحب رامپوری، مولوی ہلال احمد مبارکپوری، مولوی نعمان صاحب بہاری، مولوی جمیل احمد صاحب بہاری، مولوی سعود صاحب، شیخ سعد الدین صاحب ملیباری، استاذ جامعہ اسلامیہ وغیرہ نے کھانے، ناشتے اور چائے کی دعوتیں کیں، جامعہ اسلامیہ میں شیخ عبدالقادر سیبۃ الحمد کے درس میں شرکت رہی، بعد میں تقریباً روزانہ ہی ان سے مسجد نبوی میں مختلف موضوعات پر گفتگو رہا کرتی تھی، ان مواقع پر اکثر جامعہ کے ہندستانی اور پاکستانی طلباء بھی رہا کرتے تھے، اخوان المسلمین کے کئی سرگرم حضرات سے اکثر گھنٹوں گھنٹوں مسجد نبوی میں اخوان اور حکومت مصر کے موضوع پر

بات چیت ہوا کرتی تھی، میں جامعہ اسلامیہ کے کتب خانہ میں ایک روز بیٹھا ہوا تھا، کئی اساتذہ بھی تھے، ایک عرب استاذ نے باتوں باتوں میں فقہی مسلک کے متعلق کہہ دیا کہ احناف حدیث کے مقابلہ میں رائے پر عمل کرتے ہیں اس پر راقم نے جم کر ان سے گفتگو کی اور کہا کہ میں حنفی ہوں کوئی ایک مسئلہ ایسا بتائیے کہ جن میں میں حدیث کے مقابلہ میں رائے پر عمل کرتا ہوں، یہ گفتگو مناظرانہ انداز کی تھی، دوسرے اساتذہ خاموش مسکرا رہے تھے، اور دونوں کی گفتگوئیں سن رہے تھے، اسی طرح ایک ملیباری صاحب جو جامعہ میں کسی شعبہ سے متعلق ہیں، ان سے میں نے کہا کہ آپ عربی یا ملیباری زبان جانتے ہیں، افسوس کہ آپ ہندستانی ہیں مگر اردو نہیں جانتے، اس پر انھوں نے کہا کہ ہم کو اردو زبان کی ضرورت ہی نہیں ہے، دینی زبان عربی ہے، دنیاوی زبان ملیباری ہے، اردو کی ضرورت ہی کیا ہے، اس وقت موقع نہیں تھا میں خاموش رہا، مگر کتب خانہ میں جب وہ ملے تو پھر ان سے کھل کر بات چیت ہوئی، اور ان کو اپنی اس بات کے بے تکے پن کا احساس ہوا، مسجد نبوی میں ایک روز مغرب بعد حسب معمول تبلیغی اجتماع ہو رہا تھا، میں بھی پاس ہی الگ بیٹھا ہوا تھا، ایک مولوی صاحب ایک عرب طالب علم کو لیکر آئے کہ یہ کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں، آپ ان کو سمجھا بتا دیں، میں نے اس کو بٹھایا اور کہا کہ پوچھو کیا پوچھتے ہو، اس عزیز نے انسان کے چاند پر جانے کے بارے میں قرآن وحدیث کی رو سے سوالات کئے، میں نے اسے سمجھانا شروع کیا تو اور لوگ بھی ہندستانی پاکستانی اور عرب حضرات آ گئے میں نے اپنی وقتی یادداشت کے مطابق اسے قدیم وجدید انداز میں سمجھایا، آخر میں وہ میرا شکریہ ادا کرتا ہوا یہ کہکر اٹھا کہ اب اس بارے میں میرے شبہات دور ہو گئے۔ دوسرے حضرات بھی اس بحث سے محظوظ ہوئے اور انشراح کا اظہار کیا۔

مولانا سعد الدین صاحب ملیباری استاذ جامعہ اور بعض دوسرے حضرات کی رائے ہوئی کہ میں جامعہ کے طلبہ کے سامنے ہندستان اور عرب کے علمی تعلقات پر کوئی مقالہ پڑھوں یا تقریر کروں، میں اس کے لئے تیار بھی ہو گیا، مگر معلوم ہوا کہ دو ایک دن میں جامعہ کی چھٹی ہونے والی ہے تاکہ طلباء اختبار کی تیاری کریں لہٰذا اگر ایسا ہوتا ہے تو کل پرسوں تک ہو جانا چاہئے کیوں کہ وقت نہیں ہے، اس صورت کی وجہ سے میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اگر کوئی چیز پیش کی جائے تو ہر

اعتبار سے معیاری ہونی چاہئے، یہ نہیں کہ جیسے تیسے ایک مقالہ تیار کر کے سنا دیا جائے، میں سفر میں ہوں مراجعت کے لئے کتابیں نہیں ہیں پھر جلدی میں مقالہ کی تیاری کچھ یوں ہی سہی ہوگی اور اصل موضوع کئی پہلو سے تشنہ رہ جائے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ یہ خیال ہی ترک کر دیا جائے، کیونکہ ہم کو معلوم ہے کہ اس قسم کے مقالات کے لئے اچھے اچھے اہل علم وتحقیق مہینوں پہلے سے تیاری کرتے ہیں، معلومات جمع کرتے ہیں، اور الفاظ وعبارت میں تراش خراش کرتے ہیں، تب جا کر ایک معیاری مقالہ تیار ہوتا ہے (چاہے وہ بعد میں ظاہر کریں کہ یہ مقالہ بہت عجلت میں لکھا گیا ہے، جیسا کہ اس کا رواج بھی ہے) ایسی حالت میں الٹا سیدھا مقالہ تیار کر کے پیش کر دینا نہ جامعہ کے طلباء کے لئے مفید ہوگا اور نہ اپنے لئے بہتر ہوگا۔ چنانچہ یہ ارادہ ترک کر دیا اور اس میں اپنی کوئی ہتک نہیں محسوس کی اور نہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہوا، کتب خانہ شیخ الاسلام میں تقریباً روزانہ حاضری ہوتی اور مخطوطات ونوادرات سے استفادہ کا موقع ملتا، وہاں مختلف بلاد وامصار کے اور خود مدینہ منورہ کے اہل علم وتحقیق آتے جاتے، ان سے ان کے خصوصی فن اور موضوع پر بات چیت ہوتی، تقریباً روزانہ ہی یہاں کسی نہ کسی نئے صاحب علم سے ملنے کا موقع ملتا۔ ان کے علاوہ مدینہ منورہ میں کئی اہل علم کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور علمی گفتگو کا موقع ملتا رہتا تھا۔

ایک مرتبہ ہندو پاکستان کے چند طلبہ مسجد نبوی میں کہنے لگے کہ ہمارے یہاں کے علماء جب یہاں آتے ہیں اور ہمارے جامعہ کے شیوخ واساتذہ سے ملتے ہیں تو عربی گفتگو پر قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے تبرک بن کر رہ جاتے ہیں، نہ وہ شیوخ واساتذہ سے تبادلۂ خیال کر پاتے ہیں اور نہ وہ ہمارے علماء سے زیادہ گفتگو کر سکتے ہیں، بلکہ جانبین ایک دوسرے کی برکت حاصل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں، صرف مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، مولانا ابوالحسن صاحب ندوی اور مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ان حضرات سے کھل کر ملتے جلتے ہیں اور ہر موضوع پر نہایت واضح انداز میں معاصرانہ گفتگو کرتے ہیں۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ اس سال آپ یہاں کے اہل علم سے کھل کر ہر موضوع پر بات چیت کرتے ہیں، اور ہر قسم کی بحث اور موضوع میں حصہ لیتے ہیں، پھر اس گفتگو میں مرعوبیت اور جھجک نہیں ہوتی اور یہاں کے اہلِ علم کو بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان وپاکستان کے اہل علم بھی علم اور مطالعہ رکھتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کے یہاں بھی

معلومات ہوتی ہیں، اوران کی اپنی رائے بھی ہوتی ہے جس کے لئے وہ دلائل رکھتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے معلوم ہوا کہ ہندستانی سفارت خانہ کے عملہ میں محترم سید شہاب الدین صاحب فرسٹ سکریٹری نے بغیر کسی سابقہ ملاقات یا تعارف کے اور بغیر کسی مقصد کے صرف اخلاص اور محبت کی وجہ سے میری بہت زیادہ آؤ بھگت کی، وہ مدینہ منورہ تشریف لائے تو بار باران سے ملاقات رہی۔ اور جب انھوں نے ایک پرتکلف دعوت کی اور مدینہ منورہ کے اعیان حکومت اور اعیان شہر کو بلایا تو راقم کو بھی خاص طور سے دعوت دی، جہاں بہت سے حضرات سے ملاقات اور دیر تک مجلس رہی۔ قیام کے مدینہ منورہ کے دوران میں مولانا انعام کریم صاحب مدرسہ شرعیہ کی خدمت میں بار بار حاضری کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ وہ بھی بڑی محبت وشفقت سے پیش آتے رہے، یہیں پر بخاری شریف کے اس نسخہ کو دیکھا جس میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے پڑھا تھا اور جگہ جگہ تھوڑے تھوڑے حواشی لکھے تھے، جنۃ البقیع کے قریب رباط مجددیہ میں بھی جانا ہوا جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سلسلہ کے بزرگوں کی ہے، اس میں حضرت مظہر جان جاناں وغیرہ کے ملفوظات ومکاتیب کے نادر قلمی نسخے دیکھنے میں آئے۔ نیز ایک قرآن شریف دیکھا جو اسی سلسلہ کے ایک مشہور بزرگ کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، بارہا ایسا ہوا کہ مدینہ منورہ کی ان علمی مجلسوں میں عزیزم خالد کمال ساتھ رہے، اور اساتذہ وشیوخ سے گفتگو کے درمیان کہیں کوئی لفظ بروقت یاد نہیں آیا اور مطلب کی ادائیگی میں دقت محسوس ہوئی تو وہیں باپ نے بیٹے کی طرف مراجعت کر لیا، اور یہ بات بھی ان شیوخ واساتذہ کے نزدیک علمی شان کی ایک ادا بن گئی، اگر دل ودماغ میں معلومات ہوں تو زبان کسی نہ کسی طرح ان کو ادا کر ہی دیتی ہے، اور سننے والے اس کی قدر کرتے ہیں طرز ادا پر نہیں جاتے کیوں کہ مادری زبان کے مقابلہ میں کوئی زبان مافی الضمیر کے ادا کرنے پر کماحقہٗ قادر نہیں ہوسکتی۔

واپسی کے موقع پر جدہ میں راقم کے اعزاز میں ۳؍جون ۶۶ء کو محترم سید شہاب الدین صاحب نے ایک پرتکلف اور شاندار دعوت اپنی قیام گاہ پر دی، جس میں جدہ اور مکہ مکرمہ کے اکثر صحافی، مدیران جرائد ومجلّات اور ادباء ومصنفین تھے، ان میں شیخ حسین سراج امین رابطہ عالم اسلامی، الاستاذ عبد القدوس انصاری مدیر مجلّہ ''المنھل''، شیخ محمد احمد جمال مشہور انشاء پرداز

ومصنف، شیخ محمد حسین مدیر جریدہ عکاظ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ایک دن پہلے ہی عربی اخبارات میں اس دعوت کا اور اس میں شرکاء کا اعلان آ گیا تھا، عرب کے ان صحافیوں اور ادیبوں کی راقم سے دلچسپی کی بڑی وجہ مقالہ ''من النارجیل الی النخیل'' تھا جسے انھوں نے ''ثقافۃ الہند'' دہلی اور ''المنہل'' جدہ میں پڑھا تھا، مجھے جہاز سے اترتے ہی جدہ میں معلوم ہو چکا تھا کہ استاذ عبدالقدوس انصاری میری ملاقات کے بیحد شائق ہیں اور بڑی شدت سے انتظار کر رہے ہیں، مگر چونکہ حج کا زمانہ تھا اور مصروفیات غیر معمولی تھیں، اس لئے ان سے اسی دن ملاقات ہوئی، وہ نہایت پرتپاک طریقہ سے پیش آئے، مختلف موضوعات پر ہماری ان کی گفتگو ہوتی رہی، خاص طور سے عرب اور ہندستان کے علمی، دینی تعلقات اور ہندستان کے رجال اشخاص پر جو عرب میں گذرے ہیں، انھوں نے بیحد اصرار کیا کہ آپ دو تین ماہ کے لئے رک جائیں، ہم تمام انتظام کر دیں گے اور آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی، مگر چونکہ خالد کمال کی والدہ ساتھ تھیں اس لئے ایسا نہ ہوسکا، انھوں نے اصرار کیا کہ آپ کی جس قدر تصنیفات ہیں عربی یا اردو میں سب کی سب میرے پاس خالد کمال کے ذریعہ بھجوائیں، میں اپنی تصنیفات اور ''المنہل'' پیش کروں گا۔
چنانچہ راقم کی تمام کتابیں خالد کمال کے ذریعہ پہونچ گئیں، استاذ محمد احمد جمال غزوات نبوی کے سلسلے کے مصنف ہیں، وہ اس بارے میں مؤثر اسلوب نگارش رکھتے ہیں، ان کے مقالات ومضامین سے پہلے سے واقف تھا، قیام مدینہ منورہ کے دوران میں ان کی بعض تصنیفات کے مطالعہ کا موقع ملا، ان سے اسی موضوع پر گفتگو رہی، شیخ حسین سراج امین عام رابطہ عالم اسلامی چونکہ عالم اسلام کے ایک اہم ادارہ کے ذمہ دار ہیں، اس لئے میں نے ان سے کہا کہ آپ حضرات ایک طرف عالم اسلام کے ربط وتعلق کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لئے جان ومال کی بازی لگا دی ہے جو فی نفسہ نہایت مفید اور ضروری کام ہے، مگر دوسری طرف حال یہ ہے کہ حرم محترم میں ہندوستان پاکستان کے بعض اہلحدیث علماء اُردو میں نہایت اشتعال انگیز تقریریں کرتے ہیں، مقلدین خاص طور سے احناف کے بارے میں نہایت برے الفاظ استعمال کرتے ہیں ان کے ائمہ کو نازیبا اور دلآزار لہجہ میں یاد کرتے ہیں، اور ہر تقریر میں تنگ نظری اور تنگ دلی کا مظاہرہ کر کے نہایت گستاخانہ انداز میں سبُّ وشتم تک کا انداز اختیار کرتے ہیں، جسے ہندوستان

کے مرنجان مرنج اہل علم بھی سن کر شدید کوفت محسوس کرتے ہیں ۔ چنانچہ شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی دارالمصنفین اعظم گڈھ، مولانا سید عبدالوہاب صاحب بخاری مدراسی اور افضل العلماء مولانا عبدالباری مدراسی اور دیگر علماء ان کی تقریروں کو سن سن کر سخت کوفت محسوس کرتے ہیں۔ آپ عالم اسلام کے ربط واتحاد کے داعی ہیں اور دوسری طرف ہندوستان و پاکستان کے ان تنگ نظر اور مفاد پرست مولویوں کو مسلمانان عالم کے مرکز میں ان کو برا بھلا کہنے اور ان کے خلاف نفرت پھیلانے کی اجازت دیتے ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ ان میں اکثر وبیشتر ایسے ہیں جو اپنے کو حکومت اور شیوخ کی نظر میں اچھا ثابت کرنا چاہتے ہیں، کوئی اقامہ چاہتا ہے، کوئی تابعیہ کے چکر میں ہے، کوئی کسی ادارہ میں ملازمت کے حصول کیلئے سرگرداں ہے اور ان کی حرکتوں کو ذمہ دار حضرات ہرگز پسند نہیں کرتے، چنانچہ خود نجد وریاض کے علماء اہلحدیث اس حرکت کو ناپسند کرتے ہیں، حرم محترم مقلد اور غیر مقلد کا اکھاڑہ نہیں ہونا چاہئے اور نہ اس طرح کسی مسلک کے خلاف نفرت وحقارت کا مظاہرہ ہونا چاہئے، یہ مسلمانان عالم کو خدا کے گھر میں پا کر برا بھلا کہنا ہوا، ہمارے ان تأثرات کو شیخ حسین سراج نے سن کر فرمایا کہ فلاں شیخ سے آپ نے اس کا تذکرہ کیا یا نہیں؟ اس کے بعد بات کا رخ پھیرتے ہوئے کہا کہ چونکہ میری والدہ سندھ کے قبیلہ تمیم سے تعلق رکھتی تھیں، اور ہندوستان وعرب آپ کا خاص موضوع ہے اس لئے قبیلہ کے بارے میں مجھے معلومات دیں کہ تاریخ میں ان کے کن کن افراد کا تذکرہ ملتا ہے، اس دعوت میں ایک پُر لطف بات یہ رہی کہ مغربی طرز پر کھانے کا انتظام تھا، مگر راقم نے بھرے مجمع میں کہا کہ میں تو اسلامی تعلیم کے مطابق کھانا کھاؤں گا یہ کہہ کر پلیٹ میں کھانا لیا اور دوسرے کمرے کی میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا شروع کیا، اس کے بعد تمام حاضرین نے ایسے ہی کھایا، کھانے کی پوری مدت تقریباً اسلامی دسترخوان ہی موضوع سخن بنا رہا، بعد میں یہ مجلس دو گھنٹے سے زائد تک رہی، اور مختلف سیاسی، ملکی اور علمی وتاریخی موضوعات پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔

دعوتوں کے سلسلے میں جدہ کی ایک دعوت کا ذکر ضروری ہے، ہمارے بمبئی کے پرانے دوست جناب الحاج عبدالرحیم صاحب انصاری کئی سال سے جدہ میں مقیم ہیں اور وہاں کے ہندوستان و پاکستان کے لوگوں میں کافی مقبول ومحبوب ہیں، وہ اردو شعر وادب سے اچھی خاصی

دلچسپی رکھتے ہیں۔ایام حج میں ملتے رہے، جب جدہ پہونچا تو انھوں نے دوستوں سے تعارف اور ملاقات کیلئے ایک خاص دعوت کا انتظام کیا جو جناب محترم محمد احمد صاحب (لکھنؤ) کے دولت کدہ پر رکھی گئی تھی، اس پرتکلف دعوت میں ان کے حلقۂ احباب کے تمام ادب نواز شعراء واد باء شریک تھے ،عشاء کے بعد کھانا کھایا گیا پھر بارہ بجے رات تک شعر وادب کی نہایت لطیف وسنجیدہ محفل رہی۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مقصد نہ اپنی علمیت وقابلیت دکھانا مقصود ہے اور نہ اپنی عربیت اور عربی دانی کا اشتہار دینا ہے، راقم نے جو لکھا پڑھا تھا بمبئی کے تجارتی اور ہنگامی شہر میں اس کا باقی رکھنا مشکل ہے، پھر بھی الحمد للہ کہ لکھنے پڑھنے کا سلسلہ تا ہنوز باقی ہے، یہاں بتانا یہ ہے کہ ہمارے علماء مدارس کی فضا میں وہی پرانی عربی استعمال کرتے رہیں تو ان کو اچھا خاصا ملکہ ہو جائے اور عرب ممالک میں یا عرب علماء سے بات چیت اور تبادلہ خیالات میں کوئی دقت اور الجھن نہ ہو، اگر راقم یہاں تھوڑی بہت عربی کلام پر قدرت نہ رکھتا تو شرم اور جھجک کی وجہ سے ہر عالم اور ہر محفل سے جی چراتا، اور مختلف قسم کے وجوہ تلاش کرکے اپنے کو تسلی دے لیتا، اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنے علم اور ذات پر اعتماد کرے، اور ہر موضوع پر اپنے فی الجملہ تیار پائے ، ہمارے علماء علوم ومعلومات میں دوسرے ممالک کے علماء سے کم نہیں ہیں، مگر صرف عربی میں تھوڑی بہت قدرت نہ ہونے کی وجہ سے خاموش رہتے ہیں، اِدھر پچھلے چند سالوں سے یہ خاموشی ٹوٹ رہی ہے، مگر اس میں تیزی کی ضرورت ہے، ہمارے مدارس عربیہ کے اساتذہ کو چاہئے کہ وہ اپنے طلبا سے عربی ہی میں گفتگو کریں، پہلے تو استاذ شاگرد دونوں ہی ضیق محسوس کریں گے، مگر چند دنوں کے بعد بے تکلف فصیح وبلیغ عربی بولنے لگیں گے، جسے عرب علماء سن کر محسوس کریں گے کہ ہم ان کے مقابلہ میں غیر صحیح بولتے ہیں۔

دوسرے ممالک میں جانا ہو یا نہ ہو خود اپنے ملک میں رہ کر عربی زبان بولنا، عربی میں خط وکتابت کرنا اور عربی زبان کو اپنی دینی زبان سمجھ کر زندہ رکھنا ہمارے لئے ضروری ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

قاضی اطہر صاحب
معاصر اہل علم کے خطوط کے آئینے میں

مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہٗ

عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ المعاصرۃ اهل المنافرۃ، ہم عصر ہونا باہمی منافرت کی بنیاد ہے، یہ کہاوت تجربہ کی روشنی میں بہت حد تک صحیح ہے، دیکھا یہی جاتا ہے کہ، لوگ اپنے ہم عصر اصحابِ کمال کے اعتراف میں عموماً بخل سے کام لیتے ہیں، ان کی خوبیاں نظر انداز کر دیتے ہیں، بسا اوقات باہمی چشمک اور حسد کا ظہور ہوتا ہے۔ لیکن اس مثل سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کے مزاج میں اللہ تعالیٰ نے تواضع اور سادگی کا جذبۂ فراواں رکھا ہے۔ یہ حضرات اپنی فطری تواضع کی بنا پر اصحاب کمال بلکہ بے کمالوں کے سامنے بھی جھکے رہتے ہیں، اور ان کے سامنے اپنے کو اس طرح پیش کرتے ہیں، جیسے انھیں کوئی عظمت حاصل نہ ہوا دوسرے کو تمام عظمتیں حاصل ہوں، اور یہ معاملہ از راہ تصنع نہیں ہوتا، انھیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں ہوں تو بڑا، لیکن از راہ تواضع خود کو چھوٹا بنا کر پیش کر رہا ہوں۔ ایسا کوئی شائبہ ان کے دل میں نہیں ہوتا، وہ واقعی دل و جان سے خود کو چھوٹا دوسروں کو بڑا دیکھتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے حق تعالیٰ کے دستور من تواضع لله رفعه الله کا ظہور ہوتا ہے، کہ جو اللہ کے لئے پستی اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بلندی عطا فرماتے ہیں۔

حضرت قاضی اطہر مبارکپوری علیہ الرحمہ ایسی ہی مستثنیٰ شخصیات میں ہیں، آپ کے جتنے بھی مضامین اس نمبر میں اور اس کے علاوہ دوسرے جرائد و مجلّات میں مختلف اہل علم حضرات کے قلم سے پڑھیں گے، سب قاضی صاحب کی تواضع، کسر نفسی اور سادگی کا ذکر کرتے ہیں، جن لوگوں نے قاضی صاحب کو دیکھا ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ قاضی صاحب میں دینی غیرت اور

خودداری گوکہ بہت تھی، مگر ان میں کبر ونخوت کا شائبہ نہ تھا۔ بلکہ سچی تواضع اور بے نفسی ان کی طبیعت اور مزاج میں رچی بسی ہوئی تھی، وہ بہت بڑے تھے، بہت نامور صاحب علم تھے، کثیر التصانیف بزرگ تھے، اعلیٰ درجے کے محقق تھے، اور انھیں معلوم تھا کہ علم وتحقیق میں ان کا پایہ کتنا بلند ہے، مگر جب کسی سے ملتے، تو نہ اپنی کسی بڑائی کا اظہار کرتے، نہ اپنے علم کا دباؤ ڈالتے، ہر شخص سے خواہ وہ کتنا ہی معمولی ہو، بے تکلف ملتے، بسا اوقات اسی کی زبان میں بات کرتے، جو انھیں پہلے سے نہ جانتا ہوتا اسے احساس بھی نہ ہوتا کہ وہ علمی دنیا کی ایک عظیم ہستی سے مل رہا ہے۔

قاضی صاحب کی اسی تواضع کا اثر تھا کہ معاصرین کو ان سے حسد کرنے اور ان کا رتبہ گھٹانے کا موقع ہی نہ مل پاتا تھا، قاضی صاحب کے انداز اور ان کے معاملات سے ہر شخص محسوس کرتا کہ، وہ اسے بلند رتبہ دے رہے ہیں، پھر کوئی کس بنا پر نفرت کرے۔ وہ تو محبت کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے، اس سلسلے میں اکابر تو خیر اکابر ہیں، وہ جو چھوٹے ہیں، بہت چھوٹے ہیں، ان کے ساتھ بھی ان کے رتبے اور درجے سے بڑھ کر قاضی صاحب معاملہ فرماتے۔

قاضی صاحب کو معاصرین کس نگاہ سے دیکھتے تھے؟ قاضی صاحب کا رتبہ ان کے نزدیک کیا تھا؟ اس کی کچھ جھلکیاں ان مکاتیب ومراسلات میں دیکھی جاسکتی ہیں، جو معاصر علماء نے انھیں لکھے ہیں، قاضی صاحب کی عظمت یہاں بھی جھلکتی ہے کہ انھوں نے خطوط کا بڑا ذخیرہ نہایت اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا، ملک کے بہت سے نامور علماء اور بڑے اصحابِ علم نے یہ خطوط لکھے ہیں۔ ہم اس مضمون میں ان معاصر علماء کے خطوط کے کچھ اقتباس نقل کرتے ہیں۔

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی علیہ الرحمۃ:۔

ہمارے علم میں ہندوستان کے بڑے علماء میں سب سے قدیم اور مستحکم تعلق محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ تھا۔ قاضی صاحب کے دل میں ان کی بڑی عظمت تھی، اور مولانا اعظمی بھی قاضی صاحب کے بڑے قدرداں تھے، دونوں حضرات میں ملاقاتوں کے علاوہ مراسلت کا سلسلہ بلا انقطاع جاری رہتا تھا، میرے پاس حضرت محدث کبیر

کے خطوط کا ایک حصہ موجود ہے، یہ ۱۰/مارچ ۱۹۵۹ء سے ۳/مارچ ۱۹۸۱ء تک کے مکاتیب ہیں۔ ان کی تعداد ۶۸/ ہے، اللہ جانے ان کے علاوہ اور کتنے خطوط ہوں گے۔ یہ خطوط زیادہ علمی تر کتابوں کی تحقیق و تفتیش، گھریلو نجی حالات اور سفر وغیرہ سے متعلق ہیں، ان کی سطر سطر سے بے تکلفی، بے ساختگی، محبت و تعلق کی گرمی اور باہم مخلصانہ مناسبت کی خوشبو محسوس ہوتی ہے، چند ایک خطوط کے اقتباس یہاں نقل کرتا ہوں۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں، حضرت مولانا اعظمی اور قاضی صاحب کو یہ خیال ہوا کہ ایک علمی و تصنیفی اور نشر و اشاعت کا ادارہ قائم کیا جائے، جو علمی و تحقیقی کاموں کا مرکز ہو، اس کیلئے غور و فکر اور باہم مشورے ہوتے رہے۔ اس سلسلے میں دو جگہیں زیر غور تھیں، مئو اور بمبئی، مئو میں حضرت مولانا اعظمی تھے، بمبئی میں قاضی صاحب رہتے تھے، ایسا ادارہ غالباً مولانا چاہتے تھے کہ بمبئی میں ہو اور قاضی صاحب چاہتے تھے کہ مئو میں ہو۔ قاضی صاحب نے اس کیلئے کوشش بھی کی تھی، مگر حضرت مولانا اِدھر کے حالات سے مطمئن نہ تھے، چنانچہ ایک خط میں قاضی صاحب کو لکھتے ہیں:

''مالیگاؤں میں ۱۹/ دن لگ گئے، اس کے بعد بمبئی آنے کا موقع نہیں معلوم ہوا، نیز بڑا محرک آنے کا یہ خیال تھا کہ آپ سے، یحییٰ زبیر سے بمبئی میں کسی ادارہ کیلئے بات ہوئی ہوگی، جب معلوم ہوگیا کہ یہ بات نہیں ہے، تو کوئی خاص محرک نہیں رہا، اپنے قرب و جوار میں اب بھی میرا خیال یہی ہے کہ جیسا ادارہ آپ چاہتے ہیں، قائم ہونا مشکل ہے، اسی طرف (بمبئی میں) ایسے ادارے قائم ہوسکتے ہیں اور چل سکتے ہیں، اِس طرف بخل، حسد اور بے ذوقی نے راستے بند کر رکھے ہیں لیکن اُدھر جو خرابیاں ہیں ان کا انکار بھی ممکن نہیں، آپ دور رہتے ہیں اس لئے قرب مطلوب ہے، مگر مستقل قرب حاصل ہوجائے تو یقین ہے کہ یہاں کے حالات چند ہی دنوں میں بعد کو مرغوب و مطلوب بنا دیں گے۔

میں آج کل کھانسی سے بہت پریشان ہوں، آج خصوصیت سے بہت مضمحل ہوں، بہت جبر کر کے یہ خط لکھ رہا ہوں، میری صحت اتنی کمزور ہے کہ ہمت نہیں پڑتی، اگرچہ شوق بے نہایت ہے۔'' ۲۶/اکتوبر ۱۹۶۰ء

ایک خط میں، جو اکتوبر ۱۹۶۱ء کا لکھا ہوا ہے، چند کتابوں کا تذکرہ کرتے ہیں، اس سے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کے ذوق ومناسبت کا پتہ چلتا ہے، لکھتے ہیں:

''الحمد للہ خیریت ہے، ادھر میرا ایک نواسہ سخت بیمار ہو گیا تھا، اس سلسلہ میں بہت پریشان تھا، الحمد للہ اب وہ اچھا ہے، **العبر** جب واپس آجائے، عبارت نقل کر کے بھیجئے گا، (۱) اب اعظم گڈھ کیا لکھوں، مجمع البحرین جہاں تک یاد ہے محمد بن علی الطریحی (کٹر شیعہ اثناء عشری) کی تصنیف ہے، ایران میں چھپی ہے، لکھنو میں غالباً میں نے اسے دیکھا تھا، الفاظ آیات واحادیث کی تفسیر تمام تر کتب اہل سنت سے ماخوذ ہے۔

آپ نے جو عبارت لکھی ہے اس میں حلق کا فاعل متعین طور پر معلوم نہیں، اغلب یہ ہے کہ وہ حدیث مرفوع (فعلی) نہیں ہے، کسی صحابی یا تابعی کا واقعہ ہوگا۔ خیال میں رکھوں گا، کہیں کوئی بات نظر آئی تو لکھوں گا، ....فضائل اعمال انھوں نے مجھے دکھائی تھی ....اس کا ترجمہ بڑے کام کا ہوگا۔

حیدرآباد سے مولانا سید فضل اللہ نے سلام لکھنے کو لکھا ہے، وہ اپنی کتاب کا غلط نامہ چھپوا رہے ہیں، مجھ کو بار بار لکھا کہ کوئی خامی ہو تو لکھئے، آج ان کو چند باتوں کی طرف متوجہ کر رہا ہوں۔

آج سنن سعید بن منصور کی تیسری جلد کے تین ورق کا عکس ایک صاحب نے بھیج کر دریافت کیا ہے کہ یہ کون سی کتاب ہے، افسوس ہے کہ بس اتنی ہی مل سکی، یعنی فقط ایک جلد، باقی جلدوں کا ابھی پتہ نہیں چل سکا۔

ایک خط میں مولانا لکھتے ہیں کہ:

''خط ملا، سب حالات معلوم ہوئے، خوشی ہوئی شیخ عبد العزیز بن باز کا جواب آگیا، لکھتے ہیں کہ ۱۸ھ کے لئے داخلہ کی مدت ختم ہو گئی، لیکن خالد کمال (۲) ۸۲ھ کے داخلہ کیلئے اپنی درخواست مع شرائط قبول ومؤہلات سعودی سفیر کے پاس بھیج دیں، اسلئے آپ

(۱) العبر للذهبی میں جنگ صفین کے ذکر میں بدری صحابہ کی شرکت کا ذکر ہے، غالباً اس کی تعداد بتائی ہے، اسی عبارت کی نقل حضرت مولانا نے طلب کی تھی۔ (۲) قاضی صاحب کے بڑے صاحبزادے مولانا خالد کمال صاحب، جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ہندوستان سے ابتداً گئے تھے۔

دوسری درخواست ۸۲ھ کیلئے بھیجد یجئے، اس کے بعد میں دوسرا خط ابن باز کو لکھوں گا۔

مارچ ۱۹۸۱ء کے خط میں محدث کبیر لکھتے ہیں:

''ایک صاحب تاریخ گجرات خوب مفصل لکھوانا چاہتے ہیں، صوبہ کی تاریخ کے ساتھ تاریخی مقامات اور نامور گجراتیوں کا تذکرہ لکھوانا چاہتے ہیں، موادفراہم کرنے کی ذمہ داری ان کی ہوگی، میری نگاہ آپ پر پڑتی ہے، اگر آپ کی رضامندی معلوم ہوتو میں ان سے معاملہ طے کروں،

میں نے سنا ہے کہ آپ مبارکپور جلد ہی آنے والے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟

خطوط کے ان اقتباسات سے باہمی مناسبت اور بے تکلفی اور مخلصانہ تعلقات کی لطافت کا احساس بخوبی ہوتا ہے۔

حضرت مولانا ابوالوفاء افغانی علیہ الرحمۃ:

حضرت مولانا ابوالوفاء افغانی علیہ الرحمۃ کا شمار اس دور کے محقق اور جید علماء میں تھا، اصلاً افغانی تھے، مدرسہ نظامیہ حیدرآباد سے فارغ ہوئے، اور پھر وہیں کے ہورہے، **لجنة احياء المعارف النعمانيه** کے نام سے فقہ حنفی کی امہات الکتب کی اشاعت کے لئے ایک ادارہ قائم کیا، جس سے امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف اور امام محمد **عليهم الرحمة** کی کتابیں شائع ہوئیں، علم وفضل میں مولانا ابوالوفاء افغانی کا پایہ بہت بلند تھا، ادب وتاریخ اور فقہ وحدیث میں سند کا درجہ رکھتے تھے، بالخصوص فقہ حنفی کے ساتھ ان کا شغف مثالی تھا، علم کیلئے انھوں نے دنیا کو تج دیا تھا، متعدد بیش قیمت کتابیں ان کی تعلیق وتحقیق سے شائع ہوئیں، جن میں سے اکثر فقہ حنفی سے متعلق نوادرات کی حیثیت رکھتی ہیں، مولانا کے ساتھ قاضی صاحب کے نہایت گہرے اور مخلصانہ روابط وتعلقات تھے۔

مولانا ابوالوفاء صاحب افغانی کا ایک گرامی نامہ قاضی صاحب کے نام ملاحظہ ہو۔ تبرکاً اسے من عن نقل کرتا ہوں۔

از:۔ جلال کوچہ ۴۶۵۔ حیدرآباد دکن، یوم شنبہ ۲۰؍رجب ۱۳۹۴ھ

عزیزم قاضی جی! **رفعهٗ الله إلى الدرجة العليا واطال عمرهٗ مع السلامة**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کل آپ کا ہدیہ عالیہ موصول ہوکر موجب مسرت ہوا، بارک اللہ فی قلمک وشکرک مساعیک ۔آپ نے ماشاء اللہ قوم کی ایسی خدمت کی، جس کو اب تک کسی نے نہیں کیا تھا اور ایسے مضایق سے جواہر پارے نکالے کہ جن کی روشنی سے عالم منور ہوا، یہ خدمت آپ کے مقسوم میں تھی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پھر اس پر اللہ جل شانہٗ نے آپ کو ادب سے نوازا ہے، کہ کسی کا نام بغیر احترام کے نہیں لیا، جزاک اللہ خیراً

حضرت مولانا محمد فخر الدین صاحب علیہ الرحمۃ:

حضرت مولانا محمد فخر الدین صاحب علیہ الرحمۃ مرادآباد کے رہنے والے تھے، عرصۂ دراز تک مدرسہ شاہی مرادآباد میں شیخ الحدیث رہے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ نے اخیر عمر میں دارالعلوم دیوبند بلایا تھا۔حضرت شیخ کے انتقال کے بعد دارالعلوم میں کامیاب شیخ الحدیث رہے، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے تلامذہ میں تھے، قاضی صاحب نے بخاری شریف انھیں سے پڑھی تھی۔قاضی صاحب ان کا بہت احترام کرتے تھے، اور شیخ کو بھی ان سے بہت تعلق تھا۔ایک مکتوب ان کا ملاحظہ ہو:

میرا جی چاہتا ہے کہ میں مدینہ منورہ جاکر زیارت رسول ﷺ سے مشرف ہوکر خالد کمال سے بھی ملاقات کروں، سنا ہے کہ وہ مدینہ یونیورسٹی میں ہیں، میری حج کی درخواست نامنظور ہوگئی ہے، قدوائی صاحب سے کہلوایا ہے، امید ہے کہ منظور ہوجائے گی، آپ سے بھی درخواست ہے کہ اس بارے میں سعی فرمائیں۔شعبان ۱۳۸۵ھ

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب علیہ الرحمۃ:

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب علیہ الرحمۃ قاضی صاحب کے خاص اساتذہ میں ہیں، جنھوں نے لکھنے پڑھنے کے معاملہ میں قاضی صاحب کی بہت کچھ رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرمائی ہے، مدرسہ شاہی مردآباد میں استاذ تھے، اور ایک رسالہ وہیں سے بنام ''قائد'' نکالا کرتے تھے،

اس میں قاضی صاحب کے مضامین شائع فرماتے تھے، قاضی صاحب نے ان سے اخیر تک طالب علمانہ تعلق برقرار رکھا۔ قاضی صاحب نے جب بمبئی چھوڑنے کا ارادہ کیا، تو مولانا محمد میاں صاحب کو اس کی اطلاع دی۔ اس پر مولانا لکھتے ہیں:

نامہ عزیز باعثِ مسرت ہوا...... اچھا آپ کا دل بمبئی سے گھبرا گیا، اب کیا ارادہ ہے؟ وطن میں دل لگتا ہے، تو کیا پارچہ بافی کا کارکانہ قائم کریں گے، یا مدرسہ احیاء العلوم میں تعلیمی اور تدریسی خدمت انجام دیں گے؟ اگر ایسا ہے تو بمبئی سے دل گھبرا جانا مبارک ہو، مگر شاید یہ بھی نہ ہو سکے، تو پھر کیا؟

احقر کے ذہن میں آپ کے مناسب چند کام ہیں،

(۱) انسائیکلو پیڈیا آف انڈیا، بہت بڑا کام ہے، اگر وسائل مہیا ہوں تو حکومت سے اس میں امداد بھی مل سکتی ہے۔

(۲) اگر یہ نہ ہو تو دوسرا کام ہے، تاریخ مذاہب ہند، یہ پہلے کے مقابلے میں آسان ہے،

(۳) تیسرا کام جوان دونوں کے مقابلے میں آسان ہے، تاریخ علماء ومشائخ ہند،

تینوں کاموں کیلئے جاں فشانی اور ہمت مردانہ کی ضرورت ہے

<u>حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری:</u>

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری کے ممتاز شاگرد اور ان کے علوم کے شارح تھے، علم حدیث میں خصوصی کمال انھیں حاصل تھا، عربی زبان وادب پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔

۱۳۹۷ھ میں ان کا وصال ہوا، **معارف السنن** کے نام سے ترمذی شریف کی بہترین شرح لکھی۔ ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی المحدث نے لکھا تھا:

اس دور قحط الرجال میں مولانا کا فقدان اتنا بڑا خسارہ ہے کہ اس کی تلافی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، ایسا کامل مدتوں میں پیدا ہوتا ہے۔

مولانا محمد یوسف بنوریؒ، قاضی صاحب کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

تقریباً ایک ماہ کے بعد نامۂ گرامی کا جواب دے رہا ہوں، اس اضطراری تاخیر کے لئے معافی چاہتا ہوں، رجال السند والہند کا شکریہ، ماشاء اللہ خوب زیور طبع سے آراستہ ہوئی،

جزاکم اللہ خیراً۔ رجال السند والہند کے سلسلے میں ایک بہت بڑے محقق، جو امام صاغانی کے معاصر ہیں، گزرے ہیں، مسعود بن حسین بن شیبہ ہندی صاحب کتاب التعلیم، جنھوں نے امام ابوحنیفہ کی حمایت میں، امام الحرمین وغزالی کی سخت تردید کی ہے، غالبًا اسکو میں نے دیکھا ہوگا، اس وقت مزید کچھ یاد نہیں، تقریظ عند الفرصت لکھ کر ارسال خدمت کر دوں گا ان شاء اللہ۔

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

نامۂ گرامی نے ممنون فرمایا، کل ان شاء اللہ معارف السنن خالد صاحب کے یہاں پہونچا دی جائے گی، سنن سعید بن منصور کا کام مکمل ہوگیا، الحمد للہ، خوش خبری آپ سے سنی۔

جواہر الاصول للتقی الفاسی المکی کا مجھے بالکل علم نہیں، دیکھ لیجئے کہ اگر فوائد ہوں تو اس پر کام کیجئے، بہر حال یہ فن تو اب بہت غنی ہوگیا، اچھا ذخیرہ مطبوعات میں آگیا ہے۔

آپ کے صاحبزادے سے مل کر بہت خوشی ہوئی، ماشاء اللہ ذکی اور باوقار ہیں، اللہ تعالیٰ جید عالم بنائے۔ ۲۰؍صفر ۱۳۸۴ھ

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی:

دار العلوم دیوبند کے ابتدائی مفتی، ولی صفت، پاک فطرت حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کے صاحبزادے تھے، دین وسیاست دونوں میدانوں میں صف اول کے لوگوں میں رہے، بڑے مدبر صاحب فراست اور صاحب علم تھے، قاضی صاحب سے خصوصی تعلق تھا، قاضی صاحب کی اردو کی تمام اہم کتابیں انھوں نے اپنے قائم کردہ ادارہ ندوۃ المصنفین سے شائع کیں، اور ہر کتاب میں پیش لفظ کے طور پر بہترین تعارف لکھا۔ ایک خط میں قاضی صاحب کو لکھتے ہیں:

مکرمت نامہ ملا، مضمون گرامی پہونچ گیا تھا، یہاں یہی خیال رہا کہ رسید روانہ کر دی گئی ہے، بہر حال معذرت خواہ ہوں، ان شاء اللہ جنوری کے برہان میں مضمون شائع ہوگا، آپ کا مضمون برہان کے معیار پر پورا نہ اترے یہ کیسے ہوسکتا ہے، جماعت میں آپ کا وجود قیمتی ہے، علماء کی شان کے بہت سے جوہر آپ کی ذات میں پنہاں ہیں۔

۲۲؍اکتوبر ۱۹۶۰ء

حضرت مولانا فضل اللہ صاحب:

بہار کے مشہور بزرگ حضرت مولانا محمد علی مونگیری یکے از بانیان ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پوتے ہیں، بڑے بزرگ صاحب علم اور نیک نفس تھے، امام بخاری کی تصنیف الادب المفرد کی شرح فضل اللہ الصمد کے نام سے لکھی، اس پر قاضی صاحب نے البلاغ میں تبصرہ کیا، تو انھوں نے خط لکھا:

آپ کا مرسلہ البلاغ پڑھا، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، آپ یقین مانئے کہ آپ نے تبصرہ لکھنے میں دیر کی، اس کا ذرا ملال نہیں، انسان شے کی خوبی کو دیکھتا ہے، نہ یہ کی وہ چیز جلد حاصل ہوئی یا دیر سے۔ حافظ مجیب اللہ نے ایک سال سے زیادہ ہی دیر لگائی، بڑے اچھے الفاظ میرے متعلق اور کتاب کے متعلق لکھے، مگر پھر بھی کتاب کا حق ادا نہیں کیا، ''زندگی'' نے بڑی ہوشیاری برتی، کتاب کے شروع میں جو تعارف کتاب کا ہے، اسکو مختصر کر کے تبصرہ کا نام دے دیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی بڑے لوگوں میں ہیں، مجھ فقیر کو ان کی بارگاہ میں بار کہاں مل سکتا تھا، آپ نے تمام ہندوستانی جریدوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا ہے۔''

۲۰/اپریل ۱۹۶۳ء۔

حضرت مولانا عبدالباطن صاحب جونپوری:

حضرت مولانا عبدالباطن صاحب جون پوری ان خاصان خدا میں تھے، جنھیں دیکھ کر خدا کی یاد دل میں تازہ ہو جاتی ہے، جن کی مجلس میں بیٹھ کر مجلس نبوت کی خنکی حاصل ہوتی ہے، جونپور کے مشہور صاحب کرامت بزرگ، مصلح بنگال حضرت مولانا کرامت علی جون پوری کے پوتے، حضرت مولانا عبدالاول صاحب جونپوری کے فرزند گرامی ہیں، ایک بار ان کی خدمت میں اس خاکسار کی حاضری ہوئی ہے، طالب علمی کا دور تھا، نوجوانی کا زمانہ تھا، مگر انھوں نے ایسی خاطر مدارات کی، اور اتنی تواضع وفروتنی کا معاملہ فرمایا کہ حیرت ہو ہوگئی، چہرہ اتنا روشن اور نورانی تھا کہ اب تک اس کی تابانی آنکھوں میں محفوظ ہے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد وہاں تشریف لے گئے اور وہیں انتقال ہوگیا، اتنا بڑا جنازہ اب تک دیکھنے اور سننے میں نہیں آیا۔ اخبارات کی خبر تھی کہ چوبیس

لاکھ سے زائد مجمع نے ان کی نماز جنازہ ادا کی تھی، ان کے چھوٹے چھوٹے متعدد رسائل ہیں جو بہت مؤثر اور دلآویز ہیں۔ ایک مکتوب اس بزرگ ہستی کا بھی قاضی صاحب کے ذخیرے میں ملا، برکت کے واسطے اسے نقل کرتا ہوں:

البلاغ کے پرچے آجاتے ہیں، اور آپ سے غائبانہ علمی ملاقات ہو جاتی ہے، مارچ کے البلاغ کے شذرات میں جو مضمون دوسرے صفحہ پر ارقام فرمایا ہے، جس میں ہند و پاک کے اہل علم کی کس مپرسی کا رونا رویا گیا ہے، وہ ہو بہو میرے حسب حال ہے، کتاب ''واقعات النبیؐ''، مکمل ہو کر مسودہ صاف ہو کر رکھا ہوا ہے، لیکن طباعت واشاعت کی نوبت نہیں آئی، اس کی طباعت کے لئے چند مشہور اداروں اور مستند ہستیوں کو خط لکھا اور متوجہ کیا، افسوس کہ کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں آیا، بعض حضرات نے تو جوابی خط کا جواب تک نہ دیا، ...... واقعات النبیؐ'' میری جملہ تالیفات میں محبوب ترین کتاب ہے، آنحضرت ﷺ کے دوسو منتخب واقعات جو کہ سبق آموز دلچسپ اور لائق مطالعہ ہیں، دل کی خواہش ہے کہ کیسے امت مسلمہ کے سامنے پیش کر دئے جائیں۔

تعلیقات میں کشکول کے حصہ سے بھی انتخاب فرما سکتے ہیں، اگر میری دی ہوئی کتابیں ساتھ ہوں تو ان پر تبصرہ بھی فرما دیجئے۔ آپ نے اپنی قیمتی تالیفات مجھے دے کر جو عزت ومحبت فرمائی اس کا دل سے شکریہ، یقینی استاذ مرحوم کی روح اس تعلق سے خوش ہوئی ہوگی''

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مرحوم:

فرانس کے مشہور شہر پیرس میں رہ کر اسلامی علوم وفنون کے بلند پایہ مخلص خدمت گزار، مشہور حیدر آبادی عالم ومحقق جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو کون نہیں جانتا، دنیائے اسلام کی یہ عجیب وغریب مایۂ ناز ہستی ایک عرصہ تک یورپ کے کفرستان میں اسلام وایمان کی روشنی بکھیرتی رہی، ان کا بھی ایک خط قاضی صاحب کے نام ملاحظہ فرمایئے:

آج نوازش نامہ ملا، سرفراز ہوا...... آپ کی فاضلانہ کتاب کا ذکر سن چکا ہوں خاص کر بمبئی کے پروفیسر عبدالرحمٰن مؤمن صاحب سے، لیکن ادھر کی ڈاک اب انگریزوں کے زمانے

کی طرح نہیں ہے، مشیة اللہ غالبة، کتاب آپ کی اور تالیفوں کی طرح نفیس اور مفید ہی ہوگی، اور اس کی قطعاً محتاج نہیں کہ ایک ناچیز اس کا تعارف کرائے

؎ عطر آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید ۲۶؍ذی الحجہ ۱۴۰۱ھ

شبلی اکاڈمی دار المصنفین اعظم گڈھ کے سابق ناظم مشہور اہل علم واہل قلم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی قاضی صاحب کو لکھتے ہیں کہ:

آپ کے مضامین محفوظ ہیں ان شاء اللہ جنوری یا فروری سے چھپیں گے، بمبئی کے ماحول وہاں کی زندگی اور معاشی جدوجہد میں علمی ذوق کا قائم رکھنا آپ ہی کا کام ہے۔

۲۴؍دسمبر ۱۹۶۳ء

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے سنی شعبۂ دینیات کے ناظم مولانا تقی امینی مرحوم نے ایک خط میں لکھا:

اللہ کا بہت بڑا فضل ہے، آپ کے حال پر، جو اس قسم کے علمی کام (آپ سے) لے رہا ہے، بمبئی میں رہ کر یہ کام کرتے رہنا محض آپ کی کرامت ہے۔ ۲۵؍جنوری ۱۹۷۳ء

حافظ غلام مرتضی پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

کل لائبریری میں ''صدق جدید'' نظر آیا، اس میں ''حکومت کویت کی جانب سے ایک ہندوستانی عالم کو اعزاز'' کے عنوان کے تحت یہ خبر پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ حکومت کویت نے آپ کو اپنے یہاں کے نشریاتی شعبہ کا معتمد اور مشیر قرار دیا ہے، میں اس موقع پر آپ کو صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں، آپ ایک سادہ لیکن مصروف زندگی گزارتے ہوئے جو نمایاں علمی خدمات انجام دے رہے ہیں، اس کے پیش نظر آپ واقعی اس اعزاز کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ میں نے آپ کی قابل قدر تصنیف رجال السند والہند کو بغداد میں جن جن اساتذہ کی خدمت میں پیش کیا، انھوں نے اس کی بے حد تعریف کی، اور جب اس کا ایک نسخہ المتحف العراقی کی لائبریری میں رکھوانے کے لئے لے گیا، تو اس کے ناظم جناب کورکیس عواد نے فرمایا کہ مجھے یہ خبر نہ تھی کہ آج بھی ہندوستان میں عربی کے ایسے جلیل القدر علماء موجود ہیں۔ ۳۱؍مارچ ۱۹۶۳ء

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ بھی قاضی صاحب کے بڑے قدرداں تھے، اس سلسلے میں ان کا ایک مکتوب گرامی پڑھئے:

''افسوس ہے کہ ۸؍جون کو جب میں بمبئی واپس ہوا تو آپ سے ملاقات نہ ہوسکی، صرف چند گھنٹے قیام رہا، ایک خاندانی حادثہ کی اطلاع پا کر بہ عجلت وہاں سے روانہ ہوگیا، محمد بھائی کے یہاں آپ کا لفافہ ملا، جس میں انقلاب کے دوتین تراشے تھے، پڑھ کر بہت خوشی ہوئی، پہلی مرتبہ آپ کے قلم سے الهند في العهد الاسلامي کا ایک کثیرالاشاعت اخبار میں نام آیا، اوراس کا مختصر لیکن وقیع تعارف ہوگیا، اس کا ایک فوری فائدہ تو یہ ہوا کہ لکھنؤ کے قومی آواز میں ادارتی صفحہ پر ایک اچھا نوٹ، اس کتاب کی اشاعت کے متعلق دیا گیا، جو اول سے آخر تک آپ ہی کے مضمون پر مبنی اور اس سے ماخوذ تھا، اگرچہ ظاہر یہ ہوتا تھا کہ ان کو براہ راست اس کتاب کی طباعت کی اطلاع ملی ہے، اور وہ اس کو ایک علمی خبر کے طور پر شائع کررہے ہیں۔ اس سے بھی بہت سے اہل علم اور اہل ذوق کو کتاب کے مکمل ہونے کی خبر مل گئی، یہ کتاب کا پہلا مطبوعہ نسخہ تھا، جو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا، میری اس وقت بھی نیت ہدیہ کی تھی، معلوم نہیں آپ کو کیوں تردد رہا؟

ابھی تک میرے پاس اس کا کوئی دوسرا نسخہ نہیں پہونچا............

مجھے تو پہلے خیال نہ تھا اور نہ کتاب پیش کرتے وقت یہ نیت تھی کہ آپ سے اس کتاب پر کچھ لکھنے کی فرمائش کروں، لیکن آپ کے اس مختصر مضمون کو پڑھ کر دل میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ آپ سے اس کتاب پر ایک مفصل مضمون اور تبصرہ کی درخواست کروں، جس کو آپ اشاعت کے لئے معارف میں بھیجیں، ہندوستان میں اس کتاب پر تبصرہ کرنے کا جن چندگنی چنی ہستیوں کو حق ہے، ان میں آپ ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں، اس لئے کہ آپ کی ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ پر گہری نظر بھی ہے، اور آپ کا یہ موضوع بھی ہے، آپ مصنف کی کاوش ومحنت کا پورا اندازہ کرسکتے ہیں، پھر آپ کا قلب اور قلم گروہی عصبیتوں سے بھی پاک ہے، جو ہمارے اہل علم، اور اہل قلم کا پرانا مرض ہے، اس لئے اگر آپ کی طبیعت پر بار نہ ہو، تو آپ پوری کتاب پر نظر ڈال کر ایک علمی مضمون معارف کے

لئے سپرد قلم فرمائیں۔ والسلام مخلص ابوالحسن علی

مولانا ابومحفوظ الکریم صاحب معصومی لکچرر تاریخ مدرسہ عالیہ کلکتہ......ان کے متعلق قاضی صاحب فرماتے تھے کہ میری نگاہ میں یہ ہندوستان کے عظیم ترین عربی کے اسکالروں میں ہیں، اورانھوں نے میری کتاب ''رجال السند والہند'' حرف بحرف پڑھی ہے......ایک خط میں لکھتے ہیں:

محترم المقام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری صاحب حرسه الله ومتعنا بطول بقائه

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج شریف بعافیت تمام باد، امید کہ آپ دیوبند سہارنپور سے بخیریت واپس پہنچ چکے ہوں گے، آپ کے غائبانہ راقم نے مبارک پور کی سیر کی، آپ سے نہ ملنے کا افسوس رہا، لیکن صاحبزادگان مولانا ظفر مسعود اور حسان مسعود حفظہما اللہ نے مہمان نوازی کا حق پوری مستعدی وانشراح صدر سے ایسا ادا کیا جس کی توقع بزمانۂ حال نہیں کی جاسکتی، فجزاہم اللہ احسن الجزاء وزادہم خیراً ومیراً۔

دارالمصنفین کی دعوت پر اعظم گڈھ کا سفر کرنا پڑا۔ ۱۸/اپریل دوشنبہ کو یہاں سے روانہ ہوا، ۱۹/اپریل سہ پہر کے لگ بھگ شاہ گنج اترا، اعظم گڈھ کی ٹرین جانے ہی والی تھی اس پر بیٹھ کر اعظم گڈھ پہونچا، دارالمصنفین پہونچتے پہونچتے ساڑھے چار شام کا وقت ہو چکا تھا، مؤرخہ ۲۰/اپریل دارالمصنفین کی نذر رہا، ۲۱ کو مبارکپور جانا طے کرلیا کہ اب کی دفع آپ کو شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا، علاوہ بریں یہ خیال بھی ہوا کہ زندگی میں تو مولانا عبیداللہ مبارکپوری سے ملاقات میسر نہ آسکی، کم ازکم سنت تعزیت تو مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے مل کر ادا ہو جائیگی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب نے بڑی فراخ دلی اور محبت سے کتب خانہ دارالمصنفین کے جواں سال ملازم مولوی ابوالبرکات اصلاحی کو رہنمائی کے لئے ساتھ کر دیا، غرض مبارکپور کی آمد ورفت میں سہولت پیدا ہوگئی اور بڑا آرام رہا، آپ کو پیشگی اطلاع نہیں دی کہ دراصل یہ سفر تذبذب کے عالم میں کیا گیا، اور خود دارالمصنفین کو اپنے پہونچنے کی خبر صرف ٹیلیگرام کے ذریعہ بھیجی، ٹیلیگرام کی رفتار بھی ایسی ثابت ہوئی کہ اس سے پہلے بندہ خود دارالمصنفین جا پہنچا، اور مبارکپور سے

واپسی پر ۲۲/اپریل کی صبح تک شاید ہمارا ٹیلیگرام نہیں پہونچ پایا۔

مبارکپور کی یاد اب مشہود ہونے کے بعد تو نقش بر حجر ہے، واپسی میں اعظم گڈھ پہونچتے پہونچتے کچھ اشعار موضوع ہوئے جو کلکتہ پہونچ کر اتمام کو پہونچے، آپ کو مولانا ظفر مسعود نے کچھ تفصیلات بتائی ہوں گی، ان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے اپنی موٹر بائیک پر بیٹھا کر رسول پور کی بھی سیر کرادی، فجزاہ اللہ خیراً۔

باقی باتوں کا اندازہ اس شعری دستاویز سے کیجئے جو اپنی نااہلی کی دلیل ہے:

قصة المسير إلىٰ مبارك فور

(فی الیوم التاسع من ذی القعدة ۱۴۱۴ھ وفق الحادي والعشرين من شهر إبريل ۱۹۹۴م)

أعظم بيوم سرت من "أعظم كر" ا معى أبو البركات، خرّيت حرى

كانت (مبارك فور) غاية مذهبى حتى انتهيت أمام منزل (أطهر)

ای الشيخ المؤقر مولانا القاضى اطهر حرسه الله ومتعنا ببقائه الطويل

فوجدتهٔ عن داره متنائياً إذ لم يكن أخبرتهٔ بتصدّرى

هو في (سهارنفور) أو جنباتها ما بين كتب خزائن والمحبر

غررا يؤلف درها وعقيقها في سلك منتظم بهيّ المنظر

فلقيت حساناً وبعد هنيهة "ظفرا" وقد أتيا بوجه مسفر

حسان بن مسعود و ظفر مسعود حرسهما الله من أنجال صديقنا القاضي الأطهر حفهم الله بنعمائهٖ

فاستوقفانى دون ما متكلف واستبشرا بي، دون أي تأخر

لله درهما ودر أبيهما طبعوا على كرم وطيبة عنصر

ومضى بنا 'ظفر' إلى دار المحدْ دِثُ، من توفى قبل عدة أشهر

أي الشيخ الكبير مولانا عبيد الله المباركفوري رحمه الله

قابلت نجليه على وجه العزا ءِ، وفاح طيب الأصل من فرع طرى

أحدهما مولانا عبد الرحمٰن وهو وأخوه كلاهما من الفضلاء حفظهما الله

وإذا أبو الحسن الإمام، برهطه — وافى هنالك واستحث، بمحضري

أي الشيخ العلامة الهمام ابوالحسن علي الندوي أبقاه الله ورفاقه الكرام

فمضوا إلى غاياتهم، ومضيت من — مغنى 'المحدث'، صوب مغنى 'أطهر'

فأتى بنا 'ظفر' إلىٰ دهليزه — حيث استرحنا من كلال يعتري

وأتىٰ عقيب (الظهر) غدّانا بكلْـ — ـلِ اطايب ومطايب المتخيَّر

هذا، وأردفني علىٰ دراجة — ألية قد ساقها بتمهر

فخرجت نحو مقابر معهودة — وتهمني منها ثلاثه أقبر

ذا قبر مولانا عبيد الله، من — خدم الحديث وعاش غير مقصِّر

متورعاً، متواضعاً، متخشعاً — نشر الحديث بفكره والمزمر

'مرعاته' دلت علىٰ إحرازه — من سنة الهادي بحظ أوفر

وهناك قبر الشيخ صاحب 'تحفة' — ضمنت شفاء مزورا وممترى

أي الشيخ المحدث مولانا عبد الرحمٰن المباركفوري رحمه الله المتوفى في ١٦ شوال ۱۳۵۳ھ وفق ۱۹۳۵م

'برسول فور' ضريح(أحمد) حائز — عربيّة وطراز شعر البحتري

أي الشيخ الأديب الكبير مولانا أحمد حسين بن عبد الرحيم رحمه الله كان من أصدقاء أبي غفر لهما الله وقد رأيته في طفولتي وهو جد صديقنا 'قاضي أطهر' من جهة أمه المرحومة

زهداً وعلماً زاخراً وتورعاً — وجمال معروف وردّ المنكر

بطلاقة بدوية وطلاوة — حضرية، وبهاء جودة عبقر

و'العصر' صلينا بمسجدها، وزُرْ — نا دار هذا المضرحي العبقري

حوت القبور معالماً علمية — عملية أعيت لسان معبِّر

بحبوحة الفردوس يدخلهم وجمـ — ـع المؤمنين بدينه المتيسر

سردي لقصتي العجيبة منبئ — عما به امتازت سلالة 'أطهر'

حیاھمو رب الوریٰ بیاھمو　　في منتهی دعة وعیش مزھر
ثم انصرفنا شاکرین لجمعھم　　عوداً علیٰ بدءٍ، إلیٰ 'أعظم کر'

ترجمہ

مبارکپور کا سفر

۹/ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ مطابق ۲۱/اپریل ۱۹۹۴ء

☆ وہ دن کتنا بابرکت اور عظمت والا تھا، جب میں اعظم گڑھ شہر سے روانہ ہوا، اور میرے ساتھ ایک معتبر رہبر مولوی ابوالبرکات صاحب تھے۔
☆ قصبہ مبارکپور میرے اس سفر کی منزل تھا، میں قاضی اطہر صاحب کے مکان پر پہونچا۔
☆ مجھے معلوم ہوا کہ وہ گھر سے باہر دور گئے ہوئے ہیں، پہلے سے میں نے انھیں آنے کی اطلاع نہ دی تھی۔
☆ وہ سہارنپور میں یا اسی علاقہ میں کہیں قرطاس وقلم کے درمیان ہیں۔
☆ جہاں وہ علم وفن کے حسین موتیوں اور جواہر پاروں کو تصنیف وتالیف کی لڑی میں پرو رہے ہیں۔
☆ وہاں میری ملاقات پہلے حسان سے ہوئی، پھر تھوڑی دیر کے بعد مولوی ظفر مسعود سے ہوئی، دونوں بہت ہی خندہ پیشانی سے ملے۔
(حسان احمد اور مولوی ظفر مسعود، قاضی صاحب کے صاحبزادگان گرامی ہیں)
☆ صاحبزادگان محترم نے بے تکلفی اور بشاشت کے ساتھ مجھے اپنے گھر ٹھہرایا، انھیں اس سے بڑی مسرت ہوئی۔
☆ دونوں کیا خوب فرزند ہیں، اور ان کے والد محترم بھی کیا خوب ہیں، نہایت شریف اور پاک طینت لوگ ہیں۔
☆ پھر مولوی ظفر مسعود مجھے ان محدث کے گھر لے گئے، جن کا ابھی چند ماہ پہلے انتقال ہوا ہے۔
(یعنی شیخ کبیر مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ)
☆ میں ان کے دو صاحبزادوں سے بطور تعزیت کے ملا، اس تازہ شاخ سے اصل کی خوشبو محسوس ہوئی۔

(ایک مولانا عبدالرحمٰن صاحب اور دوسرے ان کے بھائی مولانا عبدالعزیز صاحب دونوں عالم وفاضل ہیں)

☆ وہاں اتفاقاً مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی موجود تھے، میری حاضری سے وہ خوش ہوئے۔

☆ پھر سب لوگ اپنی اپنی منزل کی طرف چلے گئے، اور میں بھی وہاں سے قاضی اطہر صاحب کے گھر آ گیا۔

☆ ظفر مسعود اپنے گھر لے آئے اور ان کی بیٹھک مین ہم نے آرام کیا۔

☆ ظہر کی نماز کے بعد انھوں نے کھانا کھلایا، عمدہ اور لذیذ کھانا۔

☆ پھر انھوں نے اپنی موٹر سائیکل پر مجھے بیٹھایا، اور بڑی مہارت سے چلا کر لے گئے۔

☆ یہ مولانا عبیداللہ صاحب کی قبر ہے، جنھوں نے حدیث کی بڑی خدمت کی ہے، اور اچھی خاصی بابرکت زندگی گزاری ہے۔

☆ صاحب ورع تھے، متواضع اور خاشع وخاضع تھے، انھوں نے حدیث کی نشر واشاعت اپنی فکر وذہانت سے بھی کی اور تحریر وکتابت سے بھی۔

☆ ان کی کتاب مرعاۃ المفاتیح، اس بات کی دلیل ہے کہ ہادیٔ اکرم ﷺ کی سنتوں سے انھوں نے حظ وافر پایا تھا۔

☆ وہیں صاحب تحفۃ الاحوذی کی بھی قبر ہے، تحفۃ الاحوذی جو ہر شک وتزویر کے لئے شفا ہے۔

(یعنی شیخ محدث مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری علیہ الرحمہ متوفی ۱۶ر شوال ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۵ء)

☆ رسول پور میں مولانا احمد حسین صاحب کا مرقد ہے، جو علوم عربیت کے ماہر اور بحتری کے طرز کے شاعر تھے۔

(یعنی شیخ ادیب کبیر مولانا احمد حسین ابن عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ، میرے والد محترم کے دوستوں میں سے تھے، میں نے بچپن میں ان کی زیارت کی تھی، وہ ہمارے دوست قاضی اطہر صاحب کے نانا تھے)

☆ وہ صاحب زہد وورع تھے، علم کے بحر ذخار تھے، نیکی وسعادت کے جمال اور برائی کی سراپا تردید تھے۔

☆ انھیں بدوی طلاقت، شہری جگمگاہٹ اور عمدگی کی رونق حاصل تھی۔

☆ ہم نے عصر کی نماز وہیں کی مسجد میں پڑھی، اور ان بزرگ کے گھر کی زیارت کی۔
☆ یہ قبریں ایسے علمی و عملی کمالات کو سمیٹے ہوئے ہیں جن کے بیان سے زبانیں قاصر ہیں۔
☆ اللہ تعالیٰ ان پر بھی اور ہم پر بھی رحم فرمائے اور اپنے فضل عمیم سے سب کی مغفرت فرمائیں۔
☆ انھیں اور تمام مسلمانوں کو اپنے دین یسیر کے طفیل باغ فردوس میں جگہ عطا فرمائیں۔
☆ میرے اس بیان واقعہ سے قاضی اطہر صاحب کے خاندان کے امتیازات نمایاں ہیں۔
☆ رب کائنات انھیں انتہائی خوشحالی اور پھلتی پھولتی زندگانی عطا فرمائے۔
☆ پھر ہم ان سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جہاں سے چلے تھے وہیں یعنی اعظم گڈھ شہر لوٹ آئے۔

میری یاوہ گوئی سے درگذر فرمایئے اور دعا فرمایئے کہ بقیہ زندگی لاف زنی کے بجائے فکرِ آخرت میں گذرے۔ ابھی ایک بڑے سانحہ سے یوں دوچار ہوا کہ میری بیوی ۷/مارچ (۱۹۹۴ء) یعنی ۲۴/رمضان ۱۴۱۴ھ کو صبح ۹/بجے انتقال کرگئی، انا للہ وانا الیہ راجعون

۲۴/فروری کو اچانک بیہوش ہوگئی، آج کل کی زبان میں جس کو ''کوما'' میں چلا جانا کہتے ہیں، فوراً اسپتال میں داخل کیا اور انتہائی احتیاطی وارڈ I.T. میں رکھ کر تدبیریں کی گئیں جو لاحاصل رہیں اور مشیت ایزدی کے آگے سرخم کرنا ہی پڑا، بحمد اللہ علاج کی دوادوش بھی داووا عباد اللہ ''الحدیث'' کے تحت شروع کی تھی اور نتیجہ جو نکلا اس پر بھی انا للہ وانا الیہ راجعون ہی موجب سکون و تحمل ہے۔ آپ بھی رحمت و مغفرت کی دعا فردیں۔ عزیزان کو میں نے دانستہ اس کی اطلاع نہیں دی تھی اب جو آپ دعا فرمائیں گے تو وہ بھی آمین کہنے مین شریک ہوجائیں گے،

جملہ عزیزان و متعلقین کو علیٰ قدر مراتب سلام و دعا، اور مولانا ظفر مسعود اور حسان مسعود صاحبان کو خصوصی سلام و شکریہ۔

اپنی اور عزیزان کی خیریت و عافیت سے حسب موقع مطلع فرمائیں والسلام

ابو محفوظ الکریم معصومی

جمعہ ۱۷/ذوالقعدہ ۱۴۱۴ھ۔ ۲۹/اپریل ۱۹۹۴ء

1/33۔سی، ہرے کرشنا کونار روڈ کلکتہ۔700014

جناب اصغر مجاہد صاحب سکریٹری تنظیم فکر ونظر، سندھ، پاکستان لکھتے ہیں:

محترم حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید ہے کہ آپ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل وکرم سے ہر طرح بعافیت ہوں گے۔

حضرت قاضی صاحب! برصغیر پاک وہند کے سب اہلِ علم، اہل فکر ونظر، مؤرخ، محقق، آپ کے شکرگذار ہیں کہ آپ نے ''مسلمانوں کی عظمت رفتہ'' کو جس طریقے سے اجاگر کیا ہے کہ مسلمانوں کا تابناک وشاندار ماضی، چاند وسورج سے بھی زیادہ روشن نظر آ رہا ہے، دنیا کے چاند وسورج تو ابھرتے وڈوبتے ہیں گے، مگر آپ کا روشن کیا ہوا محققانہ سورج رہتی دنیا تک یونہی چمکتا دمکتا رہے گا، خشک وسوکھے ہوئے ذہنوں کو آبِ حیات کی طرح سیراب کرتا رہے گا۔ یہ علم وادب کی ایسی روشنی ہے جو کبھی بھی ماند نہیں ہوتی، آپ کا تاریخ انسانیت پر عموماً اور تاریخ اسلام پر خصوصاً بڑا احسان اور قرض ہے، جو اتارے نہیں اترتا۔ یہ قرض اس طرح اتر سکتا ہے کہ آپ کی سب کتب کا دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ کرا کے شائع کیا جائے، تاکہ مسلمانوں کی تاریخ عزیمت سے مُسلم تو کیا غیر مُسلم بھی باخبر ہو جائیں، بلا مبالغہ آپ تاریخ انسانیت اور تاریخ اسلام کے محسن ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطاء فرمائے۔ آمین!

آپ کی دو کتابیں سندھی میں ترجمہ ہو کر شائع ہوگئی، جو انشاء اللہ عنقریب آپ کی خدمت میں ارسال کی جائیں گی۔

پاکستان کے معروف اہل قلم ومصنف اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذکر وفکر کے داعی حضرت علامہ طالب ہاشمی صاحب کو صدر تنظیم جناب پروفیسر اسد اللہ بھٹو صاحب نے ان کی علمی ودینی خدمات کے پیش نظر آپ کی کتابوں کا سیٹ تحفتاً دیا، جنھیں پڑھ کر موصوف نے جناب بھٹو صاحب کے نام شکریہ کا خط لکھا ہے، اور فرمایا ہے کہ ''مجھے قاضی صاحب کی کتابوں سے اپنی زیر تالیف کتب کی تکمیل کیلئے بہت بڑا مواد ملا ہے'' (ہاشمی صاحب کے خط کی نقل پیش خدمت ہے)

علامہ ہاشمی صاحب نے آپ کی کتاب ''اسلامی ہند کی عظمت رفتہ'' کے حصول کیلئے

اشد ضرورت کا اظہار فرمایا ہے، اس خط کی روشنی میں ہم آپ کی خدمت عالیہ میں ادب واحترام سے عرض کرتے ہیں کہ آپ اپنی بلند پایہ کتاب ''اسلامی ہند کی عظمت رفتہ'' کی کچھ کاپیاں ارسال فرمائیں، ہم آپ کے ممنون ومشکور ہوں گے۔

آنجناب سے استدعاء ہے کہ ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اور ساتھ ہی میرا پُرخلوص سلام میرے پیارے بھائی اور دوست جناب حسان احمد صاحب تک پہونچائیں ،اللہ کرے آپ ہمیشہ خیر وعافیت سے ہوں۔ والسلام

آپ کا مخلص، احقر اصغر مجاہد

جوائنٹ سکریٹری تنظیم فکر ونظر سندھ (پاکستان)

محترم جناب طالب ہاشمی صاحب کے خط کا اقتباس پیش خدمت ہے:

جناب مخدوم ومعظم مجاہد اسلام پروفیسر صاحب! زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

لاہور میں آپ کی صحبت میں جو لمحات میسر آئے وہ ہمیشہ یادر ہیں گے۔

آپ نے مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کی تالیفات کی صورت میں جن گرانقدر ہدیوں سے نوازا، ان کیلئے صمیم قلب سے سپاس گذار ہوں۔ میرا احساس تشکر اور بھی بڑھ گیا جب ان بلند پایہ کتابوں کو اپنی زیر تالیف کتابوں کی تکمیل کیلئے نہایت کارآمد پایا، بخدا آپ کیلئے دل سے دعائیں نکلیں۔ یہ کتابیں اور دوسرا لٹریچر پڑھ کر معلوم ہوا کہ آپ جو مہتم بالشان ملی خدمات انجام دے رہے ہیں ان کی مثال نہیں ملتی،

علاوہ ازیں مجھے قاضی اطہر مبارکپوری صاحب کی کتاب ''اسلامی ہند کی عظمت رفتہ'' کی اشد ضرورت ہے، اگر یہ کتاب یا اس کی فوٹو اسٹیٹ مہیا فرماسکیں تو آپ کا احسان ہوگا، اس پر جو خرچ بھی آئے اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہوگی۔

ہماری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

والسلام مع الاکرام دعا گو، طالب ہاشمی غفرلہٗ

مولانا لقمان سلفی صاحب ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دارالافتاء۔الریاض　　ذوالمجد والکرم حضرت قاضی صاحب، مدظلہٗ

۵؍جون ۱۹۶۸ء　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے، میں بھی آپ کی دعاؤں سے بخیر ہوں۔

کل ''المنہل'' میں آپ کا خط عبدالقدوس انصاری صاحب کے نام پڑھا، بے حد خوشی ہوئی، انھوں نے آپ کو بھی عدد مذکور کا ایک نسخہ بھیجا ہے، امید ہے کہ مل گیا ہوگا۔

آپ کی تحقیقی کتابیں اصحاب علم ودانش کیلئے خزینہ کی حیثیت رکھتی ہیں، امید ہے کہ آپ کی کتاب ''العقد الثمین'' جلد زیور طباعت سے آراستہ ہوکر آجائے گی، میں اپنے کو خوش قسمت سمجھوں گا اور میرے احساس کی رفعت کا باعث ہوگا اگر ایک نسخہ سے مجھے بھی نوازا جائے۔

میری تو رائے ہے کہ آپ مملکت سعودیہ کے مجلوں اور جرائد میں گاہے گاہے اپنے مضامین ضرور بھیجتے رہیں، علمی حلقوں میں اچھا اثر پیدا کریں گے، اب آہستہ آہستہ یہ علم کی قدر پہچاننے لگے ہیں۔

کل بھائی خالد کمال کا خط آیا تھا، خیریت سے ہیں، اور مجھ سے ناراض ہیں کہ میں نے تعاقد کے بعد فوراً ہی خط کیوں نہ لکھا، میں نے ان کو خط لکھ دیا ہے، اور معذرت کی ہے، ان کی چھٹی ۸؍ربیع الثانی سے شروع ہوگی، انکے کام سے نائب مفتی خوش ہیں، خدا مزید کی توفیق دے،

میں دارالافتاء میں مستقل ہوگیا ہوں، یہ خدا کا کرم ہے، اب کوئی قانونی پریشانی باقی نہیں رہی ہے، امید ہے کہ جواب سے ضرور نوازیں گے، میں آپ کو اپنا بزرگ اور نہایت مخلص بزرگ مانتا ہوں، آپ کی علمی گیرائی کے ساتھ بے حد سادگی اور تقویٰ مجھے ہمیشہ دعوت فکر وعمل دیتے رہتے ہیں۔ جناب قمر صاحب اور دیگر پُرسانِ حال کو سلام کہیں

، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ　　طالب دعا

محمد لقمان سلفی

قاضی صاحب کے نام ایک تعزیتی مکتوب

محترم المقام جناب الحاج مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری السلام علیکم

ایک خط روانہ کر دیا ہوں، ملا ہوگا، ابھی ابھی مبارکپور سے حاجی ظفر مسعود سلمہٗ کا خط ملا جس سے معلوم کر کے بیحد افسوس ہوا کہ آپ کے والد محترم کا (۱) انتقال ہو گیا، مرحوم کا ایسے وقت جدا ہو جانا جب کہ آپ نہ صرف وطن بلکہ ملک سے ہزاروں میل دور ہیں۔ ظاہر ہے آپ کے لئے زبردست اور نا قابل برداشت المیہ ہے مگر مرضئ مولیٰ کے آگے ہر انسان مجبور ہے۔ آپ اور خالد کمال سلمہٗ صبر کیجئے۔ میں بحیثیت ایک دیرینہ رفیق اور قریبی دوست اور اگر کہوں تو سب سے زیادہ مخلص ہونے کے ناطے اس حادثہ پر بے حد غم زدہ ہوں آپ سب لوگوں کو صبر جمیل کے لئے تلقین کرتا ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین منزل عنایت فرمائے، آمین!

ظفر مسعود سلمہٗ کے خط کا ایک روشن پہلو بڑا ہی خوش کن رہا کہ جب والد مرحوم کی قبر کی کھدائی آپ کی والدہ مرحومہ (۲) (جن کو انتقال فرمائے ہوئے ۴۴ سال گزر رہے ہیں) کے پہلو میں ہو رہی تھیں تو ایک سوراخ نظر آیا، کفن تو کالا ہو چکا تھا مگر پھٹا نہیں تھا، اور والدہ کی نعش مبارک بالکل صحیح وسالم حالت میں پائی گئی، اس سے ان کے عذاب قبر سے محفوظ رہنے اور جنتی ہونے کی دنیا ہی میں سب لوگوں کو بشارت ہو گئی، اور لوگ جوق در جوق اس منظر کو دیکھنے کے لئے جمع ہونے لگے، اس سے آپ کے گھر والوں نے غم واندوہ کے ساتھ ساتھ خوشی ومسرت کے آنسو بھی بہائے، اس لئے آپ کی تربیت دینے والی اس جنتی ماں کے دنیا میں ہی ثبوت پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں، جن کے نیک اور......خون کی آمیزش آپ کے ایک ایک قطرہ خون میں گردش کر رہی ہے، اور جن کی دعاؤں کے طفیل آپ کو تمام ممالک اسلامیہ میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہو رہی ہے، خدا آپ کی ساری خدمات دینیہ کو قبول فرمائے اور پھر مکرر طور پر میری جانب سے میرے ساتھیوں اور رفقاء کار کی جانب سے آپ کو صبر کی تلقین ہے، کمال حبیب الرحمٰن، انیس الرحمٰن، صلاح الدین اور عرفان سلام کہتے ہیں، مولوی خالد کمال کو بھی سب کا سلام قبول ہو، والسلام

قمر (مولانا عبید الرحمٰن صاحب قمر) مبارکپوری بمبئی۔ ۴؍مارچ ۱۹۷۸ء

(۱) میاں جی محمد حسن، متوفی ۲۸؍فروری ۱۹۷۸ء

(۲) حمیدہ بنت حضرت مولانا حکیم احمد حسین صاحب، (متوفیہ ۲۲؍ذی قعدی ۱۳۵۲ھ)

مورخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ

ڈاکٹر محمد الیاس صاحب اعظمی، رفیق اعزازی دارالمصنفین اعظم گڈھ

عزت وشہرت، نام ونمود اور صلہ وستائش سے بے پرواہ ہو کر جن لوگوں نے علم وادب اور تاریخ وتہذیب کی خدمات انجام دیں، ان میں ایک بہت نمایاں نام مورخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوری (۱۹۱۶-۱۹۹۶ء)ؒ کا بھی ہے، نا مساعد حالات سے نبرد آزما ہونا اور پھر کامیابی سے ہمکنار ہونا قاضی صاحب کی کتاب زندگی کا سب سے تابناک باب ہے۔

قاضی صاحب نے معلم، مورخ، مصنف اور صحافی کی حیثیت سے انتہائی فعال زندگی گزاری اور علم وادب اور خاص طور سے تاریخ کے میدان میں جو کچھ کر دکھایا اسے معجزے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

قاضی صاحب ۷/ مئی ۱۹۱۶ء کو ضلع اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ مبارک پور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم محلّہ کے مکتب میں حاصل کی، پھر مبارک پور کی مشہور درسگاہ احیاء العلوم میں داخل ہوئے، فراغت کے بعد دورہ حدیث کے لیے مدرسہ شاہی مراد آباد کا رخ کیا اور تکمیل کی، احیاء العلوم میں مولانا مفتی یٰسین صاحب مبارکپوری اور مولانا شکر اللہ مبارک پوری سے خاص طور سے فیض یاب ہوئے۔ تدریسی زندگی کا آغاز مدرسہ احیاء العلوم کی مدرسی سے ہوا، ترک ملازمت کے بعد وہ ملک کے متعدد اخبارات ورسائل میں کام کرتے ہوئے بمبئی پہونچے اور روزنامہ انقلاب سے وابستہ ہوگئے اور پھر پوری زندگی وہیں گذاردی بلکہ ایک کمرے میں گذاردی، عروس البلاد علم کش شہر قرار دیا جاتا ہے لیکن اسی شہر میں قاضی صاحب نے سب سے الگ دوکان کھولی، اور ایک گوشے میں بیٹھ کر بڑے بڑے علمی کارنامے انجام دئے، جس کے ذکر کے بغیر ہماری تہذیبی تاریخ مکمل نہ ہو سکے گی۔

قاضی صاحب کو اردو کے ساتھ عربی و فارسی پر ماہرانہ دستگاہ حاصل تھی، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان زبانوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا، اردو ہی کی طرح انہیں عربی لکھنے پر بھی قدرت حاصل تھی جیسا کہ ان کی عربی تصنیفات رجال السند والہند، عقد الثمین اور الہند فی العہد العباسین سے اندازہ ہوتا ہے۔

قاضی صاحب کو لکھنے پڑھنے اور تصنیف وتالیف کا شوق دور طالب علمی ہی سے تھا چنانچہ اس شوق میں ہمیشہ اضافہ ہی ہوتا گیا، ایام طالب علمی میں جو قلم ان کے ہاتھ میں آیا وہ ان کے موت کے ساتھ ہی کے ساتھ چھوٹا ان کی علمی و تعلیمی اور تاریخی تصنیفات کی تعداد دو درجن سے زیادہ ہے، انقلاب، معارف اور برہان میں شایع شدہ علمی و تحقیقی مقالات کی تعداد بھی سو سے کم نہ ہوگی، اس قدر بلند رتبہ تحقیقاتی کام انجمن اور ادارے انجام دیتے ہیں، کسی فرد واحد کا یہ کام نہیں تاہم قاضی صاحب نے تن تنہا وہ کارنامے انجام دیے، اس سے ان کی خدمات کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قاضی صاحب کے علمی کارناموں میں بڑا تنوع ہے لیکن ان کے دو کام علم وادب کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رکھیں گے، عرب و ہند کے تعلقات اور خطہ پورب کی علمی و تعلیمی تاریخ کی تدوین ان کے دو بڑے عظیم الشان کارنامے ہیں ان دونوں موضوعات کا ابتدائی خاکہ علامہ سید سلیمان ندوی نے بنایا تھا، ان کی مشہور کتاب عرب و ہند کے تعلقات جو اپنے موضوع پر پہلی کاوش تھی اور حیات شبلی میں خطہ پورب کی اجمالی تاریخ لکھ کر انہوں نے ان موضوعات پر لکھنے کا آغاز کیا، قاضی صاحب کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے ان کو مستقل موضوع تحقیق قرار دیا اور ایک عرصہ تک بلکہ مدۃ العمر ان دونوں موضوعات کے مطالعہ و تحقیق میں مصروف رہے اور اس کے نئے نئے گوشے اور پہلو تلاش کرتے رہے۔

پہلے موضوع پر انہوں نے مندرجہ ذیل کتابیں سپرد قلم کیں۔

[۱] عرب و ہند عہد رسالت میں [۲] ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں [۳] خلافت راشدہ اور ہندوستان [۴] خلافت عباسیہ اور ہندوستان [۵] بنو امیہ اور ہندوستان، وغیرہ۔

عربوں کے ہندوستان سے روابط کی مفصل تاریخ قاضی صاحب کا بڑا تاریخی کارنامہ ہے،

اس موضوع پر اس سے قبل اردو کیا غالباً عربی میں بھی اس قدر مبسوط اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ کوئی کاوش منظر عام پر نہیں آئی تھی، قاضی صاحب نے ایک ایک پہلو اور ایک ایک گوشے کی وضاحت کے لیے سیکڑوں کتابوں کا مطالعہ کیا اور پھر انہیں تصنیف کا جامہ پہنایا، پتہ ماری اور جاں کاہی کا یہ کام ہر کہہ ومہ کے بس کی بات نہیں، ان کی اہمیت کا صحیح اندازہ ان کتابوں کے مطالعہ ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔

دوسرے موضوع پر انہوں نے مندرجہ ذیل کتابیں قلم بند کیں۔

[ا] دیار پورب میں علم اور علماء [۲] تذکرہ علمائے مبارک پور۔

خطہ پورب کی تاریخ پردہ خفا میں رہ جاتی اگر قاضی صاحب نے اسے مستقل موضوع بنا کر اپنی تمام تر توانائی اس میں صرف نہ کی ہوتی۔

دیار پورب کسی زمانہ میں شیراز اور یونان سے کم نہ تھا تاہم گردش ایام کے گرد وغبار نے اس کے روشن ماضی کی تاریخ دھندلا دی تھی، قاضی صاحب نے دیار پورب میں علم اور علماء لکھ کر اس کی عظمت رفتہ کی نشاندہی کی اس سے پہلی بار اندازہ ہوا کہ خطہ پورب علم وادب کا کیسا لہلہاتا چمن تھا جسے خزاں کی گرم ہواؤں نے اجاڑ دیا۔

مبارک پور اور اس کا اطراف کیسے کیسے اہل علم و دانش اور ارباب فضل وکمال کا مرکز تھا اور انہوں نے علم وفن میں کیسے کیسے گراں قدر کارنامے انجام دئے اور ان کی بدولت ہندوستان میں مسلمانوں کے عزت و وقار میں کس قدر اضافہ ہوا یہ تمام باتیں پردہ خفا میں تھیں اللہ تعالیٰ قاضی صاحب کی قبر کو نور سے بھر دے کہ انہوں نے انتہائی محنت اور جاں کاہی سے اس خطہ کے خدوخال نہ صرف واضح کیے بلکہ اس کے روشن اور تابندہ نقوش کی پوری جھلک دکھا دی۔

تیسرا اہم موضوع قاضی صاحب کی تصنیفات کا تعلیمی ہے، تعلیم وتربیت سے انہیں بڑی دلچسپی تھی چنانچہ اس موضوع پر مقالات کے علاوہ ایک اہم کتاب خیر القرون کی درسگاہیں لکھ کر طالبان علم وفن میں مہمیز پیدا کرنے کی کوشش کی، انہوں نے اپنی خودنوشت قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک بھی اسی مقصد کے پیش نظر قلم بند کی، خودنوشت کا دوسرا حصہ کاروان حیات بھی دراصل اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اصلاً ان کی زندگی تعلیم وتعلم میں گذری، جس میں طلبہ کے لیے بڑا درس وعبرت کا

سامان ہے، ان کی کتاب ''تبلیغی تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں'' بھی اسی سلسلہ کی ایک کاوش ہے لیکن اس سلسلہ کی سب سے اہم کاوش ان کی معرکہ آرا کتاب ''ہر پیشہ اور ہر طبقہ میں علم وعلماء'' ہے، اس میں انہوں نے تاریخ ورجال کی صدہا کتابوں سے مختلف علوم وفنون اور مختلف پیشہ وطبقہ کے اہل علم اوران کے علمی کمالات کے حالات وواقعات جمع کیے ہیں عبرت ونصیحت اور سبق آموز واقعات کے اس مستند مرقع سے ثابت ہوتا ہے کہ علم وفن پر کسی کی اجارہ داری نہیں اور ہر شخص اس سے فیضیاب ہوکر علم وفضل کے بلند مقام پر پہونچ سکتا ہے۔

قاضی صاحب کی تصنیفات کا ایک اہم موضوع معاشرتی اصلاح اور مسلم معاشرے میں پھیلی کج رویوں کی نشاندہی اور اصلاح تھا چنانچہ ان کی کتاب اسلامی شادی، اسلامی نظام زندگی اور مسلمان، افادات حسن بصری وغیرہ کے ذریعہ قاضی صاحب نے معاشرتی اصلاح کا فریضہ انجام دیا، بلاشائبہ مبالغہ ان کی یہ کتابیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے بہترین کتابیں ہیں۔

خواتین اسلام کے عظیم الشان کارنامے ہماری تاریخ کے زریں اوراق میں ہمیشہ کے لیے ثبت ہیں مگر ہمارا موجودہ منظر نامہ کچھ بہتر نہیں اس لیے قاضی صاحب مسلمان خواتین کو علم سے آراستہ دیکھنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب ''خواتین اسلام کی علمی ودینی خدمات'' لکھ کر یہ کوشش کی کہ ہماری خواتین اپنے شاندار ماضی سے سبق لیں اور اپنی زندگیوں میں انقلاب برپا کریں، اس سلسلہ کی ان کی ایک اور کاوش ''الصالحات'' بھی ہے۔

ان موضوعات کے علاوہ متعدد دوسرے موضوعات پر بھی قاضی صاحب نے قلم اٹھایا اور ثابت کردیا کہ وہ کسی بھی موضوع پر قلم برداشتہ لکھ سکتے ہیں۔

معارف القرآن اور تدوین سیر ومغازی ان کی بلند پایا کاوشیں ہیں خاص طور سے تاریخ تدوین سیر ومغازی ان کی ایک اہم کتاب ہے، اس موضوع پر اردو میں ایک بڑا ذخیرہ ہے لیکن قاضی صاحب کی کتاب اس میں ایک اہم اضافہ کا درجہ رکھتی ہے۔

قاضی صاحب کی ایک اور کاوش علی وحسین ہے جو دراصل ایک کتاب کی تاریخی غلطیوں کی نشاندہی پر مشتمل ہے، انہوں نے حجاج کے لیے بھی بعض کتابیں اور کتابچے سپرد قلم کیے۔ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ان کی تمام کاوشوں کا بنیادی مقصد عظمت رفتہ کی بازیافت اور اپنے شاندار ماضی کی جستجو

ہے، ان کی ایک کتاب اسلامی ہند کی عظمت رفتہ سے بھی ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، بلکہ ان کی تمام تصنیفات اسی خیال ونظریہ کی مظہر ہیں۔

قاضی صاحب اقلیم سخن کے بھی تاجدار تھے مگر ان کی سخن سنجی محض تفنن طبع کے لیے تھی یہی وجہ ہے کہ مدۃ العمر سخن سنجی کے باوجود ان کا کلام بہت مختصر ہے، ان کا شعری مجموعہ ''مئے طہور'' جناب قمر الزماں صاحب مبارک پوری کے مفصل اور مبسوط مقدمہ کے ساتھ شایع ہوگیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کی شاعری فی الواقع بڑی اہمیت کی حامل تھی۔

قاضی صاحب نے حمد ونعت کے علاوہ غزلیں اور نظمیں بھی کہی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اچھی شاعری کی ہے، ان کی نظموں سے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

شعور دل سے طوفان بصیرت پھوٹ جاتا ہے ۔۔۔ بصارت کا تعلق اب نظر سے ٹوٹ جاتا ہے
گذر جاتی ہیں میری حسرتیں یاس وتمنا میں ۔۔۔ تیمیوں کا مقدر جس طرح سے پھوٹ جاتا ہے
سنا دیتا ہوں دل کی آپ بیتی پھر بھی دانستہ ۔۔۔ بسا اوقات عنوان فسانہ چھوٹ جاتا ہے
فسانہ بن رہی ہے اب تو محفل میں فدا کاری ۔۔۔ وفا کی سرد پڑتی جا رہی ہے گرم بازاری
ہے باقی وصل کی خواہش نہ فرقت کی جنوں کاری ۔۔۔ جنوں کی الفت سے ہوئی جاتی ہے بیزاری
شکایت ہائے رنگیں کہہ تو دوں لیکن ہے ڈر اطہر ۔۔۔ کہ ہو جائے نہ انکی طبع نازک پر گراں باری

ایک غزل کے چند اشعار یہ ہیں۔

سرور وکیف سے آہ وفغاں تک بات جاپہونچی ۔۔۔ پہونچنا تھا کہاں لیکن کہاں تک بات جاپہونچی
نہ کہتا تھا نہ چھیڑو میرے اشکوں کو، برا ہوگا ۔۔۔ اگر قطرے سے بحر بیکراں تک بات جاپہونچی
سکوت اطہر کیا ہم نے بہت آغاز الفت میں ۔۔۔ مگر انجام میں شرح ونہاں تک بات جاپہونچی

قاضی صاحب کی شاعری میں کیف وسرو اور جگر خراش سرمستیاں بھی ہیں تاہم ان کی شاعری میں ان کا زور علم بھی شامل ہے، قدیم انداز کی شاعری کے دلدادگان کے لیے یقیناً لطف ولذت کا سامان موجود ہے۔

قاضی صاحب کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ان کی سرگرمیوں کا دائرہ مبارک پور سے لاہور تک اور امرت سر سے بمبئی تک ملک کے مختلف حصوں اور علاقوں میں پھیلا، وہ جہاں رہے سرگرم

رہے، مدرسے قائم کیے، رسالوں کا اجرا کیا، اورتصنیف وتالیف کا مشغلہ ہر جگہ جاری وساری رہا لیکن عروس البلاد خاص ان کی سرگرمیوں کا مرکز رہا اور وہاں انہوں نے ایک کمرے میں چٹائی پر بیٹھ کر وہ کام انجام دئے جو بڑے بڑے ادارے انجام دیتے ہیں۔

ان کے کارناموں سے بڑھ کر ان کی شخصیت تھی جس میں بلا کی جاذبیت اور کشش تھی، وہ بڑے خاکسار، وضع دار اور انکسار پسند تھے، ان میں علم وفضل کا پندار نہ تھا، انتہائی سادہ زندگی بسر کی، وہ خلوص وشرافت کے مجسم پیکر تھے یہی وجہ ہے تھی کہ ہر شخص ان کا گرویدہ اور والہ وشیدا تھا، وہ ہر طبقہ میں یکساں مقبول تھے، عموماً لوگ اہل علم سے شاکی رہتے ہیں لیکن قاضی صاحب پر ہر شخص فریفتہ رہتا اور ہر فرد ان کے علم وفضل کے ساتھ ان کی نیکی، شرافت، مروت، بے نفسی، وسیع القلبی کا قائل تھا، وہ ہر شخص سے ٹوٹ کر ملتے، لوگوں کے کام آنا اور ان کے دکھ درد میں شریک ہونا ان کا شیوہ تھا حالانکہ علم وفضل کے وہ بلند مقام پر فائز اور انتہائی مصروف رہتے تھے۔

وہ طبقہ علماء میں جس قدر محبت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے دانشوروں میں بھی وہ اسی درجہ مقبول تھے، اہل علم سے علمی، عوام سے عوامی اور طلبہ سے تعلیمی گفتگو کرتے اور ہر شخص کے ذہن ومزاج کا خیال رکھتے، بڑوں کے ساتھ خوردوں سے بھی محبت سے پیش آتے، ان کی حوصلہ افزائی کرتے، مفید مشورے دیتے، راقم سے بھی محبت کا معاملہ کرتے، جب جب ان سے ملا نیا عزم وحوصلہ ملا، ایک مرتبہ پوچھا کہ آج کل کیا کر رہے ہو، میں نے بتایا کہ مولانا فراہی پر ایک مضمون نئی دنیا میں لکھا ہے، فرمایا اخبارات میں نہ لکھو، سب ضایع ہو جاتا ہے، یہ برسوں کا تجربہ ہے۔

۱۴ر جولائی ۱۹۹۶ء میں ان کا انتقال ہوا تو راقم سطور سفر میں تھا، افسوس کہ ایک مٹھی مٹی بھی نہ دے سکا، جس کا قلق اب تا زندگی رہے گا، اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے۔

☆☆☆☆☆

وہ یاد آئے بہت

مولانا قاضی ابوالمعالی اطہر مبارکپوریؒ

☆۔۔۔افسوس کہ تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

مولانا محمد نعیم صاحب صدیقی

بلا شبہ قاضی اطہر مبارکپوریؒ کا شمار اُردو زبان کے اُن مظلوم اہل قلم میں ہوتا ہے، جنھوں نے کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے ہماری زبان کو نہایت وقیع اور بیش قیمت لعل و گہر سے مالا مال کیا اور اُس کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے ہم چشمی کے لائق بنایا ہے، لیکن بایں ہمہ اُردو کی ادبی تاریخ کا یہ کتنا عظیم المیہ ہے کہ مرحوم قاضی صاحبؒ جیسے بکثرت اہل قلم جو ہر صلہ وستائش کی تمنا سے بے پرواہ مدۃ العمر خدمتِ لوح وقلم میں مصروف رہے، واا سفا! کہ وہ بیسویں صدی میں نام نہاد ترقی پسندی اور روایت شکنی کی تحریک کے نام پر ادبی تحزب پسندی اور گروہی عصبیت کی بھینٹ چڑھ کر رہ گئے، اور تاریخ ادبیاتِ اُردو میں اُن کو صف اوّل میں تو کجا دوسری تیسری صف کا بھی مستحق قرار نہیں دیا گیا، واقعہ یہ ہے کہ اس عبوری دور میں جن ادیبوں کو حزبی وابستگی اور گروہی سرپرستی حاصل رہی، اُن کی خام اور برائے نام تخلیقات کو بھی حزبی وسائل ابلاغ نے اوج شہرت عطا کر دیا،، بصد افسوس ایسے مظلومینِ ادب کی نام شماری ایک طویل فہرست کی طالب ہے، جس میں سیّد سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی،، عبدالسلام ندوی،، شاہ معین الدین،، حسن نظامی،، سیّد صباح الدین،، ابوالحسن علی ندوی،، راشد الخیری،، ملاّ واحدی،، حکیم سیّد عبدالحی،، حسرت موہانی،، اور حبیب الرحمٰن شروانی وغیرہم جیسے اساطین علم وفن کے نام شامل ہیں، اور اب ان بدنصیب ادیبوں میں ایک اور اہم نام قاضی اطہر مبارکپوری کا بھی اضافہ کرلیں **.والی اللہ المشتکی۔**

قاضی اطہر مبارکپوری بلا مبالغہ تبحر علمی، وسعتِ مطالعہ اور تحقیق وتدقیق کا ''ٹائی ٹینک'' تھے

جو اہل نظر اس دیو پیکر بحری جہاز کے تاریخی پس منظر سے واقف ہیں، وہ اس برمحل تشبیہ سے قاضی صاحب کے علمی جلالت شان کا کما حقہ اندازہ لگا سکتے ہیں، لیکن بایں ہمہ مرحوم تواضع وفروتنی اور سادگی وبے نفسی کا ایک بے مثل مرقع تھے، عاجز راقم سطور نے اپنے طویل عرصہ حیات میں انکساری وخودشکنی کی ہمالیہ قامت بکثرت شخصیتوں کی دید سے اپنی آنکھیں روشن کی ہیں، مگر قاضی صاحبؒ تو اس خصوص میں شائد صحابی رسول ﷺ سیّدنا ابوذرغفاریؓ سے بھی کچھ سوا تھے، جن کی شہرت بقول روح الامین ''اپنی کثرتِ تواضع کے باعث خلقتِ ارضی سے زیادہ مخلوق افلاک میں تھی''، مرحوم سے راقم کے ترابط وتواصل کی عمر نصف صدی سے زیادہ مدت پر محیط رہی، میں نے اس طویل عرصہ میں اُن کی کتاب زندگی کے روشن اوراق کو سفر وحضر دونوں میں خوب اچھی طرح پلٹا اور پرکھا ہے، اور اب پورے شرح صدر کے ساتھ لوجہ اللہ شہادتِ عدل دے سکتا ہوں کہ مرحوم علمی فضل وکمال کے ساتھ کردار واخلاق کی معراج تھے۔

یہاں آگے بڑھنے سے قبل ایک یادگار واقعہ کا ذکر غالبًا بے محل نہ ہوگا، گزشتہ صدی کی چھٹی دہائی کے اواخر میں اہالیان مبارکپور نے اپنے خطہ ارضی کے نیر اعظم قاضی صاحب مرحوم کی عظمتِ علمی کے اعتراف میں ایک نہایت پُر شوکت جشن کا اہتمام کیا تھا، جس میں شرکت کے لئے دارالمصنفین سے مرحومی مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور جوانمرگ دوست مولوی منصور نعمانی ندوی کی معیت میں راقمِ سطور بھی مرحوم قاضی صاحب کے دولت کدہ پر حاضر ہوا تھا، مرورزمن کے باوجود پیرانہ سال عاجز کو بخوبی یاد ہے کہ ہم لوگوں پر نظر پڑتے ہی مرحوم کی مسرت وشادمانی قابلِ دید تھی۔

غرض شب میں ہم تینوں وقتِ مقررہ پر قصبہ سے باہر جلسہ گاہ پہونچے تو وہاں شوکت وبہجت کا ایک عجیب سماں نظر افروز ہوا عقیدت کیشان مبارکپور نے فصل کٹے ایک وسیع وعریض خطہ ارض کو روشنیوں کا شہر بنا رکھا تھا، مرصع وسیع اسٹیج پر ملک بھر کے مدعوئین دانشورانِ ادب کی کہکشاں بکھری ہوئی تھی، اور اُس میں قاضی صاحبؒ ایک روشن کوکبِ تاباں بنے شہ نشیں تھے، آغاز جلسہ میں تلاوتِ قرآن اور معمول کی رسمیات (سپاس نامہ اوراستقبالیہ) کے بعد رات دیر گئے تک مقالات خوانی اور تقاریر کا دور چلا، خریدارانِ یوسف کی فہرست میں اپنا نام شامل کرانے کے لیے عاجز راقمِ سطور نے بھی ''قاضی اطہر مبارکپوری میری نظر میں'' کے عنوان سے ایک مختصر تحریر پڑھی، ملحوظ رہے کہ

وہ میرے آغاز شباب (۲۴ر سال کی عمر) کا زمانہ تھا، نئے نئے رفیق دارالمصنفین کی حیثیت سے حضرت شاہ صاحبؒ (شاہ معین الدین احمد ندوی) ابھی مجھ کو قلم پکڑ کر چلنا سکھا رہے تھے، لیکن قاضی صاحب سے میری غیر معمولی عقیدت کیشی اور اخلاص ومحبت نے بحمداللہ اس طالب علمانہ تحریر کو حسن قبول سے نوازا، اور وہ بعد میں ماہنامہ ''ضیاءالاسلام'' کے ضخیم ''قاضی اطہر نمبر'' میں شمولیت کی مستحق قرار پائی۔

قاضی اطہر مبارکپوری کے سراپا میں کشش کے بہت سے پہلو پنہاں تھے، میانہ قد،، سانولی سی رنگت،، معمولی سفید گزی گاڑھے کا کرتا پاجامہ،، سر پر کشتی نما ٹوپی،، کرتے کے اوپر زیادہ تر صدری اور کبھی کھلے بٹن کی شروانی،، کندھے پر ایک تولیہ (فرماتے یہ متعدد الاغراض ہوتا ہے)،، آنکھوں پر سنہری کمانی کا موٹے شیشوں کا چشمہ (آخر میں ضعف بصارت کے باعث کتابیں آنکھوں سے تقریباً لگا کر پڑھا کرتے تھے)،، ہاتھ میں پلاسٹک اور کبھی کپڑے کا ایک تھیلا، جس میں سفری کتابیں اور کاغذات بھرے رہتے،، بہتیرا عرض کیا کہ حضرت! ایک اچھا سا ہینڈ بیگ لے لیجیے، جواب میں بڑی شانِ استغناء کے ساتھ جھولے کی فوائد شماری پر ایسا لکچر دیتے کہ ہم لوگ چپ ہوجانے ہی میں عافیت سمجھتے،، رفتار میں لپک،، گفتار میں دریائی لہروں کا سکون،، اردو اور بھوجپوری کے امتزاج سے مجلس میں سماں پیدا کر دیا کر دیتے،، ہمہ وقت بیش قیمت علمی معلومات کا خزانہ یوں لٹاتے رہتے گویا بلند آبشار سے گرتا پانی ماحول میں نغمگی پیدا کر رہا ہو، **فرحمہ اللّٰہ رحمةً واسعةً۔**

مرحوم قاضی صاحبؒ کی سیرت وکردار کا اگر فنی تجزیہ کیا جائے تو سادگی وقناعت،، استغناء و بے نفسی،، عالی ظرفی ووسعتِ قلبی،، تواضع وانکسار،، خوش طبعی و بے تکلفی،، راست بازی وحق پژوہی،، اور خورد نوازی وذرہ افزائی اُس کے چند روشن عنوانات ہوں گے، وہ شہرت وخودنمائی سے نفور،، نفاق وتضاد سے دور،، مصلحت پسندی وظاہر داری سے بیزار،، ہر تکلف وتصنع سے عاری،، اور خود پسندی ونام ونمود کے شدید مخالف تھے، وہ ساری عمر گوشہ خمول میں گم ہو کر بحر تحقیق کی غواصی کرتے رہے، راقم نے زندگی میں تعلقات کے احترام میں مرحوم کا مثل نہیں دیکھا، وہ رہتی عمر غالب کے الفاظ میں: ''وفاداری بشرط استواری اصل ایمان'' پر عمل پیرا رہے، لاریب انکساری وفروتنی اُنکی

سرشت اور وضعداری ومحبت اُن کی طبیعت کا جزو لاینفک تھی، وہ ساری زندگی محبتیں بانٹنے اور نفرتیں مٹانے کا وظیفہ ادا کرتے رہے، مرحوم کا لباس،، غذا،، انداز تکلم،، اور طرز معیشت سب کچھ سادگی کی مجسم تصویر تھا، یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ اُن کی روکھی پھیکی اور کفایت شعارانہ زندگی اختیاری تھی، اضطراری نہ تھی،، بمبئی نگری کی چکا چوند دنیا ہمیشہ اُن کے پیچھے دوڑتی رہی اور وہ اُس کو پایہ حقارت سے ٹھکراتے چلے گئے، غرض کیا کیا اور کہاں تک مرحوم کی شمائل شماری سے نوکِ خامہ کہ عطر بیز کروں۔

ظاہر ہے ہم دونوں کی عمروں میں زمین آسمان کا تفاوت تھا، بلاشبہ وہ میرے اساتذہ وشیوخ کی صف کے بزرگ تھے، مزید برآں اُن کے کئی صاحبزادگان مجھ سے عمر میں کافی بڑے تھے، لیکن بایں ہمہ مرحوم نے اپنی خورد نوازی، بے پایاں شفقت ومحبت اور بے تکلفانہ انداز گفتگو سے ہمارے درمیان عمر وعلم کے سارے امتیاز وتفریق کو یکسر مٹا کر رکھدیا تھا، یہاں تک کہ بعض اوقات (بصد افسوس) میں اُن کے مستحق ادب واحترام کے دائرہ سے باہر بھی نکل جاتا، مگر وہ بدستور مسکراتے رہتے، اسی لیے کبھی کبھی میرے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا کہ قاضی صاحبؒ کے اخلاق وکردار کا پلّہ بھاری ہے یا اُن کے علمی وتصنیفی فضل وکمال کا ہائے! خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہوگئیں۔

اس وقت مرحوم قاضی صاحب کے حسنِ اخلاق وکردار اور متنوع کرم فرمائیوں کے متعدد واقعات راقمِ سطور کے دریچۂ دماغ کو روشن کررہے ہیں، ۱۹۷۲ء میں میرے والدین حج بیت اللہ سے واپس آرہے تھے، میرے دل میں ممبئی جا کر اُن کا استقبال کرنے کی طبعی خواہش تھی، مگر وہ میری غایت درجہ تنگی وافلاس کا دور تھا، دارالمصنفین میں میری تنخواہ صرف دوسو (۲۰۰) روپے ماہانہ تھی، بہرحال سیّد صباح الدین مرحوم کی عنایت سے مصارف سفر کے لیے ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی مل گئی، خیال تھا کہ ممبئی کے صابو صدیق مسافر خانہ میں قیام کر کے روکھا سوکھا کھالوں گا، اسی دوران حسن اتفاق سے ایک دن قاضی صاحب مرحوم کتب خانہ دارالمصنفین تشریف لائے، (وطن میں دوران قیام اکثر آتے ہی رہا کرتے تھے) میں نے باتوں باتوں میں اُن کو یہ بات بھی بتائی، تو ہائے! مرحوم نے بلا کسی تذبذب وتاخیر کے ممبئی میں اپنی قیام گاہ کی چابی میرے حوالہ کردی اور محمد علی روڈ کی جامع

مسجد کے قریب واقع اُس کا تفصیلی پتہ بھی بتادیا، اور واقعہ یہ ہے کہ میں اُس گوشہ خیر وبرکت میں ایک ہفتہ بڑے سکون وراحت کے ساتھ مقیم رہا، یا اللہ! یہ زمین شرافت ومروّت اور خورد نوازی کے کیسے کیسے آسمانوں کو کھا چکی ہے۔

مبارکپور میں قاضی صاحب مرحوم کا ذاتی کتب خانہ بلا مبالغہ ہزاروں منتخب کتابوں (عربی زیادہ اردو کم) پر مشتمل تھا، اُن کے دولت کدہ کی بیٹھک (باہری کمرہ) میں چاروں طرف شیشہ کی خوبصورت الماریوں میں کتابیں بڑے سلیقہ سے سجی ہوئی تھیں، فرمایا کرتے کہ: ''جگہ کی تنگی کے باعث ان سے بھی زیادہ کتابوں کا ذخیرہ کارٹن میں بند گھر کے اندر پٹنی (مچان) پر رکھا ہوا ہے''۔ مرحوم کو عمدہ عربی کتابوں کی خریداری ومطالعہ کا بے انتہا شوق تھا، اس خصوص میں وہ بعض بڑے دلچسپ واقعات بیان کیا کرتے تھے، قوتِ یادداشت کا یہ عالم تھا کہ اُن کو ہر کتاب کا ذریعہ حصول از بر تھا، یعنی یہ کتاب کس نے اور کب ہدیہ دی ہے، یا اُس کو کب اور کہاں سے خریدا ہے ؟، اس خصوص میں مرحوم کی خوش ذوقی کا یہ عالم تھا کہ اُنھوں نے حفاظت کے پیش نظر ہر کتاب پر مضبوط بانسی کاغذ کا کور چڑھا رکھا تھا، وہ اپنی ذاتی لائبریری کی کتابیں کسی کو عاریۃً شاذ ہی دیتے تھے، مگر عاجز یہاں بچشم پُرنم اپنی اس سعادت کا ذکر کرتا ہے کہ مرحوم استثنائی طور پر مجھکو بڑی فراخدلی کے ساتھ مطلوب کتاب دے دیا کرتے تھے، اس طرح میں اُن کے ذاتی کتب خانہ سے خوب مستفید ہوا۔

اللّھمّ اغفر له وارحمه وادخله الفردوس۔

قاضی صاحب مرحوم کو عربی واُردو دونوں زبانوں پر یکساں عبور حاصل تھا، عربی زبان میں اُنکی دو تالیفات شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں، ایک ''**العقد الثمین**'' اور دوسری ''**رجال السند والهند**''، اوّل الذکر اسلامی ہند کی فتوحات اور اس سرزمین کو اپنے ورود میمون سے نوازنے والے صحابہ وتابعین کی مستند تاریخ پر مشتمل ہے، ۳۳۵ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے اب تک دو اڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اور ثانی الذکر کتاب سندھ وہند کے قدیم ثقافتی روابط کی تاریخ کے موضوع پر ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ مقبول کتاب ہے (سطور آئندہ میں اس کی کچھ تفصیل آرہی ہے)، بلاشبہ مرحوم کا لائق صد تحسین کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے ملک کے تمام علمی مراکز اور سازگار ماحول سے دور رہ کر محض انفرادی طور پر بکثرت یادگار علمی کارنامے انجام دیے ہیں، بلاشک اُن کی ہر تصنیف طویل

مطالعہ، عمیق غور وفکر اور دیدہ ریز تحقیق پر شاہد عدل ہے، مستند و نادر اور کمیاب مآخذ کے حوالوں نے قاضی صاحب کی تخلیقات واکتسابات میں غیر معمولی وزن اور وقار پیدا کر دیا ہے، راقم سطور ذاتی طور پر واقف ہے کہ مرحوم اپنی تحقیقات کو باوزن بنانے کے لیے مراجع و مآخذ کی جستجو میں کو بکو گھوما کرتے تھے، ایک بار مجھ سے خود فرمایا کہ: ''دیکھو بھائی! تم تو اتنی بڑی لائبریری میں رہتے ہو، تم کو اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا کہ میں ایک ایک حوالہ کو کتنی محنت وجستجو سے حاصل کرتا ہوں، اس لیے میری خواہش ہوتی ہے کہ یہ حوالہ میری تحریر میں ضرور آجائے، مگر بعض رسائل کے مدیر (اشارہ شاہ معین الدین کی طرف ہوتا) ان قیمتی حوالوں کو حذف کر دیتے ہیں، جس سے مجھ کو طبعی دکھ ہوتا ہے''۔

قاضی صاحب کی علمی سرگرمیوں کا محور دو موضوعات رہے، اور ان میں انھیں درجہ اختصاص حاصل تھا، ایک عرب و ہند کے قدیم ترین روابط کی داستان سرائی اور دوسرا دیار پورب میں علمی و تعلیمی ترقیوں کی روشن تصویر پیش کرنا، عرب سیاحوں، جغرافیہ نویسوں اور مؤرخوں نے اس ملک کی تمدنی اور سیاسی تاریخ کے ساتھ خصوصی اعتنا کیا ہے، جاحظ، سلیمان تاجر، ابن خرداذبہ، مسعودی، قاضی صاعد اندلسی، عبدالکریم شہرستانی ، ابن ابی اصیبعہ ، ابن بطوطہ اور قلقشندی وغیرہ نے اپنی تصانیف میں ہندوستان کے جغرافیہ، تہذیب وتمدن ، معاشرت ، نظام حکومت اور مذاہب پر مبسوط و فاضلانہ بحث کی ہے، اُردو میں اس موضوع پر سب سے پہلی محققانہ شہرۂ آفاق تصنیف علاّمہ سید سلیمان ندویؒ کی ''عرب و ہند کے تعلقات'' ہے، جب ۱۹۲۹ء میں یہ کتاب منصۂ شہود پر آئی تو علمی دنیا اُس کی نادر تحقیقات اور قیمتی معلومات کے غلغلہ سے گونج اٹھی تھی۔

لیکن تحقیق وریسرچ کے کارواں کا کوئی اسٹاپ نہیں، وہ ہر دم رواں پیہم دواں رہتا ہے، یہ بلاشبہ درست ہے کہ حضرت سیّد صاحب نے متذکرہ کتاب میں اپنی ژرف بینی اور تلاش وجستجو سے ہندوستان کے ساتھ عرب کے گونا گوں تعلقات کا ایک دلکش اور معلومات افزا مرقع پیش کیا ہے، لیکن بایں ہمہ قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنی کاوش وتحقیق اور مزید دستیاب مآخذ سے استفادہ کر کے اس زمین کو آسمان بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے، اور ضخیم مجلدات میں عرب و ہند کے عہد بعہد سیاسی، تجادتی، علمی اور مذہبی روابط کے بے شمار گوشوں اور گوناگوں خصوصیات کو اُجاگر کیا ہے، مرحوم کی تاریخی تصانیف میں ایسے قیمتی اور نادر مآخذ کے حوالے بکثرت ملتے ہیں، جن تک اُس عہد میں

حضرت سیّد صاحب کی رسائی نہیں ہوسکی تھی۔

لاریب قاضی صاحب کے اس بیش قیمت سلسلہ تصانیف سے جہاں وقت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل ہوتی ہے، وہیں ملک میں قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے فروغ میں بھی کافی مدد ملتی ہے، مرحوم کی ان گراں قدر تصانیف سے ہم پر اس تاریخی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین ہمیشہ سے مختلف تہذیبوں کا سنگم اور ایک اعلی تمدن کا گہوارہ رہی ہے، آٹھویں صدی عیسوی میں جنوبی ہند کے بعض ساحلی علاقوں اور سندھ میں عربوں کی تہذیب آئی، اور پھر جب راہ نکل آئی تو سولہویں صدی تک مسلمان اپنے جلو میں تہذیب وتمدن کے رنگارنگ جلوے ساتھ لیکر ہندوستان آتے رہے، اور پھر جب اس کا امتزاج ہندوستان کی مخصوص تہذیب سے ہوا تو اسلامی تہذیب اُبھر کر سامنے آئی، جس کی بادنسیم اس ملک میں صدیوں چلتی رہی، قاضی صاحب کی نادر تحقیقات سے ہمارے علم میں یہ بھی اضافہ ہوتا ہے کہ عربوں نے ہندوستان میں صرف سیاست رانی اور جہانبانی ہی کے جوہر نہیں دکھائے بلکہ اُنھوں نے یہاں اسلامی علوم وفنون کی ہر شاخ کو ثمر بار کیا، اور اپنے شاندار علمی کارناموں سے اس ملک کو اقوام عالم کی صفٔ پیشیں میں ممتاز مقام عطا کیا ہے۔

اسی طرح دیار پورب میں علمی وتعلیمی ترقیات کی تاریخ بھی قاضی صاحب مرحوم کا پسندیدہ ومرغوب موضوع رہا ہے، اہل نظر سے مخفی نہیں کہ یہ مردم خیز خطہ قدیم زمانے سے علم وفن کا ایک اہم مرکز اور مختلف النوع علماء وفضلاء کا مخزن رہا ہے، اس کی علمی تاریخ مدون کرنے کی کوئی منظّم کوشش اُس وقت تک نہیں کی گئی تھی، بلاشبہ قاضی صاحبؒ نے وقت کے اس اہم تقاضے کو محسوس کیا اور اس خطہ کے متعدد علمی ادوار قائم کر کے اُن پر معلومات افزا مقالات لکھے جو پہلے رسالہ معارف اعظم گڑھ میں بالاقساط شائع ہوئے، اور پھر اُن کو ندوۃ المصنفین دہلی نے ۱۹۷۹ء میں ''دیار پورب میں علم وعلماء'' کے نام سے شائع کیا، علاوہ ازیں مرحوم نے خاص مبارکپور کے علماء وفضلاء کے سوانح وکمالات کو بھی ''تذکرہ علمائے مبارکپور'' کے نام سے مرتب کیا، جو اپنے موضوع پر ایک مستند مآخذ شمار ہوتا ہے، قاضی صاحب خود بھی اسی معدنِ فضل وکمال کے ایک لعل گراں مایہ تھے، آئندہ دیار پورب کے اہل فضل وکمال کا تذکرہ قلم بند کرنے والا موٴرخ مرحوم کو سرفہرست نمایاں مقام دینے پر مجبور ہوگا۔

عرب و ہند کے عہد بعہد روابط سے متعلق قاضی صاحب مرحوم کی ساری تصانیف ۱۹۶۵ء

سے ۱۹۷۵ء کے دوران دس سال کے عرصہ میں ندوۃ المصنفین دہلی سے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی ہیں، جن میں سے دو کتابوں ''عرب و ہند عہد رسالت میں'' اور ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' کا مصر سے عربی میں ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، خود مرحوم نے عربی زبان میں پانچ کتابیں لکھیں یا تحقیق وتصحیح کی ہے، جن میں سے دو ممتاز کتابوں کا ذکر سطور بالا میں آچکا ہے، علاوہ ازیں اُنھوں نے عربی میں **الهند فی العصر العباسیین** کے نام سے ایک مختصر کتاب لکھی تھی، جو قاہرہ (مصر) سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی، اس کے علاوہ قاضی صاحب نے دو نایاب مخطوطوں **جواهر الأصول** اور **تاریخ اسماء الثقات** کو دستیاب کر کے اُن کی تصحیح وتحقیق کی اور اپنے قیمتی حواشی وتعلیقات سے اُن کو مزین کر کے شائع کیا، آخر الذکر پر مرحوم کے قلم سے ایک نہایت پُر مغز مقدمہ بھی شامل ہے، واضح رہے کہ قاضی صاحبؒ کی چھوٹی بڑی کتابوں کی کل تعداد تین درجن کے قریب (۳۴) ہے۔

متذکرہ بالا مستقل تصانیف کے علاوہ قاضی صاحبؒ نے متنوع علمی و مذہبی موضوعات پر نہایت کثرت سے معیاری مقالات بھی سپرد قلم کیے ہیں، جو ملک کے بلند پایہ رسائل معارف، برہان اور الفرقان وغیرہ میں شائع ہو کر ذوق شناسان علم کے حلقہ میں پسند کیے گئے، واقعہ یہ ہے کہ مرحوم کے طویل تحقیقی مقالات سب سے زیادہ رسالہ معارف میں شائع ہوئے، راقم سطور ذاتی طور پر واقف ہے کہ استاذی شاہ معین الدین احمد ندوی (اڈیٹر ماہنامہ معارف اعظم گڑھ)، قاضی صاحب کے مقالات کو بیحد پسند کرتے، اُن کا انتظار کرتے اور نہایت اہتمام کے ساتھ معارف میں شائع کرتے تھے۔

میدانِ صحافت میں بھی قاضی صاحب مرحوم نے اپنے امتیاز وانفرادیت کے علم بلند کیے ہیں، چنانچہ ممبئی کی ایک مشہور تنظیم انجمن خدام النبی کے ترجمان ماہنامہ ''**البلاغ**'' کی مجلسِ ادارت کے وہ شروع ہی سے رکن رکین رہے، مگر پھر آگے چل کر وہ اس رسالہ کے مدیر تحریر ہو گئے، اور تاحیات اس پر فائز رہے، اس رسالہ میں اُن کے تاریخی اور علمی وفکری مضامین کے علاوہ ''شذرات'' کے عنوان سے اُنکی ادارتی تحریروں کو ملک میں بڑی پسندیدگی اور نگاہ اعتبار سے دیکھا جاتا تھا، انڈو عرب ثقافت کی تاریخ اُن کے قلم کی خاص جولانگاہ تھی، جس کے جلوے اُن کے البلاغ میں شائع

شدہ بکثرت مضامین میں دل و دماغ کو روشن کرتے ہیں، علاوہ ازیں ممبئی کے مشہور زمانہ اور تاریخ ساز اردو روزنامہ ''انقلاب'' میں اُن کا مقبول مذہبی کالم نہایت پابندی کے ساتھ شائع ہوا کرتا تھا، اور آج بھی یہ کالم اپنی پیشانی پر ''بیادگار قاضی اطہر مبارکپوری'' کی کلاہ افتخار کے ساتھ جاری ہے۔

سطور بالا میں مذکور ہوا کہ راقم سطور پر قاضی صاحب مرحوم کے احسانات، بزرگانہ شفقتیں ومحبتیں اور کرم فرمائیاں کیف وکم کے احاطہ سے باہر ہیں، پیش نظر مضمون میں اُن ہی کا فرض وقرض ادا کرنے کی ایک ادنی کوشش کی گئی ہے، یہ مرحوم کی حیات وخدمات پر کوئی تحقیقی مقالہ نہیں ہے، بلکہ ایک عظیم محسن اور قدم قدم پر ذرہ نوازیوں کے مجسمہ کے حضور میں ایک آنسو بھرا نذرانہ عقیدت وتشکر ہے .لاریب میرے معروف سلسلہ مضامین ''وہ یاد آئے بہت'' میں زیر نظر تحریر کو سبقت واوّلیت حاصل ہونی چاہیے تھی، اہل تعلق کا برابر اس کے لیے تقاضا بھی رہا، مگر اس میں ہوئی اگر تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا، ہوتا یوں کہ جب بھی میں نے اس جذبات فراواں سے بھرپور تحریر کو لکھنے کا ارادہ کیا گرم پانی کی ایک چادر سی نظر وقرطاس کے درمیان حائل ہوکر رہ گئی، اور میرے لیے امنڈتے ہجوم جذبات پر قابو پانا مشکل تر ہوگیا، آخر میں پھر عرض ہے کہ ہمارے تحزب پسند مؤرخین نے قاضی صاحب جیسی عظیم شخصیت کے کمالات وخدمات کو کما حقہ مقام نہیں دیا ہے، لیکن انشاء اللہ مستقبل کا مؤرخ مرحوم کے تصنیفی وتحقیقی علوئے شان کی قدر وقیمت کا شایان شان فیصلہ ضرور کرے گا۔

❁❁❁

قاضی صاحبؒ اور اہل سندھ

ضیاء الحق خیرآبادی، مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور

قاضی صاحب کو جس چیز نے علم وتحقیق کی دنیا میں شہرت وعروج اور بقائے دوام عطا کیا وہ ان کا خاص موضوع ''عرب وہند وسندھ کے تعلقات'' ہے، اس موضوع پر سب سے پہلے علامہ سید سلیمان ندویؒ نے قلم اٹھایا، اس کے بعد قاضی صاحب نے اسے مستقل موضوع بنا کر اسے مختلف ادوار میں تقسیم کر کے نہایت تفصیل وتحقیق سے اس پر بحث کی، اور اس موضوع کا حق ادا کر دیا، اور اس زبردست تاریخی خلاء کو پُر کر دیا جو صدیوں پر محیط تھا۔

اس اہم تاریخی سلسلے کی ابتداء بھی ایک عجیب وغریب انداز سے ہوئی جس پر چل آگے علم وتحقیق کی یہ عظیم الشان عمارت کھڑی ہوئی، اس داستان کو خود قاضی صاحب ہی زبانی سنئے:

> ایک روز احمد امین کی ''ضحیٰ الاسلام'' کا مطالعہ کر رہا تھا جس میں مشہور امام لغت وادب ابن الاعرابی کے متعلق کان اصلهٔ سندیاً دیکھا تو ذہن میں فوراً یہ بات آئی کہ اتنا عظیم امام لغت سندی الاصل ہے، معلوم نہیں کیسے کیسے اہل علم وفضل سندی ھندی ہوں گے جن کا ہم کو علم نہیں ہے، وقت وقت کی بات ہے، ورنہ اس سے پہلے دیوان حماسہ وغیرہ میں ابو عطاء السندی کے اشعار بار بار نظر سے گزرے مگر اس کا احساس نہیں ہوا، بس اسی وقت ابن الاعرابی کا تذکرہ نقل کیا اور اس کا سلسلہ چل پڑا جو آخر میں **رجال السند والھند** کی شکل میں سامنے آیا، ''تھیج صغیرات الامور کبیرھا'' بالکل صحیح ہے،
>
> اب رات دن چلتے پھرتے حتیٰ کہ کھانا کھاتے وقت بھی تاریخ ورجال کی کتابیں مطالعہ کرنے لگا، ایک دن میں کئی کئی کتابیں سرسری طور سے دیکھتا اور جہاں کوئی سندھی اور ھندی شخصیت نظر آتی فوراً نقل کر لیتا، ایک دن کتب خانہ کے ناظم نے کہا کہ مولانا ساری کتابیں کمرے میں لیجایئے تاکہ بار بار داخل خارج نہ کرنا پڑے، **رجال السند**

والھند کے مسوّدے کے پہلے صفحہ پر یہ عبارت درج ہے۔''إبتداء التالیف فی ۱۲/ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۸ھ و ذٰلک فی الجامعۃ الاسلامیۃ ،دابیل (سورت)التدوین جار''

اس موضوع پر قاضی صاحب نے آٹھ نہایت محققانہ کتابیں تیار کردیں،جس میں پہلی کتاب رجال السند والھند ہے،جس کا تفصیلی تعارف اسی شمارہ میں درج ہے،(۲)عرب وہند عہد رسالت میں (۳)ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں (۴)العقد الثمین فی فتوح الھند ومن ورد فیھا من الصحابۃ والتابعین (اس کا تعارف بھی اس خاص نمبر میں موجود ہے)(۵)اسلامی ہند کی عظمت رفتہ (۶) خلافت راشدہ اور ہندوستان (۷) خلافتِ امویہ اور ہندوستان (۸) خلافت عباسیہ اور ہندوستان۔

اس علمی سلسلہ کی پذیرائی تو تمام علمی دنیا نے کی اور قاضی صاحب کی تلاش وتحقیق اور نکتہ رسی کی داد دی،مگر اہل سندھ کو اس عموم میں خصوص حاصل ہے،اس لئے کہ ان کتابوں کا موضوع ہندوستان میں اسلام کی پہلی چار صدیوں کی تاریخ ہے جس کا زیادہ تر تعلق سندھ ومکران وغیرہ سے ہے،اس لئے اہل پاکستان (سندھ) نے اسے اپنی تاریخ قرار دیا،اوراب تک اس علاقہ اور اس دور کی اتنی مفصل ومرتب تاریخ نہیں لکھی گئی تھی اس لئے اس کو ایک نادر دریافت کی حیثیت حاصل ہوگئی، سکھر کی فعال ومتحرک تنظیم ''تنظیم فکر ونظر'' نے ان تمام کتابوں کو نہایت اعلیٰ معیار پر شائع کیا اوراس کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا ،اوراس کے رسم اجراء کے موقع پر مصنف کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا اور ان کی حد درجہ عزت افزائی کی ،اور انھیں ''محسن سندھ'' کا خطاب دیا ،اس مضمون میں ہم اہل سندھ کے مکاتیب ،تحریروں اور ان کے بیانات کے اقتباسات پیش کریں گے ،جس سے قاضی صاحب کے تئیں اہل سندھ کی شیفتگی ووارفتگی اور عقیدت ومحبت کا پتہ چلتا ہے،اس کی ابتداء صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم ......جو قاضی صاحبؒ کے بڑے قدرداں تھے...... کے ایک خط سے کررہے ہیں جو انھوں نے تنظیم فکر ونظر سندھ کے صدر پروفیسر اسداللہ بھٹو صاحب کو لکھا،صدر مرحوم لکھتے ہیں:

''اگر چہ آپ کی بھیجی ہوئی ساری کتب ہی قابل قدر ہیں ،لیکن میں قاضی اطہر

مبارکپوری صاحب کی کتب ''خلافت امویہ اور ہندوستان'' اور ''خلافت عباسیہ اور ہندوستان'' کا بطور خاص ذکر کروں گا، اور ان کی عرق ریزی اور محققانہ دیانت داری کی داد دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتب تاریخ اسلام سے دلچسپی رکھنے والوں کو ہمیشہ رہنمائی فراہم کرتی رہیں گی۔

میری طرف سے ایک دفعہ پھر اتنی جامع اور مفید کتاب شائع کرنے پر مبارکباد قبول کیجئے، اللہ تعالیٰ آپ کی ان نیک کوششوں کو استقامت عطا فرمائے، آمین خیر اندیش

محمد ضیاء الحق

قاضی صاحب کی پہلی ملاقات صدر مرحوم سے ۱۴۰۰ھ میں ہوئی، جب قاضی صاحب تیسری عالمی قرآن کانفرنس اور سرکاری سیرت کانفرنس میں شرکت کیلئے اسلام آباد تشریف لے گئے تھے، قاضی صاحب صدر محترم کے بارے میں لکھتے ہیں ''کانفرنس میں جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم شریک تھے، ان سے بار بار ملاقات ہوتی تھی، مرحوم سے جو شخص ایک بار ملتا تھا محسوس کرتا تھا کہ وہ اس سے خاص تعلق رکھتے ہیں، یہ مرحوم کے اخلاق کی خوبی تھی، میں بھی یہی محسوس کرتا تھا، انھوں نے مجھے ایک نہایت قیمتی لیمپ، عمدہ کشمیری مصلیٰ اور ایک حمائل شریف ہدیہ دیا ہے، ان سے خصوصی مجلسوں میں بار بار ملاقات ہوتی رہی''

قاضی صاحب کی دوسری ملاقات ۱۹۸۴ء میں ہوئی، جب قاضی صاحب مارچ ۱۹۸۴ء میں تنظیم فکر و نظر سندھ (سکھر) کی طرف سے منعقدہ ایک عظیم الشان بین الاقوامی ادبی میلے میں شریک ہوئے، قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں: ''جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم صدر پاکستان کی زیر صدارت جلسہ ہوا، جس میں صدر محترم کے ہاتھوں سندھ کی روایتی ٹوپی اور تنظیم فکر و نظر کا اعزازی نشان دیا گیا''

قاضی صاحب کا تیسرا سفر پاکستان اگست ۱۹۸۶ء میں ان کتابوں کے رسم اجراء اور تعارفی تقریب کے سلسلے میں ہوا جسے تنظیم فکر و نظر نے شائع کیا تھا، قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں: ۶/اگست کو ڈیڑھ گھنٹہ کی پرواز کے بعد ۷/بجے شام کو کراچی ہوائی اڈے پر اترے، تنظیم فکر و نظر کے صدر پروفیسر اسد اللہ بھٹو اور سکریٹری قربان علی اور دیگر کئی ارکان موجود تھے، ان حضرات نے

بے پناہ خلوص ومحبت سے استقبال کیا اور ہوٹل جیبز JABIES (جنت جیبز) کراچی میں قیام کا انتظام کیا، کتابوں کا اجراء اور تعارفی جلسہ ۷/اگست کو ہونے والا تھا، مگر صدر جلسہ سید غوث علی شاہ وزیر اعلیٰ سندھ کے پروگرام میں تبدیلی کی وجہ سے ۱۰/اگست کو ہوا، اسلئے دو دن آرام اور ملاقات کیلئے مل گئے،

پروفیسر اسد اللہ بھٹو سندھ کے سکریٹریٹ لوا گئے اور کئی اہم شخصیتوں سے تعارف کرایا، تمام لوگ بڑے خلوص ومحبت سے ملے، اور سب ہی یہ کہہ رہے تھے کہ آپ نے ہندوستان میں رہ کر ہمارے ملک سندھ کی اسلامی تاریخ پر وہ کام کیا ہے جو ابتک نہیں ہوا تھا اور ہم اپنے ماضی سے بے خبر تھے، ہمارے پاس چچ نامہ کے علاوہ یہاں کی اسلامی تاریخ کے بارے میں کچھ نہیں تھا، ہم سب آپ کے احسان مند اور شکر گذار ہیں،

(جن اہم شخصیات سے ملاقات ہوئی ان میں پاکستان کے مشہور دانشور بین الاقوامی حیثیت کے مالک جناب خالد ایم اسحاق صاحب،......ان کے بارے میں قاضی صاحب لکھتے ہیں: بڑے علم دوست بلکہ علم پرور شخص ہیں، بلا مبالغہ لاکھوں کتابیں ان کے ذاتی کتب خانہ میں ہیں، اور ہر سال لاکھوں روپیہ کتابوں کی خریداری پر خرچ کرتے ہیں'...... پروفیسر ذیشان خٹک سابق وائس چانسلر گومل یونیورسٹی پشاور، سراج منیر صاحب ڈائرکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، اور عبدالرحمٰن صاحب وغیرہ تھے،)

فاران کلب کی تقریب:۔ فاران کلب کراچی میں اہل علم اور ارباب ذوق کا ادارہ ہے جو موقع بموقع علمی اور ثقافتی پروگرام پیش کرتا رہتا ہے، عبدالرحمٰن صاحب اس کے روح رواں ہیں، کلب کی طرف سے مہمانوں کے اعزاز میں ظہرانہ کا انتظام کیا گیا۔ اس تقریب میں بہت سے اہل علم، دانشور اور صحافی شریک ہوئے، کھانے کے بعد ہال میں جلسہ ہوا، موضوع سخن میری کتابیں تھیں،

جناب سراج منیر اور پروفیسر ذیشان خٹک اور دوسرے مقررین نے بڑی فراخدلی سے حوصلہ مندانہ باتیں کیں، اور برملا اعتراف کیا کہ ہم آج تک اپنی تاریخ کے اس قدیم سرمایہ سے محروم تھے، ہم کو یہ پتہ نہیں تھا کہ اس ملک میں صحابہ وتابعین کی آمد ہوئی ہے، اور عہد رسالت ہی سے اس ملک کو اسلام اور مسلمانوں سے تعلق پیدا ہو گیا تھا، ان کتابوں نے ہماری آنکھیں کھول

دیں اوراب ہم اپنی تاریخ کے انقلابی موڑ پر آ گئے ہیں اور ہمارے سوچنے کا انداز بدل گیا ہے، ہمارے پاس محمد بن قاسم سے پہلے اوران کے بعد کی تاریخ پر کوئی سرمایہ نہیں ہے۔ان کتابوں کولکھ کرایک شخص نے ایک ادارے کا کام کیا ہے۔غرض سب ہی مقررین نے میری کتابوں کی اہمیت اورضرورت کو بیان کیا۔''

کتابوں کی ''**تعارفی تقریب**'' کی تفصیلات

تاریخ:۔ ۱۰راگست ۱۹۸۶ء بروز اتوار وقت ۷ر بجے شام

مقام:۔ تاج ہوٹل۔شاہراہ فیصل کراچی

صدارت:۔ جناب جسٹس غوث علی شاہ (وزیراعلیٰ سندھ)

مہمان خصوصی:۔ محترم مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری (بھارت)

خطبۂ استقبالیہ:۔ پروفیسر اسداللہ بھٹو،صدر تنظیم فکرونظر سندھ

مُقَــــــــرِّرین

☆☆☆ جناب خالد ایم اسحاق صاحب،سرپرست تنظیم فکرونظر سندھ

☆☆☆ جناب ڈاکٹر جمیل جالبی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی

☆☆☆ جناب پروفیسر ذیشان خٹک سابق وائس چانسلر گومل یونیورسٹی پشاور

☆☆☆ جناب پروفیسر ایاز قادری صاحب صدر شعبۂ سندھی کراچی یونیورسٹی

☆☆☆ جناب سراج منیر صاحب ڈائرکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

خطبۂ استقبالیہ کے چند اقتباسات

عزت مآب جسٹس سید غوث علی شاہ صاحب ،قابل صد احترام مولانا اطہر مبارکپوری صاحب،محترم خالد اسحاق صاحب!..............................

............حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری صاحب ایک عہد ساز انسان ، اخلاص ومحبت اسلامی کرداراور اخلاق کا ایک پیکر ہیں ، خاص طور پر اس تقریب میں شرکت کیلئے اعظم گڈھ (بھارت) سے تشریف آوری ایک ایسا احسان عظیم ہے، جس کا شکریہ ہم الفاظ میں ادانہیں کرسکتے ،اس مرد درویش نے بمبئی میں تیس سال علم تحقیق کے موتی بکھیرے ہیں،اورنہایت اعلیٰ

معیار پر بائیس کتابیں لکھی ہیں، جن کی علمیت اور دانائی کا پورے عالم اسلام میں چرچا ہے، ان کی لافانی تصنیف ''رجال السند والہند'' نے عرب وعجم میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی،

ان کی دوسری کتب (۱) ''عرب و ہند عہد رسالت میں'' (۲) ''خلافت راشدہ اور ہندوستان'' (۳) ''خلافت امویہ اور ہندوستان'' (۴) ''خلافت عباسیہ اور ہندوستان'' کی دوبارہ اشاعت کا عظیم شرف تنظیم فکرونظر سندھ کو حاصل ہے، ان کتابوں میں تاریخ اسلام کے ایسے موضوع پر قلم اٹھایا گیا ہے جس کا حق شاید اس سے پہلے ایسے جامع و بلیغ اور اعلیٰ معیار پر کسی نے ادا نہ کیا ہو۔

حضور اکرم ﷺ کے عہد مبارک سے لے کر عباسی دور تک عرب اور سندھ و ہند کے تعلقات اور اسلام کی شاعت، جہاد، تہذیب وثقافت، تجارت اور محدثین، مفسرین، فقہائے کرام، صوفیائے عظام، علمائے دین اور بزرگوں کی خدمات اور کارناموں کے متعلق یکجا اتنی کثیر اور نایاب معلومات دوسرا کوئی مصنف نہیں کرسکا ہے، مولانا محترم نے برسہابرس تک خون اور پسینے کی محنت سے قرآن وسنت، سیرت وفقہ اور تاریخ ومغازی کی سیکڑوں کتابوں کا مطالعہ کر کے یہ موتی اور لعل وجواہر قارئین کے دامن میں پیش کئے ہیں نہ صرف یہ بلکہ ماخذوں اور حوالوں کی تفصیل دیکر آئندہ کیلئے دانشوروں اور تشنگان علم کیلئے تحقیق کے دروازے کھول دئے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے تاریخ اسلام کا ابتدائی لیکن اہم ترین باب جو اہل سندھ اور اہل ہند...... واقع نہیں تھا اور اٹکلوں کے گھوڑے دوڑائے جاتے تھے مولانا موصوف نے تاریخ کے ان گمشدہ سلسلوں کو تلاش کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سرزمین سندھ کو صحابۂ کرام کے قدم چومنے کا بھی شرف حاصل ہوا ہے جس کے نتیجے میں تاریخ اسلام کا حقیقی اور نیا زاویہ سامنے آیا ہے۔

مولانا محترم کی سرزمین سندھ سے محبت اور عقیدت کا یہ عالم ہے کہ کل فرمارہے تھے کہ تاریخ سندھ لکھنے کے جنوں میں تصور ہی تصور میں میں نے بزرگان سندھ، محدثین، فقہاء اور اولیاء کرام سے ملاقاتیں کرتا رہا ہوں اور سندھ کے میدانوں، سبزہ زاروں، پہاڑوں، مکران کی وادیوں اور ریگزاروں میں منازل طے کی ہیں، لیکن اللہ کا شکر ہے آج مولانا محترم عالم بیداری میں بنفس نفیس اہل سندھ سے ملاقات کررہے ہیں۔

ہمارے آباء واجداد کا یہ بیش بہا سرمایہ پیش کر کے مولانا محترم نے بڑا احسان کیا ہے، اس لئے ہم ان کو محسن سندھ قرار دیتے ہیں۔

ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کے ڈائریکٹر جناب سراج منیر صاحب نے کہا:

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے اشرف المخلوقات کو استحکام بخشنے کے لئے پہاڑ قائم کیا ہے۔ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے بھی اپنی کتاب ''عرب و ہند عہد رسالت میں'' اور دوسری کتابیں لکھتے وقت علم ودانش اور دوسرے مبارک واقعات کے چھوٹے چھوٹے ذرے جمع کر کے پہاڑ قائم کر دیے ہیں، اور پورے عالم اسلام کو استحکام فراہم کر کے بیش قیمت خزانہ فراہم کیا ہے۔

ڈاکٹر ایاز حسین قادری صدر شعبۂ سندھی، کراچی یونیورسٹی نے کہا کہ اس کتاب کا عنوان ''عرب و ہند عہد رسالت میں'' کے بجائے ''عرب وسندھ عہد رسالت میں'' ہونا چاہئے تھا، کیونکہ زیادہ مواد سندھ کے بارے میں ہے۔

پروفیسر ذیشان خٹک وائس چانسلر گومل یونیورسٹی پیشاور نے کہا کہ: مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی تصانیف پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کتابوں کو مرتب کرنے میں بڑی عرق ریزی کی ہے، یہ بات ان کی کتابوں کے حوالے سے ملتی ہے کہ قدیم زمانے میں سندھ ایک بڑا ملک تھا جس کی سرحدیں ایک طرف کابل اور دوسری طرف بمبئ سے ملی ہوئی تھیں۔

ممتاز قانون داں جناب خالد ایم اسحاق صاحب نے کہا کہ: تاریخ عظمت کا نشان ہوتی ہے، جو فرد کو راہ بتلاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ خلافت عباسیہ کے بعد اب تک کے حالات اور واقعات کو مکمل؛ کرنے کا کام باقی ہے جو حکومت سندھ کی سرپرستی مین ہونا چاہئے۔ قاضی اطہر مبارکپوری کے انگریزی اور سندھی ترجمے کی ضرورت پر بھی انھوں نے زور دیا۔

تقریب کے صدر سندھ کے وزیر اعلیٰ سید غوث علی شاہ نے کہا کہ: مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے بیش بہا کتب لکھ کر تاریخ میں اپنے لئے ایک مقام پیدا کرلیا ہے، انھوں نے مسلمانان عالم اور پاکستان کے عوام کی ان کتب کے ذریعے جو خدمت کی ہے وہ قابل ستائش ہے، انھوں نے مولانا سے کہا کہ وہ تاریخ اسلام سے مسلمانوں کو آگاہ کرنے کے لئے اپنے کام میں مزید وسعت پیدا کریں۔ آخر میں وزیر اعلیٰ نے کہا کہ عباسی دور کے بعد سے اب تک سندھ

کی تاریخ قلمبند کرنے کا کام باقی ہے۔ اگر کوئی اس کام کا بیڑا اٹھائے تو حکومت سندھ اس کے تمام اخراجات برداشت کرنے کے لئے تیار ہے۔

اخیر میں تقریب کے مہمان خصوصی مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں نے اپنی کتابوں میں ہندوستان کا نام اس لئے دیا ہے کہ اپنے بیرون ملک کے دوروں کے دوران مجھے یہ تاثر ملا کہ وہاں کے لوگ بھارت، پاکستان اور بنگلا دیش میں رہنے والوں کو صرف انڈین تصور کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۵۵ء میں حج کے موقع پر مقدس مقامات پر جا کر میں نے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی تھی کہ وہ مجھ سے اسلام کی خدمت کا کام لیں۔ چنانچہ میری کوشش اور محنت کے بغیر تنظیم فکر ونظر کے زیرِ اہتمام یہ کتابیں بڑی خوبی اور دلکشی کے ساتھ شائع ہوئیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نیک کام میں معاونت کرنے والوں کو بھی اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین!

☆☆☆☆☆

متفرقات

(اولاد واحفاد اور شاعری)

۱۔۔۔مولانا خالد کمال صاحبؒ

۲۔۔۔مئے طہور

۳۔۔۔چارسالہ فہرستِ مضامین

مولانا خالد کمال مبارکپوریؒ
خلف اکبر مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ

مولانا قاضی ظفر مسعود مبارکپوری

ہمارے بھائی مولانا خالد کمال مبارکپوری جنھیں ہم سب بھائی بہن ''بڑے بھائی'' کہہ کر پکارتے تھے، جب کہ خاندان اور گھر کے دیگر بڑے افراد خالد کمال کہتے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش مدرسے کے سرٹیفکیٹ کے حساب سے یکم دسمبر ۱۹۳۸ء ہے۔

بھائی صاحب بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے میں بہت تیز اور ذہین وفطین تھے، مگر پڑھتے کم تھے جو پڑھتے تھے وہ یاد ہو جاتا تھا۔ والد صاحب کی طرح پڑھنے کے زمانے ہی سے شاعری اور مضمون نگاری کرنے لگے تھے، انھوں نے بھی والد صاحب کی طرح پوری تعلیم احیاء العلوم ہی میں حاصل کی، دوسال کیلئے دیوبند گئے اور وہیں سے ۱۹۵۸ء میں سند فراغت حاصل کی اور اس کے بعد چند سال مدرسہ مفتاح العلوم بھیونڈی میں جسے والد محترم نے ۱۹۵۱ء میں جاری کیا تھا، درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس دوران عبدالمنعم النجار قونصل جنرل حکومت مصر نے باصرار آپ کو جامع ازہر میں سرکاری وظیفے پر داخلہ کیلئے والد صاحب سے بہت زور دیا مگر آپ نے انکار کر دیا کیوں کہ اس زمانے میں جامع ازہر سے پڑھ کر واپس آنے والے طلبہ عام طور پر کوٹ پینٹ پہن لیتے تھے اور داڑھی بھی صاف کرا دیا کرتے تھے اس لئے والد صاحب کو انقباض تھا مگر جب جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا آغاز ہوا تو والد صاحب نے انشراح کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں داخلہ کرا دیا، جس کا تذکرہ مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی نہایت دلچسپ انداز میں کرتے ہیں:

> یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے، مدینہ یونیورسٹی کے ہوسٹل میں ایک ہنس مکھ نوجوان ہمارے روم پارٹنر بن کر آئے۔ ان کا نام خالد کمال تھا۔ خالد کمال ہوسٹل میں بادِ بہار بن کر آئے۔

کمرے کی سنجیدگی قہقہوں میں بدل گئی۔ معلوم ہوا کہ ہمارے یہ نئے روم پارٹنر مشہور و معروف عالم دین قاضی اطہر مبارکپوری کے صاحبزادے ہیں، قاضی صاحب کے نام سے ہر شخص واقف تھا جسے کچھ بھی اسلامی کتابوں اور رسائل و جرائد کے مطالعے کا موقع ملا تھا۔ (ماہنامہ دارالسلام اگست ۱۹۹۶ء)

مدینہ یونیورسٹی سے ۱۹۶۷ء میں سند فراغت حاصل کرنے کے بعد ہی حکومت سعودیہ کی طرف سے دینِ حنیف کی اشاعت کے لئے مبعوث ہوکر گھانا مغربی افریقہ بھیجے گئے، جہاں چودہ سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتے رہے۔

ربوہ (پاکستان) کے بعد دنیا میں قادیانیوں کے سب سے بڑے مرکز (گھانا) میں اسلام کا بہترین تعارف کرایا اور صحیح دینی شعور بیدار کیا، پورے گھانا میں گاؤں گاؤں، شہر شہر، قبیلہ قبیلہ گھوم گھوم کر جلسہ کیا اور قادیانیوں کو چیلنج دیا۔ چونکہ گھانا بھی برٹش کالونی تھا اس لئے اپنے پروردہ مرزا غلام احمد قادیانی کی گھانا کو پوری دنیا میں اسلام کے مقابلے میں قادیانیت کا مرکز بنانے کی کھلی ہمت افزائی کی اور اس کے لئے تمام ہتھکنڈے استعمال کیے جس میں سب سے مؤثر حربہ اپنی تبلیغ کا یہ استعمال کیا کہ تم لوگ حج کے لئے جاتے ہو وہاں جتنے کرتا پائجامہ اور شیروانی میں لوگ نظر آتے ہیں سوائے قادیانی کے کوئی اور نہیں۔ وہ بیچارے سیدھے سادھے ان کے چنگل میں پھنستے رہے اور یہ لوگ اسپتال، اسکول کالج اور مسجدیں بنوا کر لوگوں کو متوجہ کرتے رہتے اور حالات یہ تھے کہ کوئی ان کی صحیح رہنمائی کرنے والا نہیں تھا۔ چونکہ بھائی صاحب بھی کرتا پائجامہ اور شیروانی پہنتے تھے اس لئے ان کے بارے میں بھی یہ مشہور کیا کہ دیکھو حکومت سعودی نے بھی اپنا نمائندہ ایک قادیانی ہی کو بھیجا ہے۔ اس زمانے میں پاکستان کا وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں ایک نہایت بدبودار قادیانی تھا، اس لئے غیر ممالک میں تقریباً پچھتر فیصد قادیانی بھیجے جاتے تھے اور وہ لوگ بھی اس سلسلے میں مقامی لوگوں کو ورغلاتے تھے اور بیچارے دوسرے لوگ اگر کبھی منھ کھولتے یا احتجاج کرتے تو فوراً حکومت پاکستان کا عتاب نازل ہوتا یا تبادلہ کر دیا جاتا یا پاکستان بلا لیا جاتا۔

اتفاق سے بھائی صاحب کے ساتھ ایک اور ہندوستانی عالم جو جامع ازہر کے فارغ تھے

مولانا فضل الرحمٰن بہاری وہ بھی مبعوث ہوئے۔ وہ بھی دارالعلوم دیوبند سے فارغ تھے۔ ان دونوں حضرات نے وہاں کے لوگوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ قادیانی ہندوستان پاکستان میں غیر مسلم مانے جاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ وعمل سراسر اسلام کے منافی ہے، انگریزوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے اندر اختلاف پیدا کرنے کے لئے ان کو خوب بڑھاوا دیا اور وہی کام یہ لوگ گھانا میں بھی کر رہے ہیں۔ ہم ان کو کھلا ہوا چیلنج دیتے ہیں کہ یہ پوری دنیا حتی کہ اپنے آقا ظفر اللہ خان کو بھی بلالیں، ہم ان سے بحث کرنے کے لئے تیار ہیں۔ بس کیا تھا، پورے ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، پاکستانی سفارت خانے والوں نے بھی کھل کر قادیانیوں کا ساتھ دیا۔ یہ دو ہندوستانی مولوی کیا کر پائیں گے، انھیں یہ خبر نہیں تھی کہ یہ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہیں جس کا مقصد ہی باطل عقائد سے ٹکر لینا ہے۔ چنانچہ معرکہ آرائی تو ہوئی نہیں مگر دکھاوے کے لئے محاذ آرائی کرتے رہے، ان دونوں مولویوں کی کوشش رنگ لائی اور گاؤں کا گاؤں اور قبیلے کا قبیلہ توبہ واستغفار کر کے از سرِ نو کلمۂ توحید پڑھ کر اسلام میں داخل ہو گیا۔

اس سلسلے میں سر ظفر اللہ خان اور شاہ فیصل مرحوم میں خط و کتابت بھی ہوئی۔ سر ظفر اللہ خان چونکہ بین الاقوامی عدالت ہیگ (جنیوا) کا صدر رہ چکا تھا اس لئے بڑے کروفر سے شاہ فیصل مرحوم کو لکھا کہ ہم تو دنیا میں اتحاد بین المسلمین کے لئے رات دن کام کرتے ہیں اور اسلام کی اشاعت وترویج کے لئے کوشاں رہتے ہیں، مگر آپ کے آدمیوں نے گھانا میں طوفان کھڑا کر رکھا ہے تو یہ کام کیسے شرمندۂ تعبیر ہوگا جب کہ آپ بھی اس کے پرزور حامی ہیں، چونکہ اس درمیان میں پورے گھانا سے شاہ فیصل مرحوم کے نام لعنت وملامت کے خطوط کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور جتنا خط جاتا تھا شاہ فیصل مرحوم سب کو بنفس نفیس پڑھتے تھے اور جہاں ضرورت سمجھتے تھے سرخ نشان لگا کر گھانا اپنے سفیر کو واپس بھیج دیتے تھے۔ بھائی صاحب کہتے تھے کہ سفیر ہم لوگوں کو ڈاک دکھلاتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ سب شاہ کے قلم کا نشان ہے جسے میں پہچانتا ہوں۔ شاہ فیصل مرحوم ان علاقوں میں دوبارہ جا کر قبیلوں کے سردار سے ملنے کے لئے حکم دیتے تھے۔ شاہ فیصل مرحوم نے بڑی خندہ پیشانی سے سر ظفر اللہ کے خط کا جواب دارالافتاء سے منگوایا جس میں صاف لکھا تھا کہ ان کا مسلمانوں کے عقیدے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ غیر مسلمین کے زمرے میں آتے ہیں،

اسی کے ساتھ شاہ مرحوم کو دارالافتاء نے یہ مشورہ بھی دیا کہ آئندہ حج کے نام پر کوئی قادیانی مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں داخل نہ ہونے پائے۔ چنانچہ سرظفراللہ خان کو جواب ارسال کردیا گیا اور اسی کے ساتھ ساتھ سرکاری سرکلر بھی جاری ہوگیا اور سعودی سفراء کو ہدایت کردی گئی آئندہ حج کے ویزے پر کوئی قادیانی اگر مملکت میں داخل ہوا تو وہاں کی حکومت اس کی ذمہ دار ہوگی اور ہمارے اور اس حکومت کے تعلقات بگڑ جائیں گے۔ چنانچہ اس سال ہندوستان میں بھی بڑی سختی تھی کہ کوئی قادیانی ویزا حاصل نہ کرسکے اور پاکستان میں تو طوفان کھڑا ہوگیا اس لئے کہ سرکاری مشنریوں اور حکومت کے اہم عہدوں پر قادیانی فائز تھے، اسی ہنگامہ میں مجلس ختم نبوت بنی جس کی بے مثال قربانیوں کے سامنے آخر حکومت نے تھک ہار کر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا۔ اس طرح پوری دنیا میں قادیانیت کا زور ٹوٹ گیا اور مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے ان سے چھٹکارا ملا۔ الحمدللہ علی ذلک۔ یہ میں نے اس لئے لکھ دیا کہ یہ ایک حقیقت ہے جو ریکارڈ میں آجائے، اس زمانے کے سارے خطوط بھائی صاحب کے جو والد صاحب کے نام ہیں اس سے بھرے پڑے ہیں اور ضائع ہورہے ہیں۔

بھائی صاحب کی کارگزاریوں سے خوش ہوکر حکومت سعودی نے ۱۹۸۱ء میں انھیں نیوزی لینڈ بھیجا جہاں وہ اپنی وفات (۶؍دسمبر ۱۹۹۹ء) تک مقیم رہے۔

اس کی بھی تھوڑی تفصیل سن لیجئے۔ جتنے بھی سرکاری یا غیر سرکاری اور تجارتی وفود آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ جاتے رہے، سب یہ رپورٹ دارالافتاء ریاض کو بھیجتے تھے کہ نیوزی لینڈ ایک پرفضا اور پرسکون ملک ہے جہاں دنیا کے بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگ رہتے ہیں، وہ لوگ اسلام کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ کسی ایسے شخص کو بھیجا جائے جو اسلام کو ان کے سامنے مکمل طور پر ان کی زبان یعنی انگریزی میں ان کے سامنے پیش کرسکے اور ان کی صحیح رہنمائی کرسکے، چونکہ بھائی صاحب کا چودہ سالہ تجربہ اور انگریزی وعربی پر عبور اور ان سب سے بڑھ کر دینی معاملات اور مسائل کی پورے طور پر جانکاری، اس لئے انھیں کا انتخاب کیا اور بھیجا گیا جہاں انھوں نے لگ بھگ اٹھارہ سال تک اسلام اور مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کی اور اسلام کے نام پر جاری رسومات وخرافات کو ختم کرایا اور پورے وقار کے ساتھ اسلام کے نمائندے بن کر رہے اور اپنی جدوجہد

سے وہاں کے دار السلطنت ویلنگٹن میں پہلی مسجد کی بنیاد رکھی اور یوروپین افسران اور باشندوں کے سامنے دو رکعت نماز پڑھ کر مسجد کا افتتاح کیا، یہ آپ کا کمال خلوص تھا کہ افتتاح رسمی نہیں رہنے دیا بلکہ پورے ملک میں مسلمانوں کو آزادی اور برابری کے ساتھ رہنے کا حق دلوایا اور سینکڑوں انگریزوں کو حلقہ بگوش اسلام کیا، آج پورے نیوزی لینڈ میں مسلمان اپنے تمام تر دینی تخصص اور پوری شان وشوکت کے ساتھ رہتے ہیں۔ اور بھائی صاحب نیوزیلینڈ، آسٹریلیا اور نارتھ پیسفک کے جزیروں میں تاریخ کا ایک حصہ بن گئے۔

عربی زبان اور دینی معلومات کے سلسلے میں بمبئی کے مشہور میمن خاندان کے فرد احمد غریب صاحب ماہنامہ البلاغ فروری ۱۹۶۷ء میں لکھتے ہیں:

بہت دنوں سے قاضی اطہر صاحب کی کچھ خبر نہیں، دو ہفتہ قبل مدینہ منورہ میں ان کے صاحبزادے مولوی خالد کمال سے ملاقات ہوئی تھی، ماشاء اللہ دینی معلومات میں کافی ترقی کر لی ہے اور ہمارے یہاں کے علمائے کرام وفضلائے عظام میں جو کمی محسوس کر رہا تھا عربی بول چال کی، انھوں نے وہ کمی بہت اچھی طرح پوری کر لی ہے، عربی میں گفتگو بہت اچھی طرح کر لیتے ہیں اور اس چیز کی مجھ جیسے خادم علماء کو کھٹک رہتی تھی، ایک مرتبہ ہم بھائیوں نے یہاں ایک دعوت کی، جس میں چار پانچ ہندوستان و پاکستان کے علماء کو مدعو کیا، اسی موقع پر یہاں کے علماء کو بھی دعوت دی، عربی وعجمی دونوں پارٹیاں علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتی تھیں، کیونکہ اپنے علماء عربی میں گفتگو پر قادر نہیں ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے مولانا علی میاں اس سے مستثنیٰ ہیں کہ وہ عربی زبان پر قدرت رکھتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان کے مولانا محمد یوسف صاحب بنوری بھی عربی میں گفتگو پر قدرت رکھتے ہیں۔

والد صاحب کہا کرتے تھے کہ اگر خالد کمال لکھنے پڑھنے میں آتے تو مجھ سے آگے جاتے مگر اللہ تعالیٰ نے ان سے دوسرے طریقے سے دین کا بڑا بڑا کام لیا، اللہ رب العزت مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے۔ آمین ثم آمین!

آپ نے کم از کم چودہ پندرہ حج ادا فرمایا، ۱۹۹۶ء میں والد محترم کے انتقال کے بعد وطن آئے تو والدہ مرحومہ کو لوا کر حج کے لئے تشریف لے گئے۔ اسی سال منیٰ میں زبردست آگ لگی

تھی، پھر ۱۹۹۸ء میں نیوزی لینڈ سے سیدھے جدہ تشریف لے گئے اور وہاں پندرہ دن رہ کر فریضۂ حج ادا کیا اور ہندوستان تشریف لائے اور ایک ماہ گھر رہ کر واپس تشریف لے گئے۔ چند ماہ کے بعد برین ہیمریج کا حملہ ہوا جس میں سات آٹھ ماہ مبتلا رہے حالانکہ آپریشن بھی ہوا مگر جس کا وقت آجائے اسے کون ٹال سکتا ہے، بالآخر وقت موعود آ ہی گیا اور اسی مرض میں ۶ ر دسمبر ۱۹۹۹ء اور ہندوستانی تاریخ کے مطابق ۵ ر دسمبر چھ بجے شام کو انتقال فرمایا۔

مرتبہ بخشے شہادت کا موت پردیس ہی میں آ دھمکی

آپ کے انتقال پر سعودی عرب، مصر، ترکی اور دیگر بلاد عربیہ کے سفراء نے تعزیتی خطوط بھیجے اور نیوزی لینڈ کے تمام بڑے اخبارات، ریڈیو اور ٹیلیویژن نے ان کی وفات کی خبر نشر کی۔

پسماندگان میں اہلیہ، پانچ بچیاں اور ایک لڑکا فوزان طارق ہیں۔ اور یہ سب نیوزی لینڈ ہی میں مقیم ہیں۔

---

(۲) مولانا قاضی ظفر مسعود صاحب: (ولادت: یکم ر دسمبر ۱۹۴۱ء) ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں حاصل کی، ایم پی انٹر کالج مبارکپور سے ہائی اسکول کیا، اس کے بعد عربی تعلیم کے لئے مدرسہ احیاء العلوم میں داخل ہوئے، اور ۱۹۶۹ء میں جامعہ مفتاح العلوم مئو سے فراغت حاصل کی۔ بہت عمدہ علمی وادبی ذوق تھا، قاضی صاحب کی تمام تصنیفات ومضامین ومقالات کا اشاریہ تیار کر رکھا تھا، جس سے مجھے قاضی اطہر نمبر کی ترتیب میں بہت مدد ملی، مجھ سے بہت محبت رکھتے تھے۔ ۱۷ ر دسمبر ۲۰۰۹ء میں انتقال ہوا۔

(۳) مولانا سلمان مبشر صاحب (ولادت: یکم ر جنوری ۱۹۵۱ء) عالمیت تک تعلیم جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں ہوئی، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں سے دورۂ حدیث پڑھ کر ۱۹۷۲ء میں فارغ ہوئے۔ ۱۹۷۴ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے، اور ۱۹۷۸ء میں وہاں سے فراغت حاصل کی، سعودی حکومت نے آپ کو گھانا میں مبعوث کیا، ۱۹۹۲ء میں آپ کا تبادلہ ہندوستان ہو گیا۔ اس وقت دارالعلوم حسین آباد (شعبہ بنات) میں استاذ حدیث ہیں۔ والد محترم حضرت قاضی صاحب کے علوم کی نشر واشاعت میں تن من دھن سے لگے رہتے ہیں، قاضی صاحب کی کتابوں کے جدید ایڈیشن اکثر انہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہیں، بارك الله فی مساعیه وعلمه وعمله وماله

(۴) جناب حسان احمد صاحب (ولادت: یکم جمادی الاخریٰ [فروری ۱۹۵۴ء]) ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں حاصل کی، شبلی کالج سے بی۔ اے کیا، انصار گرلس انٹر کالج کے ذمہ دار ہیں۔

(۱) امۃ الرحمٰن (ام سلمہ) (ولادت: یکم مارچ ۱۹۴۸ء) قاضی صاحب کی بڑی صاحبزادی ہیں، ان کا محمد آباد گہنہ نانہالی رشتے میں ماسٹر مصباح الدین صاحب سے ہوا، قیام فیروز آباد میں ہے۔

(۲) شمیمہ عائشہ (ولادت: ۵ رشعبان ۱۳۷۹ھ [فروری ۱۹۶۰ء]) ان کا نکاح قاضی صاحب کے ماموں مولانا محمد یحییٰ صاحب کے حقیقی نواسے رضوان احمد صاحب علیگ سے ہوا۔

مئے طہور

مجموعہ کلام (غیر مطبوعہ) قاضی اطہر مبارکپوری

قاضی صاحب کے علمی سفر کا آغاز مذہبی واصلاحی شاعری سے ہوا۔ یہ طالب علمی کا دور تھا اور جب فراغت کے بعد عملی زندگی کے لق ودق صحرا میں آئے تو یہی ان کا زاد سفر تھا، آزادی کی ساعت قریب آتی جا رہی تھی۔ اس وقت ان کی نظموں کا تیور کچھ اور تھا اور آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں پر جو قیامت گذری، اس وقت کا درد وکرب، غم ویاس، احساس مظلومی وبیچارگی ان کی نظموں پر چھا گیا۔ آزادی کے فوراً بعد وہ بہرائچ چلے گئے وہاں سے ہفتہ وار ''الانصار'' جاری کیا، اس میں جتنی نظمیں شائع ہوئیں ان میں بلا استثناء ہر ایک میں وہی درد وکرب رچا بسا ہوا ہے، چار پانچ برسوں کے بعد حالات میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہوا اور امید کی کرنیں کچھ نظر آنے لگیں تو ان کی نظموں میں اس کیفیت کا عنصر شامل ہو گیا، پھر ڈابھیل، امرتسر، لاہور ہوتے ہوئے عروس البلاد بمبئی پہونچ گئے، اخبار نویسی، تصنیف وتالیف، تحقیق ومطالعہ کے صحرائے ناپیدا کنار میں اس طرح گم ہو کر رہ گئے کہ کہ شعر وشاعری کی راہ ہمیشہ کیلئے چھوٹ گئی۔

آغاز سفر میں قدم ڈگمگاتے ہیں لیکن یہی قدم اگر منزل تک پہونچ جائیں تو ان ڈگمگاتے قدموں کی بھی قدر وقیمت بہت بڑھ جاتی ہے، فطری اصولوں کے مطابق ان کی قدر شناسی ہمارے لئے ضروری ہے، اس لئے قاضی صاحب کی شاعری ان کی علمی ترقی کا پہلا زینہ ہے اس کے تذکرہ کے بغیر ان کی داستان حیات نامکمل رہ جائے گی، ہم اسی نقطۂ نگاہ سے چند نظمیں اور غزلیں یہاں پیش کر رہے ہیں۔

........................(اسیر ادروی)

نوٹ: قاضی صاحب مجموعۂ کلام ''مئے طہور'' کے نام سے اپریل ۲۰۰۶ء مولانا قمر الزماں صاحب مبارکپوری کی ترتیب اور فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ یہ ۴۵۸ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں مقدمہ ۲۲۶ رصفحات پر مشتمل ہے، اور قاضی صاحب کا کلام ۲۲۰ رصفحات پر۔ یہ مجموعہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، اس وقت اس کا ایڈیشن ناپید ہے۔ شائقین کو تلاش وجستجو کے بعد بھی نہیں مل پا رہا ہے۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

بسوئے رحمۃ للعالمین ﷺ

یثم بہ ہجرش برہم نظامے — درشام صبحے ،در صبح شامے
درصبح رویش شمسے درخشاں — شمسے چہ شمسے، شمسے مدامے
درشام زلفش، ماہ مبارک — ماہے چہ ماہے، ماہے تمامے
خط جبینش ،تقدیر ہستی — نطق بیانش ،مبرم پیامے
صدیق وفاروق عثمان وحیدر — دربند زلفش صید مدامے

اے فخر عالم! با سوز فرقت
گوید سلامے، ادنیٰ غلامے

درسوز سینہ سوزد سفینہ — دربحر غربت، اللہ اکبر
درگوش عزلت قیدجہ شورے — شورقیامت، اللہ اکبر
از تیر شیطاں درقلب ایماں — زخم نہایت، اللہ اکبر
طوف مسلماں گرد صنمہا — ایں چہ قیامت، اللہ اکبر
رسوا زدست مردمسلماں — ناموس ملت، اللہ اکبر
ہر روز جنگے برنام مذہب — نیرنگ شامت، اللہ اکبر
ہردوصنم گر، ملاو صوفی — گو ریش بر رُو گو سر بہ سجدہ
از نام فتویٰ ملت فروشی — وزنام تقویٰ از غیر پردہ
امت پریشاں در راہ طیبہ — رہبر گرفتہ ، راہ کلیسا
حاضرورت ام یا رحمت کل — با چشم تر،باآہ فسردہ

بہر غلاماں، آقا دعا کن
امت پریشاں، آقا دعا کن

(مارچ ۱۹۵۵ء)

نعت شریف

اندھیری رات، بادل کی گرج، بجلی، ہوا پانی — زمیں بھیگی ، فضا پر ہول ، ہرسو دور طوفانی
پپیہے کی صدائے درد آگیں شاخساروں میں — گھنیرے جنگلوں میں جا بہ جا جگنو کی تابانی
ادھر کوئل کی رنگیں کوک لہراتی ہے رہ رہ کر — ادھر جذبات پر ہوتی ہے پیہم برق ارزانی
جھڑی برسات کی، جل تھل زمیں پر، ابر گردوں پر — یہ کس کی یاد میں کی آسماں نے اشک افشانی
نظر سہمی سی، دل ڈوبا ہوا، اوسان وارفتہ — کوئی ایسے میں سن لیتا نوائے سوز پنہانی

عطا ہو ساقیاً تشنہ لبوں کو جام عرفانی — حریم نعت میں آئے نظر، ہر چیز نورانی
نہ پوچھ اس دم مرا سوز وگداز شاعری ہمدم — درمعنی پہ سجدہ زیر ہے لفظوں کی پیشانی
وفور بیخودی میں ہے نئے انداز سے پیہم — حریم حسن میں دست طلب کی پردہ جنبانی
تری ذات مقدس مبدأ الطاف بے پایاں — تری ذات مقدس منتہائے فضل ربانی
کھلا ہے صفحۂ قرآں، ضیائے روئے انور میں — جبیں پر گیسوئے پر پیچ میں آیات قرآنی
بیان والضحیٰ پیشانیٔ سیمیں کے جلوے میں — ہے شرح سورۂ واللیل، زلفوں کی پریشانی
تری آنکھوں کو ساقی چشمۂ کوثر سے کیا نسبت — جو اک جنبش میں چھلکائیں ہزاروں جام عرفانی

ابوبکر عمر عثماں وحیدر، واہ کیا کہنا — انہیں چاروں سے ہے آئینۂ ملت میں تابانی
قسم ہے گردش چرخ کہن کی ، دور آخر کی — زمانہ لا نہیں سکتا ان حضرات کا ثانی

بروقت قیادت

چھا جاتا ہے ماحول پہ جب رنگ تباہی
آنکھوں میں جب آجاتی ہے افسردہ نگاہی

کام آئیں نہ جس وقت اوامر نہ نواہی
حق دیتا ہے جب بھول کے باطل کی گواہی

چھپ جاتا ہے جب نور اندھیروں کی ردا میں
انوار پہ یورش کو جب اٹھتی ہے سیاہی

سجادۂ ناپاک پہ جب بے اثری سے
دم توڑتی ہے یاس میں ہر آہ سحرگاہی

جس وقت بھلا دیتا ہے منزل کا تصور
آزادی احساس کی شہراہ کا راہی

جب بیٹھ رہے دیکھ کے ہنگامہ ٔمیداں
روباہ صفت خانقہ غم میں سپاہی

تسکین ہو جب گوشہ نشینان حرم کو
ہتھیائیں گدادھر کے اسلام کی شاہی

جب موت کے سانچے میں ڈھلے زیست کی دنیا
جب امن سے ہوتی ہو تباہی پہ تباہی

اس وقت ابھرتا ہے کوئی دین کا غازی
باہیبت و باہمت و باژرف نگاہی

اس شان سے چلتا ہے شہنشاہ صداقت
خورشید پہ ہنستی ہے درخشندہ کلاہی

ہنگامۂ بیداری ہمت کے اثر سے
لیتی ہے قیامت بھی جماہی پہ جماہی

وہ امن بھی یلغار سے محفوظ نہیں ہے
جس امن کا رخ ہو تباہی ہی تباہی

جمعیۃ علماء ھند

نکل آئیں نیاموں سے تڑپ کر گرم تلواریں
رگ باطل سے پھوٹیں بے محابا خون کی دھاریں

چلو، اٹھو، بڑھو، حملہ کرو، باطل سے ٹکراؤ
اگیں کشت وفا میں غازیان دیں کی للکاریں

جب آجاتی ہے دست حق پرستی میں ید اللّٰہی
لرز جاتی ہیں قصر کفر کی مضبوط دیواریں

خیال دوری منزل سے رک جاتی ہیں جب راہیں
کہ میر کارواں کی دم بخود ہوتی ہیں گفتاریں

سمجھ جاتے ہیں اہل کارواں جب اس کی گمراہی
تو کام آتی ہے قائد کی نہ گفتاریں نہ رفتاریں

قیادت کا گلا گھٹتا ہے جب اندوہ کثرت سے
تو کام آتی ہیں پھر مردان وحدت کی ہی للکاریں

عباد خانقاہی ہوں کہ رہبان کلیسائی
اچھالی ہیں انہیں دونوں نے اہل حق کی دستاریں

بدل سکتی نہیں رخ غازیوں کا جادۂ حق سے
نہ مکاروں کی مکاری، نہ سفاکوں کی یلغاریں

جو گمراہ ازل ہیں راہ حق پر آنہیں سکتے
ہم ان کو لاکھ سمجھائیں ہم ان سے لاکھ سر ماریں

حسین احمد امیر کارواں ہیں اہل ہمت کے
جو دشواری سے گھبرائیں نہ کچھ دوری سے جی ہاریں

ہزاروں مرحلے باقی ہیں مردان محمد کے
پس دیوار مستقبل ہیں جانے کتنی یلغاریں

ہے اطہر روح مذہب اصل میں جمعیۃ علماء
ہیں جس کے دم سے قائم ہند میں ملت کی دیواریں

....(۳۰ نومبر ۱۹۴۷ء)

اشارات

زمانہ کے تغیر سے ہوئی یوں عام بربادی
کہ ویرانہ ہے ویرانہ نہ آبادی ہے آبادی

نظر اٹھتی ہے جس جانب ہے بربادی ہی بربادی
سلیقے کی اسیری ہے، قرینے کی نہ صیادی

نہ پوچھو ہمدمو! ہم بیکسوں کی وجہ بربادی
کہ آ کر اس جگہ خاموش ہوجاتے ہیں فریادی

ہماری بے زبانی رحم کے قابل ہے اے یارو
انہیں سے پوچھ لیتا کاش کوئی وجہ بربادی

بسا اوقات مرغان قفس کی گرم آہوں سے
وبال جان بن جاتی ہے صیادوں کی صیادی

بہر حال آرزو اپنی ترے قدموں کے نیچے ہے
محبت میں یہی اک چیز ہے لے دے کے بنیادی

زمانے بھر کی ٹھوکر کھا کے تیرے در پہ آئی ہے
کدھر جائیگی دل کی آہ گر تو نے بھی ٹھکرادی

فسانہ بن رہی ہے اب تو محفل میں فداکاری
وفا کی سرد پڑتی جا رہی ہے گرم بازاری

ہے باقی وصل کی خواہش نہ فرقت کی جنوں کاری
جنوں کاروں کی الفت سے ہوئی جاتی ہے بیزاری

نہ جانے کیا دل وحشی نے اپنا رنگ بدلا ہے
کہ صحرا چھوڑ کر پھرتی ہے دردر اس کی خودداری

زمانے نے اڑا دی دھجیاں دامان ہستی کی
بدن پر مردنی سی، روح پر افسردگی طاری

پڑا ہے زندگی کا کارواں ششدر دوراہے پر
نہ جینے ہی کا ساماں ہے نہ مرنے ہی کی تیاری

شکایت ہائے رنگیں کہہ تو دوں لیکن ہے ڈر اطہر
کہ ہوجائے نہ ان کی طبع نازک پر گرانباری

....(۲۰؍مارچ ۱۹۴۸ء)

مئے طہور

شعور دل سے طوفان بصیرت پھوٹ جاتا ہے
بصارت کا تعلق جب نظر سے ٹوٹ جاتا ہے

نگاہوں پر برس جاتی ہے جب مایوس تاریکی
ہر اک تار نظر سے چشمۂ خوں ٹوٹ جاتا ہے

حد منزل پہ جب جاتا ہوں یہ محسوس کرتا ہوں
کوئی آ کر متاع کارواں کو لوٹ جاتا ہے

گذر جاتی ہیں میری حسرتیں یاس و تمنا میں
یتیموں کا مقدر جس طرح سے پھوٹ جاتا ہے

سنا دیتا ہوں دل کی آپ بیتی پھر بھی دانستہ
بسا اوقات عنوان فسانہ چھوٹ جاتا ہے

گرا دیتے ہیں وہ مجھ کو نظر سے جب سر محفل
مرے جینے کا دنیا میں سہارا ٹوٹ جاتا ہے

تعالیٰ اللہ، زہے تقدیر، ایسے مرنے والوں کی
مسیحا مسکرا دیتا ہے اور دم چھوٹ جاتا ہے

ہوا جاتا ہے جب جوش سفر بیتابیٔ منزل
کوئی ہم شکل منزل بن کے اطہرؔ لوٹ جاتا ہے

مجھے اپنوں سے الفت ہے وگرنہ قاضی اطہرؔ
انہیں حالات میں اپنوں سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے

(۲۷ دسمبر ۱۹۴۷)

سرور وکیف سے آہ و فغاں تک بات جا پہنچی
پہونچنا تھا کہاں؟ لیکن کہاں تک بات جا پہونچی
جبیں سے میری، ان کے آستاں تک بات جا پہنچی
زمیں سے اٹھ کے پہلے، آسماں تک بات جا پہونچی
تھے غنچے مہر بر لب منتظر ادنیٰ اشارے کے
ذرا سے وہ ہنسے تو گلستاں تک بات جا پہونچی
دعا دیتا ہوں غماز چمن! تیری تگ و دو کو
جونہی تنکے چنے، برق تپاں تک بات جا پہونچی
معاذ اللہ، بحث حسن والفت کتنی خونی ہے
چلی مژگاں سے اور تیغ و سناں تک بات جا پہونچی
نہ کہتا تھا ، نہ چھیڑو مرے اشکوں کو برا ہوگا
اگر قطرے سے بحر بیکراں تک بات جا پہونچی
بہ ہر قیمت بدلنا ہے نظام میکدہ ہم کو
پہونچنے دو اگر پیر مغاں تک بات جا پہونچی
سکوت اطہرؔ کیا ہم نے بہت آغاز الفت میں
مگر انجام میں شرح و بیاں تک بات جا پہنچی

جب سے ان کی یاد حرز جسم وجان ہونے لگی
زندگی بیگانۂ سود و زیاں ہونے لگی

ان کی محفل میں میرا تذکرہ ہونے لگا
اب تو میری داستاں بھی داستاں ہونے لگی

میں نے برسوں یوں گزارے ہیں قفس کے رات دن
برق جب چمکی تو فکر آشیاں ہونے لگی

ہمصفیرو! کون سی دھن یہ تراشی تم نے آج
مضمحل نغموں سے روح گلستاں ہونے لگی

کچھ دنوں میں اور بدلے گی یونہی رسم قفس
اب تو کچھ آزادی آہ و فغاں ہونے لگی

ہائے وہ بیمار آنکھیں جن کا اطہرؔ ہے مریض
ان کی اک شہ پر میری دنیا جواں ہونے لگی

☆☆☆☆☆☆☆

کچھ اس انداز سے پچھلے پہر فریاد کی ہم نے
اڑھادی ماہ و انجم کو ردائے تیرگی ہم نے

جھکایا سر ترے در پر بہ انداز خودی ہم نے
ستاروں کی جبیں سے چھین لی تا بندگی ہم نے

اک ایسا کشمکش کا وقت گذرا ہے محبت میں
کہ خود اپنی تمنا کی اڑائی ہے ہنسی ہم نے

قصور اس میں ہے کیا ساحل کا دریا کی خطا کیا ہے
اگر طوفان میں جاکر خود ہی کشتی توڑ دی ہم نے

ہلا سکتی نہیں ہے دولت کونین بھی اطہرؔ
زمین فقر پر رکھی ہے بنیاد خودی ہم نے

وہ وقت بھی تھا کبھی کہ دونوں ہلاک تیغ ستم رہے ہیں
مگر اب اپنی وفا پہ قائم نہ وہ رہے ہیں نہ ہم رہے ہیں
سرور و غم کی جدا ہیں راہیں کہ ایک نغمہ ہے ایک نالہ
مگر محبت کی تلخیوں میں ندیم دونوں بہم رہے ہیں
وہاں شکنجے میں زندگی تھی یہاں ہے حلقوم زیر خنجر
کہ ہوکے آزاد ہم قفس سے اسیر دام کرم رہے ہیں
شعور واحساس پھوٹ نکلا ہے توڑ کر بندش زمانہ
قفس میں محسوس کر رہا ہوں کہ بال و پر میرے جم رہے ہیں
ہزار دنیا نے رنگ بدلے مگر نہ اپنا مقام بدلا
نشاط کی انجمن میں رہ کر بھی ہم اسیر الم رہے ہیں
وفا کے دل پر ہزار چرکے دیئے جفا نے طرح طرح کے
مگر رہ جستجو میں آگے ، تیرے شکستہ قدم رہے ہیں
گذر گیا وہ حسیں زمانہ کہ جب جواب وفا،وفا تھی
اب آگیا ہے وہ دور جس میں وفا کے امکان کم رہے ہیں
ادھر تو گذری ہے عمر اطہؔر خودی کی آزاد خلوتوں میں
وہ اور ہوں گے جو انجمن میں اسیر جاہ وحشم رہے ہیں

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(بشکریہ مجلّہ ترجمان الاسلام بنارس ''قاضی اطہر نمبر'')

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ ضیاء الاسلام کا «قاضی اطہر مبارکپوریؒ نمبر»

ایک تبصرہ

حضرت مولانا اسیر ادروی صاحب مدظلہٗ
مدیر: مجلّہ ''ترجمان الاسلام'' بنارس

مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ اہل علم کے اونچے طبقے میں معروف ومشہور ہیں، متوسط طبقے میں ان کے جاننے والے، ان کے مقام ومرتبہ سے آشنا کم ہیں، ان کی تصنیفات کا علمی اور تحقیقی معیار اتنا بلند ہے کہ عوامی حلقوں تک ان کی کتابیں نہیں پہونچ سکیں، کچھ کتابیں تو عربی زبان میں ہیں جو خالص علمی وتحقیقی کام کرنے والے اہل علم تک محدود ہیں، البتہ اردو زبان میں لکھی گئی کتابیں متوسط طبقہ کی محفلوں میں بار پاسکیں لیکن وہی اہل علم ان سے بھرپور استفادہ کرسکے جن کا ذوق خالص علمی اور تحقیقی ہے اور ان کو جدید معلومات کی جستجو رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی اہم ترین اور معیاری کتابوں کے صرف ایک ایک ایڈیشن ہی شائع ہوئے، دوسرے ایڈیشن کی نوبت کم آئی، البتہ عام قومی وملی مسائل پر دینی معلومات کی کتابیں جو اردو زبان میں ہیں اور مدلل بحثوں کی وجہ سے عام طور پر مقبول ہوئیں ان کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور قبولیت کے ہاتھوں لی گئیں اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئیں، لیکن اس کی وجہ سے قاضی صاحب کے بلند علمی مقام سے کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی، اونچے طبقے کے اہل علم میں ان کی تحقیقی کتابوں کی جو پذیرائی ہوئی اور ان کو جو اہمیت دی گئی اور ان کو مستند حوالوں کی فہرست میں شمار کیا گیا برصغیر ہندوپاک، عرب ممالک بلکہ یورپ کے دانش کدوں تک قاضی صاحب کی کتابوں کی جو رسائی ہوئی اور دانشور طبقے نے ان کے مطالعہ کے بعد جتنے بلند خیالات کا اظہار کیا اور جو قدر ومنزلت کی ان کی عظمت کا اعتراف کیا، یہی ان کے علمی

وتحقیقی مقام کو متعین کرنے کیلئے کافی ہے کیونکہ قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری، عوامی تعریف وتحسین کسی کو بلند مرتبہ نہیں بنا سکتی جب تک کہ خواص کی زبان سے اس کی قدر ولیاقت کا اعتراف نہ ہو، قاضی اطہر مبارکپوری کے پاس ان اعترافات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے وہ عوام کی تعریف وتحسین سے بے نیاز اور مستغنی ہیں۔

رسالہ ضیاء الاسلام نے یہ شمارہ شائع کر کے انھیں بلند علمی اعترافات میں اضافہ کیا ہے، ادارہ نے ایسے باوقار مقالات ومضامین فراہم کر دیئے ہیں جو ہر طبقہ میں قاضی صاحب کے مقام ومرتبہ سے روشناس کرانے والے ہیں، ہر سطح کے اہل علم ان سے اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں، مضامین قاضی صاحب کی شخصیت کی ہمہ جہتی تصویر کشی کرتے ہیں، اس خاص نمبر کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ قاضی صاحب کی خودنواشت سوانح عمری جو انھوں نے ''کاروانِ حیات'' کے نام سے مرتب کی تھی اور ابھی تک طبع نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کسی کو اس کی خبر تھی ،اس کو ادارہ نے ڈھونڈ نکالا ہے، اس کا ابتدائی حصہ جو بہت محدود صفحات پر مشتمل ہے اس کو قاضی صاحب نے اپنی حیات میں شائع کر دیا تھا، لیکن وہ زندگی کے ابتدائی دور کے حالات پر مشتمل ہے، ان کے احباب اس کو مکمل کرنے کا اصرار کرتے رہے لیکن انھوں نے کوئی مثبت جواب نہیں دیا اور نہ اپنے ارادہ کا اظہار کیا وہ خاموشی سے اس کی تکمیل کرتے رہے یہاں تک کہ ان کا وقتِ موعود آ گیا اور یہ مسودہ ان کے مسودوں کے انبار میں دبارہ گیا اور نگاہوں سے اوجھل رہا، خودنوشت سوانح کا یہ حصہ خاص طور پر قابل مطالعہ ہے، قاضی صاحب نے جو بھرپور علمی زندگی گذاری، علم وتحقیق کے شاندار کارنامے انجام دیئے، برصغیر ہند وپاک میں جو عزت وشہرت حاصل کی، پاکستان وعرب ممالک میں جو ان کے اسفار ہوئے، ان ملکوں میں جو ان کی شاندار پذیرائی ہوئی، علمی دنیا کی عظیم اور مشہور شخصیتوں سے جو ذاتی ملاقاتیں ہوئیں، تبادلۂ خیال ہوا، ان کے علمی کمالات، تصنیفی وتحقیقی کارناموں کی وجہ سے جتنا بھرپور خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے یہ ولولہ انگیز داستان اب تک ناگفتہ وناشنیدہ رہی، قاضی صاحب نے ''کاروانِ حیات'' میں بہت تفصیل سے لکھا ہے، اس میں نہ کہیں خودستائی کی جھلک ہے اور نہ تعلّی کا شائبہ! بہت سے اہم ترین واقعات ایسے ہیں کہ اگر ان میں سے چند ہی کی کسی زندگی میں پیش آ جائیں تو اس کی عزت وشہرت کو بام ثریا تک پہنچا سکتے ہیں، لیکن اتنی

سادگی سے ان واقعات کو قلمبند کر جاتے ہیں جیسے کوئی روز مرہ کا واقعہ ہو، یہ قاضی صاحب کی اعلیٰ ظرفی ہے، غرضیکہ اس داستان کا حرف حرف دلچسپی سے پڑھے جانے کے لائق ہے، یہ پوری خود نواشت ''کاروانِ حیات'' اس خاص نمبر میں شائع کر دی گئی ہے جو اس شمارے کا بہت ہی اہم قیمتی حصہ ہے کیوں کہ اس تحریر کو دستاویزی حیثیت حاصل ہے جو اس شمارے کی قدر و قیمت کو بہت بڑھا دیتی ہے۔

اس شمارے میں قاضی صاحب کی تین اہم ترین تصنیفات ''**العقد الثمین**''۔ ''**رجال السند والهند**'' اور ''دیارِ پورب میں علم اور علماء'' کا گہرا مطالعہ کر کے ان کی تاریخی و تحقیقی حیثیت پر سیر حاصل کلام کیا گیا ہے، قاضی صاحب کے بلند علمی و تحقیقی ذوق، ان کے وسعتِ مطالعہ، ان کی نکتہ رسی اور ژرف بینی کے عظیم کارناموں کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے، تینوں مقالے قابل قدر اور خصوصیت سے قابل مطالعہ ہیں۔

قاضی صاحب کے بہت سے تحقیقی مقالے جو مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے وہ ندرت علم و تحقیق کا شاہکار ہیں، ان مقالوں پر مجموعی طور سے کوئی مقالہ تو نہیں ہے جو قارئین کو ان کی قدر و قیمت سے روشناس کرائے، لیکن رسالہ البلاغ اور بعض دوسرے رسائل میں جو علمی جواہر پارے بکھرے ہوئے ہیں ان سے کئی مقالہ نگاروں نے روشناس کرایا ہے، کئی مشہور اہل قلم کے تاثراتی مضامین اس شمارے میں شامل ہیں، جن میں انھوں نے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں قاضی صاحب کی زندگی کے اہم پہلوؤں کو بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے اور ان میں قاضی صاحب کے ذہن و مزاج، اخلاق، ان کی سادگی اور سادگی میں پُرکاری کو خوبصورت لفظوں میں بیان کیا ہے، یہ سارے مضامین قابل مطالعہ ہیں۔

ضیاءالاسلام کا یہ قاضی اطہر نمبر اپنی خصوصیات کی وجہ سے ہر شخص کیلئے قابل مطالعہ ہے، اس نے قاضی صاحب کے حالات زندگی، ان کے علمی کمالات سے اہل علم کو روشناس کرانے میں کلیدی رول ادا کیا ہے، اہل علم سے اس کے مطالعہ کی سفارش کرنے میں تبصرہ نگار خوشی محسوس کرتا ہے۔

(ماہنامہ ضیاءالاسلام، اپریل ۲۰۰۴ء)

☆☆☆☆☆

فہرست مضامین ماہنامہ ''الاسلام'' و ''ضیاء الاسلام''

فہرست ماہنامہ الاسلام

جلد نمبر (۱) شوال المکرّم ۱۴۲۰ھ (جنوری ۲۰۰۰ء) شمارہ نمبر (۱)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۱) ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ (فروری ۲۰۰۰ء) شمارہ نمبر (۲)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۱) ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ (مارچ ۲۰۰۰ء) شمارہ نمبر (۳)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۱) محرم الحرام ۱۴۲۱ھ (اپریل ۲۰۰۰ء) شمارہ نمبر (۴)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۱)　　صفر المظفر ۱۴۲۱ھ (مئی ۲۰۰۰ء)　　شمارہ نمبر (۵)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۱)　　ربیع الاول ۱۴۲۱ھ (جون ۲۰۰۰ء)　　شمارہ نمبر (۶)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر(۱)　ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ (جولائی ۲۰۰۰ء)　شمارہ نمبر (۷)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر(۱)　جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ (اگست ۲۰۰۰ء)　شمارہ نمبر (۸)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۱) جمادی الاخریٰ ۱۴۲۱ھ (ستمبر ۲۰۰۰ء) شمارہ نمبر (۹)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۱) رجب المرجب ۱۴۲۱ھ (اکتوبر ۲۰۰۰ء) شمارہ نمبر (۱۰)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۱)　شعبان، رمضان ۱۴۲۱ھ (نومبر، دسمبر ۲۰۰۰ء)　شمارہ نمبر (۱۲،۱۱)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

بفضلہٖ تعالیٰ اس شمارہ پر پہلی جلد بخیر وخوبی تمام ہوئی

جلد نمبر (۲)　شوال ۱۴۲۱ھ (جنوری ۲۰۰۱ء)　شمارہ نمبر (۱)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۲)　ذی قعدہ ۱۴۲۱ھ (فروری ۲۰۰۱ء)　شمارہ نمبر (۲)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۲)　ذی الحجہ ۱۴۲۱ھ (مارچ ۲۰۰۱ء)　شمارہ نمبر (۳)

فہرست

☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۲) محرم الحرام ۱۴۲۲ھ (اپریل ۲۰۰۱ء) شمارہ نمبر (۴)

فہرست

☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۲) صفر المظفر ۱۴۲۲ھ (مئی ۲۰۰۱ء) شمارہ نمبر (۵)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۲) ربیع الاول ۱۴۲۲ھ (جون ۲۰۰۱ء) شمارہ نمبر (۶)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

’’نوٹ‘‘ ماہنامہ ضیاء الاسلام پہلے ’’الاسلام‘‘ کے نام سے جاری ہوا، اور اس کے اٹھارہ شمارے نکل بھی چکے تھے، جب اس کے ڈکلیریشن کی درخواست حکومت کو دی گئی تو ’’الاسلام‘‘ کے بجائے ’’ضیاء الاسلام‘‘ کی منظوری ملی، کیونکہ ’’الاسلام‘‘ کے نام

سے ایک رسالہ پہلے ہی سے رجسٹرڈ ہے، یہ فہرست ''الاسلام'' کی ہے، جولائی ۲۰۰۱ء سے ضیاءالاسلام کے نام کی منظوری ملی، تو اسے بھی قانونی دشواریوں کی وجہ سے ابتداء خیال کرتے ہوئے اسے جلد اول شمارہ اول سے شروع کیا گیا،

فہرست ماہنامہ ''ضیاءالاسلام''

جلد نمبر(۱) ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ (جولائی ۲۰۰۱ء) شمارہ نمبر(۱)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر(۱) جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ (اگست ۲۰۰۱ء) شمارہ نمبر(۲)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر(۱) جمادی الاخریٰ ۱۴۲۲ھ (ستمبر ۲۰۰۱ء) شمارہ نمبر(۳)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۱) رجب المرجب ۱۴۲۲ھ (اکتوبر ۲۰۰۱ء) شمارہ نمبر (۴)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۱) شعبان المعظم ۱۴۲۲ھ (نومبر ۲۰۰۱ء) شمارہ نمبر (۵)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر(۱) رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ (دسمبر ۲۰۰۱ء) شمارہ نمبر(۶)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر(۲) شوال، ذی قعدہ ۱۴۲۲ھ (جنوری، فروری ۲۰۰۲ء) شمارہ نمبر(۱-۲)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۲) ذی الحجہ ۱۴۲۲ھ (مارچ ۲۰۰۲ء) شمارہ نمبر (۳)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۲) محرم ۱۴۲۳ھ (اپریل ۲۰۰۲ء) شمارہ نمبر (۴)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۲) صفر ۱۴۲۳ھ (مئی ۲۰۰۲ء) شمارہ نمبر (۵)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۲) ربیع الاول ۱۴۲۳ھ (جون ۲۰۰۲ء) شمارہ نمبر (۶)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۲) ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ (جولائی ۲۰۰۲ء) شمارہ نمبر (۷)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۲)　جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ (اگست ۲۰۰۲ء)　شمارہ نمبر (۸)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر(۲) جمادی الاخریٰ ۱۴۲۳ھ (ستمبر ۲۰۰۲ء) شمارہ نمبر(۹)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر(۲) رجب المرجب ۱۴۲۳ھ (اکتوبر ۲۰۰۲ء) شمارہ نمبر(۱۰)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۲) شعبان/ رمضان/ شوال ۱۴۲۳ھ (نومبر/ دسمبر ۲۰۰۲ء) شمارہ نمبر (۱۱-۱۲)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر(۳) شوال، ذی قعدہ ۱۴۲۳ھ (جنوری ۲۰۰۳ء) شمارہ نمبر(۱)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر(۳) ذی قعدہ، ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ (فروری ۲۰۰۳ء) شمارہ نمبر(۲)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۳) ذی الحجہ، محرم ۱۴۲۳ھ (مارچ ۲۰۰۳ء) شمارہ نمبر (۳)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۳) محرم، صفر ۱۴۲۴ھ (اپریل ۲۰۰۳ء) شمارہ نمبر (۴)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۳)　صفر، ربیع الاول ۱۴۲۴ھ　(مئی ۲۰۰۳ء)　شمارہ نمبر (۵)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

(۱) بھیرا ایک متوسط آبادی کا گاؤں ہے، جو محمد آباد کے شمال میں مائل بہ مغرب تین کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے، ٹونس ندی کے شمالی کنارے پر آباد ہے، راقم الحروف کا مولد یہی گاؤں ہے۔

(۱) قاضی اطہر صاحب مبارکپور ہی کے رہنے والے تھے، اور اسی نام کی نسبت سے اپنے کو مبارکپوری لکھتے ہیں۔

(۱) الحاج سیٹھ احمد غریب صاحب نے ۶؍ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۴؍جولائی ۱۹۶۷ء کو پچپن سال کی عمر میں کراچی میں وفات پائی۔ (البلاغ ج:۱۷، ش:۵)

(۱) العبر للذہبی میں جنگ صفین کے ذکر میں بدری صحابہ کی شرکت کا ذکر ہے، غالباً اس کی تعداد بتائی ہے، اسی عبارت کی نقل حضرت مولانا نے طلب کی تھی۔ (۲) قاضی صاحب کے بڑے صاحبزادے مولانا خالد کمال صاحب، جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ہندوستان سے ابتداً گئے تھے۔

جلد نمبر (۳) ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ (جون ۲۰۰۳ء) شمارہ نمبر (۶)

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

جلد نمبر (۳) جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ (جولائی ۲۰۰۳ء) شمارہ نمبر (۷)

فہرست

غم یا پریشانی کے وقت کی دعا

بخاری ومسلم اورترمذی کی صحیح احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو کوئی غم یا بے چینی یا اہم کام پیش آئے تو اس کو چاہئے کہ یہ کلمات پڑھے، سب مشکلات آسان ہوجائیں گی۔ وہ کلمات یہ ہیں۔ (معارف القرآن ج:۴،ص:۱۳۱)

لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَرَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ